عنایت اللہ کی ہنگامہ خیز اور سحر انگیز خود نوشت

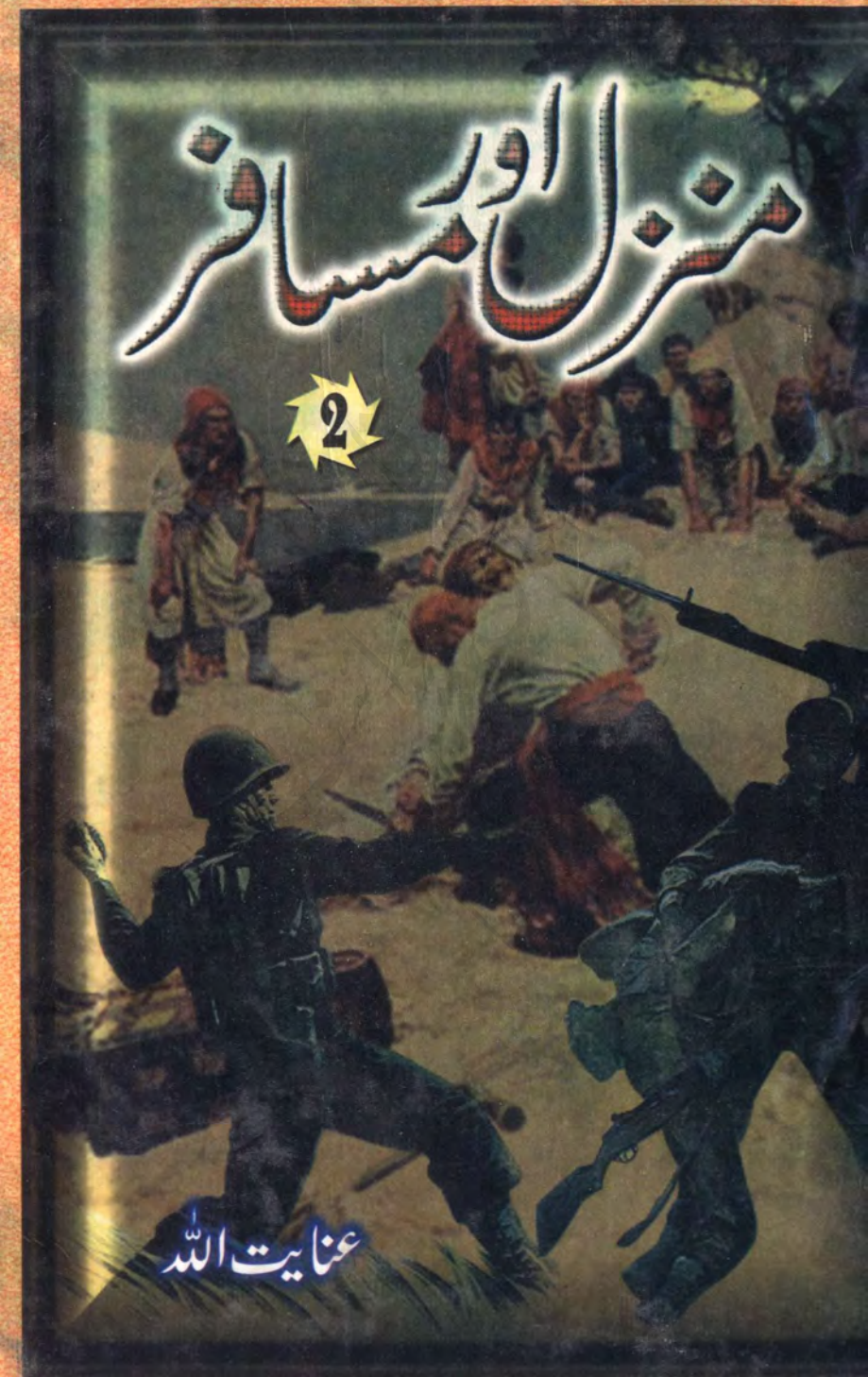

جب بات خالہ کی چل نکلی تو دو تین شہادتیں اس قسم کی مل گئیں کہ خالہ کو جب یہ جواب ملا تھا کہ اس کی بیٹی کو فضل داد اور اس کا باپ قبول نہیں کر رہے تو وہ سخت غصے میں آ گئی تھی۔ وہ عورتوں کے ساتھ دھمکیوں کی زبان میں باتیں کرنے لگی تھی۔ یہ دو عورتوں سے بھی پتہ چل گیا کہ خالہ اس گاؤں میں چند مرتبہ گئی تھی جس کی نشاندہی پنڈت نے کی تھی۔ فضل داد بڑا اکھڑ اور انتقام لینے کے معاملے میں بڑا زہری آدمی تھا۔ وہ اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لے کر کالے عامل کے گاؤں گیا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں نہایت معمولی قسم کے کسانوں کے چند ایک گھر تھے۔ انہی گھروں میں ایک گھر اس کالے عامل کا تھا۔ فضل داد اس کے ساتھ کوئی سودا بازی کرنے نہیں گیا تھا۔ اس نے گاؤں کے ایک دو آدمیوں سے اس کے متعلق پوچھا۔

فضل داد کو اس کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کچھ اس طرح تھیں کہ یہ شخص پیشے کا موچی تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ انتہائی غلیظ رہنے والا آدمی ہے۔ گاؤں میں بہت کم سلام و دعا رکھتا ہے اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ یہ گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ الٹے تعویذ اور کالے جادو کے عمل کرتا ہے اور پیسے کما لیتا ہے۔

فضل داد نے یہ خاص طور پر پوچھا کہ اس کے گھر کے افراد کتنے ہیں اور کیا کیا ہیں۔ پتہ چلا کہ اس کے علاوہ اس کی بیوی ہے اور ایک جوان لڑکی ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی اور اس کے بعد ایک لڑکا اور پھر اس کے بعد ایک لڑکی ہے۔

فضل داد نے اس کا گھر دیکھ لیا۔ کچا مکان تھا جس کی صحن کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ سارے کوائف معلوم کر کے فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی واپس آ گئے۔

○

اُسی رات آدھی رات سے کچھ پہلے فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی پھر اس گاؤں میں جا پہنچے۔ وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا نہ کوئی کتا تھا جو انہیں دیکھ کر بھونکتا۔ فضل داد دیوار کے قریب کھڑا ہو کر اچھلا تو اس کا ہاتھ دیوار کے اوپر چلا گیا۔ وہ فوجی تھا اس کے لئے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ دیوار پر پاؤں جما کر وہ اوپر گیا اور پیٹ کے بل دیوار پر لیٹ گیا۔ اس نے دایاں ہاتھ نیچے لٹکایا تو اس کے چچازاد بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور فضل داد نے اس کو اوپر کھینچا کچھ زور اس نے اپنا لگایا اور اس طرح وہ بھی دیوار پر چلا گیا۔

اُن راتوں کو چاند ذرا دیر سے نکلا کرتا تھا۔ اُس وقت چاند کچھ اُوپر آ گیا تھا۔ گھر

والے صحن میں چارپائیاں ڈالے سو رہے تھے اور انہوں نے اوپر کمبل اور کھیس لئے ہوئے تھے۔ فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی دیوار سے اترے۔ دونوں کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔ انہوں نے چاندنی میں سوئے ہوئے گھر والوں کو دیکھا۔ گھر والوں کو ذرا سی بھی ہوش نہیں تھی۔ فضل داد نے اس شخص کی جوان بیٹی کو جگایا۔

جوں ہی لڑکی کی آنکھ کھلی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ فضل داد نے کلہاڑی اس کے آگے کر کے کہا کہ اونچا سانس بھی لیا تو سر کھول دوں گا۔ اسے چارپائی سے اٹھا کر اپنے پاس کھڑا کر لیا۔ پھر کالے عامل اور اس کی بیوی کو اٹھایا۔ انہیں بھی یہی دھمکی دی گئی کہ وہ اونچی آواز نہ نکالیں ورنہ مارے جائیں گے۔ فضل داد اور اس کے چچازاد بھائی نے اپنے چہرے چھپائے ہوئے نہیں تھے۔ چھوٹے بہن بھائی سوئے رہے۔

"اندر چل کر دیا جلاؤ" ـــ فضل داد نے عامل سے کہا۔

عامل دوڑتا اندر گیا اور دیا جلایا۔ فضل داد اس کی بیٹی کو بازو سے پکڑے ہوئے اندر لے گیا۔ لڑکی کی ماں بھی ساتھ تھی۔ عامل نے ہاتھ جوڑ دیئے اور وہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ وہ شاید انہیں ڈاکو سمجھ رہا تھا۔

"ہم غریبوں کے پاس کیا ہے" ـــ عامل نے ہاتھ جوڑ کر کہا ـــ "کسی بڑے گھر میں جانا تھا"۔

"ہم ڈاکہ ڈالنے نہیں آئے" ـــ فضل داد نے کہا ـــ "اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہارے دونوں بچوں کو قتل کر کے اس لڑکی کو زندہ ساتھ لے جائیں گے۔ تم اپنا جادو چلا کر دیکھ لینا"۔

"اللہ تم دونوں کو لمبی عمر دے" ـــ عامل کی بیوی نے ہاتھ جوڑ کر کہا ـــ "تم یہ بتاؤ کہ آئے کیوں ہو اور میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جو کام کہو گے کریں گے"۔

فضل داد نے اپنی خالہ کا نام لیا اور اپنے گاؤں کا نام بھی بتایا' پھر کہا کہ اس عورت نے تم سے ایک خاوند اور اس کی بیوی پر بندش لگوا رکھی ہے کہ ان کے اولاد نہ ہو۔

"فوراً" بولو" ـــ فضل داد کے چچازاد بھائی نے کہا ـــ "یہ بات صحیح ہے یا غلط.... جھوٹ بولو اور اس کا نتیجہ ابھی دیکھ لینا۔ تمہاری عرض رپورٹ تھانے میں بھی کوئی نہیں سنے گا"۔ عامل نے کچھ بھی نہ کہا اور وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں' میں تمہیں بتاتی ہوں" ـــ عامل کی بیوی نے کہا ـــ "وہ عورت یہاں آتی

رہتی ہے اور اس نے یہ کام کروایا ہے"۔

"اوئے تم کیوں نہیں بولتے!" ـــ فضل داد کے چچازاد بھائی نے عامل کے پہلو میں کلہاڑی کے الٹے دستے کی ٹھوکر مار کر کہا ـــ "تم اپنی زبان سے بتاؤ اور فوراً" بولو"۔

"ہاں بادشاہو!" ـــ عامل نے کہا "میری بیوی نے سچی بات بتا دی ہے..... آپ حکم دیں' میں پورا کر دوں گا"۔

"اپنے شیطانی عمل کا توڑ ابھی کرو"۔ فضل داد نے کہا ـــ "اگر تم نے یہ کہا کہ ابھی نہیں ہو سکتا اور دو تین دنوں بعد ہو گا تو میں تمہاری اس بیٹی کو ساتھ لے جاؤں گا...

"ہو جائے گا حضور!" ـــ عامل نے کہا ـــ "ابھی کر دیتا ہوں۔ وہ میں نے ہی بندش لگائی تھی اس لئے اسے توڑنا میرے لئے مشکل نہیں"۔

"پھر جلدی کرو" ـــ عامل کی بیوی نے اسے کہا ـــ "اپنی جان اور اپنی عزت بچاؤ"۔

"آپ دونوں میں اس بیوی کا خاوند کون ہے؟" ـــ عامل نے پوچھا۔

فضل داد نے بتایا کہ میں اس کا خاوند ہوں۔ عامل نے اسے اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پہلے تو عامل اپنے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا اور پھر اس نے ہاتھوں سے اور پھر سر سے لوٹ پٹانگ سے اشارے کئے اور پھر فضل داد کی دونوں آنکھیں اپنی انگلیوں سے پوری طرح کھول کر ان میں پھونکیں ماریں۔ اس کے بعد اس نے میلا سا ایک کاغذ لیا اور پنسل سے اس پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں ڈالیں اور ان کے اوپر ہندی کے کچھ الفاظ لکھے اس کاغذ کو تہہ کر کے فضل داد کو دیا اور کہا کہ یہ کاغذ اسی طرح بیوی کے سر کے بالوں کے نیچے رکھ دینا۔ گرے نہیں اور یہ کاغذ تین دن اس کے بالوں کے اندر پڑا رہے۔

"باقی عمل جو کرنے والا ہے وہ میں رات کو کر کے سوؤں گا" ـــ عامل نے کہا ـــ "صبح تک بندش ٹوٹی ہوئی ہو گی اور اس کے بعد آپ کی بیوی کا بچہ ہو سکتا ہے"۔

"اور اب میری یہ بات سن لو" ـــ فضل داد نے کہا ـــ "اگر وہ عورت پھر تمہارے پاس آئی اور تم نے اس کا کام کیا تو پھر اس کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہو گا۔ تمہاری ٹانگیں گھٹنوں سے کاٹ دوں گا اور ساری عمر اپاہج بنے رہو گے"۔

"کیا آپ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں؟" ـــ عامل نے پوچھا ـــ "اور کیا یہ عورت آپ کی رشتہ دار ہے؟"

فضل داد نے اسے بتایا کہ وہ کون ہے' اس کی ذات کیا ہے اور اس کی حیثیت کیا ہے اور پھر بتایا کہ وہ فوج میں حوالدار ہے اور اسے گرفتار کرا کے دس سال قید کی سزا دلا سکتا ہے۔ یہ کر کے فضل داد نے اسے کہا کہ وہ کچھ پیسے لینا چاہتا ہے تو بتائے اور یہ پیسے اسے خوشی سے دیئے جائیں گے۔ عامل اتنا زیادہ ڈر گیا تھا کہ اس نے ہاتھ جوڑ کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔

"جا کاکی!" — فضل داد نے عامل کی بیٹی سے کہا — "ڈر مت اور جا کے سو جا"۔

"میرے بابا کو تو کچھ نہیں کہو گے نا؟" — لڑکی نے ڈرے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں کاکی!" — فضل داد نے کہا — "لیکن اپنے بابا کو کہہ دو کہ اس نے ہمیں دھوکہ دیا تو پھر نتیجہ بہت بُرا ہو گا"۔

"نہیں حوالدار جی!" — عامل نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "میں آپ کو دھوکہ نہیں دے رہا' میں نے جو کام کیا ہے اس کا نتیجہ آپ کو نظر آ جائے گا"۔

"کیا تم آنے والے وقت کا حال احوال بتا سکتے ہو؟" — فضل داد کے چچازاد بھائی نے پوچھا۔

"نہیں راجہ جی!" — عامل نے جواب دیا — "یہ سفلی عمل ہے اس کا کوئی عامل نہ ہاتھ دیکھ سکتا ہے نہ آنے والے وقت کی کوئی خبر بتا سکتا ہے۔ میرے جیسا کوئی بھی عامل آپ کو آئندہ کی خبر دے یا آپ کو قسمت کا حال بتائے تو کبھی اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس عمل کے عامل صرف یہ عمل کر سکتے ہیں"۔

فضل داد اور اس کا چچازاد بھائی وہاں سے واپس آنے کے لئے اٹھے۔ فضل داد نے عامل کو پانچ روپے دیئے جو وہ نہیں لے رہا تھا۔ فضل داد نے اسے کہا کہ وہ اپنی خوشی سے یہ پیسے دے رہا ہے۔ پھر عامل نے پانچ روپے رکھ لئے۔ اُس زمانے کے پانچ روپے آج کے پانچ سو روپوں کے برابر تھے۔ اپنے گاؤں میں آ کر فضل داد اپنے گھر اور چچازاد بھائی اپنے گھر چلا گیا۔ فضل داد کی بیوی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند اپنے چچازاد بھائی کو ساتھ لے کر کہاں گیا ہے۔ اس پریشانی اور انتظار میں اسے نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ فضل داد نے اسے بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے پھر تہہ کیا ہُوا کاغذ بیوی کے سر میں بالوں کے نیچے چھپا دیا اور اسے کہا کہ تین دن وہ سر میں پانی نہ ڈالے نہ کنگھی کرے تاکہ کاغذ تین دن اور تین راتیں بالوں ہی میں پڑا رہے۔ چوتھے

روز یہ کاغذ بالوں میں سے نکالنا تھا اور اُسے جلا کر اس کی راکھ کو ڑے کرکٹ میں یا غلاظت میں پھینک دینی تھی۔

اگلی صبح فضل داد نے اپنے باپ اور اپنی ماں کو الگ بٹھا کر بتایا کہ اسے کس طرح اور کس سے پتہ چلا تھا کہ خالہ نے اس پر اور اس کی بیوی پر کالے جادو کی بندش لگوا دی تھی۔ پھر اس نے انہیں بتایا کہ گذشتہ رات اس نے کس طرح بندش کھلوائی ہے..... ماں اور باپ نے یہ سنا تو حیرت سے ان کے منہ کھل گئے۔ ماں یہ بات ماننے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی لیکن فضل داد نے اسے منوا لیا اور اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ خالہ کو بلا لائے۔ ایک ضروری کام ہے۔

خالہ اسی گاؤں میں رہتی تھی اور اس کا گھر تھوڑی ہی دور تھا۔ کچھ دیر بعد خالہ آ گئی۔ فضل داد نے اسے اپنے ماں باپ کے پاس بٹھا لیا۔ فضل داد کی ماں بڑے غصے سے اپنی بہن کے ساتھ بولی لیکن فضل داد نے ماں کو چپ کروا دیا۔

"دیکھو خالہ!" — فضل داد نے کہا — "تم نے جو کیا تھا' بہت بُرا کیا تھا میں نے تمہارا کیا ہُوا کام ختم کرا دیا ہے"۔

"کون سا کام بیٹا؟" — خالہ نے حیران سی ہو کر پوچھا — "کیا کہہ رہے ہو؟"

"انجان نہ بنو خالہ!" — فضل داد نے کہا — "تم نے جو کر توت مجھ پر اور میری بیوی پر کی تھی' اس پر تو مردوں کے سر کھل جاتے ہیں۔ مجھ سے سچی بات سننا چاہتی ہو؟ .... تم نے مجھ پر اور میری بیوی پر کالا جادو کروایا تھا۔ اگر میں بدلہ لینا چاہتا تو یہی عمل الٹا کروا کر تمہارا بیڑا غرق کروا سکتا تھا۔ عامل نے مجھے کہا بھی تھا لیکن خالہ! تم میری ماں کی بہن ہو۔ میں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اب اتنی سی بات کہتا ہوں کہ اس شیطان کے پاس پھر نہ جانا ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گی"۔

خالہ بڑی چالاک اور ہوشیار عورت تھی۔ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی تو فضل داد نے کہا کہ وہ نہیں مانتی تو وہ اس عامل کو یہاں بلا لے گا۔

"میں تمہاری کارستانی پر پردہ ڈال رہا ہوں" — فضل داد نے کہا — "اگر تمہارے دل میں ابھی تک میل ہے تو میں ساری برادری میں تمہاری عزت سے پردہ اٹھا دوں گا اور سارے گاؤں میں تمہاری بدنامی ہو گی"۔

فضل داد کی ماں نے اپنی بہن کو کچھ سخت الفاظ کہنے شروع کر دیئے لیکن فضل داد

نے اسے چپ کروا دیا اور خالہ سے کہا کہ وہ چلی جائے اور بے فکر رہے یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہو گا۔

خالہ سر جھکائے ہوئے چلی گئی۔

فضل داد نے مجھے سنایا کہ چوتھی صبح اس نے اپنے ہاتھوں اپنی بیوی کے بالوں میں سے وہ کاغذ نکالا اور اس کی تہیں کھول کر ماچس جلائی اور کاغذ جلا دیا۔ اس کی راکھ مویشیوں کے گوبر کے ڈھیر پر پھینک دی۔

فضل داد کی چھٹی چند دن ہی رہ گئی تھی۔ وہ یہ دن گذار کر واپس اپنی یونٹ میں چلا گیا۔ ایک مہینے کے بعد اسے اپنے باپ کا خط ملا جس میں باپ نے اسے اطلاع دی تھی کہ اس کی بیوی میں ماں بننے کے آثار صاف طور پر پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی خوشی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ اس کے دل سے اپنے پیر کی مریدی ختم ہو گئی۔ وہ چاہتا تو یہ تھا کہ اپنے گھر والوں سے بھی کہے کہ وہ اس پیر کی مریدی کے جال سے نکل آئیں لیکن اس نے ایسی جرأت نہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ پیر کے خلاف بولا تو اس پر فتویٰ لگ جائے گا اور جو کوئی بھی سنے گا وہ اس کے ساتھ قطع تعلق کرے گا۔

پھر اللہ نے فضل داد کو یہ وقت بھی دکھایا کہ اسے تار ملی کہ اس کے ہاں بیٹا پیدا ہُوا ہے۔ اُسے صرف چار دنوں کی چھٹی ملی اور وہ گھر گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس نے اور اس کے گھر والوں نے کس طرح خوشیاں منائیں۔ اس کا باپ اسے پیر کے پاس لے گیا۔ بتاشوں کی پوری چنگیر ساتھ لے گئے تھے اور فضل داد کو نقد نذرانہ بھی پیش کرنا پڑا جو اس نے بادلِ نخواستہ پیش کیا۔

جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ فضل داد کی یونٹ کو ایک اور چھاؤنی میں بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد اس کی یونٹ ایک اور چھاؤنی میں چلی گئی۔ چونکہ فضل داد جسمانی اور دماغی لحاظ سے خصوصی طور پر پھرتیلا تھا اس لئے اسے کمانڈو اور گوریلا ٹریننگ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ آخر اسے اس کمانڈو فورس میں شامل کر لیا گیا جنہیں گلائیڈروں کے ذریعے برما میں جاپانیوں کے عقب میں اتارنا تھا۔ اسے کچھ عرصے کلکتہ میں ٹریننگ دی گئی اور ایک رات اسی فورس کو گلائیڈروں میں روانہ کر دیا گیا۔

یہ میں سنا چکا ہوں کہ فضل داد کے ساتھ گلائیڈر نے اور پھر جاپانیوں نے اور پھر ناگوں نے کیا سلوک کیا اور پھر مجھ تک کس طرح پہنچا۔

اگلے روز اس کے زخموں سے پتوں والی پٹی کھولی تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ زخموں کی حالت خاصی بہتر تھی۔ میں اسے دوسرے پتوں کا پانی پلا رہا تھا۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ فضل داد کو بخار نہ ہُوا۔ اگر اس کا ٹمپریچر کچھ زیادہ ہُوا بھی تھا تو وہ بہت ہی تھوڑا تھا۔ مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ اس کی جسمانی حالت تو بہتر ہو رہی تھی مگر ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی اس کا پیر اس کے دماغ پر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اسے قائل کرنے کے لئے بہت کچھ کیا لیکن اس کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اس کی ایک بات یاد آ گئی۔

"سنو فضل داد بھائی!" — میں نے کہا — "تم کہتے ہو کہ تمہیں اس گناہ کی سزا مل رہی ہے کہ تم نے پیر کے بیٹے کو قتل کیا تھا۔ اگر تمہیں سزا ہی مل رہی ہے تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ سزا کس گناہ کی مل رہی ہے..... تم نے مجھے سنایا ہے کہ جب تمہیں پیر کا مرید بنانے کے لئے اس کے پاس لے گئے تھے تو تمہارے ہاتھ میں ایک سبز جھنڈا تھا جس پر کلمۂ طیبہ شریف لکھا ہُوا تھا۔ میں اس رسم کو جانتا ہوں تم نے یہ جھنڈا پیر کے باپ کے مزار پر چڑھانا تھا لیکن تم نے یہ جھنڈا پیر کے قدموں میں رکھ دیا۔ ذرا سوچو فضل داد! کلمہ شریف کتنی مقدّس چیز ہے مگر تم نے یہ مقدّس کلام ایک گناہگار کے قدموں میں رکھ دیا۔ توبہ کرو اور جونہی تم جسمانی لحاظ سے بہتر ہو جاؤ' نماز پڑھنی شروع کر دو..... یہ بھی سوچو کہ ایک پیر نے تمہیں دھوکے میں رکھا اور اس پیر کے پاس اتنی بھی روحانی طاقت نہیں تھی کہ وہ معلوم کر لیتا کہ تمہاری بیوی پر کالا عمل کیا ہُوا ہے۔ یہ بات تمہیں ایک پنڈت نے بتائی اور اس سے تمہاری مراد پوری ہوئی۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس پیر سے وہ ہندو پنڈت بہتر تھا"۔

اگر میں یہ سنانا شروع کر دوں کہ میں نے فضل داد سے کیا کیا باتیں کیں اور کیا کیا دلیلیں اور حوالے دیئے تو میری اس کہانی کا یہ حصہ وعظ بن جائے گا۔

دو تین دنوں بعد اس کے زخم اور زیادہ ٹھیک ہو گئے اور سب سے بڑا خطرہ جو ٹل گیا وہ پس کا تھا۔ پس ختم ہو چکی اور زخموں کے اردگرد جو سرخی تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی لیکن فضل داد اپنے ہی خیالوں میں گُم سُم رہنے لگا تھا۔ بوڑھا برمی جس کا نام عثمان تھا' باقاعدگی سے اس کے زخموں پر پتے رکھ کر پٹیاں کر رہا تھا۔

ایک روز میں نے بوڑھے عثمان کو بتایا کہ فضل داد کے ذہن میں کیا وہم بیٹھ گیا ہے۔ عثمان پہلے تو سمجھا ہی نہیں کہ پیر کیا ہوتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے

سمجھایا۔ اس نے بتایا کہ برما کے مسلمانوں میں پیر کا کوئی تصوّر ہی نہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں یا بالکل ہی نہیں پڑھتے..... عثمان نے جب میرے ساتھ اس موضوع پر بات کی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ شخص کچھ علم بھی رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ فضل داد کے ذہن سے پیر کو کس طرح نکالا جائے۔

ایک روز عثمان اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے اللہ کے کرشمے سنانے لگا پھر اسے کہا کہ وہ نماز اس طرح پڑھے کہ زخمی ٹانگ لمبی کر کے بیٹھے اور اشاروں میں نماز پوری کر لیا کرے پھر اُس نے بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد درود شریف پڑھے اور پھر ایک ہزار مرتبہ "اللہ الصمد" کا وِرد کرے اور بعد میں بھی چند مرتبہ درُود شریف پڑھے۔ بوڑھے عثمان نے کہا کہ یہ اللہ کا نام ہے اور اگر پوری توجہ اللہ کی ذات پر رکھ کر یہ وظیفہ کیا جائے تو ہر طرح کی بیماری سے، وہم اور برے خیالوں سے نجات مل جاتی ہے۔

میں نے اسے وضو کروایا اور اس نے نماز پڑھی۔ اس طرح اس نے بیٹھ کر باقاعدہ نمازیں پڑھنا شروع کر دیں اور عشاء کے بعد "اللہ الصمد" کا ورد کرنے لگا۔

اٹھارہ یا اُنیس دن اور گزرے تو فضل داد کے زخم تقریباً مل گئے اور اب وہ خود وضو کر کے باقاعدہ رکوع و سجود کرنے لگا۔ میں نے اس کا ایک اثر یہ دیکھا کہ فضل داد جسمانی طور پر بالکل نارمل ہو گیا اور اس کے ذہن سے پیر نکل گیا۔

فضل داد واپس جانا چاہتا تھا۔ اسے وانگ نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک قصبہ ہے۔ وہ اس قصبے میں پہنچ جائے اور وہاں سے اسے پیچھے بھیجنے کا سرکاری انتظام ہو جائے گا۔ ایک روز وہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ میں نے ابھی تک اسے نہیں بتایا تھا کہ میں فوجی ہوں اور بھگوڑا فوجی ہوں اور واپس نہیں جا سکتا۔ میں نے ایک دو بہانے تراش کر اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

ایک روز وانگ اور ساتھی اسے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ شام کو یہ لوگ واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ اس قصبے میں پولیس موجود ہے اور ایک دفتر فوجیوں کا بھی ہے۔ حوالدار فضل داد فوجی دفتر میں چلا گیا۔ وہ بھگوڑا تو تھا نہیں کہ اپنے آپ سے پردہ نہ اٹھاتا وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ وانگ نے مجھے بتایا کہ فوجیوں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا اور اسے کہا تھا کہ اسے واپس کلکتہ بھیج دیا جائے گا۔

فضل داد چلا گیا۔ میرا وہ چین اور سکون بھی ساتھ ہی لے گیا جو میں نے ان اجنبی لوگوں میں ایک دُور افتادہ بستی میں رہ کر حاصل کیا تھا۔ یہ لوگ میرے کچھ بھی نہیں لگتے تھے۔ میں ان میں اجنبی ہی نہیں بلکہ غیر ملکی تھا۔ میں ان کی اور وہ میری زبان بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے کلچر بھی جدا تھے لیکن ان لوگوں کے ساتھ ایسا تعلق پیدا ہو گیا تھا جیسے یہ سب میرے خون کے رشتہ دار ہوں اور ان کے ساتھ میری روح کا رابطہ ہو۔ میں نے انہیں کوئی دھوکا نہیں دیا تھا اور وہ میرے آگے آنکھیں بچھاتے تھے۔ میں نے اب تک جو کہانی سنائی ہے، اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ کس طرح مجھ پر دل و جان سے فریفتہ تھے۔ میں مزید کوئی رائے نہیں دوں گا۔

اتنا عرصہ ان جنگلوں میں آوارہ بھٹکتے پھرتے اور پھر ان لوگوں میں رہتے رہتے مجھ کو یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے اندر کوئی ایسا تغیر آ گیا ہے جیسے میں وہ نہیں رہا جو فوج سے بھگوڑا ہونے سے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ کبھی یوں بھی لگتا تھا جیسے میں انہی جنگلوں میں پیدا ہوا تھا اور میں انہی لوگوں میں سے تھا اور بھٹکتے بھٹکتے اپنے لوگوں میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے شروع شروع میں گھر یاد آتا تھا، اپنے عزیز و اقارب اور یار دوست یاد آتے تھے لیکن میں گھر کو اور اپنوں کو بھولتا جا رہا تھا۔ اس سے مجھے دلی سکون حاصل ہو رہا تھا لیکن فضل داد مجھے ملا اور وہ میرے ساتھ رہا تو مجھے گھر بھی یاد آنے لگا اور اپنے پرائے بھی یاد آنے لگے۔ فضل داد جب اپنے علاقے کی باتیں سناتا تھا تو میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے میں اپنے گھر یا اپنے علاقے میں پہنچ گیا ہوں۔ اس نے اپنے علاقے کے کچھ واقعات سنائے تھے وہ جب یہ واقعات سناتا تھا تو میں تصوّر میں اپنے علاقے کے نشیب و فراز اور

پگڈنڈیوں کو دیکھنے لگتا تھا۔ فضل داد کی باتوں سے مجھے تسکین سی مل رہی تھی۔ میں نے بڑے عرصے بعد اپنے علاقے کی بات سنی اور زبان بھی بولی ورنہ وہاں تو اپنی زبان بولنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

فضل داد مجھ سے جب رخصت ہونے لگا تھا تو میرے دل میں ایک بات آئی تھی جو میں نے دل میں ہی رہنے دی تھی۔ بہت سوچا اور سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی اصلیت فضل داد کو نہ ہی بتاؤں۔ میں اُسے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں فلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں اور یہ میرے والد صاحب کا نام ہے اور وہ جب پیچھے پہنچ جائے اور کبھی چھٹی جائے تو میرے گھر یہ اطلاع دے دے کہ میں زندہ ہوں اور بالکل خیریت سے ہوں اور انشاء اللہ زندہ واپس آؤں گا لیکن میں نے فضل داد کو اپنا اصل گاؤں نہیں بتایا تھا۔ میں نے خطرہ یہ محسوس کیا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بات فوج تک پہنچ جائے کہ میں بھگوڑا ہو کر فلاں جگہ پہنچ گیا ہوں۔ خطرہ یہ تھا کہ اس صورت میں فوج اور پولیس نے میرے گھر والوں کو پریشان کئے رکھنا تھا۔ میں نے اپنے اوپر پردہ ڈالے رکھا اور فضل داد چلا گیا۔

○

اُن کے جانے کے بعد میری طبیعت بالکل ہی اُکھڑ گئی۔ میں تو انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے فوج سے بھاگا تھا لیکن ان لوگوں میں آ کر میرا یہ ارادہ ڈانواں ڈول سا ہو گیا تھا لیکن فضل داد چلا گیا تو میں اتنا بے چین ہو گیا کہ آئی این اے میں شامل ہونے کا ارادہ طوفان کی طرح میرے ذہن میں اٹھا اور اگلے ہی روز میں نے وانگ کو بلا کر کہا کہ اب ہمارے پاس جاپانیوں کی موٹر بوٹ بھی ہے' اب دریا پار کرنا مشکل نہیں' وہ مجھے دریا پار کرا دے۔ وانگ کے چہرے پر ایسا تاثر آ گیا کہ جیسے اسے میری بات بُری لگی ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو وانگ؟" — میں نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — "تم یہی کہو گے کہ دریا میں طغیانی ہے اور موٹر بوٹ اس طغیانی میں سے پار نہیں جا سکے گی"۔

"جا سکے گی صاحب!" — وانگ نے کہا — "بڑی مضبوط کشتی ہے اور اُس کا انجن زیادہ طاقت والا ہے۔ یہ سیلاب میں سے بھی گزر جائے گی لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں"۔

"دیکھو وانگ!" — میں نے کہا — "میں تم لوگوں کا پیار ہمیشہ یاد رکھوں گا اور زندگی میں ہم پھر بھی ملیں گے لیکن میں جس ارادے سے فوج سے بھاگا تھا وہ میں نے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔ اس وقت تک نہ جانے کتنے ہزار ہندوستانی فوجی جاپانیوں کی بنائی ہوئی آزاد ہندوستان کی فوج میں شامل ہو چکے ہوں گے۔ میں نے بھی اس فوج میں جانا ہے۔ پھر تم دیکھو گے کہ تمہارا ملک برما بھی آزاد ہو گا اور ہندوستان بھی"۔

وانگ میری بات نہیں سمجھ رہا تھا یا وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بڑے جذباتی انداز میں مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اُن کے ساتھ رہوں اور کہیں نہ جاؤں۔ اُس کے اس جذباتی انداز اور باتوں نے مجھے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور کر لیا اور آخر مجھے یہ کہنا پڑا کہ اچھا وانگ' میں سوچ کر تمہیں بتاؤں گا۔

اُسی رات پانچ چھ آدمیوں کا وفد میرے پاس آ گیا۔ وانگ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس وفد میں عثمان بھی تھا جس نے فضل داد کے زخموں کا علاج کیا تھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے بھی بزرگ تھا اور دانشمندی کے لحاظ سے بھی۔ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا لیکن اس نے دنیا اور زمانے کو پڑھا تھا اور اس لحاظ سے وہ کتابوں میں ڈوبے ہوئے عالموں سے زیادہ دانشمند تھا۔

"تم ابھی بچے ہو صاحب!" — عثمان نے آرام آرام سے کہا — "ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ انگریز بھی بادشاہ ہیں جاپانی بھی بادشاہ ہیں۔ انہیں دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ ان کی ساری دلچسپی اور غرض دوسرے ملکوں کے ساتھ ہے۔ جاپانیوں نے آج تک اپنا جتنا جانی نقصان کروایا ہے اور جتنے ہوائی جہاز تباہ کروائے ہیں اور جتنے سمندری جہاز انگریزوں کے ہاتھوں ڈبوئے ہیں' وہ اس لئے نہیں کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے آئے ہیں بلکہ وہ برما اور ہندوستان انگریزوں سے چھین کر اس پر اپنی بادشاہی قائم کریں گے۔ وہ ہندوستان کے فوجیوں کو اپنی غرض کے لئے استعمال کر رہے ہیں"۔

"میں نے اپنی سمجھ کے مطابق اور جو باتیں جاپانیوں اور آئی این اے کے متعلق سنی تھیں' ان کے مطابق عثمان کی بات کا جواب دیا لیکن وہ مسکرایا اور بولا کہ تم سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس نے جب اپنی بات کو آگے بڑھایا تو مجھے محسوس ہُوا کہ میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ یہ ہے بھی حقیقت کہ میرے پاس صرف ارادہ تھا کہ میں

آئی این اے میں شامل ہو جاؤں گا اور ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کراؤں گا۔

"ایک بات اور سنو صاحب!" — عثمان نے کہا — "جاپانی مسلمان نہیں۔ صرف مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو کسی ملک پر حملہ کرتی ہے تو اس ملک میں اپنی بادشاہی قائم کرنے کے لئے حملہ نہیں کرتی بلکہ یہ قوم وہاں کے لوگوں کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ یہ بھی نہ بھولو صاحب کہ جاپانیوں کی بنائی ہوئی جس فوج میں تم جا رہے ہو' اس میں ہندو زیادہ ہوں گے۔ اگر جاپانیوں نے ہندوستان سے انگریزوں کو نکال دیا اور جاپانیوں نے ہندوستان کو آزاد ہی کر دیا تو تم دیکھنا کہ ہندو کہیں گے کہ اس ملک پر حکومت کرنا ہمارا حق ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں؟"

میں نے محسوس کیا کہ میں بزرگ عثمان کو قائل کرنے کے قابل نہیں بلکہ اس نے مجھے متاثر کر لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ میں فوج سے بھگوڑا ہو کر آیا ہوں۔ اب میں واپس جاؤں گا تو مجھے گرفتار کر لیا جائے گا اور اس الزام میں میرا کورٹ مارشل ہو گا کہ میں جنگ سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے دس سال سزائے قید مل جائے۔

"تم جاؤ گے ہی کیوں صاحب!" — عثمان نے کہا — "یہاں ہمارے دو مسلمان بھائی تمہیں اپنی بیٹیاں دے رہے ہیں۔ تمہیں جو لڑکی پسند ہے' اس کے ساتھ شادی کر لو۔ اب ہمارا تمہارا جینا مرنا اکٹھے ہو گا۔ انگریز ہوئے یا جاپانی' ہم ایک روز اپنے گھروں کو واپس جائیں گے۔ تم اب اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھنا چھوڑ دو۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ تم زندہ وہاں تک نہیں پہنچ سکو گے جہاں تم جانا چاہتے ہو۔ جاپانیوں کو تم نے دیکھ لیا ہے۔ برما میں آئے تھے تو انہوں نے وہاں سے ہر وہ جوان لڑکی جو ان کو نظر آئی وہ ساتھ لے گئے۔ یہاں پر تھوڑے سے جاپانی آئے تو انہوں نے پہلا حملہ ہماری لڑکیوں پر کیا۔ کیا تم اُس قوم پر بھروسہ کرو گے؟"

ان آدمیوں میں سے دوسروں نے بھی مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ میں ان کے ساتھ ہی رہوں۔ وہ بے چارے اپنی حفاظت کے لئے مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے۔ پہلے سمیع اللہ کو وہ اپنا محافظ سمجھ بیٹھے تھے اور سمیع اللہ نے ان پر یہ تاثر قائم کر رکھا تھا کہ وہ نہ ہُوا تو یہ لوگ کسی مصیبت میں پکڑے جائیں گے اور تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ سمیع اللہ اور اُس کے غنڈوں کو میں نے ختم کیا تھا۔ اس کے بعد یہ لوگ مجھے اپنا محافظ سمجھنے لگے تھے۔ انہوں نے میرے کارناموں کے علاوہ میرا کردار بھی دیکھ لیا تھا۔ میں نے

جس طرح جاپانیوں کو ایک ہی بار مار ڈالا تھا' اس سے یہ لوگ مجھے کنگ کانگ سمجھنے لگے تھے۔

انہوں نے مجھے جذبات میں ایسا گھیرا کہ میں تو جکڑا ہی گیا۔ عثمان نے کہا کہ آج کے بعد میں اُن کا سردار ہوں اور یہاں میرا حکم چلے گا۔ میں یہ صورت یا اپنی یہ حیثیت قبول کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ عثمان بزرگ تھا اور دانشمند تھا اور میں تو اس کے مقابلے میں نادان بچہ تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اس اعزاز کے قابل نہیں۔ وہ اگر کسی کو سردار بنانا ہی چاہتے ہیں تو وہ عثمان ہے لیکن سب نے بیک زبان سرداری کی حیثیت میرے گلے میں ڈال دی۔

وہ تو چلے گئے لیکن میں رات بھر سو نہ سکا۔ اگر میں آگے اپنی منزل کی طرف نکل جاتا تو وہ میرے لئے بہتر تھا۔ راستے میں کتنی ہی دشواریوں کا سامنا ہوتا' مجھے یہ تسلی تو ہوتی کہ میں کسی مقصد کے تحت جا رہا ہوں۔ یہ سوچتے سوچتے گھر یاد آ جاتا اور پھر یہ خیال آتا کہ میں ساری عمر اپنے گھر نہیں جا سکوں گا۔ واجدہ یاد آئی تو دل اور ہی زیادہ بیزار ہو گیا۔ اس بیزاری اور اداسی اور تذبذب کا علاج صرف یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو کسی خوبصورت فریب میں مبتلا کر دیتا وہ میں نے یوں کیا کہ ان دو بری لڑکیوں کو ذہن میں لے آیا جو مجھے پیش کی جا رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات پر تیار کرنا شروع کر دیا کہ میں ان دونوں میں سے فلاں لڑکی کو منتخب کر لوں گا۔ پھر میں نے اس لڑکی کا مقابلہ واجدہ کے ساتھ کیا اور اپنے دل کو یہ یقین دلایا کہ یہ لڑکی واجدہ سے زیادہ خوبصورت اور اچھی ہے۔

میں اپنی یہ آپ بیتی یا سفرنامہ پڑھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ وہ یہ نہ بھولیں کہ میں ابھی نوجوانی کی نادان عمر میں تھا اور زندگی کے نشیب و فراز کا مجھے ذرا سا تجربہ نہیں تھا۔ میرے پاس ابھی جذبات تھے' عقل جذبات کے مقابلے میں کچھ کم تھی۔

○

میں رات بھر سو نہیں سکا تھا اس لئے صبح آنکھ نہ کھُلی اور کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ جب آنکھ کھلی تو دن آدھا گزر چکا تھا۔ سورج سر پر آ گیا تھا۔ میں نہا کر واپس آیا تو میرے آگے ناشتہ رکھا گیا۔

ناشتہ ابھی ختم نہیں کیا تھا کہ باہر سے کچھ شور سنائی دیا۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں

بھی آئیں۔ میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔ اتنے میں دوڑتے قدموں کی آوازیں میرے جھونپڑے کی طرف آنے لگیں اور وانگ میرے پاس آیا۔ وہ خاصا گھبرایا ہُوا تھا۔

"صاحب!" ـــــ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کو سنبھالنے کی کوشش کئے بغیر کہا ـــــ "جلدی اٹھیں' فوجی آرہے ہیں"۔

میں گیند کی طرح اُچھل کر پاؤں پر کھڑا ہو گیا اور باہر نکلا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں' اب پھر بتاتا ہوں کہ ہماری بستی دو پہاڑیوں کے درمیان تھی اور یہ جگہ دریا کی نسبت بلندی پر تھی۔ وہاں سے دریا کو جو راستہ جاتا تھا وہ ڈھلانی تھا یعنی نیچے کو جاتا تھا۔ مطلب یہ کہ ہم لوگ بلندی پر تھے اور درخت اور جھاڑیاں اور گھاس وغیرہ کی اتنی بہتات تھی کہ دریا سے ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ فاصلہ کم و بیش اڑھائی فرلانگ تھا یا اس سے کچھ زیادہ ہو گا۔

میں نے ذرا آگے جا کر اور ایک درخت کے تنے کے پیچھے کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک موٹر بوٹ پتن پر رکی ہوئی تھی اور اس میں سے فوجی نکل رہے تھے۔ میں ابھی پہچان نہیں سکا تھا کہ یہ جاپانی ہیں یا گورے ہیں۔ مجھے معلوم تو یہی ہو رہا تھا کہ یہ گورے ہیں لیکن پتن ایسی پوزیشن پر تھا کہ میں اتنی دُور سے اچھی طرح پہچان نہیں سکتا تھا۔

جن جاپانیوں کو میں نے مارا تھا ان میں سے دو کی لاشوں سے دُوربینیں ملی تھیں۔ یہ دونوں دُوربینیں میں نے اپنے جھونپڑے میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں جھونپڑے کی طرف دوڑا گیا اور ایک دوربین لے آیا۔ اب دیکھا تو صاف نظر آرہا تھا کہ وہ گورے یعنی انگریز فوجی ہیں۔ میں نے تو یہ سوچ لیا تھا کہ یہ جاپانی ہوئے تو ان کے پاس چلا جاؤں گا اور انہیں بتاؤں گا کہ میں ہندوستانی فوج سے بھاگ آیا ہوں اور آئی این اے میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں لیکن وہ انگریز فوجی نکلے۔

دُوربین نے مجھے صاف طور پر دکھا دیا کہ یہ سب گورے ہیں' ان میں ہندوستانی ایک بھی نہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ گورا رجمنٹ کے فوجی ہیں۔ مجھے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ یہ دشمن نہیں لیکن دو خطرے نظر آرہے تھے۔ ایک یہ کہ میں انڈین آرمی کا بھگوڑا فوجی تھا اور دوسرا یہ کہ گورے فوجی اچھے کردار کے لوگ نہیں ہوتے تھے۔ گورا رجمنٹوں کے سپاہیوں وغیرہ کو ٹامی کہا جاتا تھا اور ہم فوجی زبان میں انہیں حرامی کہا کرتے تھے۔ مشہور بھی یہی تھا کہ گورا رجمنٹوں کے سپاہیوں کو اپنے باپوں کا پتہ ہی

نہیں ہوتا اور سب کے سب ناجائز اولاد ہوتے ہیں۔ خطرہ یہ تھا کہ یہ اس بستی میں آ گئے اور انہوں نے بری لڑکیوں کو دیکھ لیا تو ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو جاپانیوں نے کیا تھا۔

یہ ٹامی اخلاق کے ایسے ویسے ہُوا کرتے تھے اور ہندوستانیوں سے تو یہ خاص طور پر نفرت کرتے تھے۔ ان سے میں کسی اچھے سلوک کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں چونکہ فوجی تھا اس لئے اُس نے زمانے کی فوج کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ جو فوجی محاذ پر سال ڈیڑھ سال لڑتے تھے وہ جنگ کے متاثرہ علاقے کی دیہاتی عورتوں کے لئے بڑے ہی خطرناک ہوتے تھے۔ عورت کے معاملے میں وہ دوست دشمن کی ذرا سی بھی تمیز نہیں کرتے تھے۔

میں نے سوچا کہ اپنے دفاع کا انتظام فوراً کر لیا جائے۔ اگر ان کی نیّت ٹھیک نہ ہوئی تو بستی کا دفاع کروں گا۔ میں تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر جھونپڑی میں گیا۔ مشین گن اور ایمونیشن کے پٹے اٹھوائے اور تین چار رائفلیں بھی لے لیں اور ان کا ایمونیشن بھی لے لیا۔ یہ جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن تھا۔ میں نے باہر آ کر بڑی اچھی جگہ مشین گن گاڑی۔ وہاں آڑ اور چھپاؤ بڑا ہی اچھا تھا۔

وانگ رائفل چلا سکتا تھا۔ ایک رائفل اور خاصا ایمونیشن اُسے دے دیا اور تین اور آدمی نکل آئے جو رائفل فائر کر سکتے تھے۔ ایک ایک رائفل انہیں دی اور ایمونیشن بھی دے دیا۔ پھر انہیں پھیلا کر بڑی اچھی پوزیشنوں میں بٹھا دیا اور میں نے انہیں کہا کہ پہلے میں فائر کروں گا اور جونہی مشین گن کا فائر ہو وہ بھی نشانہ لے کر فائر کریں تاکہ ایک بھی راؤنڈ ضائع نہ ہو۔ ہمیں یہ سہولت حاصل تھی کہ پودے بڑے گھنے تھے' جھاڑیاں گھنی تھیں اور درخت بھی زیادہ تھے۔ ہم گوروں کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ہم بلندی پر تھے اور گوروں نے جدھر سے آنا تھا وہ کشادہ اور صاف راستہ تھا۔ ادھر سے کوئی آڑ یا چھپنے کے لئے کوئی جھاڑی نہیں مل سکتی تھی۔ جھاڑیاں وغیرہ راستے کے کنارے پر تھیں۔

وہ سب موٹر بوٹ میں سے نکل آئے اور بوٹ کو انہوں نے پتن کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر وہ دریا کے کنارے کنارے ایک طرف چل دیئے اور درختوں اور اونچی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ میرا خیال تھا جو بعد میں ٹھیک نکلا کہ وہ جاپانیوں کی چھوڑی ہوئی موٹر

بوٹ کو دیکھنے کے لئے جا رہے تھے۔ یہ موٹر بوٹ میرے کہنے پر وانگ وغیرہ نے ایک جگہ چھپا دی تھی۔ ان گوروں کو یہ دریا میں سے نظر آ گئی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ سب واپس آئے اور اُن میں سے ایک نے جو یقیناً" افسر تھا' دوربین آنکھوں کے آگے رکھ کر بستی کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو کچھ کہا اور تمام سپاہی وغیرہ دو حصّوں میں تقسیم ہو کر دائیں اور بائیں چلے گئے اور وہاں سے انہوں نے ہماری طرف پیش قدمی شروع کی۔

یہ تھا صحیح فوجی طریقہ کسی مشکوک جگہ کی طرف ایڈوانس کرنے کا..... حکم دینے والا افسر اور ایک آدمی جو بعد میں پتہ چلا کہ سارجنٹ تھا' اوپر آنے والے راستے سے ہٹ کر کنارے کنارے چل پڑے۔ وہ بہت ہی محتاط ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ انہیں شک ہو گا کہ اس بستی میں جاپانی ہوں گے۔ ان کے فوجی یعنی سپاہی چُھپ چُھپ کر جا رہے تھے۔ میں نے مشین گن پر پٹہ ڈال کر تیار کر لی اور اپنے آدمیوں سے بھی کہا کہ وہ رائفلوں سے سیفٹی کیچ آگے کر کے تیار ہو جائیں۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انہوں نے اگر پہلے فائر کیا تو میں فائر کروں گا۔

مجھے ڈر یہ تھا کہ جو سپاہی چُھپ چُھپ کر اور پوزیشنیں بدل بدل کر ایڈوانس کر رہے تھے' وہ دونوں طرف سے آ کر بستی کو گھیرے میں لیں گے۔ وہ تربیت یافتہ فوجی تھے اور انہیں محاذ کا تجربہ بھی تھا اس لئے وہ اتنی ہوشمندی سے پوزیشن لیتے اور پھر ایڈوانس کرتے تھے کہ ان کی کوئی حرکت نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے ایک عقلمند سے آدمی کو درخت پر اس ہدایت کے ساتھ چڑھا دیا کہ وہ پتّوں میں چُھپا رہے اور گوروں کو دیکھتا رہے اور ہمیں بتاتا رہے کہ اسے کیا نظر آ رہا ہے۔

○

گورا افسر اور سارجنٹ قریب آ گئے۔ اب میں ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اُن کے جوان بھی ذرا ذرا سے نظر آنے لگے۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ ان کی نیّت ٹھیک نہ ہوتی یا یہ اس شک میں ہوتے کہ یہاں جاپانی ہوں گے تو یہ اب تک فائر کھول چکے ہوتے۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں فائر نہیں کروں گا اور میں نے یہ بھی سوچ لیا کہ اپنے متعلق انہیں کیا بتاؤں گا۔

وہ جب اتنا قریب آئے کہ میں ان کی آنکھوں کی سفیدی بھی دیکھ سکتا تھا' میں اپنی

پوزیشن سے اٹھا' مشین گن وہیں رہنے دی اور ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر ان آدمیوں کو بھی بلا لیا جن کے پاس رائفلیں تھیں۔ وہ دوڑتے میرے ساتھ آن کھڑے ہوئے۔ دو اور آدمی بھی آ گئے۔ میں نے گورے افسر اور سارجنٹ کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور مسکرایا۔ اس کا اثر یہ دیکھا کہ دونوں گوروں کے چہروں پر جو کھچاؤ سا تھا وہ ختم ہو گیا اور افسر کے ہونٹوں پر میں نے ہلکا سا تبسم دیکھا۔

میں آگے بڑھا اور افسر کے ساتھ اور سارجنٹ کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ افسر کیپٹن تھا۔

"Speak English?" — کیپٹن نے پوچھا اور ہم سب کی طرف دیکھا۔

"I speak English." — میں نے جواب دیا۔

میں آپ کو بتا دوں کہ گورا رجمنٹوں کے انگریز اور دوسرے فوجی اُردو بالکل نہیں جانتے تھے۔ صرف وہ انگریز فوجی افسر اردو بولتے اور سمجھتے تھے جو ہندوستانی پلٹنوں یا دوسری یونٹوں میں آتے تھے۔ سول سروس کے انگریز بھی اردو بولتے تھے۔ ان میں بعض تو اتنی اچھی بلکہ ایسی ادبی اردو بھی بولتے تھے جو ہندوستانی بھی نہیں بول سکتے تھے۔

انگریزوں کے متعلق میں ایک بات اور بھی کہنا چاہوں گا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم انگریزوں کے غلام تھے اور انگریز ہمارے بادشاہ بنے ہوئے تھے لیکن ان کی جو خوبیاں تھیں' انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا کوئی بری بات نہیں۔ ہندوستان میں صرف اردو ہی نہیں بولی جاتی تھی۔ بے شمار زبانیں تھیں۔ پٹھان رجمنٹوں میں یعنی فرنٹیئر فورس میں جو انگریز جاتے تھے وہ پشتو بولتے تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ گورکھا رجمنٹیں بھی تھیں' ان میں جانے والے انگریز افسر گورکھالی زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ ایسے ہی بنگالی زبان تھی' مدراسی زبان تھی کئی اور زبانیں تھیں' انگریز یہ زبانیں بولتے تھے۔ وہ ہماری صرف زبانوں سے ہی واقف نہیں ہو گئے تھے بلکہ ہندوستان کے ہر خطّے اور ہر مذہب کے لوگوں کی نفسیات اور معاشرت سے بھی پوری طرح واقف ہو گئے تھے اور جو نیا انگریز افسر انگلینڈ سے آتا تھا اسے اس علاقے کی زبان اور نفسیات کے متعلق اچھی طرح ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز آدھی دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔

اس کے مقابلے میں اپنے حکمرانوں کو دیکھ لیں۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ عوام کس طرح زندگی گذار رہے ہیں اور ان کی جذباتی کیفیت کیسی ہے۔ حکمران طبقے اور عوام کے درمیان ایک وسیع و عریض خلیج حائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان تباہی

اور بربادی کے راستے چل پڑا ہے۔

"کیا یہ سب لوگ یہیں کے رہنے والے ہیں؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"ہاں سر!" — میں نے جواب دیا۔

"تم تو برمی نہیں لگتے" — کیپٹن نے کہا۔

"میں ہندوستانی ہوں" — میں نے کہا — "میں برما میں برما پولیس میں تھا۔ جاپانیوں کا حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ ہم سب وہاں سے بھاگ نکلے۔ یہاں آئے تو کچھ جھونپڑے کھڑے دیکھے لیکن کوئی انسان یہاں نہیں تھا۔ ہم یہیں رک گئے اور جنگ ختم ہونے کے انتظار میں یہیں وقت گذار رہے ہیں..... میں پنجاب کا رہنے والا ہوں"۔

"برمی غدار ہیں" — کیپٹن نے کہا — "جاپانیوں نے حملہ کیا تو برمیوں نے اُن کا ساتھ دیا تھا"۔

"یہ غدار نہیں" — میں نے کہا — "یہ سب جاپانیوں سے نفرت کرتے ہیں اور انگریزوں کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ جاپانی آئے تو انہوں نے ان کی لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ ان میں ایسے چند ایک آدمی ہیں جن کی نوجوان بیٹیوں کو جاپانی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ یہ سب کہتے ہیں کہ انگریزوں کا اخلاق بہت اچھا ہوتا ہے"۔

میں نے یہ بات ان انگریزوں کو ہوا دینے کے لئے کی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر ان کے اخلاق کی تعریف کی تھی کہ وہ یہاں کسی بداخلاقی کا مظاہرہ نہ کریں..... مجھے یہ مشکل پیش آ رہی تھی کہ یہ گورا افسر اور اس کا سارجنٹ اس طرح ٹھیٹھ لہجے میں انگریزی بولتے تھے جس طرح ہمارے دیہاتی اپنی زبان آپس میں بیٹھ کر بولا کرتے ہیں۔ مجھے انگریزی بولنے کی کوئی خاص پریکٹس نہیں تھی۔ ان گوروں کی بات سمجھنے میں مجھے کان کھڑے کرنے پڑتے تھے۔ میں نے آخر انہیں کہہ ہی دیا کہ وہ ذرا آہستہ اور صاف بولیں۔ انہوں نے میری بات سمجھ لی اور مان بھی لی۔

"یہاں قریب کہیں جاپانی ہیں؟" — کیپٹن نے پوچھا۔

"نہیں سر!" — میں نے جواب دیا۔

"وہ موٹر بوٹ کس کی ہے؟" — کیپٹن نے پوچھا — "اور وہ وہاں چھپا کر کیوں

رکھی ہوئی ہے؟"

میں اتنا عقلمند تو نہ تھا لیکن میرے دماغ نے یہ سوچ لیا کہ اس گورے کپتان کو زیادہ سے زیادہ خوش کرنا چاہئے تاکہ یہ بستی کے لوگوں کے ساتھ کوئی بدتمیزی اور بداخلاقی نہ کرے۔ اس نے موٹر بوٹ کے متعلق پوچھا تو میں نے بات یہاں سے شروع کی کہ یہ موٹر بوٹ ثبوت ہے کہ اس بستی کے لوگ جاپانیوں کو اپنا بدترین دشمن اور انگریزوں کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے ہیں اور اس جنگ میں انگریزوں کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے بعد میں نے اسے سنایا کہ کس طرح اس موٹر بوٹ پر جاپانی آئے تھے جن کی تعداد تو تھی اور انہوں نے اس بستی کے لوگوں اور ان کی لڑکیوں کے ساتھ کس طرح تفریح کی اور پھر میں نے ان جاپانیوں کو کس طرح ختم کیا..... میں اگر اس واقعہ میں جو اس کیپٹن کو سنایا تھا' مبالغہ آرائی کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا لیکن میں نے جو ہُوا وہی سنایا اور اُس کا اثر گورے کیپٹن اور سارجنٹ پر ایسا ہُوا کہ دونوں کے چہروں پر چمک آ گئی اور انہوں نے مجھے دل کھول کر داد دی۔ اگر میں انہیں بتا دیتا کہ میں نے ایک انگریز پائلٹ کو ان لوگوں کے ہاتھوں مروا دیا تھا تو یہ گورا کیپٹن مجھے وہیں گولی مار دیتا۔ البتہ انہیں یہ بتایا کہ میں نے ایک اژدھا کو مار کر اس کے منہ سے ایک لڑکی کو آزاد کرایا تھا اور پھر ایک شیر بھی مارا تھا۔

"تم واقعی بہادر آدمی ہو" — سارجنٹ نے کہا — "میں فوجی زندگی کے مقابلے میں اس زندگی کو زیادہ پسند کروں گا جو تم لوگ یہاں گذار رہے ہو۔ یہ زندگی سادہ بھی ہے اور اس میں ایڈونچر بھی ہے"۔

انگریز کیپٹن اور سارجنٹ کو جب تسلی ہو گئی کہ یہ جگہ' یہ بستی اور یہ لوگ ان کے لئے خطرناک نہیں تو اس نے اپنے ان سپاہیوں کو جو ابھی تک دائیں بائیں پوزیشنیں لئے ہوئے تھے' اپنے پاس بلا لیا۔

میں سمجھتا تھا کہ یہ علاقہ جنگ سے محفوظ ہے لیکن جنگ کبھی جاپانیوں کی صورت میں' کبھی گوروں کی صورت میں اور کبھی جلتے ہوئے لڑاکا ہوائی جہاز میں سے اترے ہوئے انگریز پائلٹ کی صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھی۔ جیسے آگ کہیں دور لگی ہوئی ہو اور اس کے شرارے اوپر جا کر ہر طرف گر رہے ہوں۔ جنگِ عظیم یورپ میں' شمالی افریقہ میں اور برما میں لڑی جا رہی تھی لیکن دُور دُور دراز کے ممالک بھی جنگ کے اثرات

سے محفوظ نہیں تھے۔ میں جس علاقے میں تھا' وہاں تو کسی بھی وقت جنگ پہنچ سکتی تھی۔ میں نے تو یہ ان گوروں سے پوچھنا تھا کہ جنگ یہاں سے کتنی دُور لڑی جا رہی ہے۔

"سر!" — میں نے کیپٹن سے کہا — "آپ میرے ساتھ آئیں' میں آپ کو جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جو دُوربین آپ میرے پاس دیکھ رہے ہیں' یہ بھی ایک جاپانی کی لاش سے لی تھی۔ ایسی ایک اور دُوربین میرے جھونپڑے میں پڑی ہوئی ہے"۔

میں نے سب سے پہلے اسے مشین گن دکھائی جس کے ساتھ گولیوں کا پٹہ لگا ہُوا تھا۔

"اس گن کے پیچھے لیٹ کر آپ سامنے فیلڈ آف فائر دیکھیں" — میں نے کیپٹن سے کہا — "جب مجھے اطلاع ملی تھی کہ کچھ فوج موٹر بوٹ سے اتر رہے ہیں تو میں نے اس خیال سے یہ مشین گن اس پوزیشن پر لگا دی تھی کہ جاپانی ہوئے تو میں ان پر دو تین برسٹ فائر کر کے انہیں ختم کر دوں گا۔ میں آپ پر بھی فائر کر سکتا تھا۔ آپ کا کوئی ایک بھی آدمی زندہ نہ رہتا لیکن میں نے دوربین سے دیکھ لیا کہ یہ تو اپنے دوست ہیں..... یہ دیکھئے چار آدمی۔ ان کے پاس رائفلیں ہیں۔ انہیں میں نے بڑی اچھی جگہوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ ان کے فائر سے آپ بچ نہیں سکتے تھے"۔

انگریز کیپٹن نے سر ہلا کر اور مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں اسے اپنے جھونپڑے میں لے گیا۔ دوسرے کمرے میں جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن جس میں گرینیڈ بھی تھے' اسے دکھایا اور کہا کہ وہ یہ سارا اسلحہ وغیرہ لے جائیں..... میں نے عقل سے کام لیا تھا۔ اپنی رائفل اور انگریز پائلٹ کا ریوالور الگ چھپا کر رکھ دیا تھا۔ یہ اس لئے کہ جس طرح جاپانی اچانک آن دھمکے تھے اسی طرح کوئی اور یا جاپانیوں کی کوئی اور سیکشن یا پلاٹون یہاں آ سکتی تھی۔

"میں یہ سارے ہتھیار ایمونیشن آپ کی موٹر بوٹ میں رکھوا دیتا ہوں" — میں نے کہا — "بستی کے آدمی وہاں تک پہنچا دیں گے"۔

کیپٹن نے سارجنٹ کے ساتھ بڑی دھیمی آواز میں کوئی بات کی جو میں نہ سُن سکا۔ سارجنٹ نے سر ہلایا۔

"یہ سارے ہتھیار' گرینیڈ اور ایمونیشن تم اپنے پاس رکھو" — کیپٹن نے کہا — "اپنے تمام آدمیوں کو اس اسلحہ کا استعمال سکھا دو۔ نہ جانے کس وقت تمہیں اس کی ضرورت آ پڑے..... میں اس ساری بستی کو دیکھنا چاہوں گا۔ یہ میری ڈیوٹی ہے"۔

وہ باہر کو چل پڑا۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ دروازے میں وانگ کھڑا تھا۔ میں نے تیزی سے بولتے ہوئے وانگ سے کہا کہ وہ کسی طرف سے دوڑ کر بستی میں پہنچے اور لوگوں سے کہے کہ جب وہ ان گوروں کو دیکھیں تو تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کریں۔ میں نے وانگ سے یہ بھی کہا کہ وہ جاپانیوں کی چھوڑی ہوئی شراب اگر بچی ہوئی ہو' اور یہاں کی بنی ہوئی شراب تیار رکھے اور پندرہ صاف ستھرے گلاس بھی اکٹھے کر لے۔

میں نے ویسے ہی کیپٹن کو کوئی بات سنانی شروع کر دی جس سے میرا مقصد یہ تھا کہ یہ کچھ دیر اور یہیں کھڑا رہے اور وانگ ساری بستی کے لوگوں تک میرا پیغام پہنچا دے۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد میں کیپٹن کے ساتھ چل پڑا۔ ہم پہلی گلی میں داخل ہوئے تو عورتیں بچے اور آدمی گلی میں دونوں طرف کھڑے تھے۔ انہوں نے بڑے زور سے تالیاں بجائیں اور وہ مسکرائے بھی۔ کیپٹن نے ہاتھ ہلا ہلا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ بعض جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے کیپٹن کسی جھونپڑے کے دروازے کے اندر جھانک لیتا تھا۔

اس طرح اس نے اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ ساری بستی دیکھ لی اور میں اسے اس چبوترے تک لے گیا جس پر جاپانیوں نے اپنا وائرلیس کا سامان سیٹ کیا تھا۔ میں نے کیپٹن کو بتایا کہ جاپانیوں نے یہاں کس طرح وائرلیس سیٹ رکھے اور ایئریل کا تار کہاں سے کہاں تک باندھا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے تمام وائرلیس سیٹ دریا میں پھینک دیئے تھے۔

"تم خوش قسمت ہو" — کیپٹن نے کہا — "بال بال بچ گئے ہو ورنہ اب تک یہاں تم سب کی [illegible] بکھری ہوئی ہوتیں"۔

میں بھی فوجی ہی تھا لیکن وہ افسر تھا اس لئے مجھ سے زیادہ باتیں جانتا اور سمجھتا تھا اس نے بتایا کہ جاپانیوں نے یہاں وائرلیس سٹیشن قائم کیا تھا جسے فوجی زبان میں Listening Post کہتے ہیں۔ اس پوسٹ نے ہر طرف سے دُور دُور سے پیغام وصول بھی کرنے تھے اور بھیجنے بھی تھے۔ کیپٹن نے مجھے کہا کہ تم نے اس پوسٹ کے پورے کے

پورے نو آدمی مار ڈالے۔ اس پوسٹ کے ہیڈ کوارٹر نے یا ڈویژن ہیڈ کوارٹر نے اُس پوسٹ سے رابطہ کرنا تھا اور جب وہ دیکھتے کہ پوسٹ کے ساتھ رابطہ نہیں ہو رہا تو فوراً" دوسرے آدمی بھیجے جاتے جو دیکھتے کہ اس پوسٹ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہاں آ کر وہ دیکھتے کہ پوری کی پوری De Tachment غائب ہے تو وہ اس بستی کے ایک بچے کو بھی زندہ نہ چھوڑتے اور جوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

پھر جاپانیوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟..... گورے کیپٹن نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کتنے دن پہلے کا واقعہ ہے کہ جاپانی یہاں آئے تھے۔ میں نے یاد کر کے اسے بتایا۔ اس نے بتایا کہ انہی دنوں انگریزوں اور امریکیوں کی فوج نے جاپانیوں پر جوابی حملہ کیا تھا جو بڑا ہی زبردست' اچانک اور شدید تھا۔ اوپر سے لڑاکا بمبار طیارے نے بمباری اور گن فائرنگ بھی کی۔ جاپانی اس زمینی اور فضائی حملے کو برداشت نہ کر سکے اور تباہ بھی ہوئے اور پسپا بھی ہوئے۔ ان کا سگنل ہیڈ کوارٹر تو بری طرح تباہ کر دیا گیا تھا۔ یہ تھی وجہ کہ ہم نے اُس پوسٹ کے نو کے نو جاپانیوں کو مار ڈالا اور انہیں پوچھنے کوئی بھی نہ آیا۔ اگر کوئی آ جاتا تو ہمارا بیڑہ غرق ہو جاتا۔

میں نے کیپٹن سے پوچھا کہ جنگ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ اس نے بتایا کہ مورچے تو یہاں سے کم و بیش پچاس میل دور ہیں لیکن اصل گھمسان کی جنگ ایک سو میل دُور ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جاپانیوں کو دریا کے پار دھکیل دیا گیا ہے اور اس نے مجھے یہ تسلی بھی دی کہ اس طرف جنگ کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں رہا۔

"میں آپ سے فوجی راز نہیں اگلے رہا" — میں نے کیپٹن سے پوچھا — "اپنی دلچسپی کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ آپ اس طرف کیوں آئے ہیں؟"

"ہم گشتی ڈیوٹی پر آئے ہیں" — کیپٹن نے جواب دیا — "ہم دیکھتے پھر رہے ہیں کہ کوئی جاپانی کہیں چھپا تو نہیں' اگر ہے تو اسے پکڑ لینا ہے یا مار دینا ہے' پھر ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بھاگنے والے جاپانی کہیں اکٹھے تو نہیں ہو رہے"۔

"یہ ڈیوٹی تو میں بھی اور میرے آدمی بھی دے سکتے ہیں" — میں نے کیپٹن کو خوش کرنے کے لئے کہا — "لیکن ہم کسی جاپانی کو دیکھیں گے تو اسے پکڑیں گے نہیں بلکہ مار ڈالیں گے"۔

"میں بھی تمہیں یہی کہوں گا" — کیپٹن نے کہا — "کوئی جاپانی نظر آئے تو اسے

زندہ نہ چھوڑو"۔

ہم وہاں کھڑے یہ باتیں کر رہے تھے کہ چار پانچ آدمی شراب کی بوتلیں اور گلاس اٹھائے آ گئے۔ میں نے کیپٹن سے کہا کہ یہ لوگ آپ کو شراب پیش کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ اس میں جاپانی شراب بھی ہے اور یہاں کی بنی ہوئی بھی۔

کیپٹن نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور شراب قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے رسم و رواج کے مطابق اصرار کیا بلکہ آرزو کی کہ وہ خود نہ پیئے تو اپنے دوسرے آدمیوں کو پینے دے لیکن وہ نہ مانا..... مجھے اچانک اس کے انکار کی وجہ سمجھ آ گئی۔ وہ عقل والا افسر تھا۔ میں نے اس پر اپنا اور اس بستی کے لوگوں کا اعتماد پیدا کر لیا تھا لیکن ہم سب اس کے لئے اجنبی تھے۔ اس نے اگر یہ شک کیا تھا کہ ہم نے شراب میں بے ہوش کرنے والی کوئی چیز ملا دی ہو گی' اس کی عقلمندی تھی۔ ڈیوٹی کے دوران اسے ہماری شراب قبول کرنی ہی نہیں چاہئے تھی اور اس نے قبول نہ کی۔

آخر کیپٹن اپنے اس سیکشن کو ساتھ لے کر اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔ میں اور چار پانچ آدمی ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ ہم چاہتے تھے کہ پتن تک ان کے ساتھ جائیں لیکن کیپٹن نے روک دیا۔ وہ سب چلے گئے' اپنی موٹر بوٹ میں سوار ہوئے اور موٹر بوٹ چلی گئی۔ کم و بیش دو گھنٹوں بعد ہم نے ان کی موٹر بوٹ واپس جاتے دیکھی۔

جب یہ گورا کیپٹن اپنے گوروں کے ساتھ بستی میں گھوم پھر رہا تھا اُس وقت لڑکیاں بھی باہر نکل آئی تھیں۔ ان میں تانی کے علاوہ چار پانچ لڑکیاں اچھی خاصی خوبصورت تھیں۔ کسی گورے نے اُن کی طرف دیکھ کر کوئی بے ہُودہ اشارہ نہ کیا نہ ہی فضول بات کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انگریز بڑے اچھے کردار کے لوگ تھے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ کیپٹن عقل والا تھا۔ اُس نے یقیناً" سوچا ہو گا کہ ان لوگوں کو ناراض نہ کیا جائے کیونکہ جاپانیوں کے واپس آ جانے کی صورت میں ہم لوگ جاپانیوں سے مل کر انگریزوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے۔ بہرحال یہ ایک اور مصیبت تھی جو آئی اور ٹل گئی۔

○

بات بڑی پرانی ہو گئی ہے لیکن وہ رات مجھے آج تک اس طرح یاد ہے جیسے گزری ہوئی رات کا واقعہ ہو۔ اچانک گھٹائیں گرجنے اور چمکنے لگیں اور اس طرح تیز اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جیسے ہمارے جھونپڑے بہا کر اپنے ساتھ دریا میں لے

جائے گی۔ بجلیاں کڑکتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے جنگ ہم تک پہنچ گئی ہو اور توپیں ہمارے قریب ہی فائر کر رہی ہوں۔ بارش کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ اس کے ساتھ جھکڑ بھی تھا جو تیز و تند ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے جھونپڑے میں گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جھونپڑے کا دروازہ کھول دیا۔ یہ طوفانِ باد و باراں مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ میرے جھونپڑے کے اندر دیا جل رہا تھا۔ میں لیٹ گیا۔

ہر رات کی طرح اُس رات بھی کچھ یادیں اور کچھ باتیں ذہن میں آ رہی تھیں۔ بارش اور طوفان کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کوئی ہلکی پھلکی آواز یا آہٹ تو سنائی ہی نہیں دیتی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے جھونپڑے کے اندر کوئی آہٹ ہے جو اس طوفان کی پیدا کردہ نہیں۔ مجھے ہلکی سی غراہٹ بھی سنائی دی۔ پہلے تو میں نے اسے ٹال دیا اور کوئی توجہ نہ دی لیکن غراہٹ ایک بار اتنی اونچی ہو گئی کہ میں نے لیٹے لیٹے سر اوپر کر کے پیچھے دیکھا۔ میرا تو خون ہی خشک ہو گیا..... ایک بھیڑیا جھونپڑے کے اندر آ گیا تھا اور وہ میری طرف دیکھ کر آہستہ آہستہ غرا رہا تھا۔

میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ اگر میں ڈر کر اٹھ بیٹھتا تو یہ بھیڑیا مجھ پر حملہ کر دیتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ڈر کر بھاگ جاتا لیکن درندے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ میرے پاس یعنی میرے قریب کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ریوالور اور جاپانیوں کی رائفلیں وغیرہ ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ میں اٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا تو بھیڑیا حملہ کر دے گا لیکن یہ خطرہ بھی تھا کہ میں لیٹا رہا تو بھی یہ مجھ پر حملہ کر سکتا ہے۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ بھیڑیا بارش سے بچنے کے لئے اندر آیا ہے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بھیڑیا اکیلا نہیں ہوا کرتا یہ دو نہیں تو چار ضرور ہوں گے اور امکان یہ تھا کہ یہ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے باقی ساتھی اس کے پیچھے اندر آ سکتے ہیں۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میرے لئے بڑا ہی خوفناک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ بھیڑیا ٹہلتا ٹہلتا آگے چلا گیا اور جھونپڑے کے کونے میں بیٹھ گیا۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی جو اس کی طرف پھینکتا اور وہ بھاگ جاتا۔ وہ تو بڑے آرام سے بیٹھ گیا تھا جیسے یہ جھونپڑہ میرا نہیں اس کا تھا۔ اس کے ساتھ یہ مصیبت آئی کہ طوفان کا ایک ایسا زوردار جھونکا آیا کہ جھونپڑے کا دروازہ ٹھاہ کر کے بند ہو گیا۔ بھیڑیا ذرا سا بدکا اور بیٹھا رہا۔

ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میں بھیڑیئے سے کہتا کہ لو بھائی، تم بھی رات یہیں گزار لو

لیکن ذرا شریفوں کی طرح، میں سو جاؤں تو تم بھیڑیئے پن پر نہ اتر آنا۔ وہ درندہ میری خواہشات کا تو پابند نہ تھا نہ وہ میری زبان سمجھ سکتا تھا۔

میں دروازے کے قریب تھا اور بھیڑیا سامنے والے کونے میں بیٹھ گیا تھا۔ مجھے یہی ایک صورت نظر آئی کہ میں اٹھ کر دروازہ کھولوں اور باہر نکل جاؤں لیکن ضروری نہیں تھا کہ بھیڑیا بھی باہر نکل جاتا۔ اس میں خطرہ یہ بھی تھا کہ میں اُٹھا تو بھیڑیا مجھ پر آ پڑے گا۔ میں نے پھر دائیں بائیں دیکھا لیکن کوئی ایک بھی ایسی چیز میرے قریب نہیں تھی جو اس پر پھینکتا مگر اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ دروازہ بند تھا اور اگر میں اسے چھیڑتا تو وہ اپنے آپ کو قید میں سمجھ کر مجھ پر بڑا ہی زوردار حملہ کرتا..... میں نے اسے دیکھا اس نے اپنا منہ آگے کر کے نیچے رکھ دیا تھا۔ جیسے وہ سونا چاہتا ہو۔ میں نے سوچا کہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ جونہی اس نے منہ نیچے رکھا میں نے بڑی تیزی سے چادر اپنے اوپر سے ہٹائی اور بہت ہی تیزی سے اٹھا اور ڈائیو کرنے کے انداز سے دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ میری ٹکر سے کھل گیا اور میں باہر جا پڑا۔ بارش ایسی طوفانی کہ باہر کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ سنبھل کر اندر دیکھا بھیڑیا کان کھڑے کر کے غالباً" سوچ رہا تھا یہ کیا ہوا ہے۔ وہ باہر آنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میں نے باہر سے پتھر اٹھایا اور بڑی زور سے اُسے مارا۔ پتھر اُسے لگا اور وہ کُتے کی طرح چیخا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک اور پتھر مارا، تب وہ دوڑا اور دروازے سے بہت تیزی کے ساتھ نکل کر سیدھا میری طرف آیا۔ مجھے اس کے راستے سے ہٹنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ وہ ڈر کر اور پتھر کھا کر بھاگا تھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ میری ٹانگوں سے ٹکرایا تو میری دونوں ٹانگیں میرے نیچے سے نکل گئیں اور میں پیٹھ کے بل گرا اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں۔ بھیڑیا اس تصادم سے اور زیادہ ڈرا اور اس کی رفتار اور زیادہ تیز ہو گئی۔ میں اس سے زیادہ تیزی سے تھا، اندر کو بھاگا اور دروازہ بند کر کے اندر سے اس طرح جکڑ دیا کہ کھل نہ سکے۔

ایک تو میں بارش میں بھیگ گیا تھا اور میرے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا، اس کے ساتھ ہی کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے تھے۔ بھیڑیا تماشا کر گیا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ بال بال بچ گیا۔ میں نے کپڑے اتار پھینکے اور ایک چادر لپیٹ لی اور دیا بجھا کر سو گیا۔

صبح اٹھ کر باہر دیکھا تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ یہ بستی آباد کرنے والے کوئی عقل والے لوگ تھے۔ جہاں جھونپڑے کھڑے کئے گئے تھے وہ زمین ایک طرف سے اونچی اور دوسری طرف سے نیچی تھی۔ وہاں پانی نہیں رک سکتا تھا۔ آگے جہاں زمین ہموار تھی وہاں جھیل بنی ہوئی تھی۔ دریا کی طرف دیکھا تو پتن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اوپر کے علاقوں میں بارش ایسی ہی برسی ہو گی جس نے دریا کو سیلابی کر دیا تھا۔ سیلاب بھی ایسا کہ دریا کے کنارے ڈوب گئے تھے۔ میرے جھونپڑے کے آگے تقریباً" ایک گز چوڑا برآمدہ سا بنا ہُوا تھا۔ وہاں بہت سی چڑیاں اور چھوٹے چھوٹے پرندے مرے پڑے تھے۔

اگلے روز وانگ اور پانچ چھ دوسرے آدمی میری اور میرے جھونپڑے کی خیریت معلوم کرنے آئے۔ وانگ تو میرا خلیفہ بن گیا تھا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ چند ایک جھونپڑوں کی چھتیں اڑ گئی ہیں۔ باتوں باتوں میں وانگ نے کہا کہ اب وہ مجھے کسی دن اس قصبے میں لے جائے گا جہاں سے یہ لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء لایا کرتے تھے.....ہم قصبے کو ہی جا رہے تھے کہ راستے میں فضل داد مل گیا اور اسے اٹھا کر ہم واپس آ گئے تھے۔ اس وقت بھی وانگ اور اس کے ساتھی مجھے یہ کہہ کر قصبے کی سیر کے لئے تیار کرتے رہے تھے کہ میں ایک ہی جگہ رہ رہ کر اکتا گیا ہوں اس لئے بار بار کہتا ہوں کہ یہاں سے چلا جاؤں گا' اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا تھا کہ مجھے قصبے میں لے جائیں تاکہ میرے ذہن سے گھٹن نکل جائے۔ اب وہ پھر یہی کہہ رہے تھے۔ میں خود محسوس کر رہا تھا کہ مجھے یہاں سے کسی طرف کچھ دیر کے لئے نکلنا چاہئے۔

تین چار دنوں بعد علی الصبح ہم تین چار آدمی قصبے کو روانہ ہوئے لیکن اب ہم پیدل نہیں جا رہے تھے۔ ہم چار آدمی تھے اور چار خچریں تھیں جن پر ہم سوار تھے۔ بستی میں پانچ خچر اور دو گدھے تھے۔ قصبے تک راستہ سیدھا ہوتا تو پندرہ سولہ میل تھا لیکن راستے میں بڑا ہی گھنا جنگل تھا' دلدل والی چھوٹی چھوٹی جھیلیں تھیں' اونچی نیچی ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ وہاں کوئی آبادی ہی نہیں تھی تو راستہ کون بناتا۔ سولہ سترہ میل کا فاصلہ سو کوس کا فاصلہ لگتا تھا۔

وہاں جنگل کا ایک حصّہ دشوار گذار تھا اور درندوں کی وجہ سے خطرناک بھی۔ سب سے بڑا خطرہ اس سانپ کا تھا جو درختوں پر رہتا ہے اور کوئی نیچے سے گزرے تو اسے پیشانی پر کاٹ لیتا ہے۔ پھر زمینی سانپ تھے اور جہاں جھیلیں تھیں وہاں اژدھا اور مگرمچھ

بھی تھے۔ زیادہ خطرہ درخت والے سانپ کا تھا۔ ہماری بستی کے جو لوگ قصبے کو آتے جاتے رہتے تھے' انہوں نے سفر کے لئے قدرے محفوظ علاقہ دیکھ رکھا تھا اور وہ اس میں سے گزرتے تھے لیکن محفوظ وہ بھی نہیں تھا۔

میں رائفل تو ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ فوجی رائفل تھی اور قصبے میں پکڑی جا سکتی تھی۔ وانگ وغیرہ نے مجھے بتایا تھا کہ قصبے میں فوجی دفتر بھی ہے اور فوجی اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ان قصبوں اور بڑی آبادیوں میں جو محاذ کے بالکل قریب ہوتی ہیں' انٹیلی جنس کے آدمی وہاں موجود ہوتے ہیں اور ملٹری پولیس کی نفری بھی۔ وہ ہر کسی کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سنگاپور' ملایا' برما وغیرہ جاپانیوں کے ہاتھوں گنوا کر انگریزوں کو پتہ چلا تھا کہ جاپانیوں کا جاسوسی کا نظام ان ملکوں کی انتہائی نازک اور اہم رگوں تک پہنچا ہُوا ہے۔ ہندوستان میں بھی جاپان کے جاسوس ہندوستانیوں کی صورت میں موجود تھے۔ انگریز اس معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔

مجھ پر یہ شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں بھگوڑا فوجی ہوں۔ میری داڑھی خاصی لمبی ہو گئی تھی اور میں نے سمیع اللہ کا لمبا چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر مولویوں والی پگڑی تھی اور میں نے کندھے پر رومال ڈال رکھا تھا۔ یہ سارا حلیہ کسی مولانا یا کسی پیر و مرشد کا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ میں نے نیفے میں انگریز پائلٹ کا ریوالور اڑس رکھا ہے جس میں چھ گولیاں ہیں اور اٹھارہ گولیاں بیلٹ میں لگی ہوئی ہیں اور بیلٹ میری کمر سے بندھی ہوئی ہے۔

ہم جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ ہم اس جگہ سے گزرے جہاں میں نے ایک چھوٹا مگرمچھ مارا تھا۔ پھر اس جگہ سے بھی آگے نکل گئے جہاں فضل داد ملا تھا۔ ایک آدمی خچر پر سوار آگے آگے جا رہا تھا۔ وہ نیچے کم اور اوپر درختوں کو زیادہ دیکھتا جاتا تھا۔ جس درخت کا ٹہن نیچے کو آیا ہُوا ہوتا' اسے تو وہ زیادہ غور سے دیکھتا تھا۔ ایسے ہی ٹہنوں پر وہ سانپ ہوتے تھے جو اوپر سے جھک کر نیچے سے گزرنے والے کے ماتھے پر ڈس لیتے تھے۔ یہ آدمی اسی لئے آگے تھا کہ اسے ان سانپوں کو درختوں کے پتوں میں سے پہچان لینے کا تجربہ تھا۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے اور ایک طرف سے گھٹا اٹھ رہی تھی۔ ہم گوروں کی باتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں بار بار کہتا تھا کہ ان انگریزوں کی غلامی سے

آزاد ہونا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آزادی یا غلامی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اُس جنگل میں شیر کی موجودگی یقینی تھی۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ بھیڑیے عام تھے۔ پہلے کبھی میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جو علاقے جنگ کی زد میں آ گئے تھے' ان علاقوں کے جنگلوں میں سے درندے بھاگ کر اس طرف آ گئے تھے۔ میرے ساتھی مجھے بتاتے تھے کہ ہم چونکہ زیادہ آدمی ہیں اس لئے کوئی درندہ ہم پر حملہ نہیں کرے گا۔ درندے اکیلے دکیلے آدمی پر حملہ کرتے ہیں۔

○

ہم آدھے سے زیادہ راستہ طے کر چکے تھے۔ اب ہم ایسے علاقے میں جا رہے تھے جس میں درخت کچھ دُور دُور تھے اور ٹیکریاں بھی کچھ پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ چلنے کا راستہ آسان ہو گیا تھا۔ ہم ایک ٹیکری کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ ٹیکری ختم ہو گئی۔ وہ آدمی جو ہمارے آگے جا رہا تھا' دائیں طرف دیکھ کر رک گیا۔ ہم اس تک پہنچ کر رکے تو اُس نے ٹیکری کے پچھلی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ کسی انسان کی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔

ہمارا گائیڈ اس طرف خچر کو موڑ کر چل پڑا۔ وانگ نے اسے کہا کہ رک کر کیا کرو گے' چلو آگے لیکن اس آدمی نے تو جیسے سنا ہی نہ ہو۔

میں نے اُس طرف دیکھا تو مجھے یوں شک ہُوا جیسے اُن ہڈیوں کے ساتھ دونالی بندوق پڑی ہوئی ہو۔ کپڑوں کے ٹکڑے تو صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنا خچر ادھر کو موڑ لیا۔ باقی ساتھی بھی وہاں آ گئے۔ واقعی وہاں دونالی بندوق پڑی ہوئی تھی اور اس سے کچھ دور بیلٹ پڑی ہوئی دیکھی جس میں کارتوس اڑسے ہوئے تھے۔ میں خچر سے اُترا تو باقی سب اتر آئے۔

میں نے بندوق اٹھا کر کھولی۔ اُس میں دو کارتوس پڑے ہوئے تھے لیکن دونوں ہی فائر کئے ہوئے تھے۔ میں نے بندوق اپنے ایک آدمی کو دے دی اور کارتوسوں والی بیلٹ بھی اٹھا لی۔ اس بدقسمت شخص کی ہڈیاں الگ الگ پڑی تھیں۔ پسلیوں کا پنجر ایک طرف' اس سے کچھ دور کھوپڑی تھی جس پر ابھی کھال کچھ باقی تھی اور بال بھی تھے۔ کھوپڑی کے اندر کچھ گوشت تھا اور اسی طرح کسی ہڈی پر ذرا سی کھال چپکی ہوئی تھی اور

کچھ بال بھی تھے۔ مختصر کہ یہ ہڈیوں کی حالت بتاتی تھی کہ اس شخص کو چند دن پہلے ہی کھایا گیا ہو۔ ہڈیاں پرانی نہیں تھیں۔ بندوق سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شکاری تھا اور شکار کے لئے آیا تھا۔ ہڈیوں پر کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔

ہم سب خچروں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل پڑے۔ میرے دل پر کچھ بُرا ہی اثر ہوا اور میں سوچنے لگا کہ یہ بیچارہ نہ جانے کون تھا اور اس کے گھر والے انتظار کرتے رہے ہوں گے کہ وہ شکار مار کر لائے گا۔

"کوئی بے وقوف آدمی تھا" — میرے ایک ساتھی نے کہا — "اس جنگل میں اکیلے شکار کے لئے آنا خودکشی کی کوشش ہوتی ہے۔ ان جنگلوں میں انسان تو یوں مارا جاتا ہے جس طرح کیڑا مکوڑا پاؤں تلے آ جاتا ہے"۔

"اس جنگل میں کوئی تجربہ کار شکاری ہی شکار کھیل سکتا ہے" — ایک اور ساتھی نے کہا — "اسے درندوں نے مارا ہو گا"۔

ایسے ہی باتیں کرتے چلتے گئے۔ دو ساتھیوں نے دو شکاریوں کا ایسا ہی انجام سنایا اور یہی باتیں کرتے کرتے ہم قصبے میں داخل ہوئے۔

اس قصبے کا نام وودن تھا۔ یہ قصبہ نہیں بلکہ یہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ اردگرد بانسوں کے بنے ہوئے بڑے اچھے جھونپڑے تھے اور ان کے آگے کچھ مکان پکے بھی تھے اور کچھ پتھروں اور مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑے بھی تھے لیکن محنت اور خوبصورتی سے بنائے گئے تھے۔ میرا خیال تھا یہ ایک گمنام گاؤں ہو گا جسے جنگ نے کچھ اہمیت دے دی تھی۔ میں نے دُور ہی سے دو فوجی ٹرک دیکھے۔ فوج کی وجہ ہی سے اس قصبے کو اہمیت اور رونق ملی تھی۔

قصبے کو اتنا زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں' میں آپ کو ایک خاص بات سنانا چاہتا ہوں۔ یہ سنانے سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ اس زمانے میں سمگلنگ کے نام سے شاید بہت کم لوگ واقف ہوں گے لیکن اس قصبے میں کچھ اس طرح کی سمگلنگ ہوتی تھی کہ فوجی راشن سول کے کچھ جرائم پیشہ آدمیوں کے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ وہ اسے ضرورت مند لوگوں تک اچھی خاصی قیمت پر پہنچاتے تھے۔ جنگ عظیم کے دوران انگریز سارے ہندوستان کا اناج اور دیگر اشیائے خوردنی محاذوں پر پہنچاتا رہتا تھا۔ فوج کے سپلائی کے محکمے میں وسیع پیمانے پر کرپشن شروع ہو گئی تھی۔ ہماری بستی میں جو راشن جاتا تھا وہ فوج

کا چرایا ہوا راشن ہوتا تھا۔

ہم قصبے میں داخل ہوئے۔ بازار خاصا بارونق تھا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ چلتے چلتے وانگ نے ایک آدمی کو آواز دی۔ اُس آدمی نے رُک کر پیچھے دیکھا تو دوڑا آیا۔ وانگ خچر سے کُود کر اترا اور اس کے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔

وانگ نے میری طرف اشارہ کیا تو آدمی آہستہ آہستہ میری طرف آیا۔ میں اس کی طرف بڑھا اور اس آدمی نے جھک کر میرے ساتھ مصافحہ کیا اور میرے ہاتھ چُومے۔ میرے دوسرے ساتھی بھی خچروں سے اُتر آئے اور وہ شخص ان سب سے ملا۔

یہ سب اپنی زبان میں باتیں کر رہے تھے اس لئے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ کیا کہہ اور سُن رہے ہیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے ملٹری پولیس کے دو گورے نظر آئے جو آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ دو آدمی مجھے بڑی غور سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ آگے گئے اور واپس آ گئے۔ واپسی پر وہ میرے قریب سے گزرے اور مجھے دیکھتے گئے۔ وہ یقیناً" انٹیلیجنس کے مخبر تھے۔ میں نے ان کی طرف دھیان ہی نہ دیا لیکن میں انہیں دیکھتا رہا۔

وانگ نے میرے ساتھ اردو میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ یہ شخص جو اسے ملا ہے' اس کا پرانا دوست ہے اور جب بھی وہاں آتا ہے اس کے پاس کچھ وقت گذارتا ہے۔ وانگ نے کہا کہ یہ ہم سب کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے۔

میں نے وانگ سے پوچھا کہ اُس نے اس آدمی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے۔ وانگ نے کہا کہ اس نے یہ بتایا ہے کہ میں رنگون میں دکان کرتا تھا اور ہم اکٹھے وہاں سے بھاگے تھے۔ اس نے میرے متعلق یہ بھی بتایا کہ میں رنگون کی ایک مسجد میں امامت بھی کیا کرتا تھا۔

وہ شخص برما کے ایک اور بڑے شہر مانڈلے کا رہنے والا تھا اور وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔ وانگ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ یہ کوئی شریف آدمی نہیں بلکہ معزز قسم کے مجرموں میں سے ہے اور یہ فریب کاری اور دھوکہ دہی کا ماہر ہے۔ وانگ نے اس کا نام بتایا تھا جو اتنا مشکل تھا جو میں تھوڑی ہی دیر بعد بھول گیا تھا۔ اس نام کا تلفظ بھی بڑا مشکل تھا۔ آدمی ہنس مکھ اور زندہ دل معلوم ہوتا تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ

پُرکشش تھا۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا۔

اس کا گھر چھوٹا سا لیکن بڑا ہی خوبصورت تھا۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا جس میں بڑی اچھی قسم کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک جوڑی تپائی بھی تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ خوشحال آدمی ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کا نوکر چائے لے آیا جس کے ساتھ بسکٹ اور ایک دو اور چیزیں بھی تھیں۔

ہمارا میزبان وانگ سے زیادہ اچھی اردو بولتا تھا۔ اس نے میرے ساتھ کچھ باتیں کیں پھر وہ وانگ اور میرے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اپنی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے وانگ اور اُس کے ساتھی چونکے اس سے میں سمجھ گیا کہ اُس نے کوئی نیا انکشاف کیا ہے یا کوئی سنسنی خیزبات کہہ دی ہے۔

"لو صاحب!" ـــــ وانگ نے مجھے کہا ـــــ "یہ ہمیں اس آدمی کا واقعہ سنا رہا ہے جس کی ہڈیوں کا پنجر وغیرہ جنگل میں دیکھا تھا۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ یہ بندوق اسی کی ہے جو ہم اٹھا لائے ہیں"۔

وانگ نے بندوق اور کارتوسوں والی بیلٹ اسے دکھائی۔

ہمارے میزبان نے اپنی زبان میں بات شروع کی اور وہ بولتا ہی چلا گیا۔ ایک بار اس نے رک کر مجھ سے اردو میں کہا کہ میرے ان مہمانوں میں صرف وانگ اُردو سمجھتا ہے اس لئے میں دوسرے مہمانوں کی خاطر ان کی زبان میں بات کر رہا ہوں۔ اُس نے کہا کہ یہ آپ کو ساری کہانی سنا دیں گے۔ اس کے بعد وہ پھر اپنی زبان میں ساری بات سنانے لگا۔

میں اپنے ساتھیوں کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ اُن کے چہروں پر طرح طرح کے تاثرات آتے اور جاتے تھے۔ یہ کوئی بڑی دلچسپ کہانی معلوم ہوتی تھی..... چائے چلتی رہی اور کہانی بھی چلتی رہی اور خاصا وقت گزر گیا۔ غالباً" ڈیڑھ دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ آخر ہم اٹھے اور میزبان سے ہاتھ ملا کر آ گئے۔

وانگ مجھے سیر کرانا چاہتا تھا لیکن میں وانگ سے وہ کہانی سننا چاہتا تھا جو اسے میزبان نے سنائی تھی۔ میں آپ کو زیادہ انتظار میں نہیں رکھوں گا' بہتر سمجھتا ہوں آپ کو یہ بات سنا دوں۔

میں نے وانگ سے کہا کہ مجھے وہ پہلے یہ بات سنائے لیکن وانگ نے کہا کہ اس

شخص کی موت کا واقعہ اطمینان سے سنانے والا ہے' جب واپس چلیں گے تو راستے میں سناتا جاؤں گا..... وانگ نے مجھے سارے قصبے میں گھمایا پھرایا۔ اس کا اچھا خاصا اثر و رسوخ بازار میں نظر آیا۔ اکثر دکاندار اسے آواز دے کر بڑے پیار اور محبت سے یا احترام سے سلام کرتے تھے۔

میں اپنے مطلب کی چیزیں دیکھتا پھر رہا تھا۔ ایک دو فوجی نظر آ رہے تھے۔ میں انہیں غور سے دیکھتا تھا۔ یہ سب ہندوستانی تھے اور گورے فوجی جو نظر آتے تھے وہ زیادہ تر ملٹری پولیس کے تھے۔ چلتے چلتے وانگ ایک دکان کے سامنے رُک گیا' دکاندار کے ساتھ اس کی سلام و دعا تھی اور وہ دکاندار کے پاس چلا گیا۔ میں ذرا الگ کھڑا تھا۔ وہی دو آدمی جو میں نے پہلے بتایا ہے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے' میرے پاس آ گئے اور مسکرا کر سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرا تعاقب کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے جب بات کی تو میں نے جانا کہ یہ بنگالی ہیں گہری سانولی رنگت سے تو وہ بنگالی ہی لگتے تھے لیکن ان کا اُردو کا لب و لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ یہ بنگال کے نہیں۔

"آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا" — ان میں سے ایک نے کہا اور پوچھا — "آپ کہاں رہتے ہیں؟"

"یہ تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں ہندوستانی ہوں" — میں نے کہا — "رنگون میں میری دکان تھی۔ بڑی اچھی چل رہی تھی لیکن بیڑہ غرق ان جاپانیوں کا کہ انہوں نے حملہ کر دیا اور وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اب میں جنگل میں ایک چھوٹی سی بستی میں رہتا ہوں۔ یہ سب لوگ میرے ساتھ آئے تھے۔ آگے راستے بند ہو گئے تھے اس لئے ہم وہیں رک گئے"۔

میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں۔ ایک نے کہا وہ سلہٹ کا رہنے والا ہے دوسرے نے بوگرہ کا نام لیا۔ بوگرہ مشرقی بنگال کا ایک شہر ہے۔ میں نے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ یہاں ان کی سپلائی کا کاروبار ہے اور وہ ایک ٹھیکیدار کے معمولی سے حصّہ دار ہیں۔

وہ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر چلے گئے تو وانگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے انہیں ایسی ویسی بات تو نہیں بتا دی؟ میں نے وانگ سے پوچھا کہ وہ انہیں جانتا ہے؟ وانگ نے بتایا کہ انہیں وہ اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ انٹیلی

جنس کے مخبر تھے..... میں نے جو حلیہ بنا رکھا تھا اور جس طرح میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی یعنی مولویوں جیسی تھی' اس سے لوگوں کو دھوکہ دیا جا سکتا تھا' انٹیلی جنس کے مخبروں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جا سکتی تھی۔ انٹیلی جنس والے جانتے تھے کہ جاسوس عموماً" میرے والا بھیس بدل لیا کرتے ہیں اور عبادت گاہوں میں بیٹھ کر جاسوسی کیا کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ان مخبروں نے میری بات صحیح مان لی تھی یا نہیں۔ بہرحال ہم تھوڑی دیر بعد وہاں سے چل پڑے۔ ہمیں شام سے پہلے پہلے اس جنگل سے گزر کر اپنی بستی تک پہنچنا تھا۔ درندے شام کے بعد باہر نکلتے اور اپنا شکار ڈھونڈتے ہیں۔

ہم قصبے سے نکلے اور واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ وانگ نے اپنا خچر میرے خچر کے پہلو کے ساتھ رکھا اور اس نے بات شروع کر دی۔ بات یہ تھی کہ جب فوج نے اپنا دفتر اس قصبے میں آ کر بنایا تو ایک ادھیڑ عمر آدمی جو آسام کا رہنے والا مسلمان تھا' فوج کے ساتھ ہی یہاں آ گیا۔ وہ فوجی نہیں تھا' سویلین تھا لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی نوکری اور ڈیوٹی کیا ہے۔ اُس کا نام شجاع الدین تھا۔ وہ کسی دفتر میں تو بیٹھتا نہیں تھا' عموماً" بازار میں اس قصبے کی گلیوں میں آہستہ آہستہ گھومتا پھرتا نظر آتا تھا۔

شکل و صورت سے بڑا ہی پُروقار اور مسکراتا ہُوا لگتا تھا' ہر کسی کے ساتھ سلام و دعا رکھتا اور رُک کر خیر خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ یہاں سے غائب ہو جاتا اور کبھی ایک مہینہ اور کبھی دو مہینے لگا کر واپس آتا تھا۔ ہر کوئی اسے عزت سے ملتا کیونکہ اس کا سارا انداز اور ملنے جلنے کا طور طریقہ شریف آدمیوں والا تھا۔ وہ ایک بڑے اچھے مکان میں رہتا تھا جس میں اس کا ایک نوکر تھا' بیوی بچے نہیں تھے۔ یہ تو سب کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے اور پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ ایک بڑی جواں سال عورت اس کے گھر جانے لگی ہے۔ صاف بات تھی کہ اس عورت کے اس کے تعلقات قابلِ اعتراض تھے۔ اس کے نوکر سے کوئی پوچھتا کہ تمہارا مالک کیا کرتا ہے یا اس کے گھر کی کوئی اور بات کی جاتی تو نوکر ہنس کر ٹال دیتا یا ویسے ہی بات کو گول کر جاتا۔ یہ تو سب کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ فوج کا یا انگریزوں کا خاص قابلِ اعتماد آدمی ہے اور جسے چاہے انگریزوں سے فائدہ دلوا سکتا ہے اور جسے چاہے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ آدمی پُراسرار تھا۔

اس قصبے سے دو آدمی پکڑے گئے جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے یہاں آ کر یہ بتایا تھا کہ روزگار کی تلاش میں آئے ہیں۔ دونوں آسام کے رہنے والے

ہندو تھے۔ انہیں کوئی روزگار نہ ملا تو ایک دکان کھول لی جس میں انہوں نے سگریٹ وغیرہ رکھ لئے لیکن ایک ہی مہینے بعد وہ لاپتہ ہو گئے۔ آخر پردہ اٹھ گیا اور معلوم ہُوا کہ ان دونوں کو شجاع الدّین نے گرفتار کروایا تھا کیونکہ یہ دونوں جاپانیوں کے جاسوس تھے۔

پھر اس نے تین اور تعلیم یافتہ قسم کے آدمی اس طرح گرفتار کروائے کہ ایک رات ملٹری پولیس نے ان تینوں کے گھروں پر چھاپے مارے اور کچھ لٹریچر برآمد ہوا اور یہ ثبوت مل گیا کہ ان لوگوں کا تعلق اس انڈین نیشنل آرمی کے ساتھ ہے جو جاپانیوں نے تیار کر رکھی ہے۔ یہ کارنامہ بھی شجاع الدین کا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ شجاع الدین نے اپنے مخبر تیار کر رکھے تھے۔ وہ جو کچھ عرصے کے لئے غائب ہو جاتا تھا' وہ جاسوسی کے سلسلے میں جاتا تھا۔ اسے کئی بار فوجی گاڑی سے قصبے سے جاتے دیکھا گیا تھا۔

اس قصبے میں ایک خاندان تھا جس کا تعلق بدھ مذہب کے ساتھ تھا۔ ان کی دو جوان لڑکیاں تھیں اور دونوں خاصی خوبصورت تھیں۔ ایک رات فوج نے اس گھر پر بھی چھاپہ مارا اور دو جوان آدمیوں کو پکڑ کر لے گئی۔ پتہ چلا کہ یہ چھاپہ بھی شجاع الدین نے مروایا تھا۔

اس خاندان کو سب لوگ جانتے تھے۔ بڑا ہی شریف اور عزت والا بلکہ عظمت والا گھرانہ تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس گھر میں جاسوس بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لوگوں میں شجاع الدین کے خلاف چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ تین چار دنوں بعد اس خاندان کے یہ دونوں پکڑے ہوئے آدمی گھر آ گئے اور پھر دیکھا کہ اس خاندان کی بڑی لڑکی ایک انگریز میجر کے کوارٹر میں گئی۔ اس کے بعد یہ لڑکی اس میجر کے ساتھ گھومتی پھرتی نظر آنے لگی۔ بات بڑی صاف تھی۔ وہ یہ کہ یہ میجر اس لڑکی کو چاہتا تھا یا شجاع الدّین نے اس میجر کو خوش کرنے کے لئے یہ لڑکی اس کے ساتھ لگا دی تھی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ اس گھر پر چھاپہ مروایا' لڑکی کے دو بھائیوں کو گرفتار کروایا اور اندر ہی اندر کوئی سودا بازی ہوئی اور لڑکی نے اپنے بھائیوں کی خاطر اس انگریز میجر کے ساتھ دوستی لگا لی۔

یہ بھی سنا گیا کہ آسام سے ایک یا دو آدمی آئے تھے اور انہوں نے شجاع الدین کے متعلق بتایا تھا کہ یہ انگریزوں کا مخبر ہے اور پولیس کو اس نے مخبری کے ذریعے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور اس طرح بعض شریف گھروں کی لڑکیوں کو خراب کر چکا ہے۔ انہوں

نے یہ بھی بتایا کہ وہاں اس کے آدمی جس سے چاہیں جگا ٹیکس وصول کر لیتے ہیں۔ یہ اس شخص کی شہرت ہے۔

اس کے پاؤں اس قصبے میں جم گئے تو اس نے جگا ٹیکس یہاں بھی لینا شروع کر دیا تھا لیکن اتنا عام نہیں۔ کسی بڑے دکاندار کے ہاں جا دھمکتا اور اس سے کہتا کہ اتنے پیسے فوراً نکالو ورنہ فوج کو تم پر شبہ ہے کہ تم جاسوس ہو۔ اس کی اس قسم کی حرکتوں نے اسے سارے قصبے میں بدنام کر دیا۔ پہلے لوگ اسے احترام سے سلام کرتے تھے لیکن اب اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا لیکن اس شخص کو اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اُس کے پاس انگریزوں کی اتھارٹی تھی اور انگریزوں کا رعب استعمال کرتا تھا۔

○

اسی قصبے میں ایک مسلمان گھرانہ بھی رہتا تھا۔ مسلمانوں کے چند اور گھر بھی تھے۔ اس مسلمان گھرانے میں ایک بڑی ہی خوبصورت اور کنواری لڑکی تھی۔ وہ بغیر پردے کے باہر نکلا کرتی تھی۔ شجاع الدین کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے لڑکی کے باپ کے ساتھ میل جول شروع کر دیا اور اس کے گھر بھی جانے لگا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ ایک بار وہ چاولوں کی بوری اٹھا کر اس مسلمان کے گھر گیا تھا۔ اس سے لوگوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ لڑکی کی خاطر اس گھر کو فوج کا راشن مفت سپلائی کر رہا ہے۔

لڑکی کا باپ عزت و شرافت والا تھا اور اس گھرانے کا شمار شریف گھرانوں میں ہوتا تھا۔ وہ نمازی اور پرہیزگار آدمی تھا۔ ایک روز اس نے اپنے پڑوسیوں کو بتایا کہ شجاع الدین اسے دھمکیاں دیتا ہے کہ اپنی بیٹی کو میرے گھر بھیجا کرو ورنہ تمہیں گرفتار کروا دوں گا۔ یہ بات آہستہ آہستہ قصبے میں پھیل گئی۔ چونکہ وہ بڑا ہی معزز اور شریف گھرانہ تھا اس لئے دو تین معزز اور بزرگ آدمی شجاع الدین کے ہاں گئے اور اسے بتایا کہ وہ کم از کم اس گھرانے کو پلید نہ کرے۔

شجاع الدین نے یہ بات بنالی کہ یہ شخص اسے بلاوجہ بدنام کر رہا ہے۔ اس نے لڑکی کے باپ کے خلاف ایسے ایسے الزامات سنائے کہ سننے والوں نے کانوں میں ہاتھ رکھے اور وہاں سے واپس آ گئے۔ انہوں نے ایک بھی الزام سچا نہیں سمجھا تھا۔ البتہ وہ یہ سمجھ گئے کہ شجاع الدین میں انسانی جذبات ہیں ہی نہیں اور وہ اندر باہر سے شیطان ہے۔ لوگوں

نے یہ بھی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اس شخص کو کس طرح انسان بنایا جائے اور اگر یہ انسانیت کو قبول نہیں کرتا تو اس کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور کیا جائے لیکن فوج کے انگریز افسر اسے اتنا اچھا سمجھتے تھے کہ سب نے کہا کہ اس کے خلاف کوئی شکایت اس کے افسر نہیں مانیں گے۔ ایک روز لڑکی کے باپ نے روتے ہوئے اپنی جان پہچان کے چند ایک آدمیوں سے کہا کہ رات شجاع الدین اس کے گھر آیا تھا اور یہ کہہ کر چلا گیا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر اُس نے اپنی بیٹی کا نکاح شجاع الدین کے ساتھ نہ کیا تو وہ پورے خاندان کے آدمیوں اور عورتوں کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کروا دے گا اور کبھی بھی اس جال سے نکلنے نہیں دے گا۔ لوگوں نے یہ بات سنی تو وہ سوچنے لگے کہ درخواست لکھ کر انگریز افسروں کو دی جائے یا کیا کیا جائے۔ لڑکی کا باپ تو بیچارا رو رو کر آدھا رہ گیا تھا۔

○

شجاع الدین کا ایک مشغلہ شکار تھا۔ اس کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ وہ گھوڑے پر شکار کھیلنے جایا کرتا تھا لیکن کبھی کبھی۔ ایسا نہیں کہ ہر روز یا ہر ہفتے جاتا ہو۔ ایک بار وہ ہرن مار کر لایا تھا اور ایک بار وہ موٹا تازہ خنزیر مار لایا تھا۔ اگر اسے بڑا شکار نہیں ملتا تھا تو وہ پرندے مار لاتا تھا۔

جس روز ہم اس قصبے میں گئے تھے، اس سے پانچ چھ روز پہلے شجاع الدین شکار پر نکلا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے ساتھ اپنا ایک آدمی تھا جو اس کے لئے مخبری کیا کرتا تھا۔ وہ بھی اچھا خاصا بدمعاش آدمی تھا۔ وہ شجاع الدین کے ساتھ پیدل جا رہا تھا۔

وہ دونوں صبح کے وقت نکلے تھے۔ بارہ بجے کے بعد شجاع الدین کا یہ آدمی سرپٹ گھوڑا دوڑاتا قصبے میں واپس آیا۔ بہت ہی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ خوف اس کے چہرے پر جیسے لکھا ہوا تھا۔ اس نے بازار میں آ کر گھوڑا روکا اور پہلے ایک دو آدمی اس کے پاس رکے پھر ہجوم اس کے اردگرد اکٹھا ہو گیا۔

اس نے ہانپتی کانپتی سانسوں سے خوف زدہ آواز میں لوگوں کو سنایا کہ وہ قصبے میں سے نکلے تو شجاع الدین نے اسے کہا کہ آج میں بڑا شکار کھیلوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ آج شیر سامنے آ جائے تو مزا ہی آ جائے گا۔

وہ چلتے چلے گئے اور چار پانچ میل دو جنگل میں جا پہنچے۔ ایک جگہ شجاع الدین نے

گھوڑا روکا اور اتر آیا۔ اس نے گھوڑا اپنے آدمی کے حوالے کر دیا اور خود دونوں پیدل چلنے لگے۔ کچھ اور آگے گئے تو شجاع الدین نے اپنے اس آدمی سے کہا کہ تم گھوڑے کو پکڑے رکھو اور یہیں ٹھہرو۔ شجاع الدین نے بندوق کی دونوں نالیوں میں کارتوس پہلے ہی ڈال لئے تھے۔ وہ آگے چلتا گیا اور اپنے آدمی سے بیس پچیس قدم دور تک جا پہنچا۔

کسی جانور کے تیز دوڑنے کی آہٹیں سنائیں دیں۔ شجاع الدین رک گیا۔ اس نے بندوق دونوں ہاتھوں میں لے لی تھی۔ اچانک نیکری کے پیچھے سے ایک خنزیر سرپٹ دوڑتا نکلا۔ وہ شجاع الدین کی طرف آ رہا تھا۔ شجاع الدین نے بندوق کندھے سے لگائی اور دونوں کارتوس یکے بعد دیگرے فائر کر دیئے۔ اس کا نشانہ خطا نہ گیا اور خنزیر سیدھا دوڑتے دوڑتے ایک طرف کو مڑا پھر ایک جگہ رک کر چکر کھانے لگا اور اتنی دیر میں چار یا پانچ بھیڑیئے بڑی تیزی دوڑتے پہنچ گئے۔ یہ بھیڑیئے نہ جانے کہاں سے اور کتنی دُور سے اُس خنزیر کے تعاقب میں آ رہے تھے۔

شجاع الدین نے غالباً یہ سوچا ہو گا کہ وہ دوسرے کارتوس ڈال کر فائر کرے گا تو بھیڑیئے بھاگ جائیں گے۔ دراصل اللہ تبارک و تعالیٰ نے اُس کی موت کا سبب بنا دیا تھا جو یہ تھا کہ اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ بڑے شکار کا شوقین تو تھا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ درندے اپنا شکار نہیں چھوڑا کرتے۔ بھیڑیئے تو کسی صورت قبول نہیں کرتے کہ کوئی اور ان کا شکار اٹھا کر لے جائے۔

خنزیر ابھی گرا نہیں تھا اور شجاع الدین ابھی بندوق سے فائر کئے ہوئے کارتوس نکال بھی نہیں پایا تھا۔ خنزیر چکر کھاتے کھاتے شجاع الدین کے قدموں کے قریب آ کر گرا اور تڑپنے لگا۔ اس کے سارے جسم پر خون ہی خون تھا۔ بھیڑیئے بھی وہاں پہنچ گئے۔ شجاع الدین بندوق کی نالیاں کھول ہی نہ سکا۔ وہ بہت جلدی میں تھا اس لئے گھبراہٹ میں اس سے نالیاں نہ کھلیں۔ بھیڑیوں نے خنزیر پر حملہ کر دیا۔ شجاع الدین کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس نے بندوق کی نالیاں پکڑ کر بندوق گھمائی۔ بٹ ایک بھیڑیے کو لگا۔ وہ بھیڑیا چیختا ہوا پرے چلا گیا اور بڑے غصے سے غراتے ہوئے شجاع الدین کی طرف آیا۔

شجاع الدین کا خیال تھا کہ وہ بھیڑیوں کو بھگا دے گا۔ اس کی بندوق کو دیکھ کر بھیڑیے ذرا سے پیچھے ہٹے اور ایک چکر میں گھومنے لگے۔ ایک بھیڑیا اس کے پیچھے چلا گیا اور وہاں سے بھیڑیے نے جست لگائی تو شجاع الدین کے کندھوں پر جا پنجے گاڑے اور

اُس کی گردن پیچھے سے منہ میں لے لی۔ اپنے ساتھی کو دیکھ کر دو اور بھیڑیے شجاع الدین پر حملہ آور ہو گئے۔ وہ جان گئے تھے کہ خنزیر ان کا شکار تھا لیکن شجاع الدین اُس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ شجاع الدین خنزیر کو اپنا شکار سمجھ رہا تھا لیکن وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ درندے اپنا فیصلہ خود کیا کرتے ہیں اور وہ دوسری پارٹی کا موقف نہیں سنا کرتے۔

شجاع الدین کے ساتھی نے دیکھا کہ سارے بھیڑیے شجاع الدین پر ٹوٹ پڑے اور اسے گرا لیا۔ شجاع الدین کا ساتھی جو بیس پچیس قدم پیچھے تھا وہ بڑی تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوا اور ایڑ لگا دی۔ گھوڑا ہوا ہو گیا اور قصبے میں جا دم لیا۔

لوگوں نے یہ بات سنی تو کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ بہت افسوس ہے کہ شجاع الدین مارا گیا ہے۔ اگر کسی نے بلند آواز میں نہ کہا تو اپنے پاس کھڑے آدمی کے کان میں یہ سرگوشی ضرور کی کہ چلو یہ شیطان تو ختم ہوا۔ وانگ کو اس کے جس دوست نے میری موجودگی میں یہ کہانی سنائی تھی' اُس نے وانگ کو بتایا کہ اس مسلمان لڑکی کے باپ کو بعض لوگوں نے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ وہ خبیث مارا گیا ہے اور تمہاری بیٹی کی عزت بچ گئی ہے۔

"میرے منہ سے ایسی بددعا تو نہیں نکلی تھی" — لڑکی کے باپ نے آہ لے کر کہا — "میں نے یہ ضرور کیا تھا کہ گذشتہ رات عشاء کی نماز کے بعد نفل پڑھنے شروع کئے تو پڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ میں تھک کر چور ہو گیا' پھر میں نے ہاتھ پھیلا کر اللہ سے التجا کی کہ یا اللہ میری معصوم بیٹی کو محفوظ رکھنے والا تو ہی ہے۔ اُس کے بعد میری زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا کیونکہ میں اتنا رویا اتنا رویا کہ اپنے آپ پر قابو نہ رہا..... اب میں اللہ کی عظمت کو بسر و چشم سلام کرتا ہوں کہ اس کی ذاتِ باری نے میرے خاندان کی اور میری بیٹی کی عزت بچا لی ہے اور کوئی نہ ہو تو اللہ تو ہے ہی!"

اُمید تھی کہ جس طرح شجاع الدین نے فوج کی خدمت کی تھی' فوجی افسر کسی کو بھیجیں گے کہ جا کر دیکھو' اگر شجاع الدین کی لاش پڑی ہے تو اٹھا کر لے آؤ۔ فوج کی طرف سے ایسی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ دو آدمی جو شجاع الدین کے اپنے ہی مخبر تھے' گئے تھے لیکن دُور سے ہی واپس آ گئے۔ انہوں نے شجاع الدین کی ہڈیاں دیکھیں' بندوق بھی دیکھی اور دُور سے ہی دیکھ کر واپس آ گئے۔

یہی کچھ ہم نے دیکھا تھا اور بندوق وانگ نے لے لی تھی۔ وہ بندوق بستی میں لے

آیا تھا اور اس کے کارتوس بھی وانگ نے اپنے پاس رکھ لئے تھے۔

میں اُس واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ اس پر تبصرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

میں اس بڑھاپے میں ایک روز تلاوت قرآن کر رہا تھا تو میری نظریں پارہ 28 کی سورہ العلاق کی آیت نمبر9 پر رک گئیں۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں — "انہوں نے اپنے کئے کا مزہ چکھ لیا اور ان کا انجام نقصان والا ہی ہونا تھا"

ہم جب اُس قصبے' سے واپس اپنی بستی میں پہنچے تھے' اُس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ اُس وقت تک میں ہشاش بشاش تھا۔ اس سیر کا طبیعت پر بڑا اچھا اثر پڑا مگر شام کا کھانا کھا کر جب میں تنہا اپنے جھونپڑے میں بیٹھا تھا تو اچانک دل میں ایک بڑی ہی ناگوار گرفت محسوس کی۔ اسے گھبراہٹ کہہ لیں' خفقان کہہ لیں' ہُوا یوں کہ دل بجھ سا گیا اور ساری تازگی جو اتنی اچھی سیر سے حاصل کی تھی' بالکل ہی ختم ہو گئی۔

ایک تو شجاع الدین کا انجام یاد آ گیا۔ ذہن میں اس طرح کے تصورات آنے لگے کہ بھیڑیوں نے اسے کس طرح چیر پھاڑا ہو گا اور آخری وقت اس شخص نے کیا سوچا ہو گا۔ اسے گناہوں کی سزا ملی تھی لیکن آخر وہ انسان تھا۔ مجھے افسوس سا ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں بھی گناہگار ہوں۔ میں نے اور جو گناہ کئے سو کئے' کسی کو دھوکہ اور فریب نہیں دیا تھا۔ ناجائز دوستی بھی لگائی لیکن کسی عورت کو دھوکہ دے کر نہیں..... تاہم گناہ گناہ ہی ہوتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے بھی اس جنگل میں اپنے گناہوں کی ایسی سزا ہی ملے گی۔ یہ احساس ایک خوف کی صورت اختیار کرنے لگا۔

بڑی ہی تیزی سے میری ذہنی کیفیت ایسی بگڑی جیسے میں ابھی رو پڑوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ رونے کو جی چاہنے لگا تھا۔ میں اس وقت ڈیپریشن کے لفظ سے واقف نہیں تھا۔ آج کسی کی طبیعت ذرا سی بھی اُکھڑتی ہے یا کوئی شخص ذہن پر ذرا سا بوجھ محسوس کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھے ڈیپریشن ہو گئی ہے۔ میں اُس زمانے میں اس لفظ سے واقف نہیں تھا۔ آج اپنی وہ ذہنی کیفیت تفصیل سے بیان کرنے کی بجائے اتنا ہی بتا دیتا ہوں کہ

مجھ پر ڈیپریشن طاری ہو گئی تھی۔

بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو سنبھال لوں اور مزاج میں شگفتگی پیدا کر لوں لیکن جو بھی خیال آتا تھا وہ یاسیت اور شکست کا احساس لے کر آتا تھا۔ ایسی ذہنی کیفیت میں شاید ایسا ہی ہوتا ہے کہ کوئی امید افزا سوچ آتی ہی نہیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شجاع الدین کے انجام نے مجھے اداس کر دیا ہے لیکن مجھے وہ دو آدمی یاد آ گئے جو قصبے میں ملے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ آپ کو اس سے پہلے قصبے میں نہیں دیکھا۔ قصبے میں ہی مجھے وانگ کے دوست نے بتایا تھا کہ یہ دونوں آدمی انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ وہ اٹیلی جنس کے آدمی تھے اور میں پچھلے باب میں سنا چکا ہوں کہ وہ مجھے بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور انہوں نے میرا تعاقب بھی کیا تھا۔ میں سویلین ہوتا تو ان سے مجھے کوئی ڈر نہیں تھا لیکن میں بھگوڑا فوجی تھا۔ فوج سے بھگوڑا ہونا تو ایک جرم تھا ہی' اصل جرم یہ تھا کہ برما فرنٹ پر جو فوجی بھگوڑے ہوتے تھے' ان کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ جاپانیوں کے پاس چلے گئے ہیں۔ کوئی بھگوڑا پکڑا جاتا تو اس پر بھگوڑا ہونے کے علاوہ یہ الزام بھی عائد کیا جاتا تھا کہ وہ جاپانیوں کے پاس جانے اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے بھگوڑا ہوا تھا۔

میں نے برسوں بعد واپس گھر آ کر وہ کتابیں پڑھی تھیں جو جاپانیوں کے حملے کے متعلق لکھی گئی تھیں۔ جنرل اسلم نے ایک کتاب برما فرنٹ کے متعلق لکھی تھی۔ اس کا میں پہلے بھی حوالہ دے چکا ہوں۔ اس نے لکھا کہ جنگ کے دوران فوجی بھگوڑے ہوتے ہی رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ فوجی برما فرنٹ سے بھگوڑے ہوئے تھے اور یہ انگریزوں کے لئے ٹیڑھا مسئلہ بن گیا تھا۔ ان بھگوڑوں کی زیادہ تر تعداد جاپانیوں کے پاس چلی گئی تھی..... برما فرنٹ کے قریب اور اس علاقے میں جو چھوٹی بڑی آبادیاں تھیں اور جنگ سے محفوظ تھیں' ان میں اٹیلی جنس کے آدمی اور مخبر پھیلا دیئے گئے تھے۔ کسی پر ذرا سا بھی شک ہو جاتا کہ بھگوڑا فوجی ہو سکتا ہے' اسے پکڑ لیا جاتا تھا۔ میں تو تھا ہی غیر بری اس لئے مجھ پر شک کیا جا سکتا تھا۔

بگڑی ہوئی ذہنی کیفیت میں میرے دل پر یہ خوف بیٹھنے لگا کہ قصبے میں جن دو آدمیوں نے مجھے دیکھا تھا' وہ یہاں آ جائیں گے اور مجھے پکڑ لیں گے۔ امن کے زمانے میں چھاؤنی سے بھگوڑا ہونے کی سزا زیادہ نہیں ہوتی لیکن محاذ سے بھاگنا اور رائفل او

ایمونیشن ساتھ ہی لے جانا' بڑا ہی سنگین جرم ہوتا ہے جس کی سزا دس سال سے چودہ سال تک ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی یہ سزا اتنی ہی تھی۔

ذہن پر چونکہ یاسیت مسلط ہو گئی تھی اس لئے جو بھی تصور آتا تھا وہ یاس انگیز ہوتا تھا۔ مجھے ذہن کی آنکھوں سے یوں نظر آنے لگا جیسے میں پکڑا گیا ہوں اور کورٹ مارشل سے مجھے دس سال سزائے قید مل گئی ہے۔ قید کے تصور نے مجھے ریت کی ڈھیری بنا دیا۔ مجھے اپنے والدین اور بہن بھائی یاد آئے اور خیال آیا کہ انہیں کس قدر صدمہ ہو گا۔

گھر والوں کا خیال آیا تو گھر یاد آنے لگا۔ کبھی تو میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا کہ میں نے بھگوڑا ہونے کا ارادہ کیا ہی کیوں تھا۔ میں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ آئی این اے میں جانا ہی ہے تو وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ' کوئی وسیلہ پہلے تلاش کر لیتا۔ میں تو بلا سوچے سمجھے محض جذبات کی مصنوعی روشنی میں چل پڑا اور اس روشنی نے کسی نہ کسی مرحلے میں آ کر بجھ جانا تھا۔ وہ اُس رات بجھ گئی۔ مجھے گھر کا ایک ایک فرد یاد آیا۔ واجدہ اور اس کا خاوند بھی یاد آیا۔ میرے تو آنسو نکل آئے۔ پھر سوچ آ گئی کہ فوج کی طرف سے میرے گھر والوں کو یہ اطلاع کبھی کی مل چکی ہو گی کہ تمہارا بیٹا محاذ پر لاپتہ ہو گیا ہے۔ گھر والے میرا ماتم کر رہے ہوں گے۔

میں نے سونے کی کوشش کی لیکن صاف پتہ چل رہا تھا کہ میں آج رات سو نہیں سکوں گا..... ایک اور خیال آ گیا۔ اس نے تو اور زیادہ ڈرا دیا۔ وہ جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن تھا جو میرے جھونپڑے میں پڑا ہُوا تھا۔ پہلے جس طرح جاپان کی ایک پارٹی یہاں آئی تھی اور میں نے ان سب کو مار ڈالا تھا' اسی طرح ایک اور پارٹی آ سکتی تھی۔ جنگ میں ایسے خطرے کا امکان موجود تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جاپانیوں کی ایک اور پارٹی یہاں آ گئی تو وہ اپنے ملک کا یہ اسلحہ دیکھ کر پوچھے گی کہ یہ کہاں سے آیا۔ میں نے سوچا کہ جاپانیوں کو ذرا سا بھی شک ہُوا کہ ہم نے ان کی اس پارٹی کو مار ڈالا تھا تو وہ میرے سمیت بستی کے کسی بچے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

جاپانیوں کا خیال آیا تو مجھے انگریز کیپٹن یاد آیا جو پیٹرول ڈیوٹی پر ایک سیکشن کے ساتھ ادھر آ نکلا تھا۔ وہ کوئی اچھا آدمی تھا جس نے میری ہریات کو سچ مانا اور بڑی شرافت سے چلا گیا تھا۔ انڈین آرمی کی کوئی سیکشن یا پلاٹون بھی آ سکتی تھی۔ میرے پکڑے جانے کا خطرہ موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ صبح ہوتے ہی جاپانیوں کا اسلحہ اور ایمونیشن کہیں چھپا

دوں گا اور اپنے پاس صرف رائفل رکھوں گا اور وہ ریوالور اپنے پاس رکھوں گا جو میں نے انگریز پائلٹ سے لیا تھا۔

رات کی خاموشی میں مجھے بادلوں کی ہلکی گرج سنائی دینے لگی جو ابھی بہت دُور تھی۔ وہ برسات کا موسم تھا اور گرجتی کڑکتی گھٹائیں کسی بھی وقت آ جایا کرتی تھیں۔ یہ ہلکی ہلکی گرج جو مجھے سنائی دینے لگی تھی' بڑی تیزی سے بلند ہوتی گئی جس کا مطلب یہ تھا کہ پانی سے لدی ہوئی گھٹائیں بڑی تیز رفتاری سے آ رہی ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد آسمان میں ایسا دھماکہ ہُوا جیسے میرے جھونپڑے کے قریب ہی توپ فائر ہوئی ہو۔ پھر آسمان میں توپیں فائر ہونے لگیں۔ بارش بہت ہی تیز بلکہ طوفانی تھی۔ ایسی بارش سے مجھے لطف سا محسوس ہُوا کرتا تھا لیکن اُس رات میرا دل دہل گیا۔ ایک بار بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ میں لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک تو خوف میں اضافہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ میں بزدل ہو گیا ہوں۔

بجلی کی اس کڑک کو میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی وارننگ سمجھنے لگا کہ میرے گناہوں کی سزا کا وقت آ گیا ہے۔ میں نے پہلے سنایا ہے کہ کچھ دن پہلے رات ایسی بارش برسی تھی اور ایک بھیڑیا میرے جھونپڑے میں آ گیا تھا۔ میں ڈرا نہیں تھا اور اس سے بچنے کا اور اسے جھونپڑے سے نکالنے کا طریقہ سوچ لیا اور میں باہر نکل گیا تھا۔ پھر بھیڑیا بھی بھاگ گیا تھا اور میں جب جھونپڑے میں واپس آیا تھا تو اکیلے ہی ہنسنا شروع کر دیا تھا لیکن اب ویسی ہی بارش برس رہی تھی تو میں نے اپنے اندر اس قسم کی بزدلی محسوس کی جیسے اس جنگل کے سارے بھیڑیئے میرے جھونپڑے میں آ جائیں گے اور مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائیں گے۔

میں نے اپنے سر کو زور زور سے دائیں بائیں جھٹکے دیئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جھونپڑے میں دیا جل رہا تھا۔ میں ہاتھ پیٹھ پیچھے کر کے آہستہ آہستہ جھونپڑے میں ٹہلنے لگا۔ میں اپنا حوصلہ زندہ اور بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک یاد آ گیا کہ مجھے ان لوگوں نے اپنا سردار بنا لیا ہے۔ میرے متعلق ان لوگوں کا ایک عقیدہ بن گیا تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی غیبی طاقت ہے۔ میں نے ایک اژدھا کے منہ سے ان کی ایک لڑکی کو زندہ نکال لیا اور اژدھا کو مار ڈالا تھا۔ میں نے ایک شیر کو بھی مار ڈالا تھا۔ نو جاپانیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ایک انگریز پائلٹ کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے

مروایا تھا اور انگریز کیپٹن کے ساتھ گشتی پارٹی آئی تھی تو میں نے ایسی باتیں کی تھیں اور ایسا رویہ اختیار کیا تھا کہ یہ گورے بڑے اطمینان سے اور کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر چلے گئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس بستی کی جوان لڑکیاں میرے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔ یہ سوچ کر میرا دھیان گناہ کی طرف چلا گیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ جھونپڑے کے باہر کھڑے وانگ کو یا کسی اور کو آواز دے کر بلا لوں اور اسے کہوں کہ شراب بھی لے آؤ اور ایک لڑکی کو بھی ساتھ لے آؤ اور میرے پاس چھوڑ جاؤ۔

مجھے گناہ کا ہی خیال آنا چاہئے تھا۔ میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا اور میں انگریزوں کی انڈین آرمی کا فوجی تھا اور پھر ان لوگوں نے مجھے اپنا سردار بنایا تھا۔ مجھے اس سے لطف اٹھانا چاہئے تھا۔ سمیع اللہ خود ہی ان کا سردار اور پیر و مرشد بنا رہا تھا اور ان لوگوں کی عزتوں کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ میرے دماغ میں یہی الٹی سوچ آئی کہ میں بھی ایک رات کے لئے سمیع اللہ بن جاؤں تو کوئی ہرج نہیں۔ میں اُس وقت کی اس اذیت ناک ذہنی کیفیت سے نجات حاصل کرنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔

جھونپڑے کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازے تک گیا اور دروازہ اس ارادے سے کھولنے لگا کہ کسی کو برآمدے میں کھڑے ہو کر آواز دوں گا۔ دروازہ کھولا تو بجلی اس قدر زور سے کڑکی کہ میرے کان بند ہو گئے اور دماغ جیسے سن ہو گیا ہو۔ چمک ایسی کی باہر کا ذرّہ ذرّہ نظر آ گیا اور اُس کے بعد گھپ اندھیرا..... گھٹائیں اس طرح گرجیں جیسے غصے میں آ گئی ہوں۔ میں فوراً پیچھے ہٹا اور دروازہ بند کر لیا۔ میں اتنا بزدل تو کبھی بھی نہیں ہُوا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیئے۔ میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے — "یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دے"۔

○

ان الفاظ نے مجھے کچھ سکون دیا۔ اب جو خیال آیا' اس سے میں پریشان نہ ہُوا بلکہ یوں کچھ اطمینان سا لگا جیسے نجات کا ایک راستہ نظر آ گیا ہو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اللہ کو یاد کئے ایک مدت گزر گئی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہ سوچا اور کپڑے اتار کر بالکل برہنہ ہو گیا۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ بارش موسلا دھار تھی۔ میں بارش میں جا کھڑا ہُوا اور بارش نے میرے جسم کو دھو ڈالا۔ بارش سے ہی وضو کیا اور میں جھونپڑی میں چلا آیا۔ جسم خشک کیا' کپڑے پہنے اور قبلہ رُو کھڑا ہو گیا۔

عشاء کی نماز پڑھی اور اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کتنے نفل پڑھ ڈالے۔ کبھی نماز پڑھی تھی لیکن ایسے جیسے کوئی آدمی بے دلی سے ایک فرض ادا کر رہا ہو لیکن برسات کی اُس رات میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور میں اللہ کے حضور رکوع و سجود کر رہا تھا۔ یقین جانیں کہ مجھے جو روحانی مسرت ملی اس کا ذائقہ اس سے پہلے کبھی نہیں چکھا تھا۔

میں جب تھک گیا تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے اللہ سے کہا کہ یا اللہ میں کہاں تھا اور کہاں آ گیا ہوں' گناہگار ہوں' سزا مل رہی ہے' اب بخش دے میرے اللہ' راستہ دکھا دے اور کچھ نہیں تو مجھے گناہوں سے بچا لے۔

آج مجھے اُس وقت کی کیفیت یاد ہے لیکن وہ الفاظ اچھی طرح یاد نہیں رہے جو میں نے اللہ کے حضور پیش کئے تھے۔ یہ یاد ہے کہ میں نے اللہ سے کہا تھا کہ کم از کم یہاں ان لوگوں میں میں نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ گناہگاروں کو ختم کیا ہے۔ پھر مجھے یہ یاد ہے کہ میں اتنا رویا تھا کہ میری ہچکی بندھ گئی تھی۔

یاد نہیں آدھی رات گزر گئی تھی یا اس سے زیادہ وقت ہو گیا تھا' میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے ایک بڑا ہی واضح اور صاف خواب دیکھا۔ شام کا دھندلکا ہے معلوم نہیں کون سی جگہ ہے۔ کچی دیوار ہے اس کا چاروں طرف احاطہ ہے درمیان میں صحن ہے اور کچے مکان کے کھنڈر ہیں۔ میں اس صحن میں حیران و پریشان کھڑا ہوں اور باہر نکلنے کا راستہ دیکھ رہا ہوں لیکن وہاں کوئی دروازہ نہیں۔ کھنڈر کی طرف منہ کرتا ہوں تو یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو جاتا ہے کہ ایک بہت بڑا سانپ شاید کھنڈر سے نکل کر آیا ہے اور بالکل میرے قریب آن پہنچا ہے۔ اس کا رنگ مجھے آج تک یاد ہے..... کالا' سارے جسم پر چھوٹے چھوٹے سفید اور منحنی سے دائرے..... وہ سر اٹھا کر پھن پھیلا لیتا ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تجھے ڈسنے کے لئے آیا ہوں اور تو مجھ سے بھاگ نہیں سکے گا۔

میں خوفزدہ ہو کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہوں۔ وہ تیزی سے میرے بالکل قریب آ جاتا ہے اور اُس کا منہ اور اونچا ہو جاتا ہے۔ میں اس خیال سے بائیں طرف کو چل پڑا کہ کھنڈر میں سے بھاگ نکلنے کا راستہ مل جائے گا لیکن سانپ میرے راستے میں آ جاتا ہے۔ پیچھے مڑ کر بھاگنے لگتا ہوں تو سانپ سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔ آواز سنائی دیتی ہے کہ

تُو مجھ سے بھاگ نہیں سکے گا' میں نے تجھے ڈسنا ہی ہے۔

میں اتنا خوفزدہ ہو جاتا ہوں کہ میرا جسم کانپنے لگتا ہے۔ میں آسمان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کو پکارتا ہوں۔ سانپ اور قریب آجاتا ہے اور اب مجھے اس کی پھنکار صاف سنائی دے رہی ہے۔ معلوم نہیں ایک جانور کہاں سے نکل آتا ہے۔ میں نے اسے کسی طرف سے آتے نہیں دیکھا۔ اُسے تو جیسے زمین نے اگلا ہو۔ جانور بھی عجیب قسم کا ہے۔ جسم بالکل بلّی جیسا لیکن منہ نیولے جیسا لمبوترا اور آگے سے نوکیلا ہے۔ وہ پہلے آہستہ آہستہ' دبے پاؤں سانپ کے پیچھے سے اس کی طرف آتا ہے پھر جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لیتا ہے۔ چند لمحوں میں وہ سانپ کو بھنبھوڑ کر اس کا سر اس کے جسم سے الگ کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سارا ماحول بالکل ہی تاریک ہو جاتا ہے۔

مجھے اس جانور کی آنکھیں نظر آتی ہیں اور ان آنکھوں میں روشنی ہے جیسے چھوٹی چھوٹی دو ٹارچیں روشن ہوں۔ جانور دیوار کی طرف منہ کرتا ہے تو اس کی آنکھوں کی روشنی میں دیوار میں مجھے ایک جگہ شگاف نظر آتا ہے۔ میں بڑی تیزی سے اس شگاف میں سے باہر نکل جاتا ہوں۔ اندھیرا اجالے میں بدل جاتا ہے اور میں اپنے آپ کو ایک بلندی پر کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ افق تک ہریالی ہے' درخت اور ٹیکریاں ہیں اور افق پر کئی رنگوں کی شفق ہے اور رنگین بادلوں کے لمبے لمبے ٹکڑے دور تک چلے گئے ہیں اور کچھ بادل ٹیڑھی میڑھی لکیروں جیسے ہیں۔ پھر اندھیرا چھاتا ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔

میں بستر میں سے اٹھ بیٹھا۔ دیا جل رہا تھا۔ میری سانسیں تیز ہو گئی تھیں۔ یہ خواب ایسا حقیقی تھا کہ میں جھونپڑے کی دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا کہ یہ مٹی کی کچی دیواریں ہیں اور یہ بدل کیسے گئی ہیں۔ کچھ دیر بعد میرا ذہن بیدار ہُوا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ میں خواب کو یاد کرنے لگا اور میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ خدائی اشارہ ملا تھا۔ مجھے راستہ مل جائے گا اور میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔

ایک بات اور ہے جس پر شاید کچھ حضرات یقین نہ کریں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہمہ ہی ہو لیکن بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ میری اُس وقت کی ذہنی کیفیت کو سامنے رکھ کر میری یہ بات سنیں۔ میں نے بتایا ہے کہ افق پر بادلوں میں کچھ ایسے بادل تھے جو ذرا چوڑی اور منحنی سی لمبی لکیروں کی طرح تھے۔ آپ نے ایسے بادل دیکھے ہوں گے جو صبح طلوعِ آفتاب کے وقت یا شام غروبِ آفتاب کے وقت افق پر کبھی کبھی نظر آیا کرتے

ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی آیت آسمان پر لکھی ہوئی تھی۔ آج بھی میں یہی کہتا ہوں کہ چھوٹی سی کوئی آیت تھی یا بادل ان الفاظ کی شکل میں ڈھل گئے تھے۔ زیادہ تر خیال یہ ہے کہ یہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ لکھا ہُوا تھا۔ اس کا مطلب آپ جانتے ہیں — "تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے ہی مدد مانگتے ہیں" — میں نے دل میں پہلا عہد یہ کیا کہ اب گناہ کا ذرا سا خیال بھی ذہن میں نہیں آنے دوں گا۔

اب جو میری آنکھ لگی تو اُس وقت کھلی جب اگلے دن کا سورج خاصا اوپر آچکا تھا۔

○

میں باہر نکلا تو وہ آدمی جو میرے کام کاج کیا کرتا اور کھانا پکایا کرتا تھا' باہر بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہُوا اور پوچھا کہ ناشتہ لے آؤں یا میں پہلے غسل کروں گا۔

نہا دھو کر میں نے ناشتہ کیا اور اس آدمی سے کہا کہ وہ وانگ کو بلا لائے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا ذہن خاصا روشن ہو گیا تھا اور دماغ کچھ بہتر طریقے سے سوچنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں نے وانگ کو اس لئے بلایا تھا کہ اسے کہوں گا کہ کچھ آدمی اپنے ساتھ لے آئے تاکہ میں جاپانیوں کی رائفلیں' مشین گن اور ایمونیشن وغیرہ کسی موزوں جگہ چھپا دوں۔ وانگ کے آنے تک میں یہ سوچتا رہا کہ یہ اسلحہ اور ایمونیشن کہاں چھپایا جا سکتا ہے۔ سیدھی بات تھی کہ یہ سب چیزیں دریا میں پھینک دیتے لیکن فوجی ہونے کی وجہ سے میں اتنا اسلحہ اور ایمونیشن ضائع کرنے سے گھبراتا تھا۔ یہ کسی وقت کام آسکتا تھا۔

وانگ آیا تو میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھ رہا تھا کہ اسلحہ چھپا دیا جائے۔ میں نے اسے بتایا کہ جاپانی پھر بھی آسکتے ہیں اور وہ ہم سب کو مار ڈالیں گے اور یہاں کی عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ کوئی ایسا انگریز افسر بھی آنکلے گا جو یہ اسلحہ دیکھ کر ہم پر یہ شک کرے گا کہ ہم جاپانیوں کے حامی ہیں اور جاپانی ہمیں یہ اسلحہ دے گئے ہیں۔ اچھا ہُوا کہ وانگ میری بات سمجھ گیا۔

وہ دس بارہ آدمی اپنے ساتھ لے آیا۔ ان کے پاس دو تین کدالیں بھی تھیں۔ میں نے اسلحہ اور ایمونیشن اٹھوایا اور وہاں ان سب کو لے گیا جہاں چبوترہ بنا ہُوا تھا۔ اس چبوترے کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اسی چبوترے پر میں نے سمیع اللہ کو اس کے ساتھیوں کو گولیاں ماری تھیں۔ یہ چبوترہ چار فٹ سے کچھ زیادہ اونچا تھا۔

میں نے اس کے اردگرد گھوم کر ایک جگہ دیکھ لی اور پھر آدمیوں کو بتایا کہ یہاں سے کھدائی کریں۔ کھدائی چبوترے کے پہلو سے اندر کی طرف کی گئی تھی جیسا کہ گف کھودی جاتی ہے۔ میں نے اس کی کھدائی یوں کرائی کہ زیادہ تر کھدائی زمین میں کی گئی جس طرح کہ قبر کھودی جاتی ہے۔ اس کی لمبائی ایک رائفل کی لمبائی سے فٹ ڈیڑھ فٹ سے زیادہ رکھوائی۔

جب یہ کھدائی مکمل ہو گئی تو میں نے اس کے فرش پر کنکریاں اور پتھر ڈلوا دیئے تاکہ رائفلوں کو زمین کی نمی کا زنگ نہ چڑھے۔ نو رائفلیں اور ایک مشین گن تھی' یہ اس گڑھے میں رکھوا دیں ایمونیشن بھی رکھوا دیا اور کچھ اور چیزیں تھیں جو اسی کے اندر پھینکیں اور چبوترے کی سائیڈ میں یعنی اس گف کا جو دہانہ تھا وہاں گارے سے پتھر چنوا دیئے اور باہر اور بھی پتھر ڈال کر مٹی کا ڈھیر لگا دیا تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے اور بارش کا پانی بھی اس کے اندر نہ جائے۔

میں نے اپنی رائفل اور کچھ ایمونیشن اپنے پاس رکھا اور اس کے علاوہ انگریز پائلٹ کا ریوالور بھی میرے پاس تھا۔

تین چار دن گزر گئے۔ میں نے پہلے کسی باب میں کہا ہے کہ میں یوں سمجھنے لگا تھا جیسے ان ہی لوگوں میں پیدا ہُوا تھا اور میں اسی جنگل کی مخلوق ہوں لیکن اُس رات جو میری ذہنی کیفیت ہو گئی تھی' اس نے میرے ذہن میں ایک تغیر بلکہ ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ میرے اندر یہ سوچیں بیدار ہو گئی تھیں کہ میں اپنی عمر ضائع کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو بھی ضائع کر رہا ہوں۔ کبھی خیال آتا کہ مجھے فوج سے یوں بھگوڑا نہیں ہونا چاہئے تھا اور پھر یہ سوچ آتی کہ میں نے جس مقصد کے لئے جس منزل پر پہنچنے کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا' اس مقصد اور منزل تک مجھے جلدی پہنچنا چاہئے۔ میں نے وانگ سے پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھے دریا کے پار پہنچا دے اور اب مجھے جانے کی اجازت دے لیکن وہ نہیں مان رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی نہیں مانتے تھے۔

چار پانچ دن اسی کشمکش میں گزر گئے۔ اس دوران وانگ ایک بار پھر قصبے میں گیا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن میں اب وہاں جانے سے کچھ گھبراتا تھا۔

ایک روز وانگ کا وہ دوست آ گیا جو قصبے میں رہتا تھا اور جس کے ہاں ہم جا کر رکے تھے اور اس نے شجاع الدین کی کہانی سنائی تھی۔ وہ وانگ کے گھر ٹھہرا تھا۔ دوپہر کھانے

کے بعد وہ اور وانگ میرے پاس آ گئے اور خوب گپ شپ ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ دونوں پیئے ہوئے تھے لیکن اتنی نہیں کہ ان کی زبانیں لڑکھڑا رہی ہوں۔

"آپ فوج کی کس پلٹن میں تھے؟" — وانگ کے دوست نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کو کس نے بتایا ہے کہ میں فوج میں تھا؟" — میں نے ہنستے ہوئے پوچھا اور کہا — "کیا وانگ نے آپ کو میرے متعلق یہ نہیں بتایا تھا کہ میں رنگون میں دکان کرتا تھا اور ایک مسجد میں امامت بھی کیا کرتا تھا!"

"ہاں' یاد آ گیا ہے" — اس نے کہا — "آج وانگ نے مجھے کچھ زیادہ ہی پلا دی ہے"۔

"آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟" — اس نے پوچھا۔

"میں آگرہ کا رہنے والا ہوں" — میں نے جھوٹ بولا اور کہا — "آپ نے شاید آگرہ کا نام سنا ہو گا"۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ کوئی اور بات کر کے پھر میرے متعلق کچھ پوچھ لیتا تھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے کچھ شک ہونے لگا۔ شک یہ تھا کہ وانگ ہی نے بتایا تھا کہ یہ شخص جرائم پیشہ اور معزز قسم کے مجرموں میں سے ہے۔ وانگ نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ شخص فریب کاری اور دھوکہ دہی کا ماہر ہے۔ وہ مانڈلے کا رہنے والا تھا۔ مجھے شک ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اگر اونچے درجے کا جرائم پیشہ ہے تو یہ یقیناً انگریزوں کی انٹیلی جنس کا انفارمر یعنی مخبر ہو گا اور یہ میرے متعلق ہی معلومات حاصل کرنے آیا ہو گا۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا تھا لیکن اس کا انداز ایسا تھا کہ میں اس شک کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

کچھ دیر اور میرے پاس بیٹھ کر وہ رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے وانگ کو اپنے جھونپڑے میں بٹھا لیا۔ وانگ کے متعلق میں بتا دوں کہ اسے میں نے کبھی بھی نہیں کہا تھا کہ میں فوج سے بھگوڑا ہو کر آیا ہوں لیکن وہ کوئی کم عقل آدمی نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں فوجی ہوں کیونکہ جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میں فوج کی وردی میں تھا' میرے پاس فوجی رائفل بھی تھی اور ایمونیشن بھی۔ اس نے کبھی پوچھا بھی نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ میں فوج سے نکل کر آیا ہوں۔ میرے دل پر یہ بوجھ آ پڑا تھا کہ وانگ کے اس دوست نے آج کیوں کرید کرید کر مجھ سے یہ باتیں پوچھی

ہیں۔

"تم اصل حرامزادے ہو!" — میں نے غصے میں وانگ سے پوچھا — "کیا تم نے اسے بتایا ہے کہ میں فوجی ہوں؟"

"نہیں صاحب!" — وانگ نے جواب دیا — "میں نے اسے آپ کی ساری باتیں سنائی تھیں اور جس طرح آپ نے سمیع اللہ کو اور اس کے ساتھیوں کو مارا تھا اور اژدھا کو بھی اور شیر کو بھی مارا تھا' یہ ساری باتیں سنائی تھیں اور یہ بھی سنایا تھا کہ آپ نے جاپانیوں کو اکیلے مار ڈالا تھا۔ یہ سب سن کر میرے دوست نے کہا کہ یہ شخص فوجی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ فوجی نہیں ہے لیکن یہ نہیں مانتا تھا۔ اسی لئے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کون سی پلٹن میں تھے"۔

"تم نے انگریز پائلٹ کے متعلق بھی سنایا ہو گا" — میں نے کہا۔

"ہاں صاحب!" — وانگ نے کہا — "میں نے یہ بھی سنایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ہمارا یہ ہندوستانی ساتھی رنگون میں دکاندار تھا اور مسجد میں امامت بھی کراتا تھا"۔

میں نے وانگ کو بہت گالیاں دیں اور وہ انجان اور معصوم سا بنا ہُوا سنتا رہا۔

"آپ اتنا ناراض کیوں ہوتے ہیں؟" — وانگ نے کہا — "آپ کو کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ ہم کسی پکڑنے والے کو آپ تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے"۔

وانگ کچھ دیر بولتا رہا اور مجھے یقین دلاتا رہا کہ میرے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اور کوئی ایسا خطرہ نہیں لیکن میں کوئی نہ کوئی خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔ میں صاف محسوس کر رہا تھا کہ میرے دل پر ایک بوجھ سا آ پڑا ہے۔ میری ذہنی حالت رات والی تو نہیں تھی لیکن اس کا اثر باقی تھا اور خواب جو میں نے دیکھا تھا' اسے میں بے معنی نہیں سمجھتا تھا۔ میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ یہ خواب کوئی خدائی اشارہ ہے۔

○

اگلی صبح سب سے پہلا جو شخص میرے پاس آیا اس کا نام انگ سون تھا۔ وہ وانگ کا ساتھی تھا اور اسی کی طرح میرا دوست بلکہ مرید بن گیا تھا۔ وانگ باتیں ذرا زیادہ کیا کرتا تھا لیکن انگ سون خاموش طبع تھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی خاص بات ہے۔ پہلے تو میرے منہ کی طرف دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا تھا کہ بات کرے یا نہ کرے۔ میں نے آخر اُس سے پوچھا کہ وہ کس سوچ میں پڑا ہُوا ہے۔

"سوچ رہا ہوں صاحب!" — اُس نے کہا — "بات کروں یا نہ کروں۔ وانگ آپ کا دوست ہے اور آپ اس پر بہت اعتبار کرتے ہیں۔ آپ ناراض نہ ہو جائیں"۔

میں تو چونک پڑا اور اسے کہا کہ وہ فوراً بات کرے اور میں بالکل ناراض نہیں ہوں گا اور اس کی کچھ اور حوصلہ افزائی کی۔

"وانگ پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں" — انگ سون نے کہا — "یہ شخص بہت ہی خودغرض اور لالچی ہے۔ آپ کا دوست صرف اس لئے ہے کہ آپ نے ہمیں بہت سے خطروں سے بچایا ہے اور آئندہ بھی بچا کر رکھیں گے لیکن اب اس کی نیت خراب ہو گئی ہے"۔

میں نے اسے کہا کہ وہ فوراً اصل بات بتائے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی خاص بات کرنے آیا ہے۔ یہ شک مجھے پہلے ہی تھا کہ کچھ نہ کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے یا ہونے والا ہے۔ ہم جب قصبے وون میں گئے تھے تو انگ سون بھی ہمارے ساتھ تھا۔

"ہم وون گئے تھے تو آپ کو دو آدمی ملے" — انگ سون نے کہا — "آپ کو بتایا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے جاسوس ہیں۔ کل وانگ کا دوست یہاں وانگ کے پاس آیا تھا اور دونوں آپ کے پاس بھی آئے تھے۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اس شخص کو ان دونوں آدمیوں نے بھیجا تھا۔..... وانگ اور اس کا یہ دوست آپ کو پکڑوا رہے ہیں۔ وانگ کا دوست یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ آپ فوجی ہیں اور فوج سے بھاگ کر جاپانیوں کے پاس جا رہے ہیں"۔

"تم مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہے ہو انگ سون!" — میں نے کہا — "تم میرے سچّے اور وفادار دوست ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا ہے کہ وانگ اور اس کا دوست مجھے پکڑوانا چاہتے ہیں۔ کیا یہ باتیں تمہارے سامنے ہوئی ہیں؟"

اس نے جو بات سنائی' وہ میں اپنے الفاظ میں تحریر کر رہا ہوں..... میں پیچھے ایک نوجوان برمی لڑکی تانی کا ذکر کر آیا ہوں۔ تانی وہ لڑکی تھی جسے میں نے اژدھا کے منہ میں سے نکالا تھا اور اژدھا کو مار ڈالا تھا۔ یہ لڑکی نئی زندگی پا کر میری ایسی مرید ہوئی کہ میرے آگے سجدے کرتی تھی اور جب وہ میرے جھونپڑے میں آتی تھی تو اس کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے وہ مجھے اپنا آپ اور اپنا حسن و جوانی پیش کر رہی ہو۔ وہ معصوم سی لڑکی خاصی خوبصورت تھی۔ اللہ نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا اور جب پتہ چلا کہ یہ لڑکی ایک

لڑکے کو چاہتی ہے تو میں نے ان کی شادی کرا دی تھی۔ میں اگر سمیع اللہ جیسا ہوتا اور اپنے دین و ایمان سے دستبردار ہو جاتا تو اس لڑکی کو بڑی آسانی سے اپنی بیوی بنا سکتا تھا۔ اسے تو میں خفیہ طور پر داشتہ بھی بنا سکتا تھا لیکن میں آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اسے ایسی نظر سے کبھی بھی نہ دیکھا اور اس کے ساتھ جو نیکی کی تھی وہ اللہ کی خوشنودی کے لئے کی تھی۔

اب مجھے اس نیکی کا اجر مل رہا تھا۔ انگ سون نے مجھے بتایا کہ وانگ کی ایک بہن ہے جو تانی کی بڑی گہری اور رازدار سہیلی ہے۔ وانگ کی یہ بہن خاصی جوان ہو چکی تھی لیکن ابھی تک وانگ نے اس کی شادی کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس لڑکی نے تانی کو بتایا کہ وانگ کا دوست آیا تھا اور دونوں جھونپڑے میں سر جوڑے بیٹھے رہے تھے۔ وانگ کی بیوی اور یہ بہن اپنے کام کاج میں لگی رہیں۔

یہ جھونپڑے کوئی بڑے مکان تو نہیں تھے جن کے کمرے کشادہ اور ذرا دُور دُور ہوتے' وہ تو چھوٹے چھوٹے جھونپڑے تھے جن کے ہر کمرے میں بڑی مشکل سے دو چارپائیاں بچھ سکتی تھیں۔ وانگ کی بہن ساتھ والے کمرے میں تھی تو اسے وانگ اور اس کے دوست کی باتیں سنائی دینے لگیں۔

وانگ کے دوست نے وانگ سے کہا کہ تم یہاں کیوں ذلیل و خوار ہوتے پھر رہے ہو' وہاں میرے پاس آ جاؤ' میں تمہیں ایسے کام پر لگا دوں گا جس میں اچھے بھلے پیسے ملیں گے اور میں تمہیں بڑا اچھا مکان بھی دلا دوں گا۔ وانگ نے اس سے پوچھا کہ کام کیا ہے۔

"جاسوسی..... مخبری!" — دوست نے وانگ کو بتایا — "تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو وانگ! وہ کون سا جرم ہے جو میں نے نہیں کیا۔ میں اب یہاں نیک آدمی تو نہیں بن گیا۔ یہاں میں انگریزوں کے جاسوسی کے محکمے کا مخبر ہوں اور کچھ اور کام کاج کر لیتا ہوں۔ وہاں سے بہت دور آسام کے اندر جا کر کبھی کبھی ڈکیتی کی واردات کر لیتا ہوں یا اپنے آدمیوں سے واردات کرواتا ہوں۔ تم میرے پاس آ جاؤ"۔

"آ جاؤں گا" — وانگ نے کہا — "لیکن میں نے کبھی جاسوسی اور مخبری نہیں کی۔ تم مجھے بتا دینا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے۔ واردات جیسی بھی کہو گے کروں گا لیکن فوجیوں کے لئے کبھی مخبری نہیں کی"۔

"ایک کام کرو" — دوست نے کہا — "یہ کام تم آسانی سے کر لو گے۔ یہ میں

فوج کے جاسوسی کے محکمے کو بتاؤں گا تو تمہیں انعام بھی ملے گا اور تمہیں اچھی تنخواہ پر رکھ لیں گے اور تمہاری عزت بن جائے گی..... یہ جو داڑھی والا ہندوستانی یہاں رہتا ہے اور اُس روز تمہارے ساتھ میرے گھر میں آیا تھا' اسے پکڑوا دو"۔

"نہ بھائی!" — وانگ نے کہا — "اس شخص کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس نے ہمیں کیسے کیسے خطروں سے بچایا ہے"۔

وانگ نے اسے بتایا کہ میں نے یہاں آ کر کیا کچھ کیا تھا اور میرا کردار ان کی جوان لڑکیوں کے سلسلے میں اچھا رہا ہے اور ان کی جان اور عزت کا محافظ بنا ہُوا ہوں۔

"اگر تمہارے پاس رائفل ہوتی اور رائفل کی گولیاں ہوتیں تو یہ سارے کام تم بھی کر سکتے تھے" — دوست نے وانگ سے کہا — "یہ شخص انگریزوں کی فوج سے بھاگا ہُوا ہے۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ یہ جاپانیوں کے پاس جا رہا ہے اور جاپانیوں نے ہندوستان کے فوجیوں کی جو فوج بنائی ہے' یہ اُس میں جائے گا۔ پھر تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے ایک انگریز پائلٹ کو تم لوگوں کے ہاتھوں مروایا تھا اور اس کا ریوالور اس کے پاس ہے۔ تم اسے پکڑوا دو گے تو تمہیں میں انعام بھی دلواؤں گا اور بڑی عزت کی نوکری بھی مل جائے گی..... دیکھو وانگ دون قصبے میں جو آبادی ہے' اس میں دو تین نہیں بلکہ بہت سے لوگ انگریزوں کے مخبر ہیں۔ وہ اس قصبے میں ہی نہیں رہتے بلکہ دُور دُور چلے جاتے ہیں اور کئی خبریں بھی لے آتے ہیں اور مشکوک لوگوں کو پکڑواتے بھی ہیں۔ آسام اور بنگال میں جاپانیوں کے بے شمار جاسوس موجود ہیں۔ فوج سے جو فوجی بھگوڑے ہوتے ہیں اور ہوتے ہی رہتے ہیں' وہ آسام کی طرف نکل جاتے ہیں اور وہاں سے وہ دریا پار کر کے جاپانیوں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ایسا کوئی آدمی پکڑوا دو تو انگریز افسر بہت خوش ہوتے ہیں اور جھولی بھر کر انعام دیتے ہیں..... یہ شکار تو تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

"آ کر اسے پکڑ لو" — وانگ نے کہا — "تم یہ کام مجھ سے کیوں کروا رہے ہو؟"

"تم سمجھے نہیں وانگ!" — دوست نے کہا — "میری تمہاری دوستی بڑی پرانی ہے اور دو موقعوں پر تم نے میری مدد کی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے اس احسان کا تمہیں صلہ دوں۔ میں ملٹری پولیس کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ شکار وانگ نے پکڑا ہے"۔

اس شخص نے وانگ کو اس کام کے لئے [illegible] اور وانگ کو ایسے لالچ دیئے کہ

وانگ کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے' میں اسے پکڑوا دوں گا اور اس کی ساری باتیں بتاؤں گا اور کچھ جھوٹ موٹ باتیں اپنی طرف سے بھی شامل کر دوں گا۔ دوست نے اسے بتایا کہ وہ آج واپس جا کر ان آدمیوں کو بتائے گا جو فوجی جاسوس ہیں۔

وانگ کے دوست کا اشارہ ان دو آدمیوں کی طرف تھا جو مجھے قصبے میں ملے تھے اور انہوں نے مجھے کہا تھا کہ انہوں نے پہلے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ مجھے شکی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ دونوں آدمی میرے ذہن میں ایسے بیٹھے کہ نکل نہیں رہے تھے اور میں انہیں ایک خطرہ سمجھنے لگا تھا۔

اس کے بعد وانگ اپنے اس دوست کے ساتھ میرے جھونپڑے میں آیا تھا۔ اس شخص نے میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ میں سنا چکا ہوں..... یہ باتیں مجھ تک اس طرح پہنچیں کہ وانگ کی بہن نے ساتھ والے کمرے میں رک کر یہ ساری باتیں سنی اور تانی کو سنائیں۔ میں چشمِ تصوّر سے دیکھ سکتا تھا کہ یہ سن کر تانی کس طرح تڑپ اٹھی ہو گی۔ تانی کی نظروں میں میری حیثیت زندگی اور موت دینے والے فرشتے جیسی تھی۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ اپنا آپ مجھ پر قربان کرنے پر تیار رہتی تھی۔ اس نے وانگ کی بہن سے تو کچھ نہ کہا' گھر جا کر اپنے خاوند کو باتیں سنائیں۔ اس کا خاوند میرا مرید اور معتقد تھا۔ میں نے ان کی شادی کروائی تھی۔ میں ان دونوں کے درمیان رکاوٹ بن سکتا تھا لیکن نہ بنا اور ان کی شادی کرا کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔

تانی کے خاوند نے یہ باتیں انگ سون کو سنائیں۔ میرا خیال ہے کہ انگ سون کی اس لڑکے کے ساتھ کوئی رشتہ داری بھی تھی۔ اگر رشتہ داری نہیں تھی تو یہ بات ضرور تھی کہ انگ سون دیانت دار اور بہتر قسم کا آدمی تھا۔ پھر یہ عجیب بات بھی سنیں' شام کے بعد وانگ کی بہن تانی کے گھر گئی اور اسے کہا کہ کسی طرح مجھے خبردار کر دیا جائے اور میں اپنے بچاؤ کا کچھ بندوبست کر لوں۔ تانی نے یہ بات بھی اپنے خاوند کو بتائی اور اس کا خاوند رات پھر انگ سون سے ملا اور اس کے کانوں میں یہ بات بھی ڈال دی کہ وانگ کی اپنی بہن مجھے بچانا چاہتی ہے۔ یہ سن کر مجھے حیران نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس بستی کی تمام عورتیں اور نوجوان لڑکیاں مجھے دیوتا یا کوئی غیبی طاقت والا انسان سمجھتی تھیں۔ انہوں نے سنا تھا اور بعض نے رنگون میں دیکھا بھی تھا کہ جاپانی اچھی اچھی لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ پھر سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں نے اس بستی کی

کسی بھی جوان لڑکی کو نہیں بخشا تھا۔ جس لڑکی کو اشارہ کر دیتے' اس کے والدین خود لڑکی کو سمیع اللہ اور اس کے غنڈوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ نو جاپانی آ گئے تھے تو انہوں نے بستی کی کچھ لڑکیوں کو رات اپنے پاس رکھا تھا اور میں نے جب ان جاپانیوں کو مار ڈالا تو عورتیں مجھے دیکھنے کو آتی تھیں اور سر جھکا لیتیں تھیں جیسے میری پوجا کر رہی ہوں۔ یہ وجہ تھی کہ وانگ کی بہن بھی چاہتی تھی کہ میں اس کے بھائی اور بھائی کے دوست کے جال میں نہ آؤں اور زندہ و سلامت یہاں سے نکل جاؤں..... حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ چاہتا تھا کہ میں بچ کر یہاں سے نکل جاؤں۔

"آپ شاید نہیں جانتے صاحب!" — انگ سون نے کہا — "بستی کی عورتیں آپ کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ دیکھ لیں کہ وانگ کی اپنی بہن چاہتی ہے کہ آپ یہاں سے نکل جائیں..... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ وانگ اور اس کا دوست اگر فوج کی پولیس کو یا کسی کو بھی یہاں آپ کو پکڑنے کے لئے لے آئے تو اس بستی کی ساری آبادی ان کے مقابلے کے لئے نکل آئے گی اور آپ کو ان کے پاس نہیں جانے دے گی لیکن آپ خود سمجھ سکتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہو گا"۔

"ہاں انگ سون!" — میں نے کہا — "میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم لوگ یا ہم سب ان دو چار آدمیوں کو تو مار ڈالیں گے تو پھر یوں ہو گا کہ وہاں سے فوج آ جائے گی اور میرے ساتھ تم سب کو مار ڈالے گی یا پکڑ کر لے جائے گی۔ پھر اس بستی کی جوان لڑکیوں کا خدا ہی حافظ ہو گا..... مجھے بتاؤ کہ کیا کروں!"

"یہاں سے نکل جائیں" — انگ سون نے کہا — "اس بستی کا کوئی شخص' کوئی عورت' کوئی بچہ نہیں چاہتا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں لیکن ہمیں آپ کی زندگی درکار ہے۔ آپ کا چلے جانا بھی ہم برداشت نہیں کر سکتے اور ہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکیں گے کہ آپ کو یہاں سے قیدی بنا کر فوج لے جائے یا یہاں سے آپ کی لاش اٹھائی جائے..... میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ آپ چلے جائیں گے تو اس وانگ کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایسے طریقے سے غائب کروں گا کہ نہ اس کے قاتل کا پتہ چلے گا نہ ہی اس کی لاش ملے گی"۔

"مجھے نکل ہی جانا چاہئے" — میں نے کہا — "لیکن میں نے دریا کے پار جانا ہے۔ دریا کس طرح پار کروں گا؟"

"جاپانیوں کی موٹر بوٹ موجود ہے" — انگ سون نے کہا — "موٹر بوٹ لے کر غائب ہو جائیں"۔

"لیکن میں موٹر بوٹ چلانا تو جانتا ہی نہیں" — میں نے کہا — "اور دریا کی حالت دیکھو سیلاب اتر ہی نہیں رہا۔ کنارے ڈوبے ہوئے ہیں۔ دریا کے درمیان میں لہریں دیکھو کتنی اونچی اونچی اٹھ رہی ہیں"۔

"موٹر بوٹ چلانا کوئی مشکل کام نہیں" — انگ سون نے کہا — "میں آپ کو ابھی وہاں لے جا کر بتا دیتا ہوں کہ موٹر بوٹ سٹارٹ کس طرح کی جاتی ہے اور اسے دائیں بائیں کس طرح موڑا جاتا ہے اور روکا بھی کس طرح جا سکتا ہے۔ میں نے یہ موٹر بوٹ بڑی اچھی طرح دیکھی ہے۔ اس میں تیل کی کمی نہیں۔ بہت دور تک چلی جائے گی۔ یہ موٹر بوٹ اتنی طاقت رکھتی ہے کہ ان بڑی بڑی لہروں کو چیرتی ہوئی پار نکل جائے گی"۔

میں جانتا تھا کہ اب میرے لئے تمام راستے بند ہو گئے ہیں اور پکڑے جانے کا خطرہ سر پر آ گیا ہے۔ ایک ہی راستہ رہ گیا تھا لیکن اس راستے میں بہت ہی چوڑا اور سیلابی دریا حائل تھا۔ میں جس علاقے کا رہنے والا ہوں وہاں کوئی دریا نہیں۔ وہاں برساتی نالے ہیں اور برسات کے موسم میں جب بارش برستی ہے تو ان نالوں میں سیلاب آ جاتا ہے جو چند گھنٹوں بعد ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے سروس میں آ کر جب باہر کی دنیا دیکھی تو کئی ایک دریا دیکھے لیکن برما کا دریائے ایراوتی بہت ہی چوڑا اور خطرناک دریا تھا لیکن مجھے اسی دریا میں سے نکل کر پار جانا تھا یا اسی میں ڈوب کر مر جانا تھا۔ مر جانے کے خیال سے یہ سوچ آئی کہ پکڑے جانے سے بہتر ہے کہ میں موت کو قبول کر لوں۔ موت کے راستے پر جانے سے یہ امید پیدا ہوتی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ میں زندگی کے اگلے کنارے پر پہنچ جاؤں۔

"ٹھیک ہے انگ سون!" — میں نے کہا — "مجھے موٹر بوٹ چلانا سمجھا دو"۔

"آج ہی!" — انگ سون نے کہا — "بلکہ ابھی..... ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں کس وقت آ جائیں۔ آپ نے جو کچھ کرنا ہے وہ آج کر لیں"۔

"ہم دونوں کو اکٹھے دریا تک نہیں جانا چاہئے" — میں نے کچھ سوچ کر کہا — "میں ٹہلتے ٹہلتے اُس جگہ پہنچ جاؤں گا جہاں موٹر بوٹ چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ تم کسی اور

طرف سے وہاں پہنچ جانا..... اب تم چلو"۔

○

انگ سون تو چلا گیا لیکن مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے مجھے سیلابی دریا میں پھینک گیا ہو۔ مجھ پر ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اچانک مجھے گذشتہ رات کا خواب یاد آیا تو میرا حوصلہ ذرا مضبوط ہو گیا۔ خواب یاد نہ آتا تو بھی مجھے اپنا حوصلہ مضبوط کرنا تھا۔ اس کے سوا اب کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ میں نے اللہ کو یاد کیا اور اٹھ کر باہر نکل گیا۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ میں اپنے پیچھے بڑی اچھی یادیں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ اس بستی کے لوگ میرے لئے دعا ہی کریں گے، کوئی یہ نہیں کہے گا کہ چلو اچھا ہوا، ایک بدکار انسان یہاں سے نکلا..... یہ میرا تجربہ ہے کہ ضمیر اور روح پر کسی گناہ اور بدی کا بوجھ نہ ہو تو انسان کی روحانی قوتیں خطرے کے وقت بیدار ہو جاتی ہیں اور انسان معجزے کر کے دکھا سکتا ہے۔

میں خراماں خراماں دریا کی طرف چلا گیا اور ذرا آگے جا کر راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں وغیرہ کی اوٹ میں ہو گیا تاکہ کوئی اور، خصوصاً وانگ مجھے دیکھ نہ لے۔ وانگ دیکھ لیتا تو دوڑتا ہوا میرے پاس آتا اور کہتا تمہارے ساتھ کی خاطر آیا ہوں۔ میں اُس جگہ تک اتر گیا جہاں موٹر بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ انگ سون جلدی ہی پہنچ گیا۔

میں نے یہ موٹر بوٹ پہلے بھی دیکھی تھی اور ایک دو مرتبہ بعد میں بھی دیکھی تھی لیکن غور سے نہیں، ذرا دُور سے ہی اس پر نظر ڈالی تھی۔ اب انگ سون مجھے اس کے اندر لے گیا تب میں نے دیکھا کہ یہ بڑی ہی مضبوط موٹر بوٹ تھی اور یہ جاپانی فوج کی تھی۔ اس کی ایک سائیڈ پر جاپانی زبان کے دو تین الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے یہ تسلی ہو گئی کہ یہ عام قسم کی ماہی گیروں والی بوٹ نہیں۔

"اس میں بڑی طاقت ہے صاحب!" — انگ سون نے کہا — "میرا پکا یقین ہے کہ ان سیلابی موجوں کو یہ کشتی کچھ بھی نہیں سمجھے گی..... یہ دیکھیں، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ اسے کس طرح سٹارٹ کرنا ہے"۔

"انگ سون نے مجھے پہلی بار بتایا کہ وہ ماہی گیر تھا لیکن چھوٹا موٹا ماہی گیر نہیں بلکہ ایسی ہی موٹر بوٹ یا لانچ کرائے پر لے کر سمندر میں دُور تک چلا جاتا اور وسیع پیمانے پر

ماہی گیری کرتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سوئچ آن کر کے اس طرح انجن سٹارٹ ہوتا ہے۔ اس نے انجن سٹارٹ کر کے دکھایا۔

پھر اس نے بتایا کہ موٹر بوٹ چلائی کیسے جاتی ہے۔ میں غور سے سنتا اور سمجھتا رہا۔ اس کی رفتار تیز کرنا بھی اس نے بتایا اور روکنا بھی بتایا۔ میں نے دیکھا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

"یہ موٹر بوٹ ہے صاحب!" — انگ سون نے کہا — "یہ موٹر گاری نہیں۔ موٹر گاڑی ہو تو نئے آدمی کے لئے اسے سیدھا چلانا اور سڑک پر ہی رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور کسی درخت سے یا کسی اور چیز سے ٹکرانے کا خطرہ رہتا ہے لیکن یہ پانی پر تیرنے والی کشتی ہے۔ آپ اس پر قابو نہیں رکھ سکیں گے تو یہ بائیں کو چلی جائے گی یا دائیں کو چلی جائے گی تو جانے دیں۔ گھبرائیں نہیں اور اسے سیدھا کر لیں۔ اس نے کسی چیز کے ساتھ نہیں ٹکرانا' دریا بہت چوڑا ہے اور دریا میں نہ کوئی درخت ہے' نہ بجلی کا کوئی کھمبا ہے اور نہ ہی دوسری ٹریفک ہے۔ اگر یہ کنارے کی طرف چلی جائے تو رفتار کم کر دیں اور سنبھال لیں۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ گھبرانا نہیں"۔

میرے دل پر جو گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی وہ یہ دیکھ کر ہی ختم ہو گئی کہ موٹر بوٹ کو سٹارٹ کرنا اور چلانا' تیز کرنا اور آہستہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور سامنے وسیع دریا ہے جس میں یہ دائیں بائیں ہو بھی گئی تو ٹکرانے کا یا الٹ جانے کا خطرہ نہیں۔ خطرہ صرف یہ نظر آ رہا تھا کہ دریا کے وسط میں موجیں ذرا اونچی اٹھ رہی تھیں اور کہیں کہیں بھنور بھی تھا۔ میں نے انگ سون سے پوچھا کہ بھنور سے بچنا ضروری ہے یا نہیں؟

"بھنور سے بچ ہی جائیں تو بہتر ہے" — انگ سون نے کہا — "بعض بھنور بڑے بھی ہوتے ہیں اور بڑے تیز و تند بھی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھنور موٹر بوٹ کو اپنے چکر میں لے لے۔ آپ کو چونکہ بھنور سے نکلنے کا کوئی تجربہ نہیں اس لئے آپ بھنور سے دُور ہی رہیں۔ اب یہ یاد رکھ لیں کہ جب آپ یہاں سے بوٹ نکالیں گے تو کچھ دُور تک کنارے کے ساتھ ساتھ رہنا تاکہ آپ بڑی موجوں سے بچے رہیں۔ دو تین میل آگے جائیں گے تو دیکھیں گے کہ دریا زیادہ چوڑا ہو گیا ہے۔ وہاں آپ موٹر بوٹ کو ذرا بائیں کر کے ترچھا اگلے کنارے کی طرف لے جائیں۔ یاد رکھیں بالکل سیدھا کنارے کی طرف نہیں جانا کیونکہ سیلاب کا زور زیادہ ہے' ایسا نہ ہو کہ پہلو کی طرف سے ایسی لہر

اٹھے کہ بوٹ کو اوپر اٹھا کر پٹخ دے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ترچھا ہو کر اگلے کنارے تک جائیں۔ دو تین میل دور جا کر کنارے سے لگیں۔ اگر بوٹ لہروں میں سے نہیں نکلتی اور لہریں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہیں تو بھی گھبرانا نہیں۔ ہو گا یہ کہ بوٹ لہروں کے ساتھ اوپر جائے گی پھر نیچے آئے گی لیکن الٹے گی نہیں۔ آپ نے اسے ذرا سا بائیں طرف موڑنا ہے' بالکل ذرا سا۔ اس طرح یہ موجوں اور بڑی لہروں سے نکلتی جائے گی اور آگے کنارے تک آپ کو کوئی لہر نہیں ملے گی۔ کنارہ قریب آ جائے اور آپ یہ ارادہ کر لیں کہ یہاں سے باہر نکلنا ہے تو رفتار بہت کم کر دیں بلکہ رفتار ختم کر دیں اور بوٹ اپنے آپ کنارے تک پہنچ جائے گی اور زور سے ٹکرائے گی نہیں۔ آپ کود کر باہر نکل جائیں"۔

انگ سون نے مجھے جو سبق دینا تھا' دے لیا۔ ہر ضروری ہدایت دے دی اور میں نے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا' تیل کے متعلق پوچھا تو انگ سون نے دیکھ کر بتایا کہ بہت تیل ہے۔ یہ فوج کی موٹر بوٹ تھی اس لئے تیل کی ٹینکی بھری ہوئی تھی۔

انگ سُون جدھر سے آیا تھا اُدھر ہی چلا گیا۔ میں موٹر بوٹ سے نکلا اور واپس چل پڑا۔ اپنے جھونپڑے تک آیا تو وانگ میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ جس طرح ہر صبح مجھے تپاک سے ملا کرتا تھا اسی طرح ملا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن میں نے اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کی ساری سازش کا مجھے علم ہو گیا ہے۔ میں روزمرّہ سے زیادہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے ملا اور ہم دونوں برآمدے میں ہی بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھنے' لیٹنے اور باتیں کرنے کے سوا کوئی کام ہوتا ہی نہیں تھا۔ وانگ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے بتایا کہ ذرا سیر سپاٹے کے لئے دریا تک چلا گیا تھا۔ مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ میں وانگ کو کچھ دھوکا دینا چاہتا تھا۔

"وون کب جاؤ گے وانگ!" — میں نے کہا — "تم مجھے ایک بار وہاں لے گئے تھے تو اب جی چاہتا ہے کہ وہاں بار بار جاؤں۔ یہ قصبہ مجھے بہت ہی اچھا لگا ہے"۔

"جب کہیں گے چلے چلیں گے صاحب!" — وانگ نے کہا — "میرا دوست بھی کہہ گیا تھا کہ مولوی صاحب کو پھر کبھی اپنے ساتھ لے کر آنا"۔

"کل تو نہیں' پرسوں ترسوں چلیں گے" — میں نے کہا — "تمہارا دوست تو مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے"۔

مختصربات یہ کہ میں نے وانگ کے ساتھ ایسی باتیں کیں جن سے اسے ذرا سا بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ میں اس کی سکیم سے واقف ہو چکا ہوں۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھا اور چلا گیا۔

میں جھونپڑے میں چلا گیا اور بستر پر بیٹھ کر یہ سوچنے لگا کہ فوراً یہاں سے نکل جاؤں یا ایک دو دن انتظار کر لوں۔ حقیقت یہ تھی کہ میں دریا سے ڈر رہا تھا اور میرا ذہن فرار اور خود فریبی کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے انگ سون نے میرے آگے جھوٹ بولا ہو۔ جھوٹ بولنے کی یہی وجہ ہو سکتی تھی کہ اس کی وانگ کے ساتھ کوئی دشمنی پیدا ہو گئی ہو اور اسے وہ میری نظروں سے گرانا چاہتا ہو یا اس کا خیال یہ ہو کہ میں کسی وقت بھڑک کر وانگ کو گولی مار دوں۔ میں نے یہ سوچ تو لیا لیکن میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے تصدیق کروا تا کہ انگ سون نے سچ بولا ہے یا اس کی نیت کچھ اور تھی۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ تانی اپنے خاوند کے ساتھ جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور مسکرا کر اشارہ کیا کہ بیٹھ جائیں۔ وہ دونوں میرے سامنے میرے قریب بیٹھ گئے۔ یہ دونوں کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتے تھے اور میں دونوں کے چہروں پر شگفتگی اور مسکراہٹیں دیکھا کرتا تھا لیکن اُس روز دونوں کے چہروں پر اداسی تھی اور سنجیدگی ایسی جو اس عمر میں چہروں پر نہیں آیا کرتی۔ تانی نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور میری طرف سرک آئی۔ اس نے اپنا سر اتنا جھکایا کہ اس کا ماتھا میرے پاؤں پر آ لگا۔ سر اٹھا کر اس نے میرا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا' اسے چوما' پھر آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ اس نے پھر اپنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کا یہ انداز اور حرکتیں ایسی تھیں جیسے میں کسی دیوتا کا بت تھا اور وہ میری پوجا کر رہی تھی۔ اس کی اتنی خوبصورت آنکھیں سرخ ہو گئیں اور پھر ان آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھا۔

اس کے خاوند نے بھی ویسے ہی کیا کہ ہاتھ جوڑ کر میرے پاؤں پر سجدہ کیا اور پھر میرا دایاں ہاتھ پکڑ کر چوما اور آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ مشکل یہ تھی کہ دونوں اردو نہیں جانتے تھے۔ تانی کے خاوند نے اردو کے چند ایک الفاظ کہیں سے سیکھ لئے تھے۔ اس نے یہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے اپنی زبان بولی اور ساتھ اشارے کئے جن سے میں یہی سمجھ

سکا کہ یہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ انگ سون نے مجھے کچھ بتایا ہے یا نہیں۔ انگ سون کا نام تو اس نے تین چار مرتبہ بولا۔

تانی نے اپنی زبان میں بات کرتے ہوئے ہاتھوں سے اشارے کئے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ اس نے وانگ کا بھی نام کئی بار لیا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس کے دل میں وانگ کے خلاف نفرت بھری ہوئی ہے۔

دو انسانوں کی نیتیں صاف ہوں' دلی اور روحانی وابستگی ہو تو اشارے بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ میرا کچھ روحانی رشتہ تھا۔ مجھے خاصی دماغ سوزی کرنی پڑی۔ میں نے کچھ اپنی زبان میں کہا اور زیادہ تر اشارے کئے اور تانی کے خاوند نے اردو کے یہ چند ایک الفاظ اپنی زبان میں جوڑ کر اشارے کئے تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ انگ سون نے مجھے جو اطلاع دی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

کچھ دیر اور بیٹھ کر تانی اور اس کا خاوند ایک بار پھر میرے پاؤں پر سجدہ کر کے اٹھے اور چلے گئے۔ خاوند پہلے جھونپڑے سے نکلا۔ مجھے آج تک وہ لمحے یاد ہیں۔ تانی دروازے میں سے نکلتے نکلتے رک گئی اور اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اداسیوں کا تاثر پہلے سے کہیں زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا اور وہ دروازے سے نکل گئی۔

○

ان کے جانے کے بعد میں پھر اس سوچ میں ڈوب گیا کہ جلدی نکل جاؤں یا ایک دو دن دیکھ لوں۔ انگ سون کہتا تھا کہ میں جلدی نکل جاؤں۔ یہ تو میں فوجی کی حیثیت سے جانتا تھا کہ انٹیلی جنس والوں کو کسی پر شک ہو جائے تو وہ زیادہ انتظار نہیں کیا کرتے تاکہ ان کا مشتبہ اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آج رات نکل جاؤں گا۔ پھر یہ سوچ آئی کہ وہ لوگ اس سے پہلے بھی آ سکتے ہیں۔ مجھے اس کی پیش بندی کر لینی چاہئے۔

میرے پاس اپنی رائفل تھی اور ایمونیشن بھی تھا جو اب تھوڑا رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز پائلٹ کا ریوالور بھی میرے پاس تھا۔ وہ پرانے ٹائپ کی رائفل تھی جسے مارک تھری کہا جاتا تھا۔ اس کی میگزین میں عام طور پر پانچ راؤنڈ ڈالے جاتے تھے لیکن میگزین میں دس راؤنڈ بھی سما جاتے تھے اور گیارہواں راؤنڈ چیمبر میں رکھا جاتا تھا۔ میں نے میگزین میں دس راؤنڈ ڈال لئے اور ایک راؤنڈ چیمبر میں ڈالا اور سیفٹی کیچ بند کر دیا۔

یہ رائفل میں نے اپنے بستر میں تکئے کی طرف چھپا دی۔ بستر فرش پر بچھا ہُوا تھا۔ ریوالور میں چھ گولیاں ڈال کر نیفے میں اڑس لیا۔ میری ذہنی کیفیت ایمرجنسی یعنی ہنگامی حالات والی ہو گئی تھی۔ اب مجھے ایک لمحے کے لئے بھی بے خبر نہیں ہونا تھا۔

دوپہر کے وقت میرا خدمتی آدمی کھانا لے آیا جو میں نے ہیجانی سی کیفیت میں کھایا۔

بمشکل ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ گزرا ہو گا کہ انگ سون میرے جھونپڑے میں داخل ہُوا۔ میں لیٹا ہُوا تھا اور غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ انگ سون کو دیکھ کر میں اٹھ بیٹھا۔

"وہ آ گئے ہیں" — انگ سون نے کہا — "وہ وانگ کے جھونپڑے میں ہیں۔ آپ نکل جائیں یا ان کا انتظار کر لیں کہ وہ آپ کے پاس آتے ہیں یا نہیں لیکن یہ سوچ لیں کہ مصیبت آپ کے سر پر آ گئی ہے"۔

"تم یہاں نہ ٹھہرو" — میں نے کہا — "کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم پر شک کریں کہ تم نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا"۔

انگ سون چلا گیا اور میں اپنے دفاع کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ لوگ ابھی وانگ کے گھر میں ہیں۔ میں یہاں سے کھسک جاؤں اور ان کے آنے تک موٹر بوٹ سٹارٹ کر کے دریا میں چلا جاؤں لیکن اس میں یہ خطرہ نظر آیا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں ابھی دریا سے دور ہی ہوں تو وہ مجھے دیکھ لیں یا کوئی مخبر انہیں بتا دے کہ میں دریا کی طرف جا رہا ہوں۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ انٹیلی جنس کے وہ دو آدمی خالی ہاتھ نہیں ہوں گے، ان کے پاس ریوالور ہوں گے جو انہوں نے کپڑوں کے اندر چھپائے ہوں گے۔ وہ جب مجھے بھاگتا دیکھیں گے تو پیچھے سے مجھ پر فائر کھول دیں گے۔ موٹر بوٹ پر سوار ہو جانے کی صورت میں تو میں ان کے لئے بڑا آسان ٹارگیٹ بن سکتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے پر آ کر مجھے مار سکتے تھے۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ انہیں آنے دیا جائے۔

انگ سون سے میں نے پوچھ لیا تھا کہ وہ کتنے آدمی ہیں۔ اس نے بتایا کہ دو تو وہ آدمی ہیں جو مجھے قصبے میں ملے تھے۔ وہ تو ڈیل ڈول سے ہی فوجی لگتے تھے۔ وہ تھے ہی ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی۔ ان کے ساتھ وانگ کا دوست تھا۔ مجھے تو یہ توقع تھی کہ وہ دو چار ملٹری پولیس کے آدمیوں کو بھی ساتھ لائیں گے لیکن میں سمجھ نہ سکا کہ وہ ملٹری پولیس کو کیوں نہیں لائے تھے۔ وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میں اکیلا تھا اور مجھے دھوکا دینے کے لئے وانگ ان کے ہاتھوں میں کھیل رہا تھا اور مجھ پر قابو پانے کے لئے وہ خود ہی کافی

تھے۔

میں انہی سوچوں میں الجھا ہُوا لیٹ گیا۔ غنودگی بالکل ہی غائب ہو چکی تھی۔ یہ تو اللہ کی ذات ہی بتا سکتی تھی کہ آنے والا وقت میرے لئے کیا لا رہا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا اور میں کس انجام کو پہنچوں گا..... وہ وقت اچانک اور فوراً آ گیا جیسے ایک دھماکہ ہوا ہو۔ پہلے مجھے جھونپڑے کے باہر قدموں کی آہٹیں سنائی دیں جو بڑی تیزی سے بڑھتی ہوئی جھونپڑے کے اندر آ گئیں۔

آگے وانگ تھا جسے دیکھ کر میں اُٹھ بیٹھا۔ اس کے پیچھے وانگ کا دوست تھا اور اس کے پیچھے وہ دو آدمی تھے جو مجھے قصبے میں ملے تھے اور دونوں انٹیلی جنس کے آدمی تھے۔ میں کھڑا ہو گیا اور ان سب سے ہاتھ ملایا۔ ان چاروں کا انداز ایسا دوستانہ تھا جیسے میرے ساتھ گپ شپ لگانے کے لئے آئے ہوں۔ انٹیلی جنس کے آدمی تو دوستوں کی طرح ہنس رہے تھے۔

"مولانا!" — ان میں سے ایک نے کہا — "آپ سے ملنے کو دل بڑا ہی بے تاب تھا۔ آپ کے اس دوست سے کہا کہ ہمیں اپنے ساتھ لے چلے۔ ہم اس کے مشکور ہیں کہ یہ ہمیں اپنے ساتھ لے آیا ہے"۔

"میں آپ کا بہت مشکور ہوں" — میں نے کہا — "آپ نے میری عزت افزائی کی..... تشریف رکھیں..... میرے پاس چارپائی نہیں، کرسیاں نہیں، آپ کو فرش پر بٹھاتے مجھے شرم سی محسوس ہو رہی ہے"۔

میں نے انہیں یہ نہ کہا میرے بستر پر بیٹھ جائیں کیونکہ میں نے بستر میں تکئے کی طرف رائفل چھپا رکھی تھی۔ وہ چاروں فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ مجھ سے خیر خیریت پوچھی اور انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میری محبت کے مارے یہاں آئے ہیں۔ وہ دونوں باری باری باتیں تو میرے ساتھ کر رہے تھے لیکن ان کی نظریں جھونپڑے میں یوں گھوم پھر رہی تھیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔

"آپ غالباً آگرہ کے رہنے والے ہیں" — ان میں سے ایک نے کہا — "جنگ ختم ہو تو کبھی آگرہ تاج محل دیکھنے آئیں گے۔ آپ اپنا وہاں کا ایڈریس دے دیں تو ایک آدھ دن آپ کے ہاں بھی ٹھہریں گے"۔

"بسم اللہ!" — میں نے کہا — "یہ تو میرے لئے ایک اعزاز ہو گا۔ ایڈریس

دے دوں گا۔ آپ آئیں تو سہی"۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ کس سازش کے تحت آئے ہیں۔ اس لئے میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ یہ جو باتیں کر رہے ہیں یہ محض میرے دل کے بہلاوے کے لئے کر رہے ہیں۔ جھونپڑے کا ایک کمرہ اور بھی تھا جو ان کی پیٹھ پیچھے تھا۔ وہ بار بار اس کمرے کی طرف دیکھتے تھے۔

"آپ نے غالباً" رائفل بھی رکھی ہوئی ہے!" — ایک نے کہا۔

"رکھی ہوئی تھی" — میں نے کہا — "دریا میں پھینک دی ہے"۔

"کیوں؟" — اس نے پوچھا — "دریا میں کیوں پھینک دی ہے؟"

"یہاں جاپانیوں کی ایک پارٹی آ چکی ہے" — میں نے کہا — "پھر گورا رجمنٹ کی ایک پیٹرول پارٹی بھی آئی تھی۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کوئی اور پارٹی آ گئی تو میرے پاس فوجی رائفل دیکھ کر مجھ پر فوجی ہونے کا شبہ نہ کر دے۔ میں نے یہ رائفل رنگون کی ایک گلی سے اٹھائی تھی۔ اپنا ایک فوجی مارا گیا تھا۔ میں نے چونکہ وہاں سے نکلنا تھا اس لئے رائفل اور اس کا ایمونیشن وہاں سے اٹھا لیا۔ اب سوچا کہ میں ایک دکاندار اور پھر امام' میں نے رائفل کو کیا کرنا ہے۔ کچھ دن ہوئے رائفل دریا میں پھینک دی تھی"۔

میں جانتا تھا کہ میں جو بیان دے رہا ہوں اس پر انہیں یقین نہیں آئے گا۔ وانگ نے انہیں میرے متعلق سب کچھ بتا رکھا تھا۔ میرے منہ میں جو کچھ بھی آتا' میں کہہ دیتا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اپنے دفاع کے لئے کون سی چال چلوں۔ ابھی تو میں دیکھ رہا تھا کہ یہ کیا کارروائی کریں گے۔ میری جوابی کارروائی ان کی کارروائی کے مطابق ہونی تھی۔

"آپ نے دیکھا ان کا جھونپڑا کتنا خوبصورت ہے؟" — وانگ کے دوست نے دوستانہ انداز میں کہا — "ادھر دیکھیں' اس کا دوسرا کمرہ بھی ہے"۔

"آپ دیکھنا چاہیں تو یہ کمرہ بھی دیکھ لیں" — وانگ نے کہا — "یہ کمرہ تو اس سے بھی زیادہ صاف ستھرا اور اچھا ہے"۔

میں سمجھ گیا کہ وانگ اور اس کا دوست انہیں دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتے ہیں۔ ابھی ان کا انداز دوستوں جیسا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد یہ ریوالور نکال لیں

گے اور مجھ پر تان کر کہیں گے کہ میں یہ کہہ دوں کہ میں انڈین آرمی کا بھگوڑا ہوں اور اس کے بعد یہ مجھے ساتھ لے جائیں گے۔ وہ شاید میری رائفل ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ تو تلاشی میں بھی رائفل لے سکتے تھے لیکن مجھے جھوٹا ثابت کرنے کے لئے وہ جان گئے تھے کہ میں نے رائفل چھپا رکھی ہے اور کہیں نہ کہیں پڑی مل جائے گی۔

وہ چاروں اٹھے اور ایک دوسرے کے پیچھے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں تیزی سے اٹھا' تکیئے کی طرف بستر کے نیچے میری رائفل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے رائفل نکالی اور دبے پاؤں دوسرے کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑا لیکن ایک طرف ہو کر رُک گیا۔ اس کمرے سے مجھے ہلکی سی یعنی سرگوشی کی آواز سنائی دی — "اس کی رائفل دیکھو کہاں ہے"۔

"رائفل یہاں ہے" — میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا — "پیچھے دیکھو۔ ....اچھی طرح دیکھ لو"۔

میں نے سیفٹی کیچ آگے کر کے رائفل کاک کر لی تھی۔ وہ چاروں دوسرے کمرے کی سامنے والی دیوار تک پہنچ گئے تھے۔ چھوٹا سا تو کمرہ تھا۔ میرا خیال ہے بمشکل پانچ گز لمبا ہو گا۔

"چاروں دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ" — میں نے کہا — "ہاتھوں کو ذرا سی بھی حرکت نہ ہو۔ کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو رائفل سے گولی نکل جائے گی..... میں فوجی ہوں۔ ایک سیکنڈ میں چار گولیاں ٹھکانے پر فائر کرنا جانتا ہوں"۔

"مولانا!" — اٹیلی جنس والے ایک آدمی نے کہا — "یہ آپ ہمارے ساتھ کیا مذاق کر رہے ہیں؟"

"یہ میرے دوست وانگ سے پوچھیں" — میں نے کہا — "یہ تم سب کے ساتھ ہی جائے گا..... کیوں وانگ! تم تو بڑے عقلمند بنے پھرتے تھے لیکن ذرا سے لالچ اور ان لوگوں کے دھوکے میں آ کر تم دوستی بھی بھول گئے۔ تمہاری کنواری بہن کو میں جب چاہتا اس جھونپڑے میں پوری رات رکھ سکتا تھا لیکن میں نے تم لوگوں کی عزتوں کی حفاظت کی ہے لیکن تم وہی سانپ نکلے جو درختوں پر رہتا ہے اور دھوکے میں ڈس لیتا ہے"۔

"آپ کس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں صاحب؟" — وانگ نے کھسیانہ سا ہو کر کہا

—— "معلوم ہوتا ہے آپ کو کسی نے کوئی غلط خبر سنادی ہے"۔

میں مخاطب تو وانگ سے تھا لیکن میری نظران چاروں پر لگی ہوئی تھی۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے کے ساتھ اور اس کی نالی ان کی طرف تھی۔ انٹیلی جنس کے ایک آدمی کو میں نے دیکھ لیا۔ وہ نہایت آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ اپنے بینے کی طرف لے جا رہا تھا۔ اس نے بلکہ ان دونوں نے ذرا ٹنگ سے پاجامے پہن رکھے تھے اور ان کے اوپر لمبی قمیضیں تھیں۔ وہ اپنے آپ کو سویلین ظاہر کرتے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ اوپر کو حرکت کرتے دیکھا تو بڑے آرام سے اسے شست میں لیا اور ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے سے بھونچال آ گیا۔ وہ آدمی دو تین سیکنڈ کھڑا رہا۔ اس کے سینے سے خون پھوٹا پھر وہ گھٹنوں کے بل ہوا اور ایک طرف کو لڑھک گیا۔ گولی یقیناً" اس کے دل میں لگی تھی۔ اسی لئے اس کی آنکھیں جلدی پتھرا گئی تھیں ورنہ گولی سینے سے پار ہو جائے تو بھی آدمی اتنی جلدی نہیں مرتا۔

باقی تینوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وانگ کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ مجھے دوستی کا واسطہ دے کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے رائفل اس کی طرف کر کے ٹریگر دبایا۔ ایک دھماکہ اور ہُوا۔ فاصلہ پانچ گز بھی نہیں تھا۔ گولی اس کی پیشانی سے داخل ہوئی اور کھوپڑی میں سے نکل گئی۔ وہ گرا' ذرا دیر تڑپا اور ختم ہو گیا۔

باقی وانگ کا دوست اور انٹیلی جنس کا جوان رہ گئے تھے۔ دونوں نے اکٹھے ہی بولنا بلکہ گڑگڑانا شروع کر دیا۔ میرے پاس ایسی کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان دونوں کو میں بخش دیتا۔ میں نے تو یہاں اب رہنا ہی نہیں تھا۔

انٹیلی جنس کے جوان نے غالباً" یہ سوچا ہو گا کہ مرنا تو ہے ہی' کیوں نہ وہ اپنے دفاع کے لئے کچھ کرے۔ اسے اپنے متعلق غالباً" یہ خوش فہمی تھی کہ وہ بڑی تیزی سے ریوالور نکال کر مجھ پر گولی چلا لے گا۔ وہ بڑی ہی تیزی سے ہاتھ قمیض کے اندر لے گیا اور اس کے ساتھ ہی میری رائفل نے ایک گولی اور اگلی جو اُس کے سینے میں بھی نہ لگی اور سر میں بھی نہ لگی بلکہ درمیان میں ٹھوڑی کے نیچے لگی اور شہ رگ میں سے پار ہو گئی۔ وہ آخر فوجی تھا اور جوان بھی تھا۔ اس نے گولی کھا کر بھی ریوالور نکال لیا۔ میں نے اس کا وہ ہاتھ سیدھا نہ ہونے دیا۔ رائفل ذرا نیچے کر کے اس کے ہاتھ کو شست میں لیا اور گولی چلا دی۔ اس وقت اس کا ہاتھ اس کی ناف کے قریب تھا۔ گولی اس کے ہاتھ میں

سے نکل کر اس کی ناف سے بھی پار ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور گر پڑا اور پھر وہ اپنے ساتھی کی لاش پر گرا۔

اب وانگ کا دوست رہ گیا تھا۔ وہ مولانا مجھے معاف کر دو' کہتا ہُوا میری طرف دوڑا۔ میں نے اس پر گولی نہیں چلائی بلکہ بیونٹ فائٹنگ (سنگین بازی) کے طریقے سے رائفل کا بٹ نیچے کیا اور بٹ کو کہنی کے نیچے لے گیا۔ وہ شخص ایک قدم میرے قریب آ گیا تھا۔ اُس نے میرے قدموں میں گرنا تھا لیکن میں نے جمپ لے کر بٹ جو میری کہنی کے نیچے تھا' پوری طاقت سے اس کے منہ پر مارا۔ یہ چوٹ کوئی کتنا ہی سخت جان کیوں نہ ہو' برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ شخص چوٹ کھا کر پیچھے ہٹا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا۔ مجھے اس پر ایسا غصہ تھا کہ میں نے اسے گولی مارنے کی بجائے پیچھے ہٹ کر اور وہاں سے جمپ لے کر سنگین اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا پھر گرا۔ میں نے سنگین کھینچی اور پھر جمپ لے کر اس کے سینے میں اتار دی۔ اسی طرح ایک بار اور سنگین اس کے سینے میں اتاری اور کھینچ لی۔

میں نے انٹیلی جنس کے دونوں جوانوں کی قمیضیں سامنے سے ہٹا کر دیکھا۔ دونوں نے بنیانوں میں ریوالور اڑسے ہوئے تھے۔ یہ ریوالور میرے کسی کام نہیں آ سکتے تھے لیکن یہ خیال آ گیا کہ میں جاپانیوں کے پاس جا رہا ہوں' یہ ریوالور ساتھ لے چلوں اور انہیں دے کر کہوں گا کہ یہ میں نے انٹیلی جنس کے دو آدمیوں کو مار کر لئے تھے۔ انگریز پائلٹ کے ریوالور بھی میرے پاس تھا۔

میں نے دونوں کے ریوالور نکال لئے۔ چاروں آدمی جو مجھے پکڑ کر ساتھ لے جانے آئے تھے' مر چکے تھے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں ان سے بچ گیا۔ آج اگر کوئی مجھے کہے کہ میں کسی کو اس طرح مار ڈالوں تو میں اس کے تصوّر سے ہی کانپ اٹھوں گا۔ وہ ماحول کچھ اور تھا۔ وہاں کوئی قانون اور کوئی ضابطہ نہیں تھا۔ قانون اس کا تھا جس کے ہاتھ میں رائفل یا مشین گن تھی۔ چونکہ داؤ میرا چل گیا تھا اس لئے میں نے چاروں کو مار ڈالا۔ وہ کسی غلط فہمی یا اس خوش فہمی میں مارے گئے کہ وہ چار ہیں اور میں اکیلا ہوں اور بے خبر بھی ہوں۔ بہرحال مَیں نے کبھی بھی اپنے آپ کو ہیرو نہیں سمجھا۔ اللہ کا شکر قدم قدم پر ادا کیا ہے جس کی ذاتِ باری نے میری عقل کو روشنی دی اور میں نے دشمن پر قابو پا لیا۔

مجھے اب وہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے تھا۔ انٹیلی جنس کے یہ دو جوان آدمی اپنی مرضی سے میری بستی میں نہیں آئے تھے۔ فوج کا ایک ڈسپلن اور ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے دفتر میں یہ رپورٹ دی ہوگی کہ وہ فلاں آدمی کے ساتھ فلاں جگہ ایک مشکوک آدمی کو پکڑنے کے لئے جا رہے ہیں۔ انہیں رات تک واپس چلے جانا تھا۔ نہ جانے کی صورت میں ان کے اوپر والوں کو پریشانی لاحق ہونی تھی اور انہوں نے کچھ فوجی یہاں بھیجنے تھے کہ دیکھیں وہ دو آدمی کہاں غائب ہوگئے ہیں۔ یہ سب کچھ سوچ کر میرا بہت جلدی وہاں سے نکل جانا میرے لئے بہتر تھا۔

میں نے سویلین کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ میری فوجی پتلون اور قمیض میرے پاس موجود تھیں۔ میں نے سویلین کپڑے اتار کر وردی پہن لی۔ فوجی چپل جو پشاوری چپل جیسے تھے، پہن لئے۔

میں جب جھونپڑے سے باہر نکلا تو میں نے تین ریوالور پتلون میں اُڑسے ہوئے تھے اور رائفل کندھے سے لٹکا رکھی تھی۔ گولیوں کے دھماکے سن کر بستی کی ساری آبادی باہر نکل آئی تھی۔ جھونپڑے کے سامنے عثمان کھڑا تھا اور اس کے ساتھ انگ سون تھا اور ان کے پیچھے چار پانچ سرکردہ آدمی کھڑے حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے عثمان اور انگ سون کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پاس آجائیں۔ میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ انگ سون نے مجھے پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ وانگ کے رشتہ دار یا دوست انگ سون کے دشمن بن جائیں۔

"کیا ہُوا صاحب؟" — عثمان نے پوچھا — "یہ گولیاں کس نے چلائی تھیں؟ کیوں چلائیں تھیں؟"

"یہ لوگ مجھے پکڑنے آئے تھے" — میں نے جواب دیا — "میرا داؤ چل گیا اور میں نے وانگ، اس کے دوست اور ان کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمیوں کو گولی مار دی ہے۔ یہ سب انگریزوں کے جاسوس تھے۔ انہیں وانگ اپنے ساتھ لایا تھا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ انہوں نے وانگ کو انعام کا لالچ دیا تھا۔ اب میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ آپ نے مجھے بہت عزت اور محبت دی ہے لیکن وانگ دھوکا باز نکلا۔ میرا اللہ آپ سب کی حفاظت کرے گا۔ اگر زندگی ہوئی تو ہو سکتا ہے

کہ پھر کبھی ہماری ملاقات ہو"۔

میں نے ان دونوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عثمان اور انگ سون نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں بہت جلدی میں تھا۔ ملٹری پولیس کے آنے کا خطرہ تھا۔ عثمان نے کہا کہ میں نہ جاؤں لیکن میں نے اسے صرف اتنا ہی کہا کہ اب میں مجبور ہوگیا ہوں۔ اتنا کہہ کر میں وہاں سے چل پڑا اور وہ لوگ وہیں کھڑے رہے۔

میں راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں کی طرف ہوگیا۔ کچھ دُور پہنچ کر پیچھے دیکھا۔ بستی کے لوگ وہیں کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے رک کر اور پیچھے مُڑ کر دونوں بازو بلند کر کے لہرائے۔ سب نے اپنے بازو اسی طرح لہرا کر مجھے الوداع کہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں سے رخصت ہو کر مجھے اچھا خاصا افسوس ہُوا تھا۔ ان کے ساتھ زندگی کے بہت سے دن بڑے ہی سکون اور پیار سے گزرے تھے۔

یہ زمین جو دریا تک جاتی تھی کچھ ڈھلانی تھی۔ میں کچھ اور آگے گیا اور پیچھے دیکھا تو مجھے سوائے درختوں اور جھاڑیوں کے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بستی اور بستی والے نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔ میں اور آگے بڑھا تو اچانک ایک جھاڑی کو بڑی زور کی حرکت ہوئی۔ میں چونک کر رک گیا اور کندھے سے رائفل اتارنے لگا لیکن میرا ہاتھ وہیں رک گیا کیونکہ جھاڑی کے پیچھے سے دو لڑکیاں اٹھی تھیں۔ ایک تانی تھی اور دوسری وانگ کی بہن۔

وہ پہلو بہ پہلو چپ چاپ کھڑی مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے گرفتاری سے بچانے والی یہ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ میری زبان نہیں سمجھتی تھیں اور میں ان کی نہیں سمجھتا تھا۔ میں بازو پھیلا کر ان کی طرف بڑھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئیں اور میرے بازوؤں میں سمٹ گئیں۔ میں نے انہیں بڑی زور سے اپنے ساتھ لگا لیا اور کچھ دیر اپنے بازوؤں میں لئے رکھا۔ ان کی جوانی اور ان کا حسن مجھے آج بھی یاد ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اُس وقت میری ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا تھی۔ میں نے اُن دونوں کو بازوؤں میں لے کر اپنے گال باری باری ان کے سروں پر رکھے۔ ان کے ریشمی بالوں نے مجھے عجیب سا سکون دیا۔

مجھے محسوس ہُوا کہ دونوں سسک رہی ہیں۔ میں نے انہیں اپنے بازوؤں سے نکالا، ان کے سروں پر، پھر چہروں پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ ان دونوں نے مجھے نئی زندگی دی ہے

اور میں ان کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا..... وہ چپ چاپ مجھے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ میری زبان سے نکلا ہُوا ایک بھی لفظ نہیں سمجھ سکتیں لیکن میں نے دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں جان گیا تھا کہ یہ کسی اور طرف سے آکر یہاں چھپ گئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں اُن کے آدمیوں کو مار کر موٹر بوٹ تک جاؤں گا۔

انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار زبان سے نہیں آنسوؤں سے کیا۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا کہ میں جلدی میں ہوں۔ میں نے ایک بار پھر بازو پھیلائے تو وہ مقناطیس کی طرح کھچی ہوئی میرے ساتھ آ لگیں اور پھر میں ان سے رخصت ہُوا۔ دور آگے جا کر میں نے پیچھے دیکھا وہ وہیں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بازو لہرائے تو انہوں نے بھی بازو لہرا کر مجھے رخصت کیا۔ وہاں سے میں دوڑتا ہُوا نیچے گیا۔ جب میں موٹر بوٹ تک گیا اور اوپر دیکھا تو لڑکیاں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی موٹر بوٹ کا رسّہ کھولا جو قریب کے ایک درخت کے ساتھ بندھا ہُوا تھا۔ میں نے رسّہ موٹر بوٹ میں پھینکا اور کود کر بوٹ میں چلا گیا۔

○

بوٹ پہلی ہی ٹرائی میں سٹارٹ ہو گئی۔ میں نے بڑی احتیاط سے وہیل کو سنبھالا اور بوٹ کو وہاں سے نکال کر لے آیا جہاں چھپا کر رکھی تھی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ موٹر بوٹ کے وہیل پر کھڑا ہُوا تھا اور یہ بھی پہلا موقع تھا کہ میں اتنے زیادہ سیلابی اور اتنے زیادہ چوڑے اور منہ زور دریا میں اترا تھا۔ میں نے انگ سون کی ہدایت کے مطابق بوٹ کو دریا کے کنارے کے ساتھ رکھا لیکن اتنا قریب بھی نہیں کہ بے قابو ہو کر کنارے سے ٹکرا جاتی۔ کنارے کے ساتھ ساتھ پانی پُرسکون تھا۔ مجھے فائدہ یہ حاصل تھا کہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ جانا تھا۔ اگر کہیں انجن بند ہو جاتا یا تیل ختم ہو جاتا تو بوٹ نے رکنا نہیں تھا۔

میں نے رفتار تیز کر دی۔ بہت دور تک دریا کا کوئی موڑ نہیں تھا۔ میں نے وہیل کو اچھی طرح سنبھالے رکھا اور بوٹ کو دائیں بائیں نہ ہونے دیا۔ مجھے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ منزل تو بعد کی بات تھی، میں جب دریا کی طرف دیکھتا تھا تو کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی تھی۔ دریا کے وسط میں ایسی

منہ زور موجیں اٹھ رہی تھیں جنہیں پار کرنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ سیلاب کا ایسا شور کہ بوٹ کے انجن کی آواز اس میں دب گئی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق میں دو میل سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کر چکا تھا۔ آگے معمولی سا موڑ تھا لیکن ایسا نہیں تھا کہ میں گھبرا جاتا یا رفتار کم کرتا۔ یہ موڑ مُڑنے کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ میں اس موڑ سے آگے نکل گیا تو مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کوئی چیز بوٹ کے نیچے لگ رہی ہے اور بوٹ کا پیندا کہیں سے رگڑا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بوٹ کی رفتار اتنی نہیں رہی جتنی میں نے کر رکھی تھی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو بوٹ کے پیچھے مجھے کیچڑ سا اُڑتا نظر آیا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ بوٹ کنارے پر چڑھ گئی ہے اور کنارہ دریا میں دبا ہُوا ہے۔ دائیں طرف مجھے کوئی کنارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بوٹ کا پروپیلر پیچھے سے زمین پر لگ رہا تھا بلکہ اس نے زمین کو کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے وہیل کو فوراً بائیں طرف کیا اور پھر پیچھے دیکھا تو اب کیچڑ نہیں اُڑ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی بوٹ بہت تیز ہو گئی۔ تب مجھ کو عقل آئی کہ میں تو زمین پر بہت ہی کم گہرے پانی پر بوٹ چلاتا رہا ہوں۔ اب مجھے اور زیادہ محتاط ہونا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ کوئی بڑا پتھر نہیں آ گیا تھا ورنہ وہ پروپیلر کا ایک آدھ بلیڈ توڑ دیتا یا تینوں بلیڈوں کو ٹیڑھا کر دیتا۔ میں دراصل دریا کے وسط میں جانے سے گھبرا رہا تھا جہاں پانی کا جوش بڑا ہی ڈراؤنا تھا۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور بوٹ کو وسط کی طرف لے گیا اور وہاں سے اس کو سیدھا کر لیا۔ انگ سون نے بتایا تھا کہ آگے جا کر پاٹ بہت چوڑا ہو جائے گا لیکن ہُوا یہ کہ آگے پاٹ اور زیادہ تنگ ہو گیا اور دونوں طرف چٹانیں نظر آنے لگیں۔ وہاں تو پانی کا اس قدر جوش تھا جیسے یہ بوٹ کو نگل ہی لے گا۔ دوسری دشواری یہ تھی کہ وہاں دریا کا موڑ زیادہ تھا۔

میں نے اس جوشیلے اور خطرناک پانی سے نکل جانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ بوٹ کی رفتار اور تیز کر دی۔ چونکہ یہاں پاٹ خاصا تنگ تھا اور کناروں پر چٹانیں دریا کو روکے ہوئے تھیں اس لئے وہاں دائیں سے بائیں تک موجیں اٹھ رہی تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے یہ پانی کی موجیں نہیں بلکہ گدلے پتھروں کی چٹانیں کھڑی ہیں۔ وہاں تو سیلاب کا زور اور زیادہ بلند اور خوفناک ہو گیا تھا۔

میری حالت اب یہ تھی کہ بوٹ بہت ہی تیز تھی اور آگے چٹانوں جیسی موجیں تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے میں خود کشی کرنے کی نیت سے چٹانوں سے ٹکرانے جا رہا ہوں۔ بوٹ جب وہاں تک پہنچی تو اتنی اونچی موج یا لہر کو کاٹ کر نکل جانے کی بجائے اوپر چلی گئی۔ میرے ہاتھ سے وہیل چھوٹ گیا اور میں پیچھے جا گرا۔ پانی اس طرح اوپر سے بوٹ میں آیا جیسے بوٹ پانی کے اندر چلی گئی ہو اور ساری کہانی ہی ختم ہو گئی ہو۔

بوٹ اوپر جا کر نیچے کو گری۔ میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے میں یوں آگے کو پھینکا گیا کہ میرا سینہ وہیل کے ساتھ جا لگا اور پسلیوں پر اچھا خاصہ دباؤ پڑا۔ چند سیکنڈ کے لئے تو میرا دم گھٹ گیا۔ بوٹ ایک بار پھر اسی طرح اوپر گئی اور میں پھر پیچھے جا پڑا۔ پھر وہی عمل دوہرایا گیا کہ میں پیچھے سے جھٹکا کھا کر وہیل پر جا پڑا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ میں وہیل سے پیچھے جا پڑا تھا' اگر میں وہیل کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ دائیں یا بائیں مڑ جاتا اور بوٹ تیزی سے ایک طرف مڑتے اُلٹ جاتی۔ دریا نے خود ہی بوٹ کو اپنے قابو میں بلکہ اپنے رحم و کرم پر رکھا تھا۔

چار مرتبہ ایسے ہی ہوا اور میرا جسم اس طرح ہو گیا جیسے کسی بہت بڑی طاقت نے مجھے اٹھا اٹھا کر پتھروں پر پھینکا ہو۔ میرا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا۔

کچھ دیر کے لئے تو مجھے نظر ہی کچھ نہ آیا۔ موجوں کا پانی بڑی زور سے میری آنکھوں میں پڑا تھا۔ میں نے آنکھیں ملیں اور اب جو سامنے دیکھا تو دریا بائیں کو مڑ رہا تھا اور آگے انگ سون کے کہنے کے مطابق پاٹ بہت ہی چوڑا ہو گیا تھا۔

آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں۔ بوٹ بڑی ہی تیز رفتاری سے جا رہی تھی اور بمشکل بیس پچیس گز دور مجھے کالی سی کوئی بہت بڑی چیز دریا میں سے ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ آپ نے تصویروں میں وہیل مچھلی دیکھی ہو گی۔ بالکل ایسے لگا جیسے یہ وہیل مچھلی ہو۔ بوٹ نے وہاں تک پہنچتے چند سیکنڈ ہی لئے ہوں گے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو دریا میں سے ابھری ہوئی چٹان ہے۔ میں اُس چٹان تک پہنچ گیا تھا۔ اگر میں سنبھل نہ جاتا تو اس رفتار سے بوٹ اس چٹان سے ٹکراتی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی اور میں اس ٹکر سے کبھی زندہ نہ بچ سکتا۔ میری لاش بھی نہ ملتی۔

چٹان میری طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور بڑی ہی بڑی ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے پورا وہیل بائیں طرف گھما دیا۔ بوٹ چٹان کے بالکل قریب جا کر 90 درجے کے زاویے پر جا کر گھومی تو میں سمجھا کہ ٹکر تو بچ گئی ہے لیکن بوٹ اُلٹ جائے گی۔ پھر میں نے وہیل دائیں کو موڑا تو بوٹ سیدھی ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میری حرکت قلب بند ہو گئی ہے۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ نیچے ابھی اور چٹانیں ہوں گی اور ایسا ہو سکتا ہے بوٹ کا پیندہ کسی چٹان سے رگڑا جائے اور ذرا سا بھی سوراخ ہو گیا تو پانی بوٹ کے اندر آنے لگے گا اور پھر اس کا نتیجہ سوائے ڈوب جانے کے اور کچھ نہیں ہو گا۔

مجھے انگ سون کی وہ بات یاد آئی کہ بہت آگے جا کر بائیں کو ہو جانا لیکن بوٹ کو تر چھا رکھنا ایسا نہ کرنا کہ 90 درجے کے زاویے پر بوٹ کو موڑ کر سمجھو کہ کنارے جا لگو گے۔ میں نے بوٹ کو ذرا سا بائیں طرف موڑ دیا۔ دریا کے وسط میں لہریں تو اٹھ رہی تھیں لیکن پاٹ بہت ہی پھیل جانے کی وجہ سے ان میں وہ زور اور جوش و خروش نہیں رہا تھا جو میں پیچھے دیکھ آیا تھا۔ بوٹ ان لہروں کو چیرنے لگی۔ اب بوٹ لہروں پر غالب آ رہی تھی۔ کچھ دور تک بوٹ لہروں کو چیرتی آگے ہی آگے بڑھتی رہی اور پھر ان سے نکل گئی۔ اب میں اگلے کنارے کے قریب پہنچ رہا تھا اور پانی پُرسکون ہو گیا تھا۔ لیکن خطرہ یہ تھا کہ وہ کنارہ بھی ڈوبا ہُوا تھا اور مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کنارہ ہے کہاں۔

○

میری بڑی ہی سخت آزمائش تو اب شروع ہوئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور شام بڑی تیزی سے سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ صرف ایک سہولت حاصل تھی۔ مجھے ویسے ہی خیال آ گیا کہ اس بوٹ کے سامنے دو بتیاں بھی لگی ہوئی ہیں۔ میں نے ان کے سوئچ ڈھونڈنا چاہے تو اندھیرے میں ٹھیک طرح نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹٹول کر ایک سوئچ الگ تھلگ پوزیشن میں محسوس ہُوا جو آف پوزیشن میں تھا۔ میں ڈرا کہ یہ کسی اور چیز کا ہی نہ ہو۔ خطرہ مول لے کر اسے آن کیا تو سامنے کی بتیاں جل اٹھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ ان کی روشنی موٹر گاڑیوں کی طرح تیز اور دور تک پہنچتی تھی۔ روشنی تو مل گئی لیکن میری جسمانی حالت بگڑ رہی تھی۔ میں جس طرح بوٹ کے اندر پٹخا گیا تھا وہ سنا چکا ہوں' اُس سے تو میری ہڈیاں دُکھنے لگی تھیں۔ اس دکھن میں اضافہ اس طرح ہُوا کہ سامنے سے بڑی ہی ٹھنڈی ہوا میرے جسم کے ساتھ ٹکراتی تھی۔ میں ہوا میں کھڑا تھا اور بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس ٹھنڈ نے میرے جسم کو جام کرنا شروع کر دیا۔ اتنی تیز ہوا

میں آنکھیں کھلی رکھنا بھی خاصا مشکل تھا۔ آنکھوں پر زور دیتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آنکھیں دُکھنے لگیں۔

اچانک سامنے دیکھا تو یوں معلوم ہُوا جیسے بہت بڑا درخت دریا میں کھڑا ہو۔ میں نے رفتار کم کر دی اور بوٹ اس درخت تک پہنچ گئی۔ قریب جا کر میں سمجھا کہ یہ کوئی ٹوٹا ہُوا یا جڑوں سے اُکھڑا ہُوا درخت ہے جو نہ جانے کہاں سے دریا میں بہتا آ رہا ہے۔ میں نے اسی طرح بوٹ کو تقریباً" 90 درجے کے زاویے پر دائیں کو موڑا جس طرح چٹان سے بچنے کے لئے بائیں کو موڑا تھا۔ پھر وہی خطرہ آ گیا کہ بوٹ الٹ جائے گی۔ میں نے فوراً" بوٹ کو بائیں طرف موڑا۔ درخت کے ٹہن بوٹ کے نیچے لگے اور سائیڈ کو بھی لیکن بوٹ آگے نکل گئی۔ اب میں نے اس کی رفتار تیز نہ کی۔

میں نے دریا کے دائیں اور بائیں کا منظر بیان نہیں کیا۔ دونوں طرف ویسا ہی جنگل تھا جیسے جنگل میں میں رہ آیا تھا۔ اسی طرح چٹانیں تھیں' اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں اور درختوں کی اتنی بہتات کہ دُور تک کچھ نظر نہیں آتا تھا..... اندھیرا گہرا ہو گیا تھا دُور' بہت دور مجھے شعلے سے چمکتے اور بجھتے نظر آ رہے تھے۔ وہ یقیناً" توپ خانے کے جو گولہ باری کر رہے تھے۔ مجھے ہلکی ہلکی دھمک بھی سنائی دینے لگی تھی۔ اس سے میں سمجھا کہ میدانِ جنگ زیادہ دور نہیں۔ میں میدانِ جنگ یعنی اگلے مورچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ خاصا زیادہ فاصلہ طے کر آیا ہوں۔ اس گورے کیپٹن نے جو پیٹرول پارٹی لے کر اس بستی کی طرف گیا تھا اور جس سے میری ملاقات ہوئی تھی' بتایا تھا کہ جنگ وہاں سے پچاس ساٹھ میل دُور ہے۔ مجھے اب اور آگے نہیں جانا چاہئے تھا۔ میں نے سوچا کہ جاپانیوں کے مورچوں کے پیچھے چلا جاؤں۔

موٹر بوٹ نے ایک جھٹکا سا کھایا اور کچھ آگے چلی گئی۔ ویسا ہی جھٹکا لگا اور انجن بند ہو کر خود ہی چل پڑا لیکن یہ جھٹکے بار بار لگنے لگے اور انجن بالکل ہی بند ہو گیا۔ سامنے والی بتیاں بہت مدھم ہو گئیں۔ میں نے انجن سٹارٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن انجن ذرا سا سٹارٹ ہو کر خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ تیل ختم ہو گیا تھا۔ اگر تیل ہی ختم ہو گیا تھا تو یہ ثبوت تھا کہ میں کم و بیش چالیس میل کا فاصلہ طے کر آیا ہوں۔ اب تو آگے جانے کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ کشتی اب دریا کے زور پر چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے کنارے کی طرف موڑا لیکن کشتی کی رفتار تو تھی نہیں جو

اسے فوراً" موڑ لیتی' یہ کنارے کی طرف ہوتے ہوتے ڈیڑھ دو میل آگے نکل گئی اور آخر کنارے کے ساتھ ٹکرائی۔

بوٹ رک گئی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور کندھے سے لٹکا کر بوٹ سے نکلا تو میرے نیچے گھٹنوں تک پانی تھا۔ میں بوٹ کو وہیں چھوڑ کر پانی سے نکل گیا۔ پانی کچھ دُور تک تھا۔ آگے ویسی ہی زمین اور ویسا ہی جنگل تھا جس میں سے میں آیا تھا۔

مجھے یہ یقین تھا کہ دریا کے اس کنارے پر جاپانیوں کے مورچے ہیں۔ میں اندازے سے چلتا ہی گیا۔ برما کے جنگل کا میں عادی ہو چکا تھا۔ گھُپ اندھیرے میں بھی میں نے چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کی۔ البتہ جسم کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ اگر مجھے گرم کپڑے مل جاتے یا کوئی بند کمرہ مل جاتا تو جسم گرم ہو کر ٹھیک ہو جاتا لیکن جوں جوں رات گزرتی جا رہی تھی' ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی اور میرے جسم نے جو بوٹ میں چوٹیں کھائی تھیں وہ سارے جسم میں درد اور نقاہت پیدا کر رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ جنگل میں ایک اور خطرہ درندوں کا تھا۔ وہاں شیر بھی ہو سکتا تھا اور بھیڑیئے بھی لیکن ان کا مجھے ڈر نہیں تھا کیونکہ میرے پاس رائفل تھی اور تین ریوالور تھے۔

کچھ وقت بعد ٹانگیں جیسے رہ ہی گئی ہوں۔ وہ تو جوانی کی عمر تھی کہ میں چلتا گیا لیکن کچھ اور آگے جا کر میں نے قدم گھسیٹنے شروع کر دیئے۔ پھر ایسے ہُوا کہ چند قدم چل کر میں کسی درخت کے سہارے کھڑا ہو جاتا اور دو چار منٹ بعد چل پڑتا۔ میں اتنا سمجھتا تھا کہ رکنا ٹھیک نہیں۔ جسم نے ٹھنڈے ہو کر بالکل ہی بے جان ہو جانا تھا لیکن چلتے رہنے سے بھی نوبت وہاں تک پہنچ گئی کہ میں قدم گھسیٹنے کے بھی قابل نہ رہا۔ میں بیٹھ گیا۔

میں نے اللہ کو یاد کیا اور بلند آواز سے اللہ کو پکارا اور اس کے ساتھ ہی میں نے دماغ کو غیر حاضر نہ ہونے دیا نہ ہی خیالوں کو بھٹکنے دیا۔ اس حقیقت کو سامنے رکھا کہ مجھے جاپانیوں تک پہنچنا ہے۔

تقریباً" پندرہ منٹ میں بیٹھا رہا اور میں جب اٹھنے لگا تو پتہ چلا کہ میں ضعیف العمر آدمی کی طرح اٹھنے میں بہت دشواری محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے رائفل کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی اور اٹھ کھڑا ہُوا پھر رائفل کا سہارا لے کر اور کچھ جُھک کر اس طرح چلنے لگا جس طرح بہت ہی بوڑھا کوئی آدمی لاٹھی کے سہارے چلتا ہے۔ توپوں کے

دھماکے اب ذرا صاف اور پہلے سے کچھ بلند سنائی دینے لگے تھے اور اس طرف کا آسمان فائر ہوتی توپوں کے شعلوں سے سرخ ہوتا بجھتا اور سرخ ہوتا تھا۔

میں نے یوں محسوس کیا جیسے جنگل کم گھنا ہو گیا ہے اور درختوں کا آپس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ میرے نیچے جو زمین تھی' وہ کچھ ہموار سی ہو گئی تھی۔ کچھ دور تک کوئی ٹیکری یا چٹان راستے میں نہ آئی۔ یہ میری کوئی ڈھکی چھپی قوت تھی جو مجھے چلا رہی تھی ورنہ جسم میں اب ایک قدم بھی اٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔

پھر یوں ہُوا کہ میرا سر ڈولنے لگا اور غشی کی لہریں آنے لگیں۔ شاید اس طرح ہو رہا تھا کہ میں دو چار سیکنڈ کے لئے غشی میں چلا جاتا اور دماغ خود ہی بیدار ہو جاتا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جس طرح موٹر بوٹ کا تیل ختم ہُوا تو وہ ایک جھٹکا کھاتی' اس کا انجن خاموش ہوتا' پھر خود ہی چل پڑتا اور پھر جھٹکے سے انجن چپ ہو جاتا اور آخر بالکل ہی خاموش ہو گیا۔ میرے ساتھ ایسے ہی ہُوا اور پھر میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ کچھ یاد نہیں کہ میں بیٹھ گیا تھا' لیٹ گیا تھا یا گر پڑا تھا۔

میں بیدار ہونے لگا لیکن میرے پہلوؤں پر ٹھوکریں پڑ رہی تھیں۔ آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا کہ دھوپ نکلی ہوئی ہے اور چار فوجی میرے اِرد گرد کھڑے ہیں اور دو مجھے ٹھڈے مار رہے ہیں۔ میں فوراً اٹھا۔ تب دیکھا کہ وہ جاپانی تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ مجھے گالیاں دے رہے تھے یا مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ میں کون ہوں اور یہاں میں کس طرح پہنچا ہوں۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ہر رائفل کے آگے سنگین چڑھی ہوئی تھی۔ ایک جاپانی نے سنگین میرے پیٹ کے ساتھ لگا کر معلوم نہیں غصے میں کیا کہا۔

"انڈین!" — میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "انڈین آرمی..... آئی این اے..... انڈین نیشنل آرمی" — میں نے اس طرح کے اشارے ہاتھوں سے کئے کہ میں انڈین آرمی سے بھاگ کر آیا ہوں اور اِدھر یعنی اس طرف انڈین نیشنل آرمی میں جانا چاہتا ہوں۔

انہوں نے میری رائفل اٹھالی تھی اور تینوں ریوالور بھی میری پتلون سے نکال لئے تھے۔ وہ شاید سمجھ گئے تھے ورنہ جاپانیوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا تھا کہ وہ مجھے زندہ رہنے دیں گے۔ میں اشاروں سے انہیں بتا رہا تھا کہ مجھے پیچھے لے چلو۔ ان میں ایک جاپانی نائک یا حوالدار معلوم ہوتا تھا اُس نے فیصلہ کیا کہ مجھے پیچھے لے جائے۔ میرا خیال

ہے وہ اشارے سمجھ گیا تھا۔ یہ چاروں جاپانی "باٹا" پیٹرول ڈیپو پر تھے۔

وہ مجھے پیچھے لے چلے۔ اب توپوں کے دھماکے اور زیادہ صاف سنائی دینے لگے تھے۔ میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے فضا میں بمبار طیارے اُڑتے نظر آئے۔ وہ بمباری کر رہے تھے۔ میں میدانِ جنگ میں پہنچ گیا تھا۔ مشکل یہی نظر آ رہی تھی کہ یہ جاپانی مجھے اپنے کسی افسر کے پاس لے جا رہے ہیں' اگر وہ بھی میری زبان اور میرے اشارے نہ سمجھا تو مجھے گولی مار دے گا یا اس نے رحم کیا تو جنگی قیدی بنا کر مجھے پیچھے بھیج دے گا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ مجھے مار ڈالیں گے۔ جاپانی بین الاقوامی قواعد و ضوابط اور ریڈ کراس کی پابندیوں کے قائل نہیں تھے۔ بڑی ظالم قوم تھی۔

ایک میل سے کچھ زیادہ سفر طے کیا تو مجھے اور بھی جاپانی نظر آنے لگے۔ وہاں کوئی خیمہ نہیں تھا نہ ہی فرنٹ پر خیمے لگائے جاتے تھے۔ فوجی خندقیں کھود کر ان میں رہتے تھے۔ مجھے ایک جگہ روکا گیا۔ گہرا کھودا ہُوا کھڈ تھا جس کے اوپر جال بچھا ہُوا تھا اور اس پر درختوں کی ٹہنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میرے سامنے سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں جو اس کھڈ کے اندر جاتی تھیں۔ وہ جاپانی جو نائک یا حوالدار تھا' مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے لے گیا۔ نیچے تو ایک کشادہ کمرہ بنا ہُوا تھا۔ ایک طرف فولڈنگ میز تھی اور فولڈنگ کرسیاں تھیں جن پر تین چار جاپانی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ آفیسر تھے۔

مجھے نیچے لے جانے والے جاپانی نے انہیں کچھ کہا اور میری رائفل اور تینوں ریوالور میز پر رکھ دیئے۔ ایک آفیسر نے غصے سے بولتے ہوئے کچھ کہا۔ میں ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا اور یہی رٹ لگاتا رہا — "انڈین آرمی..... انڈین نیشنل آرمی" — ایک آفیسر نے اس جاپانی سے کچھ کہا تو وہ دوڑتا ہُوا اوپر چلا گیا۔ پھر یہ جاپانی افسر مجھے سر سے پاؤں تک اور پھر پاؤں سے سر تک دیکھتے اور آپس میں کچھ باتیں کرتے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ جاپانی واپس آیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو جاپانی نہیں لگتا تھا۔ وہ برما کا رہنے والا تھا یا سنگاپور ملایا وغیرہ کا باشندہ تھا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ ملایا کا باشندہ تھا۔ اس نے آتے ہی میرے ساتھ اردو میں بات کی۔ مجھ سے پوچھا میں کون ہوں۔

میں نے اسے بتایا کہ میں کس طرح اپنی بٹالین سے بھگوڑا ہُوا ہوں اور جنگل میں بھٹک گیا تھا اور ایک جگہ رکا رہا۔ میں نے بتایا کہ میں آئی این اے میں شامل ہونے کے لئے بھگوڑا ہُوا ہوں۔ یہ تو نہ بتایا کہ میں نے نو جاپانیوں کو مار ڈالا تھا البتہ یہ بتایا کہ انگریز

پائلٹ کو قتل کیا تھا۔ پھر میں نے جاپانیوں کے حق میں کچھ باتیں کیں۔ یہ ملائی جاپانی زبان خوب جانتا تھا۔ اس نے میری ساری بات سن کر جاپانی زبان میں جاپانی افسروں کو سنائی۔ افسروں نے کچھ سوال کئے جو اس ملائی باشندے نے مجھ سے اُردو میں پوچھے اور میں جواب دیتا رہا۔ میں آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جاپانی فوج کے افسروں کے دلوں میں رحم کی لہر آگئی اور انہوں نے حکم دیا کہ مجھے پیچھے بھیج دیا جائے۔

ملائی آدمی مجھے اپنے ساتھ لے چلا اور مجھ سے راستے میں پوچھا کہ تم کس مذہب کے آدمی ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمان ہوں۔ وہ بہت خوش ہُوا اور اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ بھی مسلمان تھا اور اس کا نام عمر تھا۔ وہ مجھے وہاں سے کم و بیش دو فرلانگ دور لے گیا۔ وہاں کچھ جاپانی موجود تھے اور ان میں ایک ہندوستانی فوجی بھی تھا۔ ملائی نے اس ہندوستانی کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اس کا نام فصیح احمد تھا۔ عمر مجھے اس کے حوالے کر کے چلا گیا۔

فصیح نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں نے اسے بتایا اور اپنی بٹالین کا نمبر بھی بتایا۔ فصیح انڈین آرمی کے ایک توپ خانے میں حوالدار کلرک تھا۔ وہ بھی میری طرح بھگوڑا ہو کر اس طرف آگیا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں ہوئیں تو معلوم ہُوا کہ اسے یہاں آئے کم و بیش ایک سال ہو گیا ہے۔ وہ جالندھر کا رہنے والا تھا۔

"تم اِدھر کہاں آنکلے ہو یار!" — فصیح نے مجھے آہستہ سے کہا — "میرا خیال ہے کہ تم میری طرح سنی سنائی باتوں سے جوش میں آگئے تھے"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا فصیح بھائی؟" — میں نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

"اب تم آ ہی گئے ہو تو کوئی فکر نہ کرو" — فصیح نے کہا — "ذرا آرام کر لو تو ساری بات سناؤں گا۔ ابھی یہ سن لو کہ یہ آئی این اے ہندوؤں کی بنائی ہوئی فوج ہے۔ ان کا پروگرام یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو فتح کر کے ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکے گا کیونکہ جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں اور انہوں نے پسپائی اختیار کر لی ہے۔ مجھے یہی نظر آ رہا ہے کہ جاپانی انگریزوں اور امریکیوں کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔ بہرحال تم خوش قسمت ہو کہ یہاں تک زندہ

اور سلامت پہنچ گئے ہو۔ میں ایک ڈیوٹی پر یہاں آیا ہوں اور اب تمہیں ساتھ لے کر پیچھے جاؤں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں!"

"بھوک سے مر رہا ہوں" — میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — "کچھ کھلا دو بھائی!"

فصیح بڑا پیارا آدمی اور میرا بڑا اچھا دوست ثابت ہُوا تھا۔ وہ فوراً اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو پلیٹیں تھیں۔ بہت اچھا کھانا تھا۔ بڑی مدت بعد اتنا اچھا کھانا دیکھا تھا میں کھانے پر ٹوٹ پڑا اور فصیح مجھے آئی این اے کی باتیں سناتا رہا۔

میں ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا تھا۔ اس دنیا میں داخل ہونے کے لئے میں فوج سے بھگوڑا ہُوا تھا۔ میرا مقصد تھا ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ جاپانیوں کے ساتھ جاملوں لیکن فصیح احمد نے ایسی بات کہہ دی جو کبھی خواب و خیال میں بھی میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ فصیح کہتا تھا کہ ہندو ہندوستان کے حکمران بننا چاہتے ہیں اور جاپانی انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر یہ ملک ہندوؤں کو دیں گے۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی پائی جاتی ہے اور یہ کشیدگی کبھی کبھی دشمنی کا رنگ اختیار کر لیا کرتی ہے لیکن میں سمجھتا تھا اور شاید میں غلط سمجھتا رہا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مخلص ہیں اور وہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلیں گے۔ میں فصیح کی بات رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کوئی اَن پڑھ فوجی نہیں تھا' میٹرک پاس تھا جو اس وقت کے معیار کے مطابق اچھی خاصی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ اُس وقت تعلیم کا یعنی سکولوں اور کالجوں کا یہ بدتر حال نہیں تھا جو آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں استاد اپنا فرض دیانتداری اور جانفشانی سے ادا کرتے تھے۔ آج کا گریجوایٹ ہمارے وقتوں کے میٹرک کوالیٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت جمعدار (نائب صوبیدار) اور صوبیدار وغیرہ بھی اَن پڑھ ہُوا کرتے تھے۔ جن میں دس جماعتیں پاس بہت ہی زیادہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ فصیح کی باتوں میں دانشمندی تھی اور وہ پُراثر انداز سے بولتا تھا۔

"فصیح بھائی!" — میں نے کہا — "تم کہتے ہو کہ جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں

جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جاپانی ہندوستان میں داخل نہیں ہو سکیں گے اور ہمارا ملک انگریزوں کے قبضے میں رہے گا"۔

"ہاں بھائی!" — فصیح نے کہا — "میرا مطلب یہی ہے۔ یہ میرا مطلب ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے۔ پورے برما پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا تھا لیکن اب آدھا برما اُن کے قبضے سے نکل گیا ہے"۔

"ہمارا کیا بنے گا؟" — میں نے پریشانی کے عالم میں کہا — "اگر جاپان کی فوج پسپا ہو گئی تو ہم انگریزوں کے جنگی قیدی بن جائیں گے اور ہماری حیثیت جنگی قیدی والی نہیں ہو گی بلکہ ہم بھگوڑے قرار دیئے جائیں گے' ہمارا کورٹ مارشل ہو گا۔ کم از کم چودہ سال سزائے قید ملے گی اور ہو سکتا ہے کہ ہمیں محاذ سے بھاگنے کے جرم میں گولی ہی مار دی جائے.... کبھی تم نے سوچا کہ ہم اس سزا سے بچنے کے لئے کہاں جائیں گے؟"

"نہیں یار!" — فصیح نے کہا — "میں نے اپنا انجام کبھی نہیں سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ جاپانی پیچھے ہٹ کر کہیں قدم جمالیں لیکن ہم جس مقصد کے لئے اپنی فوج سے بھاگے تھے' وہ مقصد پورا نہیں ہو سکے گا۔ میں تمہیں پیچھے ملایا لے جا رہا ہوں جہاں جاپانیوں کی بنائی ہوئی انڈین نیشنل آرمی کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہاں خود دیکھ لینا کہ ہندوؤں کا رویّہ کیا ہے اور مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہے۔ میں تمہیں یہ بھی بتاتا ہوں کہ آئی این اے میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ابھی اتنا پریشان ہونے کی یا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جاپانی ہمیں دھوکہ نہیں دیں گے۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ ہمیں انگریزوں کے حوالے کر کے بھاگ نہیں جائیں گے بلکہ ہمیں اپنے ساتھ جاپان لے جائیں گے.... یہاں میں تمہارے ساتھ اور زیادہ باتیں نہیں کروں گا نہ ہی تم کرنا کیونکہ ہمارے ساتھ تین ہندو ہیں۔ ان کے ساتھ دوستانہ رویّہ رکھنا"۔

"صرف ایک بات بتا دو" — میں نے پوچھا — "تم یہاں کیا ڈیوٹی دے رہے ہو؟"

"انٹیلی جنس!" — فصیح نے جواب دیا — "یہ جاپانیوں کی انٹیلی جنس کی ایک برانچ ہے۔ اس برانچ میں زیادہ تر ہندوستانی رکھے گئے ہیں۔ میں نے یہاں چار پانچ مہینے یہ ڈیوٹی کی ہے۔ ڈیوٹی یہ تھی کہ رات کو ہم لاؤڈ سپیکر دور آگے ہندوستانیوں کے مورچوں کے قریب رکھ آتے تھے اور پیچھے آ کر انگریزوں کے خلاف زہر اُگلتے اور

ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتے تھے۔ ہم ہندوستانی فوجیوں کو پکارتے اور کہتے تھے کہ غلام بن کر نہ لڑو' جاپانیوں کا ساتھ دو' یہ ہندوستان تمہارے حوالے کر دیں گے اور تمہاری غلامی ختم ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ.... اب یہ ڈیوٹی ختم ہو گئی ہے کیونکہ جاپان کی فوج تیزی سے پیچھے ہٹ رہی ہے۔ ہم دو تین دنوں تک واپس چلے جائیں گے اور تمہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔ میری ڈیوٹی میں انڈین آرمی کے بھگوڑے فوجیوں کا استقبال بھی تھا"۔

○

فصیح کی ان باتوں سے میری بے چینی کچھ کم تو ہو گئی لیکن ختم نہ ہوئی اور پھر یہ بے چینی پچھتاوے کی صورت اختیار کر گئی۔ بار بار خیال آتا کہ مجھے فوج سے یوں بھگوڑا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں تو جاپانیوں کے اس بھروسے پر چلا آیا تھا کہ جس طرح وہ حیران کُن تیزی سے ملایا اور برما پر قابض ہو گئے تھے ایسے ہی چند دنوں میں پورے ہندوستان پر چھا جائیں گے اور انگریز بھاگ جائیں گے لیکن اب سنا کہ جاپانیوں نے تو ریورس گیئر لگا لیا ہے تو مجھے خیال آیا کہ انگریزوں کے ساتھ میری کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ یا یہ کہ میں اکیلا ہی انگریزوں کا غلام نہیں تھا۔ پھر دماغ میں یہ آئی کہ میں انہی برمیوں میں اچھا تھا جو جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور مجھے اپنا پیر اور مُرشد سمجھتے تھے مگر وہاں بھی مصیبت آن نازل ہوئی اور بھاگنا پڑا۔ اب تو صبر اور شکر کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میری قسمت جاپان کی فوج کے ساتھ وابستہ ہو گئی تھی۔

میں پچھلے کسی باب میں جاپانیوں کی برق رفتار پیش قدمی اور فتوحات کا ذکر کر چکا ہوں لیکن یہاں تھوڑے سے اضافے کے ساتھ ایک بار پھر اس کا حوالہ دوں گا۔ جاپانیوں میں حبّ الوطنی کا اور لڑنے کا جذبہ ایسا تھا کہ جو سنتا تھا وہ انگلیاں دانتوں میں دے لیتا اور کچھ دیر حیرت زدہ رہ جاتا تھا۔ میں ان کے اس جذبے کو پہلے تفصیل سے بیان کر آیا ہوں۔ ایک تو یہ جذبہ تھا کہ جاپان کی نیوی اور فوج طوفان کی طرح بحرالکاہل سے آئی اور جاوا' سماٹرا' بورنیو' ملایا اور سنگاپور پر قابض ہو گئیں۔ یہ علاقے آج کے انڈونیشیا اور ملائشیا ہیں۔ ان علاقوں کو مشرقِ بعید بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد جاپان کی فوج دیکھتے ہی دیکھتے پورے برما پر قابض ہو گئی۔ میں نے اس کے تفصیلی ذکر میں یہ بھی تفصیل سے بتایا تھا کہ جاپان کی فوج کو جاپانیوں کے مقامی جاسوسوں کی بہت ہی زیادہ مدد حاصل تھی۔

اب ہُوا یوں کہ جاپانی جتنی تیزی سے آئے تھے اتنی ہی تیزی سے پسپا ہونے لگے تھے۔

برما سے جاپانیوں کی پسپائی کی دو وجوہات تھیں' ان میں ایک یہ تھی کہ انگریزوں اور امریکیوں نے بے پناہ جنگی طاقت سے برما پر جوابی حملہ کیا تھا۔ ان دونوں بڑی طاقتوں نے اپنی ایئر فورس اور نیوی کو اس طرح استعمال کیا کہ جاپانیوں کے قدم اُکھڑ گئے۔

جاپانیوں کی پسپائی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مشرقِ بعید کے بہت بڑے علاقے پر ان کا قبضہ تھا اور یہ قبضہ مستحکم تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ برما سے پیچھے ہٹ کر وہ ان علاقوں میں قدم جما لیں گے اور اپنی فوج کی اب از سرِ نو تنظیم کر کے برما پر جوابی حملہ کریں گے۔ ایک وجہ اور بھی تھی جو جاپانیوں کی کمزوری بن گئی تھی۔ میں فوجی زبان میں بات کر رہا ہوں۔ ان کی سپلائی لائن لمبی ہو گئی تھی۔ ان کی کمک اور رسد بروقت منزل تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کی سپلائی لائن انگریزوں اور امریکیوں کے بمبار طیاروں کی زد میں رہتی تھی۔

یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جاپان کی فوج کو پیچھے ہٹانا کوئی آسان کام بھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانی سپاہی اگر کہیں اکیلا رہ جاتا تو وہ بھاگتا نہیں تھا نہ وہ اپنے آپ کو جنگی قیدی کے طور پر پیش کرتا تھا۔ جاپانیوں میں یہ رواج تھا کہ ہتھیار ڈالنے سے بہتر خودکشی کو سمجھتے تھے۔ میں ایسے بے شمار واقعات سنا سکتا ہوں کہ جاپانیوں نے پیچھے ہٹنے یا ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کو بہتر سمجھا اور اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے نام پر بڑے فخر سے خودکشی کر لی۔ جرنیل جس کا ڈویژن شکست کھا جاتا اور وہ اپنے علاقے کا دفاع نہ کر سکتا' وہ افسروں کو اکٹھا کر کے باقاعدہ ایک تقریب منعقد کرتا اور سب سے معافی مانگ کر تلوار اپنے پیٹ پر رکھ کر زور سے دباتا اور تلوار اس کی پیٹھ کی طرف سے باہر نکل آتی۔ جاپانی افسروں کے پاس تقریباً" دو فٹ لمبی تلوار ہوتی تھی۔ برما سے اگر جاپانی پیچھے ہٹ رہے تھے تو وہ باقاعدہ ڈویژنوں' بریگیڈوں یا یونٹوں کی شکل میں پسپا ہو رہے تھے۔ اس وقت تک ان کی پسپائی منظم تھی یعنی وہ باقاعدہ پلان کے تحت پیچھے ہٹ رہے تھے اور صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں قدم جما لیں گے۔

بہرحال یہ فوجی معاملات ہیں' میں آپ کو اپنی بات سناتا ہوں۔ صورتِ حال یہ تھی کہ تقریباً" آدھا برما جاپانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ جاپانیوں کو اس پسپائی کا رنج اور ملال تھا یا نہیں' میں اپنی حالت بتاتا ہوں کہ مجھ پر رنج اور ملال کی اور

پچھتاوے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں اپنے بچاؤ کے لئے جاپانیوں کی فتح کی دعائیں مانگتا تھا۔ بات بڑی صاف تھی' جاپانی قائم تھے تو میں بھی قائم تھا ورنہ پکڑے جانے کی صورت میں عمر قید تھی یا سزائے موت۔

ہم دو دن وہاں رہے۔ فصیح کے ساتھ جو تین ہندوستانی ہندو تھے' وہ بھی فوجی تھے۔ دو رہتک کے رہنے والے اور ایک راجپوتانہ کے کسی گاؤں کا تھا۔ اس پارٹی کے ساتھ ایک جاپانی افسر تھا جس کا عہدہ کیپٹن تھا۔ ایک ترجمان کے ذریعے اس افسر نے میرا باقاعدہ انٹرویو لیا تھا اور میری حوصلہ افزائی کی تھی۔

تیسرے روز علی الصبح ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ ہم فوجی ٹرک میں سوار ہوئے۔ فصیح تھا' میں تھا اور تین ہندو تھے اور ہمارے ساتھ دو جاپانی سپاہی بھی تھے۔ ڈرائیور بھی جاپانی تھا۔ ان کا کیپٹن اگلی سیٹ پر بیٹھا اور ہم سب پیچھے بیٹھ گئے۔ وہاں سے رنگون تقریباً" چار سو میل دُور تھا۔ وہ سارا علاقہ گھنا اور جنگلاتی اور کچھ علاقہ پہاڑی اور چٹانی تھا۔ جاپان کی فوج نے درخت کاٹ کاٹ کر باقاعدہ رستے بنا دیئے تھے اور جگہ لکھی اور پکی سڑک بھی مل گئی تھی لیکن ہم رک رک کر رنگون کی طرف جا رہے تھے۔ ہم اگلے مورچوں سے پیچھے پیچھے جا رہے تھے یعنی ہم پچھلے مورچوں میں سے گزر رہے تھے جسے سیکنڈ ایشلان کہا جاتا ہے۔ رک رک کر چلنے کی وجہ یہ تھی کہ امریکیوں کے اور انگریزوں کے بمبار طیارے تمام تر علاقے پر بے پناہ بمباری کر رہے تھے۔ کوئی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کس وقت بمبار آ نکلیں اور کس جگہ بمباری کر دیں۔ رات کو ہمیں کسی پچھلے مورچے میں رُکنا پڑتا تھا۔

ہمیں ایک ایسے سیکنڈ ایشلان میں رُکنا پڑا جہاں بہت ہی رونق تھی۔ رونق کا مطلب یہ ہے کہ وہاں فوجیوں کی تعداد زیادہ تھی کہ یہ بہت بڑا سپلائی ڈمپ تھا۔ وہاں تیل پٹرول کا بھی بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ خیمے بھی لگے ہوئے تھے اور زمین دوز جگہیں بھی بنائی ہوئی تھیں۔ ہمیں رات بھر کے لئے ایک خیمہ دے دیا گیا جو ایک گہرے کھڈ کے اوپر لگا ہوا تھا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے میں اور فصیح ویسے ہی باہر نکلے۔ ٹرک کے سفر نے جسم توڑ ڈالا تھا۔ ہم ذرا سیر و تفریح کرنا اور کچھ پیدل چلنا چاہتے تھے۔ ہم نے پچھلے مورچوں میں تین چار جگہوں پر جوان لڑکیاں گھومتی پھرتی دیکھی تھیں۔ یہ لڑکیاں ان علاقوں کی تھیں جن پر جاپانی فوج کا قبضہ ہو گیا تھا۔ میں پچھلے ایک باب میں ان لڑکیوں

کے متعلق تفصیلات پیش کر چکا ہوں۔ اس کے بعد ایک تازہ خبر ملی تھی جس کا میں خاص طور پر حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ جاپانی فوج کو یہ اجازت تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں سے اپنی پسند کی لڑکیاں اپنے ساتھ تفریح طبع کے لئے رکھ لیں۔ ان لڑکیوں کو آگے تک لے جاتے اور اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ گذشتہ برس یعنی آدھی صدی بعد اقوامِ متحدہ نے جاپان سے کہا تھا کہ اس کی فوج نے جنگ عظیم میں جن لڑکیوں کو تفریح کے لئے اپنے ساتھ رکھا تھا اور انہیں پوری فوج کی داشتائیں بنا دیا تھا' جاپان ان کے لواحقین سے باقاعدہ معافی مانگے اور انہیں معاوضہ ادا کرے۔ پہلے تو جاپان کی حکومت پس و پیش کرتی رہی لیکن جب دنیا بھر کی اقوام نے دباؤ ڈالا تو جاپان کی حکومت نے باقاعدہ معافی مانگ لی اور یہ بھی انکشاف ہُوا کہ ایسی بد قسمت لڑکیوں کی تعداد دو لاکھ تھی۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو جاپانی فوج کے ساتھ ساتھ رہیں یا رکھی گئیں' ان کے علاوہ وہ بد قسمت لڑکیاں بھی تھیں جن کے ساتھ فوجیوں نے اجتماعی زیادتی کی اور وہ مر گئیں۔ تازہ خبر یہ ہے کہ ان دو لاکھ لڑکیوں میں سے آج ایک ہزار زندہ ہیں یا ایک ہزار کے ایڈریس معلوم کر لئے گئے ہیں.. .. یہ تو اب ضعیف العمر ہو چکی ہوں گی اور جن کے ایڈریس نہیں ملے وہ نہ جانے کب اور کہاں دنیا سے اٹھ گئی ہوں گی۔ جاپانی جب پسپا ہوئے تھے تو ان لڑکیوں کو جنگلوں میں بھٹکتا چھوڑ گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ بھوک اور پیاس سے مر گئی ہوں گی یا درندوں کی خوراک بن گئی ہوں گی یا اگر وہ واپس آئیں بھی تو بعض نے خودکشی کر لی ہو گی اور بعض بیمار ہو کر مر گئی ہوں گی۔

یہاں میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ میں نے جاپانیوں کی شجاعت کے' جذبۂ حُب الوطنی کے فرض کی لگن کے مظاہرے اپنی آنکھوں دیکھے ہیں۔ جاپانی فوجی تھا یا شہری' وہ اپنے وطن اور اپنے بادشاہ کا روحانی طور پر وفادار تھا۔ وہ وطن اور بادشاہ کے نام پر اپنی جان دینے کو بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کی جانیں اپنے وطن اور بادشاہ کی امانت ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے خلفائے راشدین کے زمانے کے مسلمان یاد آ جاتے۔ رومیوں اور ایرانیوں کی ہیبت ناک جنگی طاقت کا دم خم ہمارے مجاہدین نے توڑا اور ان طاقتوں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کفار کے ڈیڑھ لاکھ کے لشکر کو چالیس ہزار اور پچاس ہزار مجاہدین نے شکست دی۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟.... شوقِ شہادت سے۔ اور یہ نظریہ یا عقیدہ کہ ہماری جانیں اللہ کی امانت ہیں اور یہ ہمیں اسلام کے نام پر اللہ کی

راہ میں قربان کرنی ہیں۔ تاریخ اسلام کا وہ باب پڑھ کر دیکھیں۔ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ خالد بن ولیدؓ طارق بن زیاد' سعد بن ابی وقاص' مثنیٰ بن حارثہ' محمد بن قاسم' صلاح الدین ایوبی' سلطان محمود غزنوی اور ان جیسے بے شمار فرزندانِ توحید کو کفار بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

میں نے وہی جذبہ جاپانی فوجیوں میں دیکھا ہے لیکن کیا وجہ ہوئی کہ جاپانی اس جذبے کے باوجود اور جنگی طاقت ہونے کے باوجود شکست کھا گئے۔.... صرف اس لئے کہ جو علاقہ انہوں نے فتح کیا' وہاں گھر گھر کی تلاشی لے کر نوجوان عورتوں اور خوبصورت لڑکیوں کو اکٹھا کر لیا اور انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔ میں جن مجاہدینِ اسلام کا ذکر کر رہا ہوں' یہ شیوہ ان کا نہیں تھا۔ انہوں نے تو مفتوحہ علاقے کی عورتوں کو تحفظ دیا اور ان کی عزتوں کی رکھوالی کی۔ کسی کو کوئی لڑکی اچھی لگی تو اس کے وارثوں کی رضامندی سے اس کے ساتھ باقاعدہ نکاح پڑھایا۔ جاپانی اس معاملے میں الٹ نکلے۔ یہ حقیقت ہے کہ جس قوم نے' جس فوج نے اور جس انسان نے عورت کو اس طرح تفریح کا ذریعہ بنایا کہ اسے زبردستی اغوا کر کے کھلونا بنا لیا' وہ قوم' وہ فوج اور وہ انسان تباہ و برباد ہُوا۔ میں نے جاپانیوں کی پسپائی کی کچھ اور وجوہات پیش کی ہیں لیکن یہ میرا ذاتی خیال ہے کہ جاپانیوں کی شکست کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ عورت کو مالِ غنیمت سمجھ کر اسے کھلونا بنا لیتے اور توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے تھے۔

○

میں ذکر کر رہا تھا ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ کا جہاں بہت ہی رونق تھی۔ میں اور فصیح ذرا سیر و تفریح کے لئے شام سے کچھ پہلے باہر نکلے۔ ہر طرف جاپانی فوجی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض ہمیں دیکھ کر مسکراتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہم ہندوستانی ہیں اور جنگی قیدی نہیں بلکہ آئی این اے میں شامل ہو کر ان کے بھائی بن گئے ہیں۔ ہم نے وہاں لڑکیوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی دیکھی۔ ہم پیچھے بھی جہاں جہاں رکے تھے' وہاں بھی لڑکیاں دیکھیں۔ ان میں بیشتر ایسی تھیں جن کے چہروں پر اداسی اور مظلومیت کے تاثرات بڑے ہی واضح تھے۔ بعض ایسی بھی دیکھیں جو ہمیں دیکھتی تھیں تو ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی تھی۔ ان میں زیادہ تر مشرقِ بعید کے مفتوحہ علاقوں کی تھیں۔ برمی ہو یا انڈونیشی یا ملائی' ان کے خدوخال تقریباً ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

ان میں ہم نے تین چار ہندوستانی لڑکیاں دیکھیں۔ انہیں جاپانیوں نے رنگون سے اغوا کیا ہو گا۔ برما میں رنگون ہی ایک شہر تھا جہاں کا کاروبار ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ رنگون میں بے انداز ہندوستانی تھے جن میں پنجابیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

دو جواں سال لڑکیاں ایک طرف سے خراماں خراماں چلی آ رہی تھیں۔ وہ شاید ہمیں دیکھ کر مسکرا اٹھی تھیں۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ دونوں گورے رنگ کی اور کشش والی لڑکیاں تھیں۔ دونوں کے بال کٹے ہوئے تھے' انہوں نے جاپانیوں کی فوجی وردی والی پتلونیں پہن رکھی تھیں اور فوجی قمیضیں پتلون کے اندر کی ہوئی تھیں۔ اس لباس پر تو وہ اور زیادہ اچھی لگتی تھیں۔ ان کے انداز سے اور ان کی مسکراہٹ سے پتہ چلتا تھا کہ یہ جاپانی فوج میں ملازم ہیں اور انہیں کوئی غم اور کوئی فکر نہیں۔ ہمارے قدم سست پڑ گئے کیونکہ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے ساتھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

"تم دونوں ہمارے گرائیں معلوم ہوتے ہو" — ایک لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا اور پوچھا — "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

ہم دونوں نے اسے بتایا کہ ہم کہاں کہاں کے رہنے والے ہیں اور پھر اس سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔

"امرتسر!" — اس نے جواب دیا — "میں سکھ ہوں"۔

میں نے دوسری سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔

"الٰہ آباد!" — اس نے جواب دیا — "میں ہندو ہوں"۔

"تم دونوں کو یہاں دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے" — فصیح نے کہا — "افسوس اس پر بھی آتا ہے کہ ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے"۔

"اگر ہندوستان قریب ہوتا تو ہم دونوں کو یہاں سے نکال لے جاتے" — میں نے کہا — "تم بہت بُرے جال میں پھنسی ہوئی ہو"۔

دونوں ہنس پڑیں۔ دونوں کچھ کچھ نشے میں معلوم ہوتی تھیں۔ نشہ شراب کا ہی ہو سکتا تھا۔

"ہم دونوں کو کوئی افسوس نہیں" — امرتسر والی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا

— "ہم دونوں کو ایک ایک افسر مل گیا ہے۔ ہم پر کوئی ظلم اور کوئی جبر نہیں ہوتا"۔

"کیا تم اس ذلت میں خوش ہو؟" — میں نے پوچھا اور کہا — "تم عقل والی لڑکی ہو۔ تم نے اچھا کیا کہ اس ذلت کو قبول کر لیا ہے اور اسی میں خوش ہو"۔

وہ دونوں ہنسی مذاق کے موڈ میں تھیں۔ ان کے انداز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پکنک پر آئی ہوئی ہوں یا ان کے اپنے خاوند انہیں یہاں سیر و تفریح کے لئے لائے ہوں۔ فصیح بھی زندہ دل آدمی تھا اور میری اپنی فکر بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ہم نے لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی سے ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ دونوں ہماری باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ دونوں جاپانیوں کے پاس اتنی خوش کیوں ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کی باقاعدہ برین واشنگ کی گئی ہو۔

میں آپ کو یہی دکھانا چاہتا ہوں کہ انسان کیا ہے اور انسان ایک گہرے سمندر کی مانند ہے۔ پستی کو قبول کر لے تو پستی ہی میں اُترتا چلا جاتا ہے اور خوش رہتا ہے اور اگر عظمت کی طرف اٹھنے لگے تو ایسی ایسی قربانیاں دے ڈالتا ہے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں۔ عورت کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ عورت کی فطرت اتنی گہری ہے کہ اس کی تہہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا' غلط نہیں۔ فصیح نے امرتسر کی اس سکھ لڑکی سے کہا کہ سکھ تو بڑے غیرت والے ہوتے ہیں اور تم ایک جاپانی افسر کی داشتہ بن کر خوش ہو۔

"کون سے جالندھر کے رہنے والے ہو؟" — سکھنی نے پوچھا — "تم سکھوں کے علاقے میں رہتے ہوئے شاید نہیں جانتے کہ ایک سکھ شادی کرتا ہے تو اس کے بھائی جتنے بھی ہوں وہ اس کی بیوی کو اپنی بیوی بنا لیتے ہیں۔ ایک بھائی کی بیوی تمام بھائیوں پر جائز ہوتی ہے"۔

ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ سکھوں کا رواج ہے کہ ایک بھائی کی بیوی تمام بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے۔ تمام بھائی شادی شدہ ہوں تو وہ ایک دوسرے کی بیوی کو اپنے آپ پر حلال سمجھتے ہیں۔ سنا ہے آج کل نئی روشنی کے سکھ اس رواج کو ختم کر رہے ہیں لیکن یہ رواج ختم نہیں ہُوا' سکھوں کے دیہاتی علاقے میں ابھی تک چل رہا ہے۔

"میں تمہاری حیرت ابھی رفع کر دیتی ہوں" — سکھنی نے ٹھیٹ پنجابی زبان میں کہا — "یہ ایک واقعی حیران ہونے والی بات ہے کہ میں ان جاپانیوں کے ساتھ خوش ہوں لیکن ایک بات پر غور کرو۔ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ کیا میں گوری چٹی خوبصورت لڑکی

نہیں؟.... اگر میں اپنا خاوند تمہارے سامنے کھڑا کر دوں تو پھر تم خود کہہ اٹھو گے کہ نہیں تم ان جاپانیوں کے پاس رہو.... میں امرتسر کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئی تھی لیکن سکھ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ وہ اس لئے کہ سر کے بال لپیٹ کر رکھتے ہیں اور اوپر اتنی بڑی پگڑی باندھی ہوتی ہے۔ کئی کئی دن سر کے بال دھوتے ہی نہیں۔ ان کے بالوں سے بدبُو آتی ہے۔ ان کے جسم سے بھی بدبُو آتی ہے۔ میری شادی جس سکھ کے ساتھ کرائی گئی وہ سانولے نہیں بلکہ کالے رنگ کا ہے۔ اس کی داڑھی آنکھوں کے قریب سے شروع ہوتی ہے اور دور نیچے تک چلی گئی ہے۔ اس کا چہرہ تو نظر آتا ہی نہیں۔ گندا اتنا کہ دو دو ہفتے سر کے بال نہیں دھوتا اور اس کے سر میں جوئیں پڑی رہتی ہیں اور رکے ہوئے پسینے کی جو بدبو ہے وہ اس کی ماں برداشت کر لیتی ہو گی' میری برداشت سے باہر تھی ....

"میرے سسرال کا کاروبار بڑے عرصے سے رنگون میں تھا۔ میرا خاوند مجھے رنگون لے آیا تب مجھے پتہ چلا کہ یہ تو بڑے امیر کبیر لوگ ہیں لیکن مجھے دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ یہاں میرے خاوند کے دو بھائی بھی تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو ایک نے کہا کہ لڑکی تو بڑی پیاری لے آیا ہے۔ میں پہلے ہی غصے اور نفرت سے بھری ہوئی تھی۔ میں نے صحن میں کھڑے ہو کر اعلان کر دیا کہ میں جس کی بیوی ہوں اسی کی بیوی بنوں گی اور کوئی دوسرا میرے قریب نہ آئے ورنہ میں کسی کا سر پھوڑ دوں گی۔ دونوں بھائی ہنس پڑے۔ میں ان کی ہنسی سمجھ گئی۔ وہ میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ میرے خاوند میں دوسری بُری عادت یہ تھی کہ دیسی اور سستی شراب پیتا تھا۔ اس شراب کی بدبُو ایسی تھی کہ مجھے اُبکائیاں آنے لگتی تھیں.... دو تین دنوں بعد میرے خاوند کے بھائیوں نے میرے ساتھ زبردستی شروع کر دی۔ میں گالیاں بکتی رہی یا کبھی رو پڑتی لیکن تینوں بھائی میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ میری حالت پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ اس سارے گھر میں مجھے سوائے بدبُو کے اور کچھ نہیں ملتا تھا یا یہ حیوانوں والا سلوک تھا جو میرے ساتھ ہو رہا تھا....

"چھ سات مہینے ہی گزرے تھے کہ یہ خبریں کانوں میں پڑنے لگیں کہ جاپان کی فوج علاقوں پر علاقے فتح کرتی ہوئی بڑی تیزی سے چلی آ رہی ہے.... لوگوں نے رنگون سے بھاگنا شروع کر دیا لیکن میرا خاوند اور اس کے بھائی اتنا اچھا کاروبار جو انہیں کھلی دولت دے رہا تھا' چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا اور

ایک روز جاپانی رنگون میں آ گئے۔ رنگون میں رہنے والے بڑی خوش تھے کہ انگریز چلے گئے ہیں اور جاپانی آ گئے ہیں۔ یہاں کے لوگ جاپانیوں کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔ ہندوستان کے جو لوگ بھاگ سکے وہ بھاگ گئے اور برمیوں نے ان کے گھروں کو لوٹ لیا۔

...

"پھر یہ شور اٹھنے لگا کہ جوان لڑکیوں کو گھروں میں چھپا لو کیونکہ جاپان کے فوجی لڑکیوں کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ برمیوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ انہوں نے جاپانیوں کی مدد کی ہے اس لئے جاپانی ان کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ نہیں ڈالیں گے لیکن جاپانیوں کو جہاں کہیں خوبصورت لڑکی نظر آئی' انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ بری ہے' ہندوستانی ہے یا کس ملک کی ہے۔ وہ اسے ساتھ لے گئے۔ میرا خاوند اور اس کے بھائی مجھے چھپا کر رکھتے تھے لیکن میرا دماغ ایسا خراب ہُوا کہ جوں ہی وہ سب باہر جاتے' میں باہر نکل کر گلی میں کھڑی ہو جاتی اور ایک روز جاپانی مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے....

"پہلے پہل تو میں اپنی اس غلطی پر بہت پچھتائی کہ میں کیا کر بیٹھی ہوں۔ قدرت نے مجھے جو خوبصورتی دی تھی اور اتنا اچھا جسم دیا تھا' یہ میرے لئے ایک مصیبت بن گیا۔ آخر ایک روز ایک افسر نے مجھے دیکھ لیا اور وہ اپنے ساتھ لے آیا۔ اب اتنے عرصے سے اس افسر کے ساتھ ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ باقاعدہ شادی نہیں ہوئی لیکن ہم نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے اور میں بڑے مزے کی زندگی گذار رہی ہوں۔ کھانے کو بہت اچھا ملتا ہے اور جاپان کی بہترین شراب پیتی ہوں"۔

میں اور فصیح بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تھے۔ فصیح بھی شاید میری طرح یہی سوچ رہا تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی دیکھنے میں انسان لگتی ہے لیکن مکمل حیوان ہے! حیوان بنا دی گئی ہے۔

سکھنی جب اپنی واردات سنا رہی تھی تو اس کی ساتھی الٰہ آباد کی ہندو لڑکی یوں بار بار ہنستی تھی جیسے کوئی بچہ بڑی دلچسپ اور مزاحیہ کہانی سن رہا ہو۔ میں اس سے پوچھنے ہی لگا تھا کہ وہ اتنی خوش کیوں ہے لیکن سکھ لڑکی نے اس کی واردات بھی سنا دی جو اس طرح ہے کہ اس کا باپ ہندوؤں کی طرح پیسے کا پجاری تھا۔ اس نے ایک بوڑھے ہندو تاجر سے خاصی رقم لے کر اپنی اس خوبصورت اور نوجوان بیٹی کو اس کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔

بوڑھا امیر کبیر تاجر تھا اور اس کا بزنس رنگون تک پہنچا ہُوا تھا۔ کچھ عرصہ رنگون میں گذارا کرتا تھا۔

ان کے ہاں عورت کی حیثیت ایک خریدی ہوئی لونڈی جیسی ہوتی ہے۔ لڑکی نوجوانی میں ہی اگر بیوہ ہو جائے تو وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی بلکہ اسے سارے خاندان کے لئے منحوس قرار دے کر الگ پھینک دیا جاتا ہے لیکن ہندو مرد بوڑھا ہی کیوں نہ ہو جائے وہ ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ برما پر جاپان کی فوج کے حملے سے چند مہینے پہلے یہ بوڑھا ہندو تاجر رنگون آیا اور اپنی نئی نویلی اور نوجوان دلہن کو بھی لے آیا۔ یہ لڑکی اس بوڑھے کی خدمت خاطر کرتی رہی لیکن اس بوڑھے نے لڑکی کی کوئی خدمت نہ کی بلکہ اسے پیسے کا محتاج رکھا کیونکہ وہ بہت ہی کنجوس تھا۔ تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ یہ لڑکی کس طرح زندگی کے شب و روز گذارتی رہی ہو گی۔ آخر جاپان کی فوج اس کے لئے نجات کا پیغام لے کر آئی۔

اس ہندو تاجر نے رنگون سے بھاگنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا اور پھر بھاگنے کا وقت گزر گیا۔ ایک روز اس لڑکی کو دو تین جاپانی فوجیوں نے دیکھ لیا اور اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کا انداز سکھ لڑکی جیسا نہیں تھا جو خود باہر گلی میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ ہندو جب جاپانیوں کے ہاتھ چڑھی تو وہ بہت روئی اور بہت تڑپی۔ اس کے ساتھ جاپانی فوجیوں نے حیوانوں اور وحشیوں جیسا سلوک کیا۔ آخر ایک روز ایک جاپانی افسر نے اسے دیکھا تو اپنے ساتھ لے آیا۔ سکھ لڑکی کی طرح اس جاپانی افسر نے بھی ہندو لڑکی کو بغیر شادی کئے بیوی بنا کر رکھا۔ اس ہندوانی نے ہمیں بتایا کہ اس کا افسر کہتا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ جاپان لے جائے گا۔

یہ تھی وجہ ان دونوں لڑکیوں کی خوشی کی۔ دونوں ہر طرح مطمئن تھیں اور ایک روز جاپان چلے جانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

○

ایک روز ہم رنگون پہنچ گئے۔ ہمارا ٹرک ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رُکا۔ یہ جاپان کی فوج نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ اسی میں انٹیلی جنس کا دفتر بھی تھا۔ اس عمارت کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ہمیں ان کمروں میں بھیج دیا گیا۔ میں اور فصیح ایک کمرے میں چلے گئے جس میں چارپائی اور ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔

برما کا شہر رنگون جس کی میں نے بہت باتیں سنی تھیں۔ بہت اچھا اور خوبصورت ش
تھا۔ اس میں ٹرامیں چلتی تھیں اور سڑکیں کشادہ تھیں مگر اب اس خوبصورت اور بر
بڑے شہر پر قہر برس رہا تھا۔ جاپانیوں نے تو اس شہر پر بمباری اور توپوں کی گولہ باری
بغیر ہی قبضہ کر لیا تھا لیکن اب امریکہ اور برطانیہ کے بمبار جہاز اس پر ظالمانہ بمباری
رہے تھے۔ شہر بُری طرح تباہ ہو رہا تھا۔ جاپانیوں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

رنگون میں ہم تین دن رکے رہے لیکن نہ دن کو چین اور نہ رات کو نیند۔ ہر وق
بم گرتے اور پھٹتے رہتے تھے۔ اور یہ خوف ہر لحہ دل کو گرفت میں لئے رکھتا تھا کہ ا
ایک بم اس عمارت پر گرے گا اور ہم سب اس کے ملبے تلے دب کر مر جائیں گے۔

فصیح مجھے اکیلا چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی کے سلسلے میں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک صبح وہ حس
معمول گیا لیکن فوراً" ہی واپس آ گیا۔ اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ ہم آج ہی ایک گ
بوٹ کے ذریعے ملایا کے ایک بڑے شہر کوالالمپور یا سنگاپور جا رہے ہیں۔

اس سے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارا جاپانی افسر آ گیا اور اس نے کہا کہ فوراً" نکلو
ٹرک میں بیٹھو۔ مجھے جاپانی وردی دی گئی اور ایک رائفل اور ایمونیشن بھی دیا گیا اور
کے علاوہ کچھ اور سامان جو انفنٹری کے ایک سپاہی کے پاس ہوتا تھا' مجھے دیا گیا۔ میں
اپنی وردی اور جوتے وہیں پھینک دیئے اور جاپانی فوج کا باقاعدہ سپاہی بن کر ٹرک
سوار ہو گیا۔ ٹرک ہمیں بندرگاہ پر لے گیا جہاں وہ گن بوٹ کھڑی تھی جس نے ہمیں
لے جانا تھا۔ وہاں تو ہر کام بڑی ہی جلدی میں ہو رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی گن بوٹ وا
نے زبانوں سے اور ہاتھوں کے اشاروں سے کہنا شروع کر دیا کہ فوراً" بوٹ میں سوا
جاؤ' وقت بہت کم ہے۔ ان کی یہ جلد بازی بتا رہی تھی کہ حالات ایمرجنسی والے ہیں
ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا۔

ہم سب گن بوٹ میں چلے گئے۔ گن بوٹ ایک بڑے سائز کی لانچ تھی جس
چاروں طرف مشین گنیں لگی ہوئی تھیں اور ان میں چار اکٹھی مشین گنیں ایک ٹ
فٹ کی ہوئی تھیں جو طیارہ شکن گنیں تھیں۔ اس بوٹ میں دو چھوٹے کیبن اور
خاصا کشادہ کیبن تھا جس میں ہمیں سفر کرنا تھا۔

جونہی ہم گن بوٹ میں داخل ہوئے بوٹ چل پڑی۔ میں نے زندگی میں پہلا
سمندر دیکھا۔ میں برساتی نالوں اور ندیوں کے دیس کا رہنے والا تھا۔ بارش برستی

ان ندی نالوں میں سیلاب آتا اور چند گھنٹوں بعد سیلاب اُتر جاتا اور سردیوں کے موسم
میں یہ ندی نالے بالکل خشک رہتے تھے۔ میں نے ہندوستان کے دریا دیکھے تھے اور جو
سب سے بڑا دریا دیکھا وہ برما کا ایراوتی تھا جسے میں نے موٹر بوٹ پر عبور کیا تھا۔ میں سمجھتا
تھا کہ اس سے بڑا دریا کوئی اور نہیں ہو سکتا لیکن جب سمندر کی وسعت دیکھی تو خیال آیا
کہ ایراوتی تو چھوٹی سی ایک ندی ہے۔

گن بوٹ جب کھلے سمندر میں گئی تو میں ہر طرف حیرت سے دیکھنے لگا اور مجھے خدا
یاد آ گیا۔ سمندر میرے تصوّروں سے بھی زیادہ وسیع و عریض تھا۔ ایک طرف تو ابھی
تک رنگون کا شہر اور ساحل نظر آ رہا تھا لیکن باقی اطراف سوائے اُفق کے پانی ہی پانی تھا۔
سمندر کا اپنا ایک تاثر ہوتا ہے۔ انسان کا ذہن کھلتا ہے پھر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ مجھے وہ
دودھ جیسے سفید پرندے بڑے اچھے لگ رہے تھے جن کی چونچیں سرخ تھیں اور پنجے
بطخوں جیسے تھے۔ یہ گن بوٹ کے اوپر منڈلاتے رہے۔ یہ پرندے اس توقع پر ہمارے
ساتھ ساتھ اُڑ رہے تھے کہ ہم کھانے کے لئے کچھ پھینکیں گے۔ وہ سمندر میں اُترتے
اور بطخوں کی طرح تیرتے تھے۔ پھر اُڑتے اور ہمارے اوپر آ جاتے۔ جب انہوں نے
دیکھا کہ اس بوٹ سے کھانے کو کچھ بھی نہیں مل رہا تو وہ واپس ہونے لگے۔ پھر میں نے
مچھلیاں دیکھیں۔ انہوں نے مجھے اور بھی زیادہ حیران کر دیا۔ ایک مچھلی جس کی لمبائی دو
فٹ یا اس سے ذرا کم ہو گی' پانی سے اُبھرتی اور تین چار فٹ پانی سے اوپر آ کر اڑتی اور پانی
سے اتنا ہی بلند رہتی اور پندرہ بیس گز آگے جا کر پانی میں ڈبکی لگا جاتی۔ میں مچھلیوں کا یہ
کھیل دیکھتا رہا اور اس کے ساتھ ہی سمندر نے اپنا ایک اور اثر دکھانا شروع کر دیا۔ میں
سر میں گرانی سی محسوس کر رہا تھا اور جسم کی کیفیت ایسی ہو گئی تھی جیسے بخار ہو گیا ہو۔
اس کے ساتھ ہی متلی محسوس ہونے لگی۔

میں اُس وقت لانچ کے اوپر کھڑا سمندر دیکھ رہا تھا۔ فصیح ایک ہندو ساتھی کے ساتھ
کیبن سے اوپر آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ فصیح نے بتایا کہ ہم
سب کی حالت یہی ہو رہی ہے اور چند گھنٹے یہ ایسی ہی رہے گی۔ اسے Sea Sickness
کہتے ہیں۔ بحری جہاز جب کھلے سمندر میں جاتا ہے تو تمام مسافر اسی بیماری میں مبتلا ہو
جاتے ہیں۔ متلی تو ہر کوئی محسوس کرتا ہے لیکن کچھ مسافر قے بھی کرنے لگتے ہیں۔ بخار
محسوس ہوتا ہے لیکن ہوتا نہیں۔ سر کی گرانی کو بعض مسافر بڑی مشکل سے برداشت

کرتے ہیں۔ اس کا کوئی علاج نہیں اور نہ ہی اس کا علاج کیا جاتا ہے۔ بارہ گھنٹوں کے اندر اندر حالت نارمل ہو جاتی ہے۔ فصیح نے مجھے سمندر کے یہ اثرات سمجھائے تو مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہُوا اور رات تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔

غروب آفتاب کے منظر کو میں آج تک نہیں بھولا۔ سورج جب غروب ہونے لگا تو یوں نظر آتا تھا جیسے اس طرف سمندر کو آگ لگ گئی ہو۔ سمندر کی حالت یہ تھی جیسے کسی نے سارے سمندر میں سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھیرے دیئے ہوں اور وہ چمک رہے ہوں.... پھر سورج سمندر میں ڈوب گیا۔

رنگون سے سنگاپور کم و بیش بارہ سو میل دور ہے۔ ہمیں یہ سارا سفر اس گن بوٹ پر طے کرنا تھا.... میں نے سمندر میں تین رنگ دیکھے۔ بندرگاہ سے ہٹے تو سمندر کا رنگ ہلکا سبز تھا اور دور گئے تو اس کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا اور شام سے کچھ دیر پہلے میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سمندر کا رنگ بالکل کالا ہو گیا تھا۔ میں سمجھا کہ سورج غروب ہو رہا ہے اس لئے سمندر کا گہرا نیلا رنگ کالا نظر آتا ہے۔ میں نے فصیح کو بتایا تو اس نے کہا کہ سمندر کا پانی بالکل شفاف ہوتا ہے۔ یہ رنگ سمندر کی گہرائی ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں سمندر کا رنگ کالا ہو گیا تھا وہاں سمندر بہت ہی گہرا تھا۔

فصیح نے ایک اور دلچسپ بات بتائی۔ یہ وہ کالا پانی تھا جو ہم اکثر سنا کرتے تھے۔ اس طرح کہ فلاں قاتل کو عمر قید ہو گئی ہے اور اسے کالا پانی بھیج دیا گیا ہے۔ آج بھی کبھی کبھی کالا پانی کا ذکر آتا ہے۔ یہ خلیج بنگال میں جزیروں کا ایک جھرمٹ ہے جسے جزائر انڈیمان کہتے ہیں۔ یہ جزائر رنگون سے کم و بیش 300 میل اور کلکتہ سے تقریباً 700 میل دُور ہیں۔ یہ بھارت کے جزیرے ہیں لیکن اب وہاں وہ قید خانہ نہیں جو انگریزوں کے زمانے میں ہُوا کرتا تھا۔ چونکہ ان جزیروں کے اردگرد پانی بہت ہی گہرا اور اس گہرائی کی وجہ سے کالا نظر آتا ہے اس لئے اسے کالا پانی کہتے ہیں۔ جزائر انڈیمان کے متعلق ایک چیز مشہور تھی کہ وہاں سے کوئی قیدی فرار نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان جزائر کے اردگرد نوکیلی چٹانیں ہیں جو سمندر کے پانی میں چھپی رہتی ہیں۔ یہ چٹانیں ہی آدمی کو زخمی کر کے ڈبو دیتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ ان جزیروں کے اردگرد شارک مچھلیاں بھی پائی جاتی تھیں یا اب بھی ہوں گی۔ یہ مچھلیاں انسان خور ہوتی ہیں۔ میں نے انگریزی کی ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ صرف ایک آدمی جو وہاں قیدی

فرار ہو کر برما پہنچ گیا تھا۔ وہ برما کا ہی رہنے والا تھا اور اس نے کسی کو قتل کر دیا تھا۔ مجھے اس کا نام تو یاد نہیں رہا' وہ وہاں کے ایک نمبردار کا بیٹا تھا۔ اُس وقت برما پر بھی انگریزوں کی بادشاہی تھی اس لئے وہاں کے قاتلوں کو بھی کالا پانی بھیجا جاتا تھا۔ انگریز نے برما میں نمبرداری سسٹم چلا رکھا تھا۔

بات چونکہ انڈیمان کی ہو رہی ہے یعنی کالا پانی کی تو میں ایک دو باتیں سنانا بے محل نہیں سمجھوں گا۔ جاپانیوں نے جب مشرق بعید کے ممالک پر قبضہ کر لیا تھا تو جزائر انڈیمان پر بے پناہ بمباری کی تھی۔ وہاں جتنے بھی قیدی تھے اور اس قید خانے کے عملے کی نفری تھی' وہ سب کے سب مارے گئے تھے۔ قیدیوں کے علاوہ ان جزائر کے باشندے بھی مارے گئے۔ وہ معصوم لوگ تھے۔ ان لوگوں کی اپنی ایک ثقافت' معاشرت اور تاریخ تھی۔ ایک جزیرے میں تو قیدی رہتے تھے اور دوسرے جزائر میں حبشیوں کی طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ان کے قد بہت ہی چھوٹے تھے اور وہ Pigmy کہلاتے تھے۔ ان کا لباس اتنا سا ہی ہوتا کہ کمر کے گرد ایک کپڑا لپیٹ کر رکھتے تھے اور باقی جسم' مردوں کا اور عورتوں کا بھی برہنہ رہتا تھا۔ وہ اس دنیا اور تہذیب سے بہت دور اور لاتعلق رہتے تھے جس دنیا میں ایک دوسرے کے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ہُوا تھا کہ ان جزائر کی وہ نسل بالکل ہی ناپید ہو گئی ہے اور اب بھارت نے وہاں نہ جانے کس قسم کی تنصیبات لگا رکھی ہیں اور وہاں بھارتی نیوی کا بھی کوئی سلسلہ ہے۔

جزائر انڈیمان یعنی کالا پانی کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ سیّد احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین کے بہت سے لیڈروں کو عمر قید دے کر کالا پانی بھیج دیا گیا تھا۔ تحریکِ مجاہدین کے کچھ مجاہدین کو بھی کالا پانی بھیجا گیا تھا۔ 1857ء میں جب مسلمانوں نے جنگِ آزادی لڑی اور ہار گئے تو انگریزوں نے چند ایک سرکردہ مسلمانوں کو عمر قید دے کر کالا پانی بھیج دیا تھا۔ انہی دنوں وہاں ایک مشہور واقعہ ہُوا۔ ایک پٹھان مجاہد نے انڈیمان کے قید خانے کے انچارج انگریز افسر کو دن دیہاڑے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر خنجر سے قتل کر دیا تھا۔ اسے وہیں سزائے موت دے دی گئی تھی۔

جب جاپانیوں نے جزائر انڈیمان پر بمباری کی تو کچھ قیدی مارے گئے اور بعض نے سمندر میں کُود کر جانیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن کچھ دُور تک ہی پہنچ سکے اور ڈوب

گئے۔ میں نے یہ بھی پڑھا تھا کہ ایک انگریز میجر تھوڑے سے قیدیوں کو یا سٹاف کے آدمیوں کو ایک کشتی میں لے کر ہندوستان کے ساحل تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ اکیلا زندہ پہنچا تھا یا غالباً" اس کے ساتھ ایک یا دو آدمی تھے۔ باقی سب بھوک اور پیاس سے مر گئے تھے اور ان کی لاشیں سمندر میں پھینک دی گئی تھیں۔ یہ انگریز میجر جس کا تعلق انڈیمان کے قید خانے سے تھا' بہت ہی بُری حالت میں پہنچا تھا۔ یہ دو مثالیں ملتی ہیں کہ ایک برما کا قیدی فرار ہو کر منزل پر پہنچ گیا تھا اور دوسرا یہ میجر تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ وہاں کوئی قید خانہ نہیں تھا۔ قیدی کھلے پھرتے تھے جیسے وہاں کے باشندے ہوں۔ وہ اپنا کام کاج کرتے تھے اور ان میں جن کا چال چلن ٹھیک رہتا اور جنہیں قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا' انہیں کچھ دنوں کی چھٹی دے کر ان کے گھروں کو بھیج دیا جاتا تھا.... میرے قصبے سے تین میل دور ایک گاؤں ہے جس کے دو سگے بھائی کالا پانی میں تھے۔ انہوں نے ایک بڑے ہی شریف اور معتزز آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ دونوں کو عمر قید ہوئی اور انہیں کالا پانی بھیج دیا گیا تھا۔ چھ ہی مہینے پہلے وہ دس دس دنوں کی چھٹی آئے تھے اور واپس چلے گئے تھے۔ پھر جنگِ عظیم کے دوران ان کے گھر سرکاری اطلاع آئی تھی کہ دونوں بھائی بمباری میں مارے گئے ہیں۔

○

"دعا کرتے رہنا دوستو!" — ہمارے ایک ہندو ساتھی نے کہا — "گن بوٹ والے بتاتے ہیں کہ بہت ہی خطرہ ہے کیونکہ امریکہ اور برطانیہ کی نیوی کے بحری جنگی جہاز اس سمندر میں پہنچ گئے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دن کے وقت کم ہی سفر کریں گے' رات کو سفر کیا کریں گے اور رفتار تیز رکھنی پڑے گی"۔

نقشے میں دیکھیں۔ برما کے دور نیچے ایک طرف ملایا نظر آتا ہے جو آج کل ملائشیا کہلاتا ہے۔ دوسری طرف سماٹرا ہے۔ ان دونوں کے درمیان تنگ سمندر ہے جو آبنائے ملاکا کہلاتا ہے۔ ہم ابھی اس سے بہت دور کھلے سمندر میں تھے اور کالے پانی میں سے گزر رہے تھے۔ بڑا ہی لمبا سفر تھا۔ اگر حالات امن والے ہوتے تو گن بوٹ کی جو رفتار تھی' اس سے ہم جلدی پہنچ سکتے تھے لیکن گن بوٹ سیدھے راستے پر نہیں جا رہی تھی۔

تین چار دنوں بعد بوریت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس لئے کہ باہر کا منظر ایک ہی جیسا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُفق کا بڑا ہی وسیع دائرہ ہے جس کے اندر پانی ہے اور اس پانی پر

صرف یہ ایک گن بوٹ ہے جو چلی جا رہی ہے۔ جسم اور دماغ پر سمندر کے جو اثرات ہوئے تھے' رات کو ہی ختم ہو گئے تھے۔ وقت گذارنا محال ہو رہا تھا۔ وہاں ایک ہی کام تھا کہ سارے ساتھی مل کر گپ بازی کرتے اور رات کو میں اور فصیح گن بوٹ کے عرشے پر جا بیٹھتے اور اپنے اپنے گھروں کی باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم اپنے گھروں کو اور گھر والوں کو بھول جائیں۔

"ایک بات بتاؤ" — ایک رات فصیح نے مجھ سے پوچھا — "تمہیں یہ خیال کس طرح آیا تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا ہے اور اس کا یہ طریقہ ہے کہ آئی این اے میں شامل ہُوا جائے"۔

"یہ بعد کی بات ہے" — میں نے کہا — "پہلے تو یہ پوچھو کہ میں فوج میں بھرتی ہی کیوں ہُوا تھا"۔

"چلو' یہی بتا دو" — فصیح نے کہا — "وقت گذارنا ہے' ایک دوسرے کی ایسی ہی باتیں سن لیں تو وقت بڑا ٹھیک گزرتا ہے"۔

میں نے اسے یہ ساری کہانی سنا دی جو آپ کو سنا چکا ہوں کہ میں بھرتی کیوں ہُوا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ جعلی پیر کو ہم نے کس طرح مار اپیٹا تھا اور پھر واجدہ کے خاوند آصف کی باتیں بھی سنائیں۔ پھر اسے بتایا کہ مجھے ہندوستان کی آزادی کا خیال کیوں آیا تھا۔ یہ تو میں اسے پہلے ایک دن سنا چکا تھا کہ میں دریائے ایراوتی کے پار جنگلوں میں کہاں کہاں خوار ہوتا پھر رہا تھا اور پھر کس طرح وہاں ایک بستی مل گئی جہاں میں رہا اور پھر یہ بھی کہ مجھے وہاں سے کس طرح نکلنا پڑا۔

"تم قیمتی آدمی ہو" — فصیح نے کہا — "تم شریف آدمی نہیں تھے لیکن ان برمیوں کی بستی میں آ کر شریف آدمی بن گئے۔ اگر کوئی اور تمہاری جگہ ہوتا' میں ہی ہوتا تو ان برمی لڑکیوں سے جو تمہیں پیر و مُرشد سمجھتی تھیں' پورا پورا لطف اٹھاتا.... میں تمہیں یہ بات اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی قیمت اور اپنی قدر پہچانو' یہ زندگی میں کسی نہ کسی مقام پر تمہارے کام آئے گی۔ گناہوں سے آدمی لطف تو اٹھا سکتا ہے لیکن زندگی میں جو خواری ملتی ہے' اس کے بارے میں نہیں سوچتا۔ ان جاپانی فوجیوں کو دیکھ لو۔ ان کا مورال کتنا ہائی ہے اور یہ کس طرح جانیں قربان کرتے ہیں۔ امریکہ اور انگریزوں نے ان پر جو اپنی فوجوں کا اور بمبار جہازوں کا دباؤ ڈالا ہُوا ہے' کوئی اور ہوتا تو کبھی کا بھاگ گیا

ہوتا لیکن جاپانیوں کو پیچھے ہٹانا ان دونوں بادشاہیوں کے لئے ایک مسئلہ بنا ہُوا ہے۔ ہانگ کانگ' سنگاپور اور ملایا کے ایک ہی حملے سے انگریز وہاں سے بھاگ گئے تھے لیکن ان جاپانیوں کو عورتوں کا جو چسکا ہے' اسی نے انہیں ایک کمزوری بن کر پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ اگر تم برمیوں کی اس بستی میں ان لڑکیوں کے ساتھ دلچسپی پیدا کر لیتے جو تم نے مجھے بتائی ہیں تو اس وقت تک تم انگریزوں کی انٹیلی جنس کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے ہوتے اور جیل میں ساری عمر کے لئے پڑے ہوئے ہوتے"۔

کہانی اتنی لمبی ہو گئی تھی کہ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی اور نیند آنے لگی۔ ہم دونوں اٹھے اور نیچے کیبن میں جا کر سو گئے۔

○

اگلی رات کھانا کھا کر ہم دونوں روزمرّہ کی طرح عرشے پر جا کر بیٹھ گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم اسی گن بوٹ میں پیدا ہوئے تھے اور اسی میں عمر گزر جائے گی اور ہماری لاشیں سمندر میں پھینک دی جائیں گی۔ سوائے سمندر کے یا افق کے اور کوئی چیز اس دنیا کی نظر نہیں آتی تھی۔ کبھی جاپانیوں کا کوئی بحری جنگی جہاز دور سے گزرتا نظر آ جاتا تھا۔

"فصیح بھائی!" — میں نے کہا — "تم سے یہ پوچھنا بے کار ہے کہ تمہیں ہندوستان کی آزادی کا خیال کس طرح آیا تھا۔ تمہاری تعلیم میری طرح میٹرک ہی ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ میں تو آوارہ ہی پھرتا اور بدمعاشیاں کرتا رہا ہوں"۔

فصیح احمد نے پہلے تو آہ بھری پھر سر جھکا لیا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ میں بھی سنجیدگی سی تھی۔ اس نے کوئی اور ہی واردات سنا دی۔ یہ سنانے سے پہلے میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہر انسان ایک کہانی کا کردار ہوتا ہے۔ حوالدار فضل داد برما کے جنگلوں میں مجھے ملا تھا تو اس نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ میں اپنی کہانی آپ کو سنا چکا ہوں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی ذات میں کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں رکھتے۔ اگر آپ دوسروں کے دکھ بانٹنے کا تہیہ کر لیں تو میں کہتا ہوں ہر کسی کے ساتھ ایک قصّہ وابستہ ہے اور بعض انسانوں کے قصے تو رونگٹے بھی کھڑے کر دیتے ہیں۔

"میں تمہیں اپنی بات نہیں سنانا چاہتا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا راز ہے جو کسی

اور کو معلوم نہیں ہونا چاہئے لیکن میں تمہیں یہ راز دیتا ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ ہم واپس اپنے وطن کبھی نہیں جا سکیں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم نے مجھے بھائی سمجھ کر اپنی باتیں سنائی ہیں۔ اب میری سنو.... میں انڈین آرمی سے اس لئے بھگوڑا نہیں ہُوا کہ آئی این اے میں شامل ہو کر ہندوستان کو آزاد کراؤں گا بلکہ اصل وجہ یہ ہوئی کہ مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا اور آگے ایک پناہ موجود تھی۔ یہ تھی انڈین نیشنل آرمی۔ میں نے سوچا چلو اس بہانے ہندوستان کو آزاد کرا لیں گے' اور میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ جاپانیوں نے ہندوستان کو آزاد کرا دیا تو مجھے فوج میں اونچا عہدہ مل جائے گا۔ کوئی اونچا عہدہ نہ سہی' لیفٹیننٹ یا کیپٹن تو بنا ہی دیں گے"۔

فصیح نے جو بات سنائی وہ میں اپنی زبانی پیش کرتا ہوں.... ہمارے علاقے کے لوگوں کی طرح فصیح کے خاندان کی بھی یہ روایت تھی کہ فوج میں بھرتی ہونا ہے۔ اس کا باپ ریٹائرڈ صوبیدار میجر تھا۔ ایک چچا صوبیدار تھا۔ انگریزوں نے انہیں نہری علاقے میں مربعے دیئے تھے۔ فصیح راجپوت ذات کا تھا۔ چونکہ اس نے دس جماعتیں پاس کر لی تھیں اس لئے اسے حوالدار کلرک بھرتی کیا گیا۔ جنگِ عظیم سے پہلے فوج میں سپاہی کلرک رکھے جاتے تھے۔ جنگِ عظیم کے تیسرے سال ہر سپاہی کلرک کو حوالدار کلرک بنا دیا گیا تھا۔ فصیح کی سروس چار سال ہو چکی تھی۔

اس کی ایک چھوٹی بہن تھی جو شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی اور اس کے رشتے کے پیغام آ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی انہیں پسند نہ آیا۔

فصیح کے والدین کی خواہش تھی کہ کوئی بڑے زمیندارے والا خاندان مل جائے۔ والدین کی عموماً" خواہش یہی ہوتی ہے کہ لڑکی اس گھر میں دی جائے جس گھر میں روپیہ پیسہ عام ہو اور آمدنی کے ذرائع لامحدود ہوں۔ یہ خیال خام ہے کہ امیر گھرانے میں لڑکی سکھ چین سے رہتی ہے۔ کچھ ایسا ہی خیال ان لوگوں کا تھا۔ آخر بیس میل دُور کے ایک بڑے گاؤں سے پیغام آ گیا۔ فصیح کے والدین کو اتنا ہی بتایا گیا کہ ان کا زمیندارہ اتنا بڑا ہے کہ گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل لگی رہتی ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ لڑکا خوبصورت جوان ہے اور ذات بھی راجپوت تھی۔ یہ لوگ اس سے زیادہ لڑکے والوں سے واقف نہیں تھے۔ دیکھنا تو یہ بھی چاہئے تھا کہ اخلاق اور کردار کے لحاظ سے اور نیّت کے لحاظ سے وہ لوگ کیسے ہیں۔ اس کی بجائے انہوں نے اس گھر کی زمینداری اور امیری دیکھی۔

دراصل انہوں نے دیکھا کچھ بھی نہیں۔

رشتے کا پیغام وہاں کے رہنے والے ایک میاں بیوی لائے تھے جو فصیح کے والدین کو جانتے تھے۔ یہ صرف سلام و دعا تھی اور انہیں معلوم تھا اس گھر میں ایک لڑکی ہے۔ ان میاں بیوی نے لڑکے والوں کی اتنی زیادہ تعریفیں کیں کہ فصیح کے والدین چکر میں آ گئے۔ وہ ایک روز لڑکے والوں کے ہاں چلے گئے۔ انہوں نے لڑکے کو دیکھا تو باغ باغ ہو گئے۔ لڑکے کی شکل و صورت تو بہت ہی اچھی تھی لیکن جسم کے لحاظ سے وہ مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ گٹھا ہُوا جسم اور دراز قد۔ انہیں اس نوجوان میں جو بات سب سے زیادہ اچھی لگی وہ یہ تھی کہ شرمیلا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے لئے فصیح کے باپ کے پاس بیٹھا تو سوائے ہنسنے' مسکرانے اور شرمانے کے اس نے کوئی بات نہ کی اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

کوئی مجھ سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ یہ واقعہ ہی کردار کی خوبی تھی کہ اتنے بڑے زمیندار کا بیٹا ہو کر وہ شرمیلا تھا۔ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کے بیٹے تو اپنے آپ کو شہزادے سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے گاؤں کے لوگوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں۔ ہر طرح کی بدتمیزی اور بے ہُودہ حرکتیں کرتے ہیں اور عورت بازی ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ فصیح کے والدین کو بھی لڑکے کی یہ ادا بڑی اچھی لگی اور انہوں نے اپنی بیٹی کا رشتہ انہیں دے دیا۔

فصیح کے باپ نے فصیح کو خط لکھا کہ اس کی بہن کا رشتہ طے ہو گیا ہے اور اب شادی کا دن مقرر کرنا ہے۔ خط میں باپ نے لڑکے کی اور لڑکے کے باپ کی بہت تعریفیں لکھی تھیں۔ اُس وقت فصیح کوہاٹ چھاؤنی میں تھا۔ فصیح نے انہیں لکھا کہ اتنی جلد بازی نہیں کرنی چاہئے تھی' وہ چھٹی آتا اور اچھی طرح ان لوگوں کو دیکھ بھال لیتا اور وہاں کے کچھ لوگوں سے رائے لے لیتا لیکن بات طے ہو چکی تھی اس لئے فصیح نے بھی اسے قبول کر لیا۔ شادی کا دن بھی مقرر ہو گیا۔ فصیح پانچ دنوں کی چھٹی لے کر آیا۔ بارات بڑی شان و شوکت سے آئی اور لڑکی کی ڈولی چلی گئی۔ فصیح نے مجھے بتایا کہ دولہا اسے بھی بہت اچھا لگا تھا۔ پتہ چلتا تھا کہ کوئی مرد ہے۔ خوبرو بھی اور بارعب بھی!

○

جب جنگ شروع ہوئی تھی تو تمام فوج کی چھٹیاں بند کر دی گئی تھیں۔ جنگ کے

جب طول کھینچا تو چھٹیاں کھول دی گئیں۔ چھٹیوں سے مطلب لمبی چھٹی ہے۔ ہر فوجی جنگ سے پہلے ڈیڑھ مہینے کی اکٹھی چھٹی لے سکتا تھا لیکن جنگ میں جب چھٹیاں کھلیں تو یہ معیاد ایک مہینہ کر دی گئی۔ فصیح کی بہن کی شادی کو تین مہینے ہو چکے تھے جب فصیح ایک مہینہ چھٹی لے کر گھر آیا۔ بہن بھائی کو آپس میں پیار ہوتا ہی ہے لیکن فصیح نے بتایا کہ اسے اپنی اس بہن کے ساتھ اور بہن کو اس کے ساتھ غیر معمولی طور پر بہت زیادہ پیار تھا۔ ان دنوں اس کی بہن اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ دیہات کی لڑکیاں اپنی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ اپنے دکھ سکھ کی باتیں کیا کرتی ہیں' باپوں اور بھائیوں کے ساتھ نہیں لیکن فصیح اور اس کی بہن کی آپس میں ایسی بے تکلفی تھی کہ بہن نے فصیح کو بتایا کہ ان کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہُوا ہے۔ دھوکہ یہ ہُوا کہ لڑکا دیکھنے میں تو خوبرُو اور بارعب ہے لیکن ذہنی طور پر وہ ٹھیک نہیں۔ اس میں کوئی دماغی نقص تھا یا نہ جانے کیا تھا۔ فصیح کو بتایا کہ پہلی رات دولہا کو دھکیل کر دلہن کے کمرے میں داخل کیا گیا لیکن اس کے چہرے پر اور حرکتوں میں خوفزدگی کی کیفیت صاف نظر آتی تھی۔ اسے تو جیسے یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اب وہ دولہا ہے۔ دلہن نے تنگ آ کر اس کا بازو پکڑا تو وہ بازو چھڑا کر کمرے سے نکل گیا۔

فصیح کی بہن کو پہلے تو یہ صدمہ ہوا کہ اس کا دولہا کسی اور لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کی مرضی کے مطابق نہیں اس لئے وہ دلہن کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ دلہن روتے بیٹھ گئی اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے' بھاگ جائے یا اپنی ساس اور سُسر سے پوچھے کہ یہ کیا معاملہ ہے اور اگر دُولہا اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تو طلاق دے کر رخصت کر دے لیکن ہُوا یوں کہ پہلی رات جب دُولہا کمرے سے نکل گیا تو اس کی ماں اور ایک بہن دلہن کے پاس آئی۔

انہوں نے فصیح کی بہن سے کہا کہ لڑکا بڑا شرمیلا ہے اور دلہن اُسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لگا لے لیکن فصیح کی بہن ایسی کم عقل تو نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ شرمیلے آدمی کس طرح کے ہوتے ہیں۔ دولہا کا تو انداز اور طور طریقہ بھی کچھ اور تھا۔ دلہن نے اپنی ساس اور اس کی بیٹی کو صاف کہہ دیا کہ تمہارے بیٹے نے اسے قبول نہیں کیا اس لئے فوراً اسے طلاق دے دی جائے۔ دولہا کی ماں کے آنسو نکل آئے۔ دولہا کی بہن کی بھی یہی حالت ہوئی۔ انہوں نے دلہن کا دل پرچانے کی بہت کوشش کی

اور دولہا پر پردہ بھی ڈالا لیکن دلہن کو شک ہو گیا تھا کہ جو کچھ بھی ہے' معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ دولہا کی ماں اور بہن نے دلہن کی منت سماجت شروع کر دی اور کہا کہ وہ ان کی عزت رکھے اور دولہا کو لاڈ پیار سے اپنے ساتھ لگا لے۔

دولہا آدھی رات کے بعد اس کمرے میں آیا۔ دلہن نے اس کے ساتھ باتیں اور پیار و محبت کی حرکتیں کیں تو دولہا احمقوں کی طرح ہنس پڑا اور پھر ایسی باتوں پر بھی ہنستا رہا جن پر ہنسی نہیں آیا کرتی یا آنی نہیں چاہئے۔ ہنستے ہنستے وہ اس طرح سنجیدہ ہو جاتا تھا جیسے جلتے ہوئے بلب کا سوئچ آف کر دیا جائے۔ وہ سو تو گیا لیکن دلہن سے دور ہٹ کر جیسے اس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ اگلے روز دولہا کی ماں اور بہن پھر دلہن کے پاس آ بیٹھیں اور اسے کہا کہ جس طرح اس نے رات کو دولہا کو اس کمرے میں رکھا تھا اسی طرح اسے اپنے ساتھ رکھے اور اس کے ساتھ زیادہ تر لاڈ اور پیار کرے۔

فصیح کی بہن پہلے پھیرے پر اپنے میکے آئی تو اس نے اپنی ماں کو اپنے دولہا کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔ اسے شاید امید تھی کہ وہ دولہا کو اپنے راستے پر لے آئے گی۔ رواج کے مطابق دلہن کے پہلے پھیرے پر دولہا ساتھ تھا اور رواج کے بالکل خلاف اس کی بڑی بہن بھی ساتھ تھی۔ اگلے روز وہ واپس چلے گئے اور دلہن بھی ان کے ساتھ گئی۔ فصیح کے باپ کو ذرا سا شک ہوا کہ دولہا اتنا شرمیلا بھی نہیں ہو سکتا کہ بات ہی نہ کرے۔ بہرحال جہاں تک میرا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو دھوکہ دیے رکھا کہ ان کا داماد شریف اور شرمیلا لڑکا ہے۔ بہن نے فصیح کو بتایا کہ اس کے بعد اس کے دولہا کا یہ رویہ تھا کہ اس کے کمرے میں آ جاتا لیکن ویسے ہی ذرا سی بات پر وہ منہ بسور کر چلا جاتا۔ دلہن اب اس گھر سے واقف بھی ہو چکی تھی اور بے تکلف بھی۔ وہ اس کے پیچھے جا کر اسے واپس لے آتی تھی۔ دولہا دلہن کے کمرے سے بھاگ کر اپنی ماں کے پاس چلا جاتا تھا۔ فصیح کی بہن اسے وہاں سے اپنے کمرے میں لانے کے لئے جاتی تو اس کا یہ خاوند بچوں کی طرح ماں سے کہتا تھا کہ یہ لڑکی مجھے چھیڑتی ہے اور سونے نہیں دیتی۔ اس کی ماں کبھی تو ہنس پڑتی اور کبھی اسے ڈانٹ دیتی اور کبھی ویسے ہی کوئی بات کہہ کر اسے بہلا لیتی تھی۔

تین مہینے بعد فصیح کی بہن نے اپنی ماں کو بتایا کہ اس کا خاوند نام کا خاوند ہے اور ان

میاں بیوی کا کوئی تعلق قائم نہیں ہوا۔ فصیح کی بہن پردہ نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے سسرال کے کھیت دیکھنے کے لئے یا سیر سپاٹے کے لئے باہر نکل جاتی تھی۔ ایک دو لڑکیاں اس کے قریب آ گئیں جن کے ساتھ اس نے بے تکلفی پیدا کر لی۔ ان لڑکیوں نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور زمیندار کا یہ بیٹا ذہنی لحاظ سے بالکل ٹھیک نہیں اور اپنی برادری تو دور کی بات ہے' اپنے خون کے رشتے داروں نے بھی اسے اپنی بیٹی نہیں دی تھی۔ جہاں سے انہوں نے رشتہ مانگا وہاں سے ٹکا سا جواب مل گیا۔ یہ سن کر فصیح کی بہن تو چکرا گئی اور اسے کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو گا۔

فصیح اپنی بہن کی شادی کے تین مہینوں بعد آیا تھا۔ ان تین مہینوں میں بہت کچھ ہوا اور کئی پردے اٹھے تھے۔ فصیح کی بہن پندرہ بیس دنوں سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس کے سسرال سے پیغام آتے تھے کہ لڑکی کو چھوڑ جائیں لیکن فصیح کا باپ جواب بھیجتا تھا کہ ہمارے داماد کو بھیجو' وہ آ کر اپنی بیوی کو لے جائے۔ اُدھر سے کوئی بھی نہیں آتا تھا۔ دراصل فصیح کا باپ داماد کو بلا کر اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا مگر اس کے داماد کے والدین اسے اسی لئے نہیں بھیجتے تھے کہ اس کی یہ دماغی یا ذہنی کمزوری بے نقاب ہو جائے گی۔ لڑکی نے کہہ دیا کہ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ البتہ میرا خاوند آ جائے تو وہ جیسا کیسا بھی ہے' میں چلی جاؤں گی لیکن اس کا خاوند نہیں آ رہا تھا اور اتنے میں فصیح چھٹی آ گیا۔

○

فصیح نے جب یہ ساری باتیں سنیں تو وہ طیش میں آ گیا۔ اس نے پہلے تو اپنے ماں باپ کو بُرا بھلا کہا جنہوں نے اندھا دھند اپنی بیٹی کا رشتہ وہاں طے کر دیا تھا۔ پھر یہ فیصلہ سنایا کہ اس کی بہن اس وقت تک سسرال نہیں جائے گی جب تک اُدھر سے اسے کوئی لینے نہیں آتا۔

"اُدھر سے کوئی لینے نہیں آئے گا" — باپ نے فصیح سے کہا — "اس کی ایک وجہ ہے جو میں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتائی' اب سن لو۔ میں بیٹی کے سسرال گیا تھا۔ اس کے سُسر نے بڑے رعب سے مجھے کہا کہ بیٹی کو بھیج دو ورنہ پچھتاؤ گے۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ رعب میں آیا ہوا ہے تو میں نے بھی رعب سے بات کی اور کہا کہ تم نے ہمیں دھوکہ دیا ہے کہ پہلے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا بیٹا ذہنی مریض ہے۔ یہ سن کر وہ اور زیادہ غصے میں آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ میری بیٹی کو طلاق دے دو کیونکہ تمہارا بیٹا کسی

بھی پہلو سے خاوند بننے کے قابل نہیں اور میں اپنی بیٹی کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس نے کہا کہ ہم طلاق نہیں دیں گے۔ بیٹی کو گھر بٹھائے رکھو.... میں نے کوئی اور بات نہ کی اور واپس آ گیا"۔

فصیح نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ بہن کو طلاق دلوائے گا لیکن اس نے یہ بھی سوچ لیا کہ یہ کام رعب سے اور للکارنے سے یا لڑائی جھگڑے سے نہیں ہو گا۔ یہ تو اس نے دیکھا کہ حالات کتنے ہی خطرناک کیوں نہ ہو جاتے وہ بڑے ٹھنڈے دل سے اور دماغ کو اپنے قابو میں رکھ کر سوچتا اور فیصلہ کیا کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اپنی بہن کو طلاق دلوانے کے لئے جذبات اور غصے سے نہیں عقل سے ہی کام لیا ہو گا۔ ایک تو اسے غصہ ان میاں بیوی پر تھا جنہوں نے آ کر اس کے والدین کو سبز باغ دکھائے' جھوٹ بولے اور انہیں اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے بیٹی کا رشتہ وہاں دے دیا لیکن ان پر غصہ اتارنا بعد کا کام تھا۔ پہلا کام تھا بہن کو طلاق دلوانا۔

اس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ بات کی۔ اس کے دوست بھی اس جیسے عقل والے تھے۔ ان میں سے ایک کے رشتہ دار اس گاؤں میں رہتے تھے جس گاؤں میں فصیح کی بہن بیاہی گئی تھی۔ اس نے فصیح کو بتایا کہ وہ اس گاؤں جا کر پہلے تو یہ پتہ کرے گا کہ اس لڑکے میں کیا نقص ہے۔ اس نے یہ رائے دی تھی کہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسا نقص نہ ہو اور کوئی اور وجہ ہو کہ وہ اپنی بیوی کو پسند نہیں کرتا۔ فصیح نے یہ بات مان لی اور دوست سے کہا کہ وہ اسی روز چلا جائے۔ دوست چلا گیا۔

اس دوست نے واپس آ کر جو بات سنائی وہ کوئی عجیب نہیں تھی۔ یہ میں مختصراً بتا رہا ہوں کہ یہ لڑکا دو بہنوں میں اکلوتا تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی بیٹا نہ ہُوا۔ ماں باپ نے اس بیٹے کو بڑا ہونے ہی نہیں دیا۔ ہر وقت اٹھائے اٹھائے رکھتے اور اس کی ہر بات مانتے تھے۔ ذرا آنکھوں سے اوجھل ہُوا تو ماں پریشان ہو کر دوڑ پڑی اور جہاں کہیں اسے دیکھا اٹھا کر گھر لے آئی۔ اس عمر میں بھی ماں کا رویہ ویسا ہی تھا جیسے اس کا یہ بیٹا ابھی دودھ پیتا بچہ ہو۔ ماں نے اس میں مردانگی پیدا ہی نہیں ہونے دی۔ یہی رویہ باپ کا تھا۔ امیر کبیر گھرانہ تھا اس لئے نوکروں کی اور بیگار پر کام کرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ بیٹے کو ماں باپ نے نہ کوئی ذمہ داری دی نہ اسے کوئی ذمہ داری لینے دی۔ وہ اگر مردوں کی طرح خود اعتمادی کے ساتھ بات کرتا تھا تو ماں کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ

بچوں جیسی باتیں کیا کرے۔

یہ رائے اور یہ تجزیہ ایک پڑھے لکھے آدمی نے کیا تھا اور اس نے فصیح کے اس دوست کو بتایا تھا۔ دیہاتی لوگ اسے قسم کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ کسی کا بیٹا اس طرح کا نکل آئے تو وہ نفسیاتی تجزیے نہیں کرایا کرتے بلکہ اپنے پیر کے پاس چلے جاتے ہیں یا انہیں کوئی شاہ جی مل جاتے ہیں اور وہ انہیں بتاتے ہیں کہ بیٹے کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ بچوں کی سی باتیں کرتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا دماغ کام ہی نہیں کرتا۔ پھر پیر صاحب یا شاہ جی یہ تشخیص کرتے ہیں کہ اس پر آسیبی اثر ہے یا اس پر سایہ ہے یا یہ کہ کسی دشمن نے اس پر اُلٹے تعویذ کرائے ہیں۔

فصیح کا یہ دوست بھی میٹرک پاس تھا اور عقل رکھتا تھا۔ اس نے دو تین اور آدمیوں سے اور اپنے رشتہ داروں سے بھی رائے لی تھی۔ سب نے یہی رائے دی کہ لڑکا جھلا (پاگل) ہے۔ اس دوست نے فصیح کو یہ بتایا کہ اس لڑکے کے سُدھرنے کا یعنی نارمل ذہنی حالت میں آنے کا کوئی امکان نہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اس لڑکے پر ایسا پردہ پڑا ہُوا تھا کہ ہر کسی کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ شخص ذہنی طور پر معذور ہے۔ وہ خود تو اتنا زیادہ بولتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے کوئی بات کرتے تھے تو مسکرا کر ادھورا سا جواب دیتا اور ہنسنے لگتا تھا۔ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جو اسے جھلا سمجھتے تھے۔ بہرحال دوست نے فصیح سے کہا کہ جس طرح بھی ہو' خواہ عدالت میں جانا پڑے' اس سے طلاق لو ورنہ فصیح کی بہن باقی عمر گھر بیٹھی کڑھتی رہے گی۔

فصیح کے لئے یہ ایسا مسئلہ بن گیا جس کا اسے کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنی اس بہن پر اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار تھا۔ اس نے اپنے ان دوستوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا اور پھر اس کے دو اور دوست تھے جو سکھ تھے۔ وہ سکھوں کی اکثریت کا علاقہ تھا۔ سکھ اور مسلمان آپس میں ٹھیک ٹھاک سلوک اور اتفاق سے رہتے تھے۔ یہ تو 1947ء میں سکھ ہندوؤں کی باتوں میں آ گئے اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے ورنہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے بلکہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کو تو سکھ اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ ان سکھ دوستوں نے بھی فصیح سے کہا کہ طلاق لینے کی کوئی ترکیب سوچیں۔

ان دونوں سکھوں میں ایک فصیح کا زیادہ ہی گہرا دوست تھا۔ اس نے فصیح سے

علیحدگی میں کہا کہ وہ ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہے اور اگر نوبت لڑائی مار کٹائی تک پہ
گئی تو وہ اپنے آدمی ساتھ لے آئے گا اور فصیح کا ساتھ دے گا۔ فصیح لڑائی مار کٹائی
قائل نہیں تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ امن پسند تھا اور لڑنے سے ڈرتا تھا بلکہ
مطلب یہ کہ وہ لڑنے مرنے کی بجائے استادی سے طلاق حاصل کرنا چاہتا تھا۔

جب فصیح مجھے یہ قصہ سنا رہا تھا تو میں ذرا سا بھی حیران نہیں ہو رہا تھا' اور مجھے امید
ہے کہ میری یہ تحریر پڑھنے والے بھی حیران نہیں ہوں گے۔ ہمارے معاشرے میں
دستور ہے کہ اپنے بیٹے کو بیاہتا ہے خواہ وہ شادی کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ لڑکا نکما
نکھٹو ہو' نشئی ہو یا پاگل ہی کیوں نہ ہو' لڑکی والوں کو دھوکے میں رکھا جاتا اور ایک لڑکی
زندگی برباد کر دی جاتی ہے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان ذہنی طور پر اس طرح معذور ہے کہ ہر وقت
ڈیپریشن میں رہتا ہے اور کوئی کام نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کی سنتا ہے تو ڈاکٹر یا حکیم یا کو
عامل اس کا یہ علاج بتاتا ہے کہ اس کی شادی کر دی جائے تو یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسے
لڑکوں کی شادیاں عموماً" فریب کاری کے ذریعے کرائی جاتی ہیں۔ رشتے کرانے والی مائیں
ایسے رشتے پکے کرانے میں خاص رول ادا کرتی ہیں اور منہ مانگی اُجرت وصول کر لیتی
ہیں۔ ایسے ذہنی مریض لڑکوں کا شادی کے بعد انجام یہ ہوتا ہے کہ پہلے تو وہ اکیلا برباد
رہا تھا' اس کے بعد ایک لڑکی بھی اس کے ساتھ بندھی تباہ و برباد ہوتی ہے۔

ہم اس وقت اپنے وطن سے تھوڑی دُور نہیں بلکہ بہت ہی دُور سمندر میں ایک
گن بوٹ پر چلے جا رہے تھے۔ میرے اور میرے وطن کے درمیان دو ملک حائل تھے
ایک برما اور دوسرا ہندوستان لیکن فصیح مجھے یہ قصہ ایسے پُر اثر انداز سے سنا رہا تھا کہ
اپنے وطن پہنچ گیا اور یوں لگا جیسے میں ایک فلم دیکھ رہا تھا۔ قصہ تو دردناک اور افسوسناک
تھا لیکن اس نے مجھے میرے اپنے معاشرے میں پہنچا دیا۔

دوستوں نے فصیح کو یہ مشورہ دیا کہ ایک بار خود اپنی بہن کے سسر سے ملے اور اس
کے ساتھ صلح صفائی کے انداز سے بات کرے اور دیکھے کہ اس کا رویہ کیا ہے۔ ہو سکتا
ہے کہ وہ طلاق دینے پر راضی ہو جائے۔

فصیح کی چھٹی صرف ایک مہینہ تھی اور ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ وہ اگلے ہی روز اپنی
بہن کے سُسرال چلا گیا۔

○

فصیح نے اپنی بہن کے سُسر کے ساتھ برخورداری سے بات کی اور کہا کہ وہ اگر اپنے
بیٹے کا کوئی علاج کروا لے تو فصیح خود اپنی بہن کو یہاں چھوڑ جائے گا۔ سُسر نے یہ بات سنی
تو وہ غصے میں آ گیا۔ وہ یہ الفاظ تو سننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا ذہنی مریض ہے۔ اس
نے فصیح کو ڈانٹا بھی اور دھمکیاں بھی دیں۔ فصیح نے اس کا یہ سلوک برداشت کیا اور اس
کی منتیں کیں کہ وہ اس کی بہن کے حال پر رحم کرے اور اسے طلاق دے دے۔

"طلاق تو ہم ساری عمر نہیں دیں گے" ـــــ سُسر نے کہا ـــــ "جاؤ اور اپنی بہن کو
گھر بٹھائے رکھو۔ اگر آج کے بعد یہاں طلاق لینے آئے تو تمہاری لاش واپس جائے
گی۔ جب تک میرا بیٹا زندہ ہے طلاق نہیں ملے گی"۔

فصیح وہاں سے آ گیا اور اب اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی دماغی مریض ہو گیا ہے۔
اپنی بہن کے سُسر نے اس کے ساتھ سلوک ہی ایسا بُرا کیا تھا کہ فصیح کا دماغ کسی اور
راستے پر چل پڑا۔ سُسر نے کہا تھا کہ جب تک اس کا بیٹا زندہ ہے طلاق نہیں ملے گی۔
فصیح یہ سوچتا ہُوا گھر آیا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اس کا بیٹا زیادہ دن زندہ ہی نہ رہ
سکے۔

فصیح نے اپنے مسلمان دوستوں کو تو اتنا ہی بتایا کہ اس کی بہن کے سُسر نے اس کے
ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور طلاق سے صاف جواب دے دیا ہے لیکن اپنے دو سکھ
دوستوں کو اس نے کوئی اور ہی بات بتائی۔ اس نے انہیں ایک تو اپنی بہن کے سُسر کا
سلوک سنایا اور یہ کہا کہ وہ اس کے بیٹے کو زندہ نہیں رہنے دے گا لیکن اسے کوئی ایسا
طریقہ نہیں سوجھ رہا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا
کہ وہ اپنی بہن کے خاوند کو ایسے طریقے سے مارے کہ کسی کو پتہ نہ چل سکے کہ اس کا
قاتل کون ہے۔ فصیح نے یہ باتیں اپنے سکھ دوستوں کے ساتھ اس وجہ سے کی تھیں کہ
اس قسم کے خطرناک فیصلے سکھ ہی کر سکتے تھے۔

اس کے سکھ دوستوں نے اسے کہا کہ بات اگر صرف قتل کرنے کی ہوتی تو وہ دوستی
کا حق اس طرح ادا کرتے کہ اس شخص کے گاؤں جا کر اسے قتل کر دیتے لیکن طریقہ
استادوں والا استعمال کرنا ہے۔ دونوں سکھ اور فصیح طریقے سوچتے رہے۔ تینوں نے کوئی
نہ کوئی طریقہ بیان کیا لیکن ایسا کوئی طریقہ سامنے نہیں آ رہا تھا جس سے قاتل کا سراغ نہ

ملتا۔ اچانک ایک سکھ کے دماغ میں ایک طریقہ آگیا۔

"تھوڑی سی رقم لگے گی" ـــ ایک سکھ دوست نے کہا ـــ "میں ایک سنیاسی جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آج کل وہ کہاں ہے۔ ان لوگوں کے پاس ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا ایک قطرہ زبان پر رکھو تو آدمی وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے لیکن ہمیں زہر نہیں چاہئے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ لاش کا جب پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے تو پتہ چل جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ پھر قاتل کا سراغ بھی مل جاتا ہے.... سنیاسی میں پوچھوں گا کہ کوئی ایسا زہر دے دے جس کا اثر آہستہ آہستہ ہو خواہ ایک مہینہ جائے دو مہینے لگ جائیں' امید ہے کہ ایسا زہر مل جائے گا"۔

فصیح نے اسے کہا کہ ایسا زہر لادو اور سنیاسی جتنے پیسے مانگے گا وہ دے گا۔

یہ سکھ اسی وقت فصیح کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ آج کل تو پاکستان میں رہنے والے سنیاسیوں کو جانتے ہی نہیں' انگریزوں کے وقتوں میں سنیاسی جنگلوں میں رہتے تھے ایسی جڑی بُوٹیاں ڈھونڈ نکالتے تھے جن سے عام لوگ واقف نہیں ہوتے۔ وہ دوا بناتے تھے اور ان کے پاس ہر مرض کا علاج ہوتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ ان سنیاسیوں پاس سانپوں اور بچھوؤں کا زہر بھی ہوتا ہے.... اس سکھ کو معلوم تھا یہ سنیاسی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے تین ساڑھے تین میل دُور ڈیرے ڈالے ہوئے تھے وہاں جا پہنچے۔

بڑا سنیاسی اس سکھ کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ فصیح کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوست کو کیوں اور کس طرح جانتا ہے۔ بہرحال اس سکھ نے سنیاسی سے کہا کہ اسے زہر چاہئے جو آہستہ آہستہ اثر کرے اور ڈاکٹروں کو بھی شک نہ ہو کہ مرنے والے کو دیا گیا تھا۔ سنیاسیوں کی آمدنی کا یہی تو ذریعہ تھا۔ سنیاسی نے کہا کہ اس کے پاس ایسا ہے جو دودھ یا لسی یا چائے میں چند قطرے ڈال کر پلا دو تو پینے والے کو پتہ ہی نہیں اسے زہر دیا گیا ہے۔ سات آٹھ روز بعد اس کا جگر خراب ہونے لگتا ہے اور اس آ یرقان ہو جاتا ہے۔ وہ کسی بھی حکیم یا ڈاکٹر کے پاس چلا جائے' اسے یہی تشخیص ہ کہ یہ یرقان ہے۔ اسے یرقان کی دوائیاں دی جائیں گی جن کا کچھ بھی اثر نہیں ہو پندرہ بیس دنوں تک وہ آدمی مر جائے گا۔

"سنیاسی مہاراج!" ـــ فصیح نے کہا ـــ "حکم دیں' کیا خدمت کروں' مجھے

دے دیں"۔

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ سنیاسی نے صرف پچاس روپے مانگے جو فصیح نے اسی وقت دے دیئے اور سنیاسی نے تھوڑا سا پوڈر ایک پُڑیا میں لپیٹ کر فصیح کو دے دیا.. ..میں نے کہا ہے صرف پچاس روپے.... یہ پچاس روپے آج والے نہیں تھے۔ اُس وقت کے پچاس روپے آج کی کرنسی کے مطابق کم و بیش ڈیڑھ ہزار روپے کے برابر تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

فصیح زہر تو لے آیا لیکن ابھی اس نے اور اس کے سکھ دوست نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ یہ زہر فصیح اپنی بہن کے پاگل خاوند کو دے گا کس طرح۔ وہ جب سنیاسی سے زہر لے کر واپس آ رہے تھے تو راستے میں یہی سوچتے آئے کہ یہ زہر اسے کس طرح دیا جائے۔ یہ طریقہ فصیح کے دماغ میں آگیا۔ اس نے یہ طریقہ اپنے دوست کو سنایا تو دوست نے اس کی تائید کر دی اور کہا کہ اب جو ہوتا ہے ہوتا رہے' یہ کام کر گزرو۔

فصیح احمد نے ایک دن کا وقفہ ڈالا اور اس سے اگلے روز گھر والوں کو بتائے بغیر اپنی بہن کے سُسرال چلا گیا اور بہن کے سُسر سے ملا۔ سسر کے چہرے پر پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے زیادہ رعونت کے تاثرات آگئے۔ اس نے پہلی بات فصیح سے یہ پوچھی کہ بہن کو کیوں نہیں لائے۔ فصیح باقاعدہ پلان بنا کر گیا تھا۔ اس کے مطابق وہ سُسر کے آگے اس طرح جھک گیا جیسے اس کا زر خرید غلام ہو اور کوئی بہت بڑی غلطی کر بیٹھا ہو۔

"ہم آپ کی جُوتیوں میں بیٹھنے والے لوگ ہیں!" ـــ فصیح نے کم ترین بن کر کہا ـــ "ہم نے آپ کے گھر میں اپنی بیٹی دی ہوئی ہے اس لئے ہمارے سر آپ کے آگے جھکے رہنے چاہئیں۔ میں آپ کا ہر حکم بجا لاؤں گا لیکن ایک گذارش میری بھی سُن لیں"۔

فصیح نے اپنی بہن کے سسر کے ساتھ یہی ایک بات نہیں کی تھی بلکہ وہ جب بولتا تھا تو سسر بیچ میں بول پڑتا تھا۔ فصیح فوراً چپ ہو جاتا اور اس طرح توجہ سے چوہدری کی بات سننے لگتا جیسے چوہدری اس ملک کا بادشاہ ہو۔ جب چوہدری اپنی بات ختم کرتا تو فصیح اس سے پوچھتا کہ چوہدری صاحب' مجھے بولنے کی اجازت ہے؟.... فصیح کے اس رویئے اور انداز نے چوہدری کو موم کر دیا لیکن چوہدری اپنی اس ضد پر قائم رہا کہ لڑکی کو میکے سے لانے کے لئے اس کا کوئی آدمی یا عورت نہیں جائے گی بلکہ لڑکی کو فصیح یا اس کی ماں

یا اس کا باپ لے کر آئے گا۔

"چوہدری صاحب!" — فصیح نے عرض کرنے کے لہجے میں کہا — "مجھے
سے پہلے آپ کی عزت کا خیال ہے۔ میں ایسا مطالبہ کبھی نہیں کروں گا کہ آپ کے گ
کوئی نوکر بھی لڑکی کو لینے جائے۔ میری درخواست صرف یہ ہے کہ میرے باپ کی عز
کا تھوڑا سا خیال کریں۔ اگر آپ منظور کرلیں تو میں ایک عرض کرتا ہوں۔ آپ کا
ویسے بھی میرے دل کو بہت اچھا لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ
اور آپ یہ سمجھیں کہ میں اسے اپنے پیار اور محبت کی خاطر لے جارہا ہوں۔ اسے اک
رات اپنے پاس رکھوں گا اور اگلے دن میں اسے اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر آپ
خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اس طرح آپ کا حکم بھی پورا ہو جائے گا اور میرے با
کی عزت بھی رہ جائے گی"۔

فصیح نے اس بے وقوف چوہدری کو پہلے ہی موم کرلیا تھا۔ پھر فصیح نے غلامو
جیسی جو ایکٹنگ کی تھی، وہ بھی کام کر گئی۔ چوہدری نے اسے اجازت دے دی کہ وہ ا
کے بیٹے کو ساتھ لے جائے۔ اس نے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ وہ فصیح کے ساتھ اس
گاؤں چلا جائے۔

جونہی فصیح نے چوہدری کے بیٹے کو یعنی اپنی بہن کے خاوند کو دیکھا تو اُٹھ کر بڑی
بے تابی سے اور پیار سے اسے گلے لگا لیا اور کہا کہ وہ تو اسے دن رات یاد آتا رہتا
وغیرہ وغیرہ۔ چوہدری کا بیٹا اپنی عادت یا فطرت کے مطابق کچھ جھینپا اور شرمایا لیکن با
نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور فصیح نے پیار اور محبت کا بڑا شدید مظاہرہ کیا تو بیٹا تیار ہ
.... یہاں یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس کام نے ہونا ہوتا ہے اُس کے لئے سبب بن جاتے ہ
چوہدری کے بیٹے کا فصیح کے ساتھ چل پڑنا ممکن نظر نہیں آتا تھا لیکن وہ فصیح کے س
چل پڑا۔

○

چوہدری کا بیٹا جب فصیح کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہُوا تو سب حیران رہ
کہ یہ معجزہ کس طرح ہو گیا ہے۔ اس لڑکے کے نہ آنے کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ
شرمیلا تھا یا ذہنی مریض تھا بلکہ بڑی وجہ یہ تھی جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ اس
باپ نے اعلان کر رکھا تھا کہ فصیح کی بہن کو سسرال لانے کے لئے کوئی نہیں جائے

فصیح نے گھر والوں کو بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ وہاں گیا تھا۔

چوہدری کے بیٹے کی بہت ہی زیادہ خاطر تواضع کی گئی۔ فصیح کی بہن اس کے آگے
نوکروں کی طرح پھرتی رہی۔ رات کو فصیح نے چوہدری کے بیٹے کو اپنے کمرے میں
سلایا۔ رات سونے سے پہلے چوہدری کے بیٹے کو دودھ پیش کیا گیا۔ فصیح نے نظر بچا کر
سنیاسی سے لیا ہُوا زہر تھوڑا سا اس دودھ میں ڈال کر ہلا دیا۔ فصیح نے اپنی ماں اور بہن
سے کہا تھا کہ اسے رات کو دودھ ضرور پلانا۔ یہ دونوں عورتیں یہ سمجھی ہوں گی کہ یہ بھی
خاطر تواضع کا ایک حصہ ہے۔ چوہدری کے بیٹے نے دودھ پی لیا۔

اگلے ہی روز فصیح نے اپنی بہن کو اور بہن کے خاوند کو ساتھ لیا اور بہن کے سُسرال
جا پہنچا۔ سُسرال والے بہت خوش ہوئے کہ چلو یہ مسئلہ حل ہوا۔ فصیح فوراً" واپس آنا
چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے اسے رات وہیں رکھا اور اگلے روز آنے کی اجازت دی۔

فصیح نے مجھے سنایا کہ اس نے جب اپنے گھر میں بہن سے کہا تھا کہ وہ سسرال چلنے
کی تیاری کرے تو بہن بہت ہی حیران اور پریشان ہو گئی تھی کہ اس کا اپنا بھائی اسے گھر
سے دھکیل رہا تھا۔ اس بھائی پر تو اسے بہت ہی ناز تھا اور بھائی نے اس کی حوصلہ افزائی
اس فیصلے سے کی تھی کہ وہ اسے طلاق دلوائے گا۔ بہن کے آنسو نکل آئے۔

"صرف ایک مہینے کی بات ہے میری بہن!" — فصیح نے بہن کو تسلی دیتے ہوئے
کہا — "کسی کو یہ نہ بتانا کہ میں نے تمہیں یہ بات کہی ہے۔ تم ایک مہینہ اس خاوند کو
برداشت کرو اور اس جہنم میں پڑی رہو۔ اللہ کرے گا تمہیں رہائی مل جائے گی"۔

بہن نے اس سے پوچھا کہ رہائی کس طرح ملے گی لیکن فصیح نے اسے اصل بات نہ
بتائی۔ بہن کو بھائی پر اعتماد تھا اس لئے وہ ساتھ چل پڑی۔

"اب میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں" — فصیح نے مجھے یہ واردات سناتے
ہوئے کہا — "میں نے اپنی بہن کے بگلے خاوند کو زہر تو دے دیا لیکن اس سے مجھے
اطمینان نہ ہُوا نہ یہ خوشی ہوئی کہ اس آدمی سے جان چھوٹ جائے گی بلکہ ہُوا یہ کہ جب
میں وہاں سے واپس اپنے گاؤں کو چلا تو یوں دل گھبرا گیا جیسے کسی چیز نے میرے دل کو اپنی
مٹھی میں لے کر دبا لیا ہو۔ مجھ جیسا دلیر اور نڈر آدمی گھبرانے لگا۔ دل اور دماغ میں ایک
خوف بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت تسلیاں دیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ میں
نے اپنی بہن کے خاوند کو زہر دیا ہے نہ ہی اس نے فوراً" مرجانا تھا۔ سنیاسی نے یقین دلایا

تھا کہ اس زہر کا کسی کو سراغ نہیں ملتا لیکن میرے دل پر خوف کی جو پکڑ آ گئی تھی وہ ڈھیلی نہیں ہو رہی تھی"۔

وہ تو جوانی کا وقت تھا جب فصیح احمد دور سمندر میں مجھے یہ داستان سنا رہا تھا۔ اس وقت نفسیات کی اور انسانی فطرت کی مجھے اور فصیح کو سُوجھ بُوجھ نہیں تھی۔ آج بڑھاپے کی اس عمر میں جب میں کتابوں کے سمندر میں غوطے لگاتا رہتا ہوں' معاشرے کا اور انسانوں کا تجزیہ کر سکتا ہوں.... فصیح نے کہا تھا کہ وہ دلیر اور نڈر تھا۔ انسانی نفسیات کچھ اور کہتی ہے۔ دلیر اور نڈر ہونا کچھ اور بات ہے لیکن کسی انسان کی جان لینا بالکل ہی مختلف عمل ہے جس کا فطری دلیری کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق نہیں۔ ایک بزدل آدمی بھی قتل کر سکتا ہے لیکن قتل کے بعد اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ دعائیں کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھی قتل کر دے۔ دلیر اور نڈر آدمی کا ردِ عمل قتل کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ فصیح نے مجھے سنایا کہ روز بروز اس کی بے چینی بڑھتی گئی اور حالت یہاں تک پہنچی کہ رات گہری نیند سے وہ اس طرح جاگ اٹھتا جیسے کسی نے اس کو جگایا ہو۔ وہ اپنی یہ حالت کسی کو بتاتا نہیں تھا۔

چھ سات دن گزرے اس کی بہن کے سسرال سے اطلاع آئی کہ بہن کا خاوند بیمار ہو گیا ہے۔ فصیح' اس کا باپ اور اس کی ماں اسی وقت بیمار پُرسی کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو مریض کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور اسے متلی محسوس ہوتی تھی اور ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ علاج گاؤں کا ایک ہندو حکیم کر رہا تھا جس کی وہاں بہت شہرت تھی۔

فصیح اپنے باپ اور ماں کے ساتھ اگلے روز واپس آیا.... تین چار دنوں بعد فصیح پھر گھر والوں کو یہ بتا کر کہ وہ بہن کے خاوند کو دیکھنے جا رہا ہے' چلا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ حکیم نے یرقان کی تشخیص کی ہے۔ لڑکے کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ اس کی آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں اور جسم کا رنگ ہلدی جیسا ہو گیا تھا۔ ساری علامات یرقان کی تھیں اور علاج بھی یرقان کا ہو رہا تھا۔ فصیح کو اگر خوش نہیں تو مطمئن ہو جانا چاہئے تھا کہ اس زہر کے متعلق سنیاسی کی بات بالکل صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ یرقان تو ایک عام مرض ہے جو نہ جانے کب سے انسانوں کو لاحق ہو رہا ہے لیکن فصیح کے اندر جو بے چینی تھی وہ پہلے سے زیادہ ہو گئی اور خوف کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ کچھ دیر مریض کے پاس بیٹھا اسے تسلیاں دیتا رہا۔ مریض بار بار فصیح کی طرف دیکھتا تھا اور

فصیح یوں ڈر جاتا تھا جیسے مریض اسے کہہ رہا ہو کہ مجھے تم نے بیمار کیا ہے اور تم میرے قاتل ہو۔

فصیح واپس اپنے گھر آ گیا۔ اس کا سکھ دوست اس کا رازدان تھا۔ ویسے بھی ان کا آپس میں بہت پیار تھا۔ فصیح نے اپنے اس دوست کو بتایا کہ اندر سے اس کے دل اور دماغ کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ اس سکھ دوست نے اسے بہت تسلیاں دیں اور یہ بھی کہا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہُوا تھا اور اس نے جو کچھ کیا ہے اپنی بہن کی نجات کے لئے کیا ہے اور یہ بالکل جائز ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ دھوکا دینے والوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہئے۔ فصیح کی کچھ تسلی ہوئی لیکن جب وہ اکیلا بیٹھا تو اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔

پھر وہ دن آیا جب اس کی بہن کے سُسرال سے ایک آدمی یہ اطلاع لے کر آیا کہ بہن کی بہن کا خاوند فوت ہو گیا ہے۔ فصیح کو یوں لگا جیسے اطلاع لانے والے اس آدمی نے اس کے دل میں خنجر اتار دیا ہو۔ وہ جوان آدمی تھا اس لئے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا لیکن اس کی حالت کچھ زیادہ ہی غیر ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بہن کے سُسرال گاؤں پہنچا اور کفن دفن وغیرہ کے بعد واپس آ گیا۔ اس نے اپنی بہن کے چہرے پر اطمینان اور کچھ خوشی کے تاثرات دیکھے تھے۔ بہن کے ساتھ اسے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا' بہن کو اس نے ذرا دور سے دیکھا تھا۔ اس کی بہن کو رہائی مل گئی تھی لیکن اس نے ابھی عدت کے تین مہینے سسرال میں ہی گزارنے تھے۔

○

فصیح کی چھٹی کا صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ اس کا کام چھٹی کے اندر اندر ہی ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سامنے مقتول کو دفن ہوتے دیکھا تھا اور پھر رواج کے مطابق اس نے اپنے ہاتھوں اس کی قبر میں مٹی ڈالی تھی لیکن اس کے دل کی اور ذہن کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ اس کا خوف ذرا سا بھی کم نہ ہُوا اور بے چینی بھی پہلے جیسی رہی۔ وہ اُسی رات کی گاڑی میں سوار ہُوا اور پھر اگلے دن اور اگلی رات کا سفر کر کے کوہاٹ پہنچ گیا۔ فاصلہ اتنا زیادہ تو نہ تھا لیکن لاہور بھی گاڑی بدلنی تھی اور راولپنڈی بھی۔

یہاں سے آگے فصیح نے مجھے جو بات سنائی وہ نفسیات کا علم سمجھنے والوں کے لئے تو قابلِ فہم ہے لیکن عام لوگوں کے لئے یہ حیران کن قصہ ہے۔ فصیح نے مجھے سنایا کہ اپنی بارک میں ایک رات وہ معمول کے مطابق گہری نیند سویا ہُوا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اسے کسی نے جگایا ہے۔ اس نے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا' اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ وہ بستر سے اٹھا اور بارک کے برآمدے میں چلا گیا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ اس کے دل پر جو خوف بیٹھا رہتا تھا وہ زیادہ ہو گیا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ واپس آ کر لیٹا مگر نیند بہت دیر سے آئی۔

دو تین راتوں بعد پھر ایسے ہی ہُوا۔ وقت تقریباً" آدھی رات کا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو کوئی شک نہیں تھا کہ اسے کسی نے جھنجھوڑا ہے۔ بارک تاریک تھی۔ اس تاریکی میں اسے اپنی بہن کا مقتول خاوند اپنی چارپائی کے پاس کھڑا نظر آیا اور وہ کچھ دیر فصیح کو دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹ ہلے اور فصیح کو یہ سرگوشی سنائی دی ـــــ "میں تمہیں سونے نہیں دوں گا" ـــــ اور مقتول تاریکی میں تحلیل ہو گیا۔ فصیح کی حالت ایسی بُری ہو گئی کہ اس کا سارا وجود کانپنے لگا اور پسینہ پھوٹ آیا حالانکہ موسم پسینے والا نہیں تھا۔ اسے شدید ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے دائیں اور بائیں سوئے ہوئے ساتھیوں کو جگائے اور انہیں بتائے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن معاملہ قتل کا تھا اس لئے اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی کہ ایسا نہ ہو کہ اس کے منہ سے راز کی بات نکل جائے۔

اُن دنوں قبائلی پٹھان انگریزوں کے خلاف خاصے سرگرم تھے۔ میں اپنی اس داستان کے کسی ابتدائی باب میں قبائلی پٹھانوں کے اس جہاد آزادی کی تفصیلات سنا چکا ہوں۔ کوہاٹ چھاؤنی میں جو یونٹیں رہتی تھیں' انہیں کبھی کبھی قبائلی علاقے میں بھیجا جاتا تھا۔ ایک روز فصیح کے توپ خانے کو بھی بنوں کی طرف جانے کا حکم ملا۔ ان کا توپ خانہ فوراً" روانہ ہو گیا۔ پٹھانوں کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کیا گیا تھا جس میں توپ خانے کی بھی ضرورت تھی۔ میں چونکہ قبائلیوں کے جہاد کی تفصیلات سنا چکا ہوں اس لئے یہاں بات مختصر کروں گا۔ اصل بات تو فصیح کی ہے' میں اسی پر توجہ مرکوز رکھوں گا۔

ان دنوں قبائلی پٹھانوں کے خلاف زیادہ تر آپریشن وزیرستان کے علاقے میں ہوئے تھے۔ ایک بریگیڈ قبائلی علاقے میں پیشقدمی کر رہا تھا اور فصیح کا توپ خانہ کَوَرنگ فائر دے رہا تھا۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ یہ آپریشن بظاہر قبائلیوں کو کچلنے کے لئے اور دبائے رکھنے کے لئے کیا گیا تھا لیکن انگریزوں کا اصل مقصد فوجیوں کو لڑائی کی ٹریننگ دینا تھا۔ ان دنوں جنگِ عظیم لڑی جا رہی تھی اس لئے فوج کو ٹریننگ دے کر تیار رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

کوہاٹ کا یہ بریگیڈ قبائلی علاقے میں خیموں میں رہتا تھا۔ فصیح چونکہ حوالدار کلرک تھا اس لئے وہ فیلڈ میں نہیں جاتا تھا۔ ایک روز جب اس کا توپ خانہ آگے گیا تو وہ بھی ساتھ تھا اسے توپوں سے خاصا پیچھے رہنا تھا۔ ادھر گولہ باری شروع ہو گئی اور فصیح تماشا دیکھنے کے لئے ایک توپ کی طرف چل پڑا۔ اس کی بیٹری کی چار توپیں ایک دوسری سے ذرا دُور دُور لگی ہوئی تھیں۔ جس توپ کی طرف وہ جا رہا تھا اس کے راستے میں دو ٹیکریاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ فصیح کو ان ٹیکریوں میں سے گزرنا تھا۔ ان ٹیکریوں کے درمیان پہنچا تو اسے پیچھے سے آواز آئی ـــــ "اوئے فصیح!" ـــــ فصیح نے رُک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے کسی نے پکارا ضرور تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا واپس چل پڑا۔ اسے کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے ٹیکریوں کے اوپر بھی دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ ٹیکریوں سے باہر آ کر دیکھا۔ اسے پکارنے والا نظر نہ آیا۔ اسے اپنی بیٹری کے کچھ جوان پیچھے بیٹھے نظر آئے۔ وہ اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے جس طرح وہ انہیں بیٹھا چھوڑ گیا تھا۔

وہ قبائلی علاقہ تھا جس میں ٹیکریاں ہی ٹیکریاں تھیں اور سامنے بڑے اونچے پہاڑ تھے۔ فصیح ابھی دائیں بائیں' آگے پیچھے دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے کس نے پکارا ہے کہ اسے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔ اس آواز کو اس نے پہچان لیا۔ اس طرح اس کی بہن کا خاوند ہنسا کرتا تھا۔ فصیح پر ایسا خوف طاری ہُوا کہ اس نے صاف طور پر دیکھا کہ وہ باہر سے نہیں تو اندر سے کانپ رہا ہے۔ اس نے اپنے دل کو بہلانے کی بہت کوشش کی اور اپنے آپ کو بہت یقین دلایا کہ اس کی بہن کا خاوند دفن ہو چکا ہے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا اس نے یہ علاج سوچا کہ ان جوانوں میں جا بیٹھا جن میں وہ پہلے بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ جوان دل بہلانے کے لئے گپ شپ لگا رہے تھے۔ ان کا کام گولہ باری کے بعد شروع ہونا تھا۔

یہاں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ کیسا میدانِ جنگ تھا جس میں بہت سے جوان فارغ بیٹھے تھے اور فصیح توپوں کی گولہ باری کا تماشہ دیکھنے کے لئے چل پڑا تھا۔ میں نے اس داستان کے شروع شروع میں بتایا ہے کہ قبائلی علاقے کا میدان جنگ ویسا نہیں تھا جیسا دو فوجوں کے درمیان جنگ کا میدان ہوتا تھا۔ پٹھانوں کے پاس توپ خانہ نہیں تھا نہ ان کے پاس لڑاکا بمبار طیارے تھے۔ ان کے پاس تو ہلکی پھلکی مشین گن بھی نہیں

تھی۔ قبائلی اکیلے اکیلے ایک دوسرے سے کہیں دُور چھپ کر فوجیوں پر فائرنگ کرتے تھے پھر وہ جگہ بدل کر کسی اور جگہ جا بیٹھتے تھے۔ قبائلیوں کی طرف سے ایک گولی آتی تھی تو اُدھر سے انگریز توپوں کے کئی گولے اور رائفلوں اور مشین گنوں کا بے شمار ایمونیشن پھونک ڈالتے تھے۔

فصیح کی اب حالت یہ تھی کہ جہاں کہیں وہ اکیلا ہوتا' مقتول اسے آواز دیتا یا اسے ایک آدھ سیکنڈ کے لئے اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا اور پھر غائب ہو جاتا تھا۔ تیسری چوتھی رات اس کی آنکھ کھل جاتی اور اسے مقتول پائنتی کی طرف کھڑا نظر آتا اور پھر غائب ہو جاتا تھا۔ فصیح اپنی یہ ذہنی حالت کسی کو بتاتا نہیں تھا لیکن اس کے دوستوں کو شک ہو گیا تھا کہ فصیح کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ دوست اس سے پوچھتے تھے تو وہ اتنا ہی جواب دیتا تھا کہ اس کی نوجوان بہن بیوہ ہو گئی ہے۔ دوستوں نے اسے کئی بار کہا کہ وہ ابھی نوجوان ہے اس کی دوسری شادی ہو جائے گی۔ فصیح اس بات پر خاموش ہو جایا کرتا تھا لیکن اس کے دوست نہیں جانتے تھے کہ اس خاموشی میں اس نے کیسا طوفان چھپا رکھا ہے اور اس طوفان کا نہ جانے انجام کیا ہو گا۔

پندرہ سولہ دنوں بعد اس کا بریگیڈ واپس کوہاٹ چھاؤنی میں آ گیا۔ فصیح نے اکیلے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا لیکن تیسری چوتھی رات مقتول اسے جگا دیتا تھا اور وہ اسے اپنی چارپائی کی پائنتی کھڑا نظر آتا تھا۔ تقریباً" دو ہفتوں میں ایک رات اس کی دفتر میں ڈیوٹی ہوتی تھی۔ ڈیوٹی یہ تھی کہ اسے ٹیلیفون کے پاس سونا پڑتا تھا۔ اسے ڈیوٹی کلرک کہا کرتے تھے۔ ڈیوٹی کی رات تو مقتول لازماً" آتا تھا۔ مقتول کو اس نے اپنے ڈیوٹی روم میں ٹہلتے ہوئے بھی دیکھا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ مقتول تو نظر نہ آتا لیکن اس کی مخصوص آواز سنائی دیا کرتی تھی۔

اس نے اس کا ایک علاج یہ کیا کہ جس رات اس کی ڈیوٹی ہوتی' وہ قرآن مجید اپنے ساتھ لے جایا تھا۔ جونہی مقتول اسے جگاتا' وہ قرآن کھول کر تلاوت شروع کر دیتا تھا۔ اس نے نماز بھی باقاعدگی سے شروع کر دی تھی لیکن مقتول نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

آخر اس نے تنگ آ کر اپنے ایک گہرے دوست کو بتایا۔ اسے اصل بات نہ بتائی' صرف یہ کہا کہ اسے ایک آدمی کی شکل نظر آتی ہے اور یہ آدمی اسے رات کو جگا دیتا ہے اور کچھ کہہ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ دن کے وقت بھی جب وہ اکیلا ہوتا ہے

تو اسے یہ شکل نظر آتی ہے جو کبھی تو خاموش رہتی اور اسے دیکھتی رہتی ہے اور ہنس کر غائب ہو جاتی ہے۔ دوست نے اسے بتایا کہ کوہاٹ کے مضافات میں کہیں ایک مزار ہے' وہ وہاں جا کر فاتحہ پڑھا کرے اور اپنی نجات کے لئے دعا بھی کیا کرے۔

فصیح ایک روز اکیلا ہی وہاں چلا گیا۔ وہ مزار دراصل چھوٹا سا ایک مقبرہ تھا جس کے باہر دو تین مجاور بیٹھے رہتے تھے۔ لوگ وہاں آتے تھے اور مقبرے کے اندر جا کر فاتحہ پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ فصیح وہاں گیا اور اندر جا کر فاتحہ پڑھنے لگا تو اسے ہنسی کی آواز آئی۔ فصیح بدک کر پیچھے ہٹا۔ پھر اسے آواز آئی کہ وہ یہاں سے چلا جائے ورنہ اسے یہیں قتل کر دیا جائے گا۔ یہ آواز مقتول کی تھی جسے وہ پہچانتا تھا۔ وہ فاتحہ پڑھ کر وہاں سے اس حالت میں نکلا کہ اس کا سر چکرا رہا تھا اور اس کا دل خوف کی بڑی ظالم گرفت میں تھا۔

○

فصیح نے مجھے ایک ایک دن اور ایک ایک رات کی واردات سنائی تھی۔ گن بوٹ اپنی رفتار پر چلی جا رہی تھی' رات اندھیری تھی' آسمان ستاروں سے بھرا ہُوا تھا اور فصیح بول رہا تھا اور میں گم صُم سن رہا تھا۔ وہ ہر بات تفصیل سے سناتا تھا۔ یقین کریں کہ میرے دل پر بھی خوف بیٹھنے لگا۔ میں اسے کوئی آسیب یا شرشرار سمجھنے لگا تھا۔ اگر میں یہ ساری تفصیلات سنانے لگوں تو سو سوا سو ورق اسی میں سیاہ ہو جائیں گے۔ یہ راز مجھ پر اس وقت کھُلا تھا جب میں نے بڑھاپے کے آغاز میں کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں۔

مجھے نفسیات اور عمرانیات (سوشیالوجی) میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اتفاق سے نفسیات کی ایک کتاب مل گئی۔ میں نے اس میں مختلف قاتلوں کے ردِعمل پڑھے تھے۔ اس میں ایک قاتل کا ردِعمل بالکل اسی جیسا تھا جیسا فصیح مجھے سنا رہا تھا۔ پھر میں نے بیس اکیس سال پہلے "حکایت" میں مدیر "حکایت" جناب عنایت اللہ کی لکھی ہوئی ایک سچی کہانی پڑھی تھی جس کا عنوان تھا "ضمیر کا انتقام" یہ حیدر آباد کے ایک قاتل کی بیان کی ہوئی آپ بیتی تھی جو اس نے مدیر "حکایت" کو کراچی جیل میں سنائی تھی۔ میں نے جب یہ کہانی پڑھی تھی تو مجھے فصیح بہت ہی یاد آیا تھا۔ چونکہ یہ نفسیاتی معاملہ ہوتا ہے اس لئے حیدر آباد والا قاتل بالکل فصیح احمد لگتا تھا۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کا ضمیر کسی بھی جُرم اور گناہ کو قبول نہیں کیا کرتا پھر بھی

کچھ لوگ جرم کو اپنا باقاعدہ پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں سے لذت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ بعض انسانوں کے ضمیر اتنے مضبوط ہوتے ہیں یا شاید اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ ان کا ردِعمل بڑا ہی خوفناک ہوتا ہے۔ فصیح کا کیس کچھ ایسا ہی تھا۔

ایک اور بات یاد آتی ہے کہ فصیح نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے خاندان میں اگر زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تعلیم ضرور تھی اور ان میں شائستگی بھی تھی۔ مطلب یہ کہ فصیح بالکل دیہاتی اور اَن پڑھ خاندان کا فرد نہیں تھا۔ اس کی بہن نے بھی آٹھ جماعتیں پاس کرلی تھیں جو اس دور میں لڑکیوں کے لئے بڑی تعلیم سمجھی جاتی تھی۔ اس بہن کے سُسرال والے خالصتاً" اَن پڑھ اور دیہاتی تھے اور وہ اپنے آپ کو ولیر اور عقلمند صرف اس لئے سمجھتے تھے کہ وہ بڑے درجے کے زمیندار تھے اور گھر میں پیسہ تھا.... میں واضح یہ کرنا چاہتا ہوں کہ فصیح کی فطرت میں اور اس کے خاندان میں دیہاتیوں والا خون خرابہ اور لڑائی مار کٹائی اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا رویّہ نہیں تھا۔ یہی فصیح کی کمزوری بن گئی تھی اور وہ ایک آدمی کو قتل کر کے اتنا کمزور ہو گیا کہ اس خون کو ہضم نہ کر سکا۔ اس نے دینی کتابیں پڑھنی شروع کر دی تھیں اور کچھ اور کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ اس طرح اس نے خاصا علم حاصل کر لیا تھا لیکن مقتول کے آسیب سے وہ پیچھا نہ چھڑا سکا۔

پانچ چھ مہینے اس کیفیت میں گزر گئے اور فصیح خطرناک حد تک ذہنی مریض بن گیا۔ اس دوران خُدا نے اُسے ایک خوشی بھی دی۔ وہ یہ تھی کہ اس کی بیوہ بہن کی عدّت پوری ہوئی تو وہ اپنے گھر آ گئی اور ڈیڑھ دو مہینے بعد اس کی دوسری شادی ہو گئی۔ فصیح اس کی دوسری شادی پر گیا تھا لیکن اس نے مجھے سنایا کہ وہاں مقتول کے واہمے نے اس کا بہت بُرا حال کر دیا۔ وہ کھیتوں کی طرف گیا تو مقتول کو سامنے کھڑا پایا۔

ایک بار وہ قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک بزرگ کا مزار تھا۔ اس نے اس مزار پر فاتحہ پڑھنا تھی۔ فصل خاصے اونچے تھے۔ فصیح مینڈھ پر جا رہا تھا تو اچانک مقتول اس کے سامنے آن کھڑا ہُوا۔ فصیح کو ایسا غصہ آیا کہ اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور دانت پیستے ہوئے مقتول کی طرف اس طرح دوڑا جس طرح کوئی درندہ شکار پر جھپٹتا ہے۔ وہ اس لئے مقتول پر جھپٹا تھا کہ اس کی گردن دبوچ کر مار ڈالے گا لیکن وہ قریب پہنچا تو مقتول غائب ہو گیا اور فصیح کو اس کی ہنسی سنائی دی۔

فصیح پانچ دنوں کی چھُٹی لے کر گیا تھا۔ اس کی بہن اپنی دوسری شادی پر بہت ہی

خوش تھی۔ گھر بھی بھلا اور لڑکا بھی اچھا مل گیا تھا۔ یہ ان کے دیکھے بھالے ہوئے لوگ تھے۔ فصیح نے مجھے سنایا کہ اپنی بہن کو اتنا خوش دیکھ کر اس کو خیال آتا تھا کہ اس بہن کو کیا خبر کہ اس کی خوشی کی خاطر اس کے بڑے بھائی نے کتنی بڑی قربانی دی ہے اور دیتا چلا جا رہا ہے۔ وہ بڑی بھیانک اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

بہن نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے جب بہن کو سُسرال چلنے پر تیار کیا تھا تو یہ کیوں کہا تھا کہ صرف ایک مہینے کی بات ہے' برداشت کرو اور پھر تمہیں رہائی مل جائے گی.... فصیح نے اسے یہ جواب دیا کہ ایک بزرگ نے اسے کوئی روحانی حساب کتاب کر کے بتایا تھا کہ یہ لڑکا ایک مہینے کے اندر اندر مر جائے گا۔ بہن اس جواب سے مطمئن ہو گئی تھی اور بھائی نے ایک خوفناک راز اپنے دل میں چھپائے رکھا تھا۔

○

فصیح احمد پانچ دنوں کی چھُٹی گذار کر واپس اپنے توپ خانہ یونٹ میں پہنچا تو اگلے ہی روز حکم مل گیا کہ یونٹ فوراً" کلکتہ پہنچے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے توپ خانے کو برما محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔

یہاں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو گول کر جاتا ہوں اور فصیح کو برما کے محاذ پر پہنچا دیتا ہوں۔ اس کی ذہنی حالت اب یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے خود کُشی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی یونٹ کو برما کے محاذ پر پہنچنے کا حکم ملا تو وہ کچھ خوشی محسوس کرنے لگا کہ اب اسے خود کُشی کی ضرورت نہیں پڑے گی محاذ پر ہی مارا جائے گا۔ وہ وقت برما کے محاذ کے عروج کا وقت تھا۔ سارے ہندوستان میں برما کے محاذ کے متعلق بڑی خوفناک خبریں پھیل رہی تھیں۔ یہی ایک بات سننے میں آتی تھی کہ برما میں ہندوستان کی فوج کے فوجی مکھیوں کی طرح مارے جا رہے ہیں۔ اس میں حقیقت اتنی تو نہیں تھی' یہ جاپانیوں کے فتح کالم کا کام تھا جس نے سارے ہندوستان میں جاپانیوں کی اور برما فرنٹ کی دہشت پھیلا دی تھی۔ فصیح ڈرنے کی بجائے خوش تھا کہ وہاں جاتے ہی وہ مارا جائے گا۔

اُس وقت اتحادیوں نے یعنی امریکہ اور برطانیہ نے مل کر برما پر جوابی حملہ شروع کر دیا تھا اور جاپان کی فوج بڑی ہی بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جاپانی مورچوں کی طرف سے لاؤڈ سپیکروں سے اعلان ہو رہے تھے کہ ہندوستان کے فوجی انڈین نیشنل آرمی میں آ جائیں اور اپنے ملک کو انگریزوں سے آزاد کرائیں۔

توپ خانہ پوزیشن میں آچکا تھا اور مسلسل گولہ باری کر رہا تھا۔ ایک دن جاپانی لڑاکا بمبار طیارے اگلے مورچوں سے پیچھے گن پوزیشنوں پر آ گئے۔ توپ خانے کو توڑ ٹمن سب سے پہلے تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کام کے لئے طیارے استعمال کئے جاتے ہیں جو پیچھے آ کر گن پوزیشنوں پر بم بھی گراتے ہیں اور مشین گنیں بھی فائر کرتے ہیں۔ جاپانی لڑاکا بمبار طیارے آئے تو انہوں نے گن پوزیشنوں پر قہر برسانا شروع کر دیا۔ پہلے جو طیارے آئے وہ بم گرا کر آگے نکل گئے۔ توپ خانے کے آدمی اِدھر اُدھر پناہ لینے کو دوڑے تو اور طیارے آ گئے جنہوں نے اس سارے علاقے پر مشین گن فائر کی اور آگے نکل گئے۔ وہ پھر آئے اور اسی طرح بم گرائے۔ دوسرے آنے والے طیاروں نے مشین گنیں فائر کیں۔ وہ تو جیسے گولیوں کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔

جب یہ ہوائی حملہ ختم ہُوا تو جو لوگ زندہ تھے اور زخمی نہیں ہوئے تھے وہ اپنے ساتھیوں کو دیکھنے اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ انہیں زمین پر گرے ہوئے زخمی اور لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کئی توپیں ایک پہلو پر یا بالکل اُلٹی پڑی تھیں۔ فصیح بال بال بچ گیا تھا۔ وہ بھی زخمیوں کو اٹھانے کے لئے آگے آیا تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ زخمی کراہ رہے تھے اور پانی مانگتے تھے۔ اس نے ایسی لاشیں دیکھیں جن کے بازو یا ٹانگیں یا بازو بھی اور ٹانگیں بھی اُڑ گئی تھیں۔ کہیں جسم سے کٹا ہُوا سر پڑا تھا اور کہیں صرف ایک بازو یا ایک ٹانگ پڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ جاپانیوں نے ٹھکانے پر بمباری کی تھی۔ بعض زخمیوں کے پیٹ اور سینے کھُل گئے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ ان کے جسم کے اندر کیا ہے۔ ہر طرف خون ہی خون اور لاشیں ہی لاشیں!

فصیح ان سب کو جانتا تھا۔ وہ تو کوہاٹ سے یہاں تک ہنستے کھیلتے، گاتے اور تالیاں بجاتے آئے تھے لیکن اب ان میں سے کئی ایک کے وہ ہاتھ ہی کٹ کر نہ جانے کہاں جا پڑے تھے جن سے وہ تالیاں بجایا کرتے تھے۔ سروں کے بغیر تو لاشیں کئی ایک تھیں۔ فصیح نے اپنے ایک بڑے پیارے دوست کی لاش دیکھی۔ اس لاش کے ساتھ دایاں بازو تھا ہی نہیں بائیں طرف کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ فصیح یوں محسوس کرنے لگا جیسے وہ قے کر دے گا اور صرف کھایا پیا ہی نہیں بلکہ اس کی انتڑیاں بھی منہ کے راستے باہر نکل آئیں گی۔

میڈیکل کور کے آدمی آ گئے وہ بھی فوجی تھے ان میں لیفٹیننٹ اور کیپٹن اور میجر ڈاکٹر

بھی تھے نرسنگ اردلی بھی تھے۔ بہت سے سٹریچر آ گئے تھے۔ وہ زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر سٹریچر پر ڈالتے اور دوڑتے ہوئے لے جاتے تھے۔ فصیح وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ پیچھے چلا گیا اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا سوچے اور کیا کرے۔

اس کے بعد یہ روزمرّہ کا معمول بن گیا کہ جاپانی طیارے آتے اور تباہی مچاتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ فصیح اپنے بمبار طیارے بھی دیکھتا تھا جو اس سے زیادہ بمباری جاپانیوں کے اگلے اور پچھلے مورچوں پر کرتے تھے۔ فصیح کی توپ خانہ رجمنٹ آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی۔ پندرہ بیس دنوں بعد اور توپیں آ گئیں اور نفری بھی آ گئی۔ رجمنٹ میں پھر جان پڑ گئی اور گولہ باری شروع ہو گئی۔

فصیح کی رجمنٹ کو آگے جانے کا حکم ملا اور نئی گن پوزیشنیں بتائی گئیں۔ فصیح نے ہر جگہ لاشیں دیکھیں جن میں پرانی لاشوں کی ہڈیوں کے ڈھانچے بھی تھے اور اس نے بکھری ہوئی ہڈیاں بھی دیکھیں۔ آپ کو سنانے والی بات یہ ہے کہ فصیح کی ذات میں ایک انقلاب آ گیا۔ محاذ پر بھی مقتول اسے نظر آتا تھا اور اس پر ہنستا تھا۔ فصیح کی اس ذہنی کیفیت میں ذرا سی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے دعا مانگی کہ خدا اسے موت دے دے۔ میدانِ جنگ میں موت ہی ایک چیز تھی جو بڑی جلدی مل جاتی تھی لیکن فصیح کو نہیں مل رہی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی کٹی پھٹی لاشیں دیکھیں اور ان کے بکھرے ہوئے اعضاء دیکھے تو کئی دن اسے مقتول نظر نہ آیا۔ اس کی رجمنٹ جب نئی پوزیشنوں پر گئی اور اس نے راستے میں پرانی لاشوں کی ہڈیوں کے پنجر اور بکھری ہوئی ہڈیاں اور نئی لاشیں دیکھیں تو مقتول بالکل ہی غائب ہو گیا اور فصیح کو کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا لیکن وہ صاف طور پر محسوس کر رہا تھا کہ وہ اب پہلے والا فصیح نہیں رہا اور اس کے اندر کوئی تغیّر آ گیا ہے۔ اس تغیّر کو وہ نہ سمجھ سکا۔

وہ لاؤڈ سپیکروں سے اعلان سنتا رہتا تھا جو جاپانیوں کے مورچوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ فصیح نے ارادہ کر لیا کہ وہ آئی این اے میں چلا جائے گا۔ اس کے دل سے موت کی خواہش نکل گئی تھی۔ دو اڑھائی مہینے اسے مقتول نظر نہ آیا تو فصیح نے محسوس کیا کہ اس کے دل پر خوف کی جو گرفت رہتی تھی وہ خاصی کم ہو گئی ہے۔ اب وہ دل ہی دل میں زندہ رہنے کی دعائیں مانگتا تھا۔

میں بڑی اچھی طرح بیان کر چکا ہوں کہ برما کا جنگل کیسا تھا اور اس میں اونچائی ٹیکریاں، چٹانیں اور پہاڑیاں زیادہ تھیں۔ آدمی ذرا ایک طرف ہو جاتا تھا تو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کہاں غائب ہو گیا ہے ایک رات فصیح چپکے سے نکلا اور چلتے چلتے آگے ڈھلان آگئی جو دُور نیچے تک جاتی تھی۔ وہ درختوں کو پکڑ پکڑ کر نیچے ہی نیچے اترتا چلا گیا اور جب نیچے پہنچا تو ایک طرف کو چل پڑا۔ وہ ساری رات چلتا رہا اور اسے کچھ یاد نہ رہا نہ کچھ خیال رہا کہ وہ کتنی بار کس کس طرف مُڑا تھا اور یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ وہ آگے جانے کی بجائے کہیں پیچھے تو نہیں جا رہا!..... وہ چلتا ہی رہا اور صبح طلوع ہوئی۔ اس کے سر کے اوپر سے گولیاں گزرتی رہی تھیں۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ اپنے ہی لئے اجنبی ہو گیا تھا اور یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی ایک طاقت ہے یا کوئی جن یا چڑیل ہے جو اسے آگے ہی آگے لے جا رہی تھی۔ وہ ٹیکریوں کے درمیان چلتے چلتے دائیں کو مڑا تو آگے اسے کُھلا راستہ مل گیا۔ وہ جگہ کشادہ تھی اس نے وہاں چند ایک جاپانیوں کو دیکھا۔

ایک جاپانی نے اسے اپنی طرف آتا دیکھ لیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔ وہ دس بارہ جاپانی فوجی تھے۔ انہوں نے فصیح کی طرف دیکھا۔ فصیح اپنی رائفل ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے رائفل اوپر کی اور بایاں ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا — "انڈین نیشنل آرمی"۔

تین چار جاپانیوں نے رائفلیں کندھوں سے لگا کر نالیاں اس کی طرف کر دیں۔ اس نے اپنی رائفل اُن کی طرف پھینک دی اور بڑی تیزی سے چلتا اُن تک پہنچ گیا۔ جاپانی اسے پکڑ کر ایک آفیسر کے سامنے لے گئے۔ میری طرح فصیح بار بار یہی کہتا تھا، انڈین نیشنل آرمی۔ اسے پیچھے بھیج دیا گیا اور اس طرح فصیح انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گیا۔

"میرے بھائی!" — فصیح نے مجھ سے کہا — "وہ دن اور آج کا دن، چوہدری کا بیٹا مجھے نظر نہیں آیا اور میں پہلے کی طرح کا انسان بن گیا ہوں۔ دل پر کوئی خوف نہیں اور ذہن میں کوئی شک نہیں"۔

گن بوٹ چلی جا رہی تھی، رات شاید ساری ہی گزر گئی تھی اور ہم دونوں ابھی تک عرشے پر بیٹھے تھے۔ ہم وہیں لیٹ گئے اور آنکھ اس وقت کھلی جب دھوپ چمک رہی تھی اور اس کی تپش ہمیں عجیب سا سکون دے رہی تھی۔

ایراوتی کے پار جھونپڑوں کی بستی میں مجھے حوالدار فضل داد نے اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ وہ میں پچھلے ایک باب میں تحریر کر آیا ہوں۔ وہ جب یہ واقعہ سنا رہا تھا تو میں یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے اپنے دیہاتی معاشرے میں واپس چلا گیا ہوں۔ میں برما کے اس جنگل سے اور جھونپڑوں کی اس بستی سے جیسے نکل ہی گیا تھا یا شاید میں اس ماحول کو بھول گیا اور تصوّروں میں کھو گیا تھا۔

اب فصیح احمد جاپانیوں کی گن بوٹ کے عرشے پر میرے پاس بیٹھا اپنی بہن کی شادی، بربادی اور نجات کی کہانی سنا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ میرے گاؤں کے ایک گھر کی کہانی ہو۔ دراصل یہ ہر گاؤں کی کہانی ہے۔ میں تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وطن سے دو اڑھائی ہزار میل دُور سمندر کے سینے پر بہا جا رہا ہوں اور دنیا کے اس خطّے میں موت پاگلوں کی طرح ناچ رہی ہے اور قہقہے لگا رہی ہے۔ وہاں آسمان سے آگ برستی تھی اور زمین شعلے اگلتی تھی، رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیوں نے جال تان رکھا تھا، سمندر میں ساحل کے ساتھ ساتھ ایک میل یا ڈیڑھ میل کی چوڑائی میں مقناطیسی بارودی سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی لمحہ زندگی کا آخری لمحہ ہو سکتا تھا۔ ہم آبنائے ملاکا میں داخل ہو گئے تھے۔ بائیں طرف ملایا اور دائیں طرف سماٹرا تھا۔ نقشے میں ملایا دائیں طرف اور سماٹرا بائیں طرف ہے۔ آبنائے ملاکا کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی اسی میل ہے اور ایک جگہ کم سے کم چوڑائی بیس میل ہے۔

فصیح احمد کے بولنے کے انداز میں ایسا تاثر تھا کہ سننے والے کو جیسے باندھ لیتا تھا۔ وہ بول رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی تھی۔ میں اپنے دیہات کے

لوگوں کو متحرک اور روزمرّہ زندگی میں سرگرم دیکھ رہا تھا۔ فصیح احمد مجھے اس سمندر سے نکال لے گیا تھا اور اُس نے مجھے دنیا کے اس خطّے میں پہنچا دیا جہاں پاگل بیٹے کو بیاہنے کے لئے جھوٹ اور فریب کاری کے جال بچھائے جاتے ہیں۔ کسی اچھی بھلی کنواری لڑکی کی زندگی برباد ہوتی ہے اور اس کے جذبات صبح و شام فریب کاری کی چکّی میں پستے ہیں۔ پاگل بیٹے والوں کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لئے لوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کا بیٹا ہوش و حواس میں ہے۔ یہ تو صرف وہ لڑکی جانتی ہے کہ یہ لڑکا نہ جسمانی طور پر اور نہ ذہنی طور پر شادی کے قابل تھا۔ داغدار اور نقص دار بیٹیوں کو ڈولی میں بٹھانے کے لئے اتنا زیادہ اور اتنا قیمتی جہیز دیا جاتا ہے کہ دیکھنے والے حیرت سے چکرا جاتے ہیں اور لڑکے والے صرف جہیز کے لالچ میں اپنے بیٹے کو رسوائی اور جذباتی تباہی میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ سارا پیسہ حرام کا ہوتا ہے یا جائیداد بیچ کر یا قرض لے کر جہیز بنائے جاتے ہیں۔

فصیح احمد کی زبان کا جادو مجھے واپس اُس دنیا میں لے گیا تھا جہاں لوگ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے دھونس، دھاندلی اور شوبازی سے کام لیتے ہیں.... جہاں دیانتداری نہیں ظاہرداری ہے، جہاں قانون نیلام ہوتا ہے، جو زیادہ بولی دے آبرو باختہ عورت کی طرح قانون اُسی کا ہو جاتا ہے، جہاں مسجد کا امام خُدائی احکام کا رسمی طور پر اور گاؤں کے چوہدری کے حکم کا دلی طور پر پابند ہوتا ہے اور جہاں شرابی اور زانی پیروں کے لوگوں کی قسمت اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے اور جہاں بھینس اُسی کی ہوتی ہے جس کے ہاتھ دولت کی یا چوہدراہٹ کی یا غنڈہ گردی کی لاٹھی آجاتی ہے اور جہاں اونچی ذات والے چھوٹی ذات والوں کو اپنی رعایا سمجھتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ کی ذات کا ذرہ بھی خوف یا احترام نہیں ہوتا۔

میں بھی اسی لاٹھی کے ڈر سے گھر سے بھاگا اور فوج میں پناہ لی تھی۔ فصیح احمد کا میدانِ جنگ کی خونریزی، لاشوں اور ہولناکی نے ذہن کے جہنم سے نکالا تھا۔ اُس نے اپنی بہن کو سسرال کے تنور سے نکالنے کے لئے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ اُس نے ایک ماں کا اکلوتا اور نوجوان بیٹا زہر سے قتل کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنے ضمیر کو بھی خون کر دیا تھا۔ وہ تو معزّز خاندان کا فرد تھا۔

ہم دونوں مفرور تھے۔ انگریزوں کی فوج کے ہی مفرور نہیں بلکہ اپنے غلط کار اور

فریب کار اور فریب خوردہ دیہاتی معاشرے کے بھی مفرور!

فصیح نے بات ختم کی تو میرا ذہن نہایت آہستہ آہستہ واپس گن بوٹ کے عرشے پر آیا۔ ہر طرف سمندر تھا۔ پچھلے پہر کا چاند سمندر سے ابھر کر اوپر آگیا تھا۔ چاندنی نے سمندر پر چاندی بکھیر دی تھی اور گن بوٹ سمندر کی چمکتی ہوئی ہلکی ہلکی لہروں کو چیرتی جا رہی تھی۔

آج سوچتا ہوں، زندگی نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں.... مگر اپنی قوم کے اور اپنے ملک کے جو رنگ دیکھ رہا ہوں، یہ دل پہ کبھی کبھی ہول طاری کر دیتے ہیں۔ شاید بوڑھا ہو گیا ہوں اور برداشت کی قوت نہیں رہی۔ کبھی تو دل زیادہ ہی گھبرا جاتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے اور ایسے میں مجھے وہ سمندر یاد آتا ہے اور جی میں آتی ہے کہ ایک بار پھر وہیں چلا جاؤں، سمندر میں میری کشتی تیرتی چلی جائے، چلی جائے اور مجھے وہاں تک پہنچا دے جہاں رات کے پچھلے پہر کا چاند سمندر سے اُبھرتا ہے۔

آج پھر فرار ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔

اپنے اس سفرنامے سے ہٹ کر ایک بات کہنا چاہتا ہوں.... اسی باب میں بتاؤں گا کہ میں نے جاپانیوں کے جنگی قیدی دیکھے تھے جو انگریز تھے۔ ان کی حالت دیکھی تھی بہت بُری تھی۔ مشقت زیادہ اور خوراک بہت ہی کم۔ کوئی مرتا ہے تو مر جائے.... آج اپنی قوم کو دیکھتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی غیر قوم نے میرے ملک کو فتح کر لیا ہو اور میری قوم کو عوام بنا کر ان عوام کو جنگی قیدی بنا لیا ہو.... مشقت زیادہ، خوراک بہت کم.. .. آج کا دن زندہ رہے تو کل کا کچھ پتہ نہیں!

اگلے روز ہماری گن بوٹ ایک بندرگاہ پر رکی۔ اُس میں تیل ڈالا گیا اور گن بوٹ والوں نے بہت سا راشن بندرگاہ سے لے کر گن بوٹ میں رکھ لیا اور اڑھائی تین گھنٹوں بعد بوٹ پھر چل پڑی۔

○

تین روز گزر گئے۔ دوپہر کے وقت گن بوٹ ایک بڑی بندرگاہ میں داخل ہوئی اور اندر جا کر ایک برتھ کے ساتھ رُک گئی۔ ہمیں اُترنے کو کہا گیا۔

یہ ملاکا شہر کی بندرگاہ تھی۔ وہاں جاپانیوں کے بحری جنگی جہاز اِدھر اُدھر لنگرانداز تھے۔ میں نے تین چار گن بوٹیں بھی دیکھیں۔ ہر طرف جاپانی ہی جاپانی نظر آتے تھے۔

یہ ملایا کی ایک بڑی بندرگاہ تھی۔

ہمارے ساتھ جو جاپانی افسر تھا' وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گیا اور ایک جگہ ٹھہرنے کہا۔ وہ خود کسی دفتر میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد جاپانی نیوی کی ایک فوجی گاڑی آ گئی۔ ہمارا جاپانی افسر بھی آیا اور ہم سب اس فوجی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ فصیح نے مجھے بتایا کہ ہ کوالالمپور جا رہے ہیں۔

کوالالمپور اُس وقت بھی ملایا کا دارالحکومت تھا اور آج بھی یہی شہر دارالحکومت ہے۔ اب یہ ملایا نہیں بلکہ ملائشیا ہے اور یہ ایک مسلمان ملک ہے۔ ملائشیا میں ہندو بھ آباد ہیں۔ بُدھ مت کے پیروکار بھی اور وہاں چینی باشندوں کی آبادی بھی خاصی زیا ہے۔

ملاکا سے کوالالمپور پچھتر میل دُور ہے۔ ہم نے یہ فاصلہ اس فوجی گاڑی میں طے کر تھا۔ اس اتنے بڑے شہر میں ہم نے جنگ کے یہ آثار دیکھے کہ کئی عمارتیں بمباری سے تباہ ہو گئی تھیں اور بعض مکانوں کی دیواروں پر گولیوں کے نشان صاف نظر آتے تھے لیکن جب ہم اس شہر میں پہنچے وہاں کوئی جنگ نہیں لڑی جا رہی تھی۔ نہ کہیں سے گو کی آواز آتی تھی نہ اوپر لڑاکا طیارے اُڑتے تھے' جاپانی فوجی تو نظر آتے تھے لیکن ان کے چہروں پر سکون اور اطمینان تھا۔ انہوں نے ملایا انگریزوں سے چھیننا تھا۔ سڑکوں پر ہم۔ سویلین لوگ گھومتے پھرتے بھی دیکھے۔

ہماری گاڑی شہر سے نکل گئی اور چند میل آگے جا کر گھنے جنگل میں داخل ہو گئی یہ پکّی سڑک تھی اور اس کے ساتھ ریلوے لائن بھی جاتی تھی۔ اس جنگل میں زیادہ درخت ربڑ کے تھے اور اس کے بعد ناریل اور تاڑ کے درخت تھے۔ یہ ملک آج بھی ر پیدا کرتا ہے اور یہ اس کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ میں آپ کو کوئی اور ہی مناظر دکھ چاہتا ہوں۔ راستے میں ایک اور سڑک بنائی جا رہی تھی۔ خاکی وردی میں لپٹی ہوئی ایک سفید فام مخلوق تھی جو سڑک پر کام کر رہی تھی۔ وہاں کوئی سویلین مزدور نظر نہیں آ تھا۔

یہ سفید فام زیادہ تر انگریز تھے اور ان میں آسٹریلیا کے فوجی بھی تھے۔ یہ سب جنگ قیدی تھے جن سے جاپانی فوج نے ہتھیار ڈلوائے تھے۔ ان میں مجھے کوئی ایک بھی سیاہ فا یعنی ہندوستانی فوجی نظر نہ آیا۔ میں آسٹریلیا والوں کو انگریز ہی کہوں گا۔ اگر فصیح نہ بتاتا

ان میں آسٹریلیا کی فوج کے جنگی قیدی بھی ہیں تو میں سب کو انگلینڈ کے باشندے سمجھتا۔

یہ انگریز کہیں سے بڑے بڑے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے اور دوسرے انگریز ان پتھروں کو ہتھوڑوں سے توڑ رہے تھے۔

ان انگریز جنگی قیدیوں کی وردیاں پھٹ گئی تھیں اور بہت ہی میلی تھیں۔ ان کے چہرے زیادہ مشقت اور کم خوراک کی وجہ سے سُوکھ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں اور بازوؤں اور ٹانگوں کی ہڈیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان میں اگر کوئی نقاہت کی وجہ سے تھک کر بیٹھ جاتا تو جاپانی فوجی جو ان سے مشقت کروا رہے تھے' اُس جنگی قیدی کو مارنا پیٹنا شروع کر دیتے تھے۔

ہماری گاڑی وہاں کچھ دیر کے لئے رُک گئی شاید اس لئے کہ ہمارے جاپانی افسر کو وہاں کوئی اپنا دوست مل گیا تھا اور وہ اس کے پاس جا بیٹھا تھا۔ میں ان جنگی قیدیوں کو دیکھنے لگا۔

ایک جنگی قیدی کو دیکھا۔ وہ کندھے پر کم و بیش پندرہ سیر وزنی پتھر اٹھا کر لا رہا تھا۔ ویسے ہی میری نظریں اُس پر جم گئیں۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ اُس کے لئے قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ اُس نے چند قدم اور اٹھائے' رُکا اور مُنہ کے بَل گرا۔ پتھر اس کے سر کے قریب تھا۔ اس پتھر نے اُس کا چہرہ بائیں طرف سے لہولہان کر دیا۔ اُس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اُٹھ نہ سکا۔ دو قیدی دوڑ کر اُس تک پہنچے اور اُسے اٹھانے لگے۔

دو جاپانی فوجی دوڑے آئے اور ان دونوں قیدیوں کو رائفلوں کے بٹ مار مار کر پیچھے دھکیل دیا اور اُس گرے ہوئے قیدی کو ٹھُڈے مارنے لگے۔ وہ تو پہلے ہی اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ اُسے اتنی زور کے ٹھُڈے پڑے تو وہ بالکل ہی لیٹ گیا۔

ایک جاپانی فوجی کچھ دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید افسر تھا۔ اس نے اپنی زبان میں ان دونوں سپاہیوں سے کچھ کہا۔ ان دونوں سپاہیوں نے اس زخمی انگریز کی ٹانگیں ٹخنوں سے پکڑیں اور پیٹھ کے بل گھسیٹتے ہوئے ذرا دور لے گئے۔ ان میں سے ایک جاپانی نے رائفل کی نالی اس انگریز قیدی کے سر کے قریب کی اور ایک گولی فائر کر دی۔

جاپانی افسر نے اپنے قریب کام کرتے ہوئے چار پانچ قیدیوں کو ٹھڈے مار کر اُٹھایا اور مرے ہوئے قیدی کی طرف اشارہ کر کے انہیں اشارہ کیا کہ اُس تک پہنچیں۔ چار پانچ انگریز قیدی دوڑے گئے اور اپنے مرے ہوئے ساتھی کو اٹھا کر ایک طرف چلے گئے۔

"گڑھا کھود کر اس میں دفن کر آئیں گے" ـــــ مجھے فصیح احمد کی آواز سنائی دی
میرے قریب کھڑا کہہ رہا تھا ـــــ "ان قیدیوں کے ساتھ جاپانی بہت ہی بُرا سلوک کر
ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی بیمار ہو جائے یا اس طرح زخمی ہو جائے یا کمزوری کی وجہ
کام کرنے کے قابل نہ رہے تو اسے اسی طرح گولی مار دیتے ہیں اور اس کے سا
سے کہتے ہیں کہ اسے کہیں گڑھا کھود کر دفن کر دو"۔

یہ تھی وہ قوم جو ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی بلکہ اس قوم نے پور
ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا اور یہ قوم ہندوستانیوں سے نفرت کرتی تھی۔

اس قوم نے چالبازیوں اور فریب کاریوں سے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا۔ پھر اس
نے غریب اور کمزور ملکوں پر فوج کشی کی، قتل و غارت کی اور ان ملکوں پر قبضہ کرتی
گئی۔ انگریزوں نے آدھی سے زیادہ دنیا پر قبضہ کیا اور اپنی بادشاہی پھیلا دی۔ ان
متعلق یہ جو مشہور تھا کہ انگریزوں کی بادشاہی میں کبھی سورج غروب نہیں ہُوا غلط
تھا۔ ہندوستان میں تو لوگ انگریزوں کو آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھا کرتے تھے
اُن کا عقیدہ بن گیا تھا کہ حکومت تو صرف انگریز کا حق ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں نے جس مکاری اور عیاری سے اپنی بادشاہی کے
مضبوط کئے، ان میں ایک یہ حربہ تھا کہ ان انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے خوشا
اور غدار پیدا کئے۔ مسلمانوں میں بھی انہیں ایمان فروش مل گئے۔ انگریزوں نے ا
انعام و اکرام سے نوازا اور انہیں اتنی بڑی بڑی جاگیریں دیں جو یہ لوگ کبھی خواب
نہیں دیکھ سکتے تھے۔

سلطان ٹیپو شہید کو ان انگریزوں نے مسلمان غداروں سے شکست دلوائی اور
ہندوستان پر قبضہ کیا۔

سیّد احمد شہیدؒ کو ان انگریزوں نے مسلمان غدّاروں سے شکست دلوائی اور ا
شہید کروایا۔

1857ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں نے مسلمان غدّاروں سے دِلّی کے دروا
کھلوائے اور دِلّی پر قبضہ کیا اور پھر ان غدّاروں کے ذریعے انہوں نے بہادر شاہ
گرفتار کیا اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ہندوستان میں تو انگریزوں نے غدا
ایمان فروش پیدا کر لئے تھے اور پھر ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کو معاشی اور معا

لحاظ سے پستیوں میں پھینک دیا اور پھر مسلمانوں نے ذات پات کے امتیاز کو مزید پختہ کر
کے ہماری قوم کو دو حصوں میں کاٹ دیا۔ ایک اونچی ذاتیں اور دوسرے نیچ ذاتیں۔ انہیں
جتنے بھی غدار ملے وہ اونچی ذاتوں میں سے ملے۔ انگریزوں نے جاگیریں اور نہری مربعے
ان ہی اونچی ذاتوں والوں کو دیئے اور انہی لوگوں کے بل بوتے پر انگریز ہندوستان کے
بادشاہ بنے رہے لیکن ملایا میں ان کی صورت خاصی مختلف تھی۔

انگریزوں نے ملایا پر 1867ء میں قبضہ کیا تھا اور وہاں اپنی بادشاہی اسی طرح قائم کر
دی تھی جس طرح ہندوستان میں کی تھی۔ جنگِ عظیم شروع ہونے سے بہت پہلے
جاپانیوں نے ملایا میں اپنے جاسوس اور ایجنٹ پیدا کر لئے تھے۔ جونہی جاپانی فوج حملہ آور
ہوئی، برما کی طرح ملایا کے لوگوں نے بھی جاپانی فوج کا استقبال کیا۔ میں نے بہت بعد میں
ایک انگریز کی ہی لکھی ہوئی کتاب میں پڑھا تھا کہ ملایا میں انگریزوں کے جو اپنے جاسوس
تھے، ان میں بیشتر جاپانیوں کے لئے کام کر رہے تھے اور وہ جاپانیوں کے خلاف انگریزوں کو
بالکل غلط اطلاعیں دیتے تھے۔

ملایا کے لوگوں کا یہ رویّہ اور رجحان بھی قابلِ غور ہے کہ وہ فوج میں بھرتی ہوتے ہی
نہیں تھے اور انگریزوں نے یہ بات بنالی کہ ملایا کے لوگ چونکہ جنگجو نہیں اس لئے یہ
فوج کے قابل ہی نہیں۔ ملایا میں جاپانیوں کے حملے کے وقت جو فوج تھی، اس میں انگریز
رجمنٹیں تھیں، آسٹریلیا کے متعدّد بریگیڈ تھے اور باقی تمام فوج انڈین آرمی تھی۔ جنگ
کے وقت ہندوستان کے ان مہاراجوں نے بھی اپنی فوج ملایا بھیج دی تھی جنہوں نے اپنی
اپنی فوجیں بنا رکھی تھیں۔ ان میں گورکھا رجمنٹیں بھی تھیں اور کشمیر کی ڈوگرہ رجمنٹیں
بھی۔

ہندوستان میں انگریزی راج اور اس راج کی مسلم دشمنی کے متعلق میں ادھوری
ادھوری بات کر رہا ہوں۔ اگر میں تفصیل سے لکھنے لگوں تو بڑی موٹی کتاب لکھ ڈالوں۔
اس موضوع پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں صرف ایک حوالہ دوں گا، وہ یہ کہ لارڈ ماؤنٹ
بیٹن ہندوستان کا آخری وائسرائے تھا اور اس کے ہاتھوں ہندوستان تقسیم ہُوا اور پاکستان
معرضِ وجود میں آیا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہماری آزادی کے چند سال بعد ایک کتاب
لکھی تھی جس میں اس نے ہندوستان کی تقسیم کے متعلق لکھا کہ اسے معلوم نہیں تھا
کہ قائدِاعظم ٹی بی کے مریض ہیں۔ میں اس سلسلے میں ایک اور کتاب کا حوالہ دوں گا جو

پاکستان میں چھپی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹر الٰہی بخش مرحوم نے جو قائدِاعظم کے آخری دنوں کے معالج تھے، نے لکھی تھی۔ انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایک پارسی ڈاکٹر نے ڈیڑھ دو سال پہلے قائدِاعظم کا ڈاکٹری معائینہ کیا اور ایکسرے وغیرہ بھی لئے اور اس نے قائدِاعظم کو بتایا کہ وہ ٹی بی کے مریض ہیں۔ قائدِاعظم نے اسے بڑی سختی سے کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں ٹی بی کا مریض ہوں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ قائدِاعظم تحریک پاکستان میں ٹی بی کے مریض کی حیثیت سے سرگرم رہے اور مسلمانوں کو پاکستان دلا دیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی کتاب میں لکھا کہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ محمد علی جناح ٹی بی کا مریض ہے تو میں دو سال اور ہندوستان تقسیم نہ ہونے دیتا۔ اتنے میں محمد علی جناح ٹی بی کی وجہ سے اس دنیا سے اٹھ جاتا اور پھر کبھی بھی ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اور اس دنیا میں پاکستان کا نام و نشان نہ ہوتا۔ ماؤنٹ بیٹن کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کبھی بھی آزادی نہ ملتی اور مسلمان انگریزوں کے بعد ہندو کے غلام ہوتے۔

انگریزوں اور ہندوؤں کی سازش بھی یہی تھی۔ پھر یہ دونوں قومیں کامیاب کیوں نہ ہو سکیں؟.... اس سوال کا جواب تاریخ پاکستان کا ہی نہیں بلکہ تاریخ اسلام کا ایک درخشاں باب ہے۔ یہ پاکستانی علاقوں کے مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ تمام تر ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک معجزہ نما کارنامہ ہے۔ ہندی مسلمانوں نے یہ کارنامہ تو کر دکھایا لیکن انگریزوں نے پھر بھی اپنی منافقت کا مظاہرہ کر دیا۔ فیروز پور اور گورداسپور کے علاقے جو مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تھے، ہندوستان میں شامل کر دیئے۔ اُدھر کشمیر کے مہاراجہ کی پشت پناہی کی کہ وہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لے اور ہندوستان اپنی فوج کشمیر میں داخل کر دے گا۔ یہ ایسی تقسیم تھی کہ ہندوستان اور پاکستان آج تک برسرِپیکار ہیں اور سرحدی امن کبھی بھی قائم نہیں ہو سکا۔

○

معافی چاہتا ہوں، بات کہیں اور کی کر رہا تھا اور کہیں اور جا نکلا۔ انگریزوں کو جاپانیوں کی قید میں دیکھ کر اور پھر انہیں ذلت و رسوائی میں بھوکے پیاسے مشقت کرتے دیکھ کر یہ یاد آنا قدرتی امر تھا کہ یہی انگریز ہمیں جانوروں سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتے تھے۔ ہم تو انڈین ہی تھے لیکن جب کوئی گورا کسی ہندوستانی کو انڈین کہہ کر پکارتا تھا تو اس میں

نفرت اور حقارت بھری ہوئی ہوتی تھی۔ میں کس طرح بھول سکتا ہوں کہ انگریزوں کے وقتوں میں لاہور جیسے بڑے ریلوے سٹیشنوں کے اندر فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لئے ریستوران بنے ہوئے تھے۔ بعض انگریز اپنے پالتو کُتے بھی ریستوران میں لے جاتے تھے۔ ان ریستورانوں کے باہر ایک بورڈ لگا ہوتا تھا جس پر لکھا تھا — "Dogs and Indians not Allowed" — (کُتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے)۔ یہ ریستوران صرف انگریزوں کے لئے ریزرو ہو کر رہ گئے تھے حالانکہ فرسٹ کلاس میں ہندوستانی بھی سفر کیا کرتے تھے مگر انگریزوں کی نظر میں کُتے اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہیں تھا۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ انگریزوں کی بادشاہی آدھے سے زیادہ کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھی۔ سمندروں پر بھی انہی کی حکمرانی تھی۔ یہ الفاظ ایک انگریز امیرالبحر (نیول کمانڈر) کے ہیں کہ دنیا پر وہی بادشاہی کرے گا جس کی بحری قوت بہت ہی زیادہ اور مضبوط ہو گی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انگریزوں کی بحری قوت بڑی ہی مضبوط اور زیادہ تھی۔ آدھی سے کچھ زیادہ دنیا کی بادشاہی اور بحری طاقت نے انگریزوں کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔

میں چونکہ ملایا کی بات کر رہا ہوں اس لئے اب اسی پر توجہ مرکوز رکھوں گا۔ ملایا کے نیچے والے کنارے پر سنگاپور ایک بہت بڑا شہر اور بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ انگریزوں نے سنگاپور کو دو نام دے رکھے تھے۔ ایک تھا "ناقابل تسخیر قلعہ" اور دوسرا نام تھا "مشرق بعید کا جبل الطارق"۔ جاپانیوں کا ہدف یہی سنگاپور اور یہی ملایا تھا۔

بحرالکاہل میں امریکہ سے خاصا دُور چھوٹا سا ایک جزیرہ ہے جس کا نام ہے پرل ہاربر۔ جنگِ عظیم جرمنی نے شروع کی تھی اور وہ مہینہ ستمبر 1939ء کا تھا۔ کسی نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چھوٹا سا ملک جسے جاپان کہتے ہیں، جنگِ عظیم میں شریک ہو جائے گا۔ ایک روز اچانک جاپان جنگ میں شامل ہو گیا اور وہ جرمنی کا دوست بن کر اتحادیوں یعنی امریکہ برطانیہ وغیرہ کے خلاف میدان میں کُودا۔ وہ دن 7 دسمبر 1941ء کا تھا جب جاپانی لڑاکا بمبار طیاروں نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا۔ پرل ہاربر جو ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، اس لئے جاپانیوں کے لئے اہم تھا کہ اسے امریکہ نے اپنا جنگی بحری اڈہ (نیول بیس)

بنا رکھا تھا۔ امریکہ کی زیادہ تر بحری قوت اسی جزیرے میں تھی۔ جاپانیوں کے طیارہ بردار بحری جہاز بڑی خاموشی اور رازداری سے پرل ہاربر کے قریب آئے اور ان کے عرشوں سے لڑاکا بمبار طیارے اُڑے اور ایک ہی دن میں بلکہ چند گھنٹوں میں انہوں نے امریکہ کی بحری قوت کا صفایا کر دیا۔

وہاں سے جاپانیوں نے مشرقِ بعید کا رخ کیا۔ یہ وہ جزیرے ہیں جو آج کل انڈونیشیا اور ملائشیا کہلاتے ہیں۔ ان کے راستے میں فلپائن آتا تھا جو بہت ہی بڑا جزیرہ تھا۔ بحری جہازوں سے جاپانی فوج اتری اور دیکھتے ہی دیکھتے فلپائن پر قبضہ کر کے وہاں کی فوج سے ہتھیار ڈلوا لئے۔

مجھے یاد ہے کہ میں جب اپنی بٹالین میں ہی تھا تو خبر ملی تھی کہ جاپانیوں نے ملایا اور برما پر حملہ کر کے ان ملکوں کو قبضے میں لے لیا ہے۔ ہمارے انگریز کمپنی کمانڈر نے جاپانیوں کو جاپانی چوہے کہا تھا اور یہ بھی کہ جاپانی بہت کمزور قوم ہے اور اسے ہم تباہ و برباد کر دیں گے۔ پھر ہماری بٹالین کے تمام انگریز افسروں نے جاپانیوں کو جاپانی چوہے کہنا شروع کر دیا تھا۔

جنگ کے خاتمے کے پندرہ سال بعد، 1960ء میں، انگلینڈ میں ایک کتاب چھپی تھی — The Fall of Singapore — میں نے یہ کتاب بہت عرصے بعد پڑھی تھی۔ اس کتاب کا مصنف ایک انگریز ہی ہے۔ اس نے بڑی ہی دیانتداری اور بے باکی سے اپنی قوم کی ڈینگوں اور خوش فہمیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ پتہ چلا کہ جب ملایا اور سنگاپور پر جاپانیوں کے قبضے کی خبر پہنچی تو برطانیہ کی پارلیمنٹ اور اخباری دنیا میں بھونچال آ گیا۔ ان کے لئے اپنی یہ شکست غیر متوقع تھی کیونکہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے جاری ہونے والے بیان پڑھا اور سنا کرتے تھے جن میں سنگاپور کو ناقابلِ تسخیر قلعہ اور مشرقِ بعید کا جبل الطارق کہا جاتا تھا اور یہ بھی کہ ملایا کا دفاع اتنا مضبوط ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے ساحل کے اندر نہیں آ سکتی۔ اخباری دنیا نے اپنی حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس شکست کی انکوائری کی جائے اور اس کے جو ذمہ دار ہیں انہیں سزا دی جائے۔

اُس وقت برطانیہ کا وزیرِ اعظم دنیا کا مشہور و معروف مدبّر سیاستدان چرچل تھا۔ وہ جنگی امور میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انکوائری کرائے گا لیکن جنگ کے بعد اس نے کہا تھا کہ وہ انکوائری تو ضرور کراتا لیکن جن انگریز فوجیوں نے ملایا

اور سنگاپور میں جانیں قربان کی ہیں، یہ اُن کی روحوں کی توہین ہو گی۔

جاپانیوں نے جس طرح سنگاپور اور ملایا پر فوج کشی کر کے قبضہ کیا تھا، اگر میں یہ تفصیل سے سنانے لگوں تو بات بہت ہی لمبی ہو جائے گی اور شاید قارئین اس میں بوریت بھی محسوس کریں۔ میں وہی بات کہوں گا جو پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ وہ یہ کہ انگریز اس خوش فہمی بلکہ اس غرور اور تکبّر میں مبتلا تھے کہ جس طرح انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے لوگوں کو دبا کر اور ان کے گلے گھونٹ کر رکھا ہُوا ہے اور جس طرح ان میں سے انہوں نے خوشامدی اور ایمان فروش پیدا کر لئے ہیں ایسے ہی ملایا کے لوگ بھی انہیں دنیا کی بہت بڑی طاقت سمجھتے ہیں اور ان سے ڈرتے ہیں لیکن وہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ ملایا میں انگریزوں کو وہ پذیرائی حاصل نہیں تھی جو ہندوستان وغیرہ میں تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہاں کے لوگ انگریزوں کے خلاف کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ ان میں جاپانیوں کے جاسوس، ایجنٹ اور حمایتی تھے جو اس قدر خفیہ اور پوشیدہ تھے کہ کسی کو شک تک نہ ہُوا۔ یہی وجہ تھی کہ جاپانیوں نے جب ملایا پر قبضہ کیا تو وہاں کی پبلک کے ساتھ انہوں نے اچھا سلوک کیا۔ اچھے سلوک کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شہریوں کا قتلِ عام اور ان کے گھروں میں لُوٹ مار نہ کی بلکہ ان کے جان و مال کی حفاظت کی۔ البتہ انہوں نے وہاں جو بھی خوبصورت لڑکی دیکھی اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ جاپانی اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس ہانگ کانگ میں جاپانیوں کا رویّہ بہت ہی ظالمانہ تھا۔ ملایا سے پہلے جاپانیوں نے ہانگ کانگ پر حملہ کیا اور وہاں قبضہ کر لیا تھا۔ وہاں سے بھی انگریز کی فوج بھاگی تھی اور باقی نے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن شہریوں نے انگریزوں کی فوج کی مدد کی تھی اور جاپانیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ جاپانیوں نے وہاں کی پبلک کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا۔ قتل و غارت بھی کی، لُوٹ مار بھی کی اور وسیع پیمانے پر عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی آبروریزی کی تھی۔ ملایا میں ان کا سلوک اور برتاؤ خاصا بہتر رہا جس کا اعتراف خود انگریزوں نے کیا تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ انگریزوں نے ملایا میں دنیا بھر کی فوج اکٹھی کر رکھی تھی جس میں ان کی اپنی گورا رجمنٹیں تھیں، آسٹریلیا کے بریگیڈ تھے اور انڈین آرمی کی بے شمار یونٹیں، توپ خانے اور ریاستی فوجیں بھی تھیں اور گورکھا رجمنٹیں بھی تھیں۔ میں

گورکھا رجمنٹوں کا ذکر الگ اس لئے کر رہا ہوں کہ گورکھے سے بڑھ کر کوئی سپاہی وفادار نہیں ہو سکتا۔ گورکھے اپنی جانیں قربان کر دیتے تھے پسپا نہیں ہوتے تھے اور ان کو وہ بھی نہیں دیتے تھے جن سے انہیں تنخواہ اور راشن پانی ملتا تھا۔

○

ملایا میں صورتِ حال یہ بن گئی تھی کہ جاپانی فوج جدھر بھی حملہ کرتی تھی وہاں انگریزوں کی فوج تھوڑے سے مقابلے کے بعد پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ انگریزوں کو اپنی فرعونیت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ انہوں نے وہاں ایئر فورس بھی بہت تھوڑی رکھی ہوئی تھی اور بحری جنگی جہاز بھی تھوڑے تھے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ جاپانیوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ جاپان چھوٹا سا ایک جزیرہ ہے جہاں سے اسے اتنی زیادہ فوج نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے مقابلے میں انگریزوں کے پاس اُن دوسرے ملکوں کی فوجیں بھی تھیں جن میں ان کی بادشاہی تھی لیکن اس فوج کے پاؤں کہیں بھی جم نہیں رہے تھے۔

انگریزوں کی فوج کا کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل Percival تھا۔ وہ اپنے سپریم کمانڈر کو مشرقِ بعید کی افواج کا سپریم کمانڈر تھا' اپنی پسپائی کی اور جاپانیوں کی پیشقدمی کی اطلاعیں دے رہا تھا۔ سپریم کمانڈر اُس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور غالباً" یہ خبریں برطانیہ بھی پہنچ رہی تھیں لیکن انگریزوں کی پسپائی بتا رہی تھی کہ ملایا کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ جاپانیوں نے ملایا پر 9 اور 10 دسمبر کی درمیانی رات حملہ کیا تھا۔

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ انگریزوں کی بحری طاقت کا جواب نہیں تھا۔ اس بحری طاقت میں دو ایسے بحری جنگی جہاز تھے جن پر انگریزوں کو اور خصوصاً" ان کے وزیرِاعظم چرچل کو بہت ہی ناز تھا۔ ان میں ایک تھا — Prince of Wales اور دوسرا تھا Repulse۔ چرچل کہا کرتا تھا کہ یہ دو بحری جہاز سمندر پر تیرتے ہوئے دو قلعے ہیں جو ناقابلِ تسخیر ہیں۔

چرچل کو جب ملایا کے سقوط کی اطلاعیں مل رہی تھیں تو اُس نے اپنے سرکاری گھر نمبر 10 ڈاؤننگ سٹریٹ میں اپنی کابینہ کا اجلاس بلایا اور انہیں آگاہ کیا کہ ملایا میں صورتِ حال اتنی مخدوش ہے کہ اب کسی بھی وقت ملایا کے سقوط کی اطلاع آ سکتی ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اب ہمارے ہاتھ میں جو بحری طاقت رہ گئی ہے' وہ دو بحری جہاز پرنس آف

ویلز اور ری پلس ہیں۔ چرچل نے یہ الفاظ بھی کہے کہ ہمیں فخر ہے کہ یہ دو بحری جہاز ہم انگریزی بولنے والی قوموں (امریکہ اور برطانیہ) کو بحرالکاہل میں فتح دلائیں گے۔ امریکہ کا مغربی ساحل اور آسٹریلیا کا شمالی ساحل اور ہماری مشرقِ بعید کی نوآبادیات محفوظ ہو جائیں گے.... چرچل کا مطلب یہ تھا کہ دنیا پر صرف انگریزی بولنے والی قومیں یعنی امریکہ اور برطانیہ حکومت کریں گی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ دونوں بحری جہاز بہت ہی بڑی بحری طاقت تھے۔ ان جہازوں میں جو گنیں لگی ہوئی تھیں وہ راڈار سے کنٹرول ہوتی تھیں۔ ان دونوں بحری جہازوں کا کمانڈر ایک تھا جس کا نام ایڈمرل سر ٹام فلپس تھا۔ جرمنی نے جب برطانیہ پر حملہ کیا تھا تو اس ایڈمرل نے ان دونوں جہازوں سے جرمنی کی بحری طاقت کو روکے رکھا تھا۔

جرمنی کی نیوی کے خلاف کچھ عرصہ لڑ کر یہ دونوں بحری جہاز غائب ہو گئے تھے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ جہاز کہاں چلے گئے ہیں۔ دراصل ان کی نقل و حرکت کو خفیہ رکھا گیا تھا اور اس وقت یہ دونوں جہاز ملایا کے مشرقی ساحل پر کوانٹین کی بندرگاہ میں تھے۔ ان دونوں کے کمانڈر ایڈمرل ٹام فلپس کو برطانیہ سے حکم پہنچا کہ فوراً" باہر نکلیں اور جاپانی یلغار کو روکیں۔ جنگی وقائع نگار لکھتے ہیں کہ چرچل نے پورے وثوق سے کہا تھا کہ اب جاپانی بحرالکاہل میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔

دونوں بحری جہاز بندرگاہ سے نکلے اور کچھ دور جا کر اُنہوں نے یہ فارمیشن بنا لی کہ ایک دوسرے سے دُور ہو گئے یعنی ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف ہو گیا اور ان کا درمیانی فاصلہ دو تین میل تھا۔ اُس وقت جاپان کے جنگی بحری جہاز اس سمندر میں موجود تھے لیکن کوئی بھی ان کے قریب نہ آیا اور نہ کسی بحری جہاز نے ان پر ایک بھی گولہ فائر کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جاپانیوں کے بحری جہاز اور دُور ہٹ گئے تھے۔

دونوں جہاز بندرگاہ سے تقریباً" ڈیڑھ سو میل دور نکل گئے تو ری پلس پر جاپانی بمباروں نے حملہ کر دیا۔ وہ 10 دسمبر 1991ء کا دن تھا۔ ریکارڈ کے مطابق اُس وقت دن کے ساڑھے گیارہ بجے تھے جب پہلے جاپانی بمبار آسمان میں نظر آئے۔ ان کی بلندی دس ہزار فٹ تھی اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اس سے پہلے آسمان بالکل صاف تھا اور کوئی طیارہ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر پہلے کچھ دُور ایک جاپانی لڑاکا طیارہ

نظر آیا تھا جو واپس ساحل کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دراصل جاسوس طیّارہ تھا اور یہی
آیا تھا کہ اس وقت انگریزوں کی قوت کہاں ہے۔

یہاں میں پھر کہوں گا کہ یہ ملایا تھا' ہندوستان نہیں تھا جہاں ان انگریزوں نے
پیدا کر کے سلطان ٹیپو کو شہید کیا اور غداروں نے قلعہ سرنگاپٹم کا ایک دروازہ کھول
انگریزوں کی فوج اندر داخل ہو گئی تھی۔ ملایا کے لوگوں میں ان ہندوستانی غداروں
کوئی غدّار نہیں تھا جنہوں نے 1857ء میں دِلّی کا ایک دروازہ کھول کر انگریزوں کی فو
راستہ دے دیا تھا۔ جاپانی ملایا میں اجنبی تھے۔ ان کی کامیابی کی وجہ صرف یہ تھی کہ ا
رہنمائی اور مدد کے لئے وہاں کے لوگ موجود تھے۔ وہ انگریزوں کی منافقت سے
آئے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے اتنے بڑے دو بحری جہاز بندرگاہ سے نکلے تو جاپانیو
فوراً" اطلاع مل گئی۔ انہوں نے پہلے ایک ریکی طیّارہ بھیجا اور وہ طیّارہ واپس آیا تو
طیّاروں کا ایک غول بھیج دیا۔

"ری پلس" کی مشین گنوں اور توپوں نے ان بمبار طیاروں پر بے پناہ فائر کھوا
لیکن یوں لگتا تھا جیسے جاپانیوں کو اس بے ہنگم فائر کی کچھ پرواہ نہیں۔ طیّارہ شکن تو
کے گولے اوپر جا کر پھٹ رہے تھے اور مشین گنوں نے فضا میں گولیوں کا جال تان
لیکن جاپانی بمبار طیّاروں نے بحری جہاز کے اوپر آ کر بم گرا دیئے۔ زیادہ تر بم ری
کے عرشے پر گرے اور جہاز کے کچھ اہم حصے تباہ کر دیئے۔ بحری جہاز کے گنروں
جاپانیوں کا ایک طیّارہ مار گرایا۔ بمباروں کا یہ غول آگے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد جاپانی بمبار طیّاروں کا ایک اور غول آیا۔ اب ان بمبارو
ہدف "پرنس آف ویلز" تھا۔ اس پر بھی ان طیّاروں نے بم گرائے جو اس کے عر
گرے اور خاصا نقصان ہُوا۔ اس کے ساتھ ہی جاپانیوں کا ایک طیّارہ نیچے آیا اور اس
"پرنس آف ویلز" کے ایک پہلو کی طرف سے آ کر تارپیڈو گرائے۔ یہ دو تارپیڈو
تارپیڈو پہلے سمندر میں جاتا ہے اور پھر سیدھا ہو جاتا ہے۔ اس کی مشینری پانی کے
جاتے ہی چل پڑتی ہے اور تارپیڈو اپنے ہدف پر راکٹ کی طرح بڑی ہی تیز رفتار سے
ہے۔ یہ سمندر کے اندر اندر بحری جہاز کے پہلو کے ساتھ ٹکراتا اور جب پھٹتا
بحری جہاز کے پہلو میں خاصا بڑا شگاف کر دیتا ہے۔ بحری جہاز کا تمام گولہ بارود نیچے وا
حصے میں رکھا جاتا ہے جسے میگزین کہتے ہیں۔ اگر تارپیڈو میگزین کے پہلو میں پھٹے تو

بحری جہاز کا پورا گولہ بارود پھٹتا ہے اور جہاز کو ایسا تباہ کرتا ہے کہ جہاز فوراً" ڈوب جاتا
ہے۔ اگر بحری جہاز چھوٹا ہو تو یہ دو حصوں میں کٹ جاتا ہے۔ اگر میگزین کی بجائے
تارپیڈو کسی اور حصے میں لگے تو وہاں سے جہاز کا پہلو ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور سمندر کا پانی
جہاز کے اندر جا کر جہاز کو ڈبو دیتا ہے۔

"پرنس آف ویلز" کے پہلو میں دو تارپیڈو لگے۔ یہ میگزین میں تو نہ لگے' پچھلے
حصے میں لگے جس سے اس کا پروپیلر ٹوٹ گیا۔ پروپیلر ہی جہاز کو چلاتا ہے۔ اس کے ساتھ
ہی جہاز کو دائیں بائیں کرنے والا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا یعنی اس کا سٹیئرنگ گیئر بیکار ہو گیا۔
اب انگریزوں کا "سمندر میں تیرتا ہُوا قلعہ" چلتے چلتے رک گیا اور جاپانی بمباروں کے لئے
بڑا آسان ٹارگٹ بن گیا۔

اُدھر "ری پلس" کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پہلی بمباری سے اس میں آگ لگ
گئی۔ آگ کے باوجود یہ بحری جہاز سمندر پر ٹھیک ٹھاک تیرتا رہا اور اس کی مشین گنیں
اور بڑی توپیں جاپانی ہوائی جہازوں پر آگ برساتی رہیں۔ اس میں آگ اتنی جلدی پھیل
نہیں سکتی تھی کیونکہ آگ بجھانے کا انتظام نہایت اچھا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ ایک بہت
بڑا جہاز تھا۔ اسے بھی تارپیڈو لگے اور اس نے زخم بھی کھائے لیکن اس کے عملے نے
ہمت نہ ہاری اور بمباروں کا مقابلہ کرتے رہے اور جہاز کو بھی سمندر پر تیرتا رکھا۔

دونوں بحری جہاز بہت نقصان اٹھا چکے تھے۔ ان کی رفتار نہ ہونے کے برابر رہ گئی
تھی۔ "ری پلس" تو بالکل ہی رک گیا تھا۔ جاپانی طیارے نیچے آ گئے اور ان بحری جہازوں
کے طیّارہ شکن فائر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان پر لپک لپک کر آگ برسانے لگے۔ میں
نے کبھی ایک بات سنی تھی کہ ایک جاپانی ہوا باز نے اوپر سے سیدھی ڈائیو کی اور اپنے
طیّارے کو ایک بحری جہاز کی چمنی میں پھینک دیا تھا۔ بحری جہاز کی چمنی بند ہو جائے تو
جہاز بالکل بے کار ہو جاتا ہے اور اس کے انجن روم میں سیاہ دھواں بھر جاتا ہے۔ میں نے
یہ بات اس لئے صحیح مان لی تھی کہ جاپانیوں کے لئے اپنی جانیں یوں قربان کرنا قابلِ فخر
سمجھا جاتا تھا لیکن ملایا میں کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا تھا کہ یہ بات غلط ہے اور ایسا کوئی واقعہ
نہیں ہُوا نہ وہاں جاپانیوں کو اس قسم کی خودکُش کارروائی کرنے کی ضرورت تھی۔ ہاں
البتہ جاپانی ہوابازوں نے دس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے آ کر دونوں بحری جہازوں کے
بہت ہی قریب اُڑ کر اس پر آگ برسائی تھی تاکہ یہ جلدی ڈوب جائیں۔

ڈیڑھ بجے کے قریب دونوں بحری جہاز ڈوبنے لگے اور ان کے عملے کے آدمی سمندر میں کودنے لگے۔ انہوں نے لائف بوٹیں سمندر میں پھینکیں اور بعض ویسے ہی سمندر میں کود گئے۔ ان دونوں بحری جہازوں کے ساتھ دو تباہ کن بحری جہاز بھی تھے جو انہیں اسکارٹ کر رہے تھے اور ان سے دور دور تھے۔ وہ اتنی دور تھے کہ ان کی طیارہ شکن گنیں جاپانی طیاروں تک فائر نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ جب دونوں جہاز ڈوبنے لگے اور ان کے آدمی سمندر میں کودنے لگے تو وہ دونوں جہاز ان لوگوں کو سمندر میں سے نکال لے جانے کے لئے آئے۔

یہ بات انگریزوں نے خود لکھی ہے کہ جب جاپانی ہوابازوں نے دیکھا کہ وہ اپنے ٹارگٹ کو مار چکے ہیں اور اس کے عملے کو بچانے کے لئے ان کے دو بحری جہاز آ رہے ہیں تو جاپانی ہوابازوں نے ان پر حملہ نہ کیا اور چلے گئے۔ جاپانی ہواباز چاہتے تو ان دو بحری جہازوں کو بھی مار سکتے تھے۔ انگریزوں نے ان ہوابازوں کو اپنے نقصان کے باوجود خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ان دو بحری جہازوں میں جو عملہ تھا اس کی کل نفری دو ہزار نو سو اکیّس تھی اور جنہیں زندہ بچا لیا گیا ان کی تعداد دو ہزار اکیاسی تھی۔ انہیں دنوں چھوٹے تباہ کن جہازوں میں ڈال کر سنگاپور پہنچا دیا گیا تھا۔ ان دونوں بحری جہازوں کا کمانڈر ایڈمرل ٹام فلپس اُس وقت "پرنس آف ویلز" میں تھا۔ وہ اس بحری جہاز میں سے نکلا ہی نہیں اور ڈوب کر مر گیا۔ دونوں جہازوں کے کیپٹن اپنے اپنے جہاز ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں لے گئے لیکن ان میں سے ایک نہ جانے کس طرح زندہ سمندر کی سطح پر آ گیا اور اسے اٹھا لیا گیا۔ جنگ کے بعد اُس نے ان دونوں بحری جہازوں کی تباہی کا حال لکھا تھا۔

بحری جنگوں کی شروع ہی سے ایک روایت چلی آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ جو جہاز لڑائی میں ڈوبنے لگتا ہے اس کا باقی عملہ تو سمندر میں کود جاتا ہے لیکن اس کا کیپٹن جہاز سے نہیں نکلتا اور وہ اپنے جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہہ میں چلا جاتا ہے۔ اسے خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اس خودکشی کو ہارے ہوئے کیپٹن جائز سمجھتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کا سامنا اس صورت میں نہیں کرنا چاہتے کہ اس کیپٹن کا جہاز لڑائی میں ڈوب گیا تھا اور یہ زندہ باہر گھوم پھر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایڈمرل ٹام فلپس اسی روایت کے مطابق بحری جہاز کے ساتھ ہی ڈوب گیا تھا۔

ابھی ایک عبرت ناک بات بھی سنیں۔ اسی صبح برطانوی وزیرِ اعظم چرچل نے حکم

بھیجا تھا کہ "پرنس آف ویلز" اور "ری پلس" کو کھلے سمندر میں بھیج دیا جائے کہ وہ جاپان کی بحری قوت کو تہس نہس کر دیں۔ اس کے بعد اُس نے اپنی کابینہ کا اجلاس اپنے گھر میں بلایا تھا اور متکبرانہ الفاظ کہے تھے جو میں پہلے تحریر کر چکا ہوں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ صرف انگریزی بولنے والی دو قومیں دنیا پر بادشاہی کریں گی اور پھر اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ دو بحری جہاز کھلے سمندر میں نکلیں گے تو پورے بحرالکاہل پر انگریزی بولنے والی قوموں کی حکمرانی ہو گی لیکن اس اجلاس کے صرف دو گھنٹوں بعد ملایا سے بذریعہ وائرلیس اطلاع پہنچی کہ اس کی خوفناک بحری قوت سمندر میں ڈوب گئی ہے اور اس کے تیرتے ہوئے بحری قلعوں کا اب کوئی نام و نشان نہیں رہا۔ تاریخ کے مطابق یہ اطلاع یوں ملی تھی۔

"مسٹر چرچل! پرنس آف ویلز اور ری پلس کو جاپانیوں نے تباہ و برباد کر کے ڈبو دیا ہے"۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو" — چرچل نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا — "کیا یہ خبر صحیح بھی ہو سکتی ہے؟"

"ہاں مسٹر چرچل! اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ میں سرکاری حیثیت سے بول رہا ہوں"۔

ایک اخباری رپورٹر نے لکھا تھا کہ اُس وقت چرچل اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ اُس نے یہ نہ پوچھا کہ دونوں جہاز کس طرح ڈوبے ہیں۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور رکھ دیا۔ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر اُس کے آنسو پھوٹے اور پھر آنسو بہنے لگے۔ جنگ کے بعد چرچل نے اپنی یہ کیفیت اپنے قلم سے ایک کتاب میں لکھی تھی اور اُس نے یہ الفاظ لکھے — "ساری جنگ میں مجھے اس سے زیادہ بڑا صدمہ کبھی نہیں پہنچا تھا"۔

ملایا میں جاپانیوں نے ان انگریزوں کی یہ حالت کر دی تھی کہ ان کی مسلح افواج کا نظام ہی درہم برہم ہو کے رہ گیا تھا۔ یہ دونوں بڑے بحری جہاز جب حملے میں تباہ و برباد ہو رہے تھے تو دونوں جہازوں میں سے کیپٹن ایئر ہیڈ کوارٹر کو وائرلیس کے پیغام بھیجتے رہے کہ اپنے لڑاکا طیارے فوراً بھیجو' جاپانی طیارے ہم پر حملہ کر رہے ہیں لیکن اُدھر سے یا

تو جواب ملتا ہی نہیں تھا' اگر جواب ملتا تو یہ ملتا کہ طیارے آ رہے ہیں۔ لہٰذا میں کہ
ہے کہ کوالٹین میں رائل ایئرفورس کہ جو لڑاکا طیارے تھے' انہیں ایک پہلے حکم
کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا تھا اور اس سکوارڈن کے کمانڈر کو یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ
تیار رہیں کیونکہ اس نے اپنا لڑاکا سکواڈرن اپنے بحری بیڑے کا سکارٹ کرنے کے
لے جانا ہے۔ لڑاکا طیاروں کے اس سکوارڈن کو آخر حکم پہنچا کہ وہ فوراً ٹیک آف کر
اور ساحل سے اتنی دُور' فلاں سمت میں جائیں اور انہیں اپنے دو بڑے بحری جہاز
آئیں گے' انہیں اسکارٹ کریں۔

طیارے اُڑے اور جب وہ اُس مقام تک پہنچے تو آسمان خالی تھا۔ کوئی ایک بھی جاپ
طیارہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیچے دیکھا تو اپنا کوئی بحری جنگی جہاز نظر نہیں آ رہا تھا۔ دونو
بحری جہاز سمندر کی تہہ میں جا چکے تھے اور جاپانی طیارے اپنا کام کر کے اپنے اڈے پر
بھی چکے تھے۔ انگریزوں کے دو چھوٹے بحری جہاز بڑے بحری جہازوں کے عملے کو سمن
سے اٹھا کر سنگاپور لے جا رہے تھے اور وہ خاصی دور نکل گئے تھے۔ انگریزوں کا یہ فائ
سکوارڈن واپس آ گیا۔

میں آپ کو دو حقائق بتا رہا ہوں جو تاریخ کے ریکارڈ پر ہیں۔ ملایا میں مجھے دو سرو
سے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں اور میں نے بعض باتوں کو سچ نہیں سمجھا تھا۔ م
جب واپس اپنے گھر آیا اور کچھ عرصہ بعد جنگِ عظیم کی کتابیں پڑھنی شروع کیں تو بہ
سی باتوں کی تصدیق ہو گئی اور کئی ایک نئے انکشاف ہوئے۔ جن دنوں انگریزوں کی نیو
کے دو بڑے ہی زبردست بحری جنگی جہاز "پرنس آف ویلز" اور "ری پلس" تباہ ہو
ڈوبے تھے' ان دنوں انگریزوں کی رائل ایئرفورس کا یہ حال تھا کہ اُس کے لڑاکا طیارے
زمین پر ہی مارے جا رہے تھے۔ جاپانی طیارے اس وقت سر پر آن پہنچتے تھے جب
انگریزوں کے لڑاکا طیاروں میں پٹرول ڈالا جا رہا ہوتا تھا یا یہ کہیں حملے کے لئے ٹیک آ
کرنے لگتے تھے۔ جاپانی طیارے اوپر سے غوطے میں آتے اور انہیں زمین پر ہی
آتش کر دیتے تھے۔ جاپانیوں نے جن ہوائی اڈوں پر قبضہ کیا تھا' وہ ان ہوائی اڈوں
بہت دُور تھے جو ابھی انگریزوں کے پاس تھے۔ سوچنے والی بات ہے کہ جاپانیوں کو کو
اطلاع دیتا تھا کہ فلاں اڈے پر طیاروں میں پٹرول ڈالا جا رہا ہے یا طیارے حملے کے
اُڑنے لگے ہیں۔ یہ مخبری اور جاسوسی وہاں کے مقامی لوگ بذریعہ وائرلیس کرتے تھ

میں یہاں ایک انگریز جنگی وقائع نگار کے الفاظ پیش کرتا ہوں —— "جاپانیوں نے ہم سے
ملایا کا آسمان چھین لیا تھا"۔

دراصل جنوری 1942ء کے پہلے ہفتے تک انگریز ملایا کی جنگ ہار چکے تھے۔ وہ اب
اپنے فوجیوں کو صرف مروا رہے تھے اور پیچھے ہٹتے آ رہے تھے۔ آسمان جاپانیوں کے ہاتھ
تھا اور سمندر پر بھی اب جاپانیوں کی حکمرانی تھی۔ زمین پر انگریزوں کی فوج کا یہ حال تھا کہ
ہوائی مدد سے محروم ہو گئی تھی۔ اسے آسٹریلیا اور ہندوستان کی فوجوں کی کمک بھیجی گئی
لیکن ان دونوں فوجوں کو جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بحری جہازوں سے اُترتے ہی انہیں
جاپانیوں سے لڑنا پڑا اور پھر وہ بھاگ اٹھے۔

میں نے پہلے کہا ہے کہ ملایا سنگاپور کی جنگ کی کہانی بڑی ہی لمبی داستان ہے۔ اسے
میں اب اس طرح سمیٹتا ہوں کہ 15 فروری 1942ء کے روز ملایا کی افواج کے جنرل آفیسر
کمانڈنگ لیفٹیننٹ جنرل پرسیول نے سنگاپور میں جاپانیوں کے آگے ہتھیار ڈال کر اپنے
سرنڈر کے کاغذات پر غیر مشروط طور پر دستخط کر دیے اور اپنے آپ کو جاپانیوں کے
حوالے کر دیا۔ یہاں سے جاپانی آگے برما کی طرف بڑھے تھے اور برما پر قبضہ کیا تھا۔

میں نے بہت مدت بعد ایک انگریز جنگی مبصر فرینک اوون کی کتاب پڑھی تھی جس
میں اُس نے لکھا کہ جاپانیوں کی فتح کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ملایا میں
خصوصاً جنوب میں سنگاپور کے قریب زیادہ تر اراضی جاپانیوں کی ملکیت تھی۔ یہ ان کی
ذاتی ملکیت تھی۔ یہ ایسی ہی تھی جیسے ہمارے ہاں مربعے ہوتے ہیں۔ یہاں ربڑ کے
درختوں کے وسیع و عریض فارم بھی تھے۔ ان میں سے بھی بعض کے مالک جاپانی تھے۔ یہ
تمام جاپانی اپنے ملک میں رہتے تھے اور ان کی زراعت یا ربڑ کی صنعت ان کے منیجر چلاتے
تھے جو ملایا کے مقامی لوگ تھے۔ ان منیجروں نے ملایا میں اپنے طور پر سڑکیں بنائی تھیں۔
ملایا میں انگریزوں کی حکومت تھی انگریزوں کو ذرا سا بھی شک نہ گزرا کہ یہ سڑکیں کسی
اور مقصد کے لئے بنائی جا رہی ہیں۔ وہ تو خوش ہوئے ہوں گے کہ یہ لوگ اپنے خرچ پر
سڑکیں بنا رہے ہیں۔ یہ جنگِ عظیم کے آغاز سے پہلے کے دَور کی بات ہے۔ کسی کے
وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز جاپانی بھی جنگ میں کُود پڑیں گے اور وہ ملایا پر حملہ
کریں گے۔ ان منیجروں نے سڑکیں بھی ایسی بنائیں کہ دُور دُور تک لے گئے اور یہ
سڑکیں شمال کی طرف دائیں اور بائیں بندرگاہوں پر پہنچا دیں۔ جب جاپانیوں نے ملایا پر

حملہ کیا تو جاپانی فوج نے یہ سڑکیں استعمال کیں۔ یہ ایک باقاعدہ پلان تھا۔ یہ مصنف لکھتا ہے کہ انگریزوں کی فوج جدھر بھی نقل و حرکت کرتی تھی یا پسپا ہوتی تھی' جاپان کی فوج ان سڑکوں کے ذریعے آگے بڑھ کر انگریزوں کی فوج کے پہلوؤں پر حملے کرتی اور اسے بہت نقصان پہنچاتی تھی۔

○

میرے لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ ملایا اور سنگاپور میں انگریزوں کی فوج کی کُل نفری کتنی تھی۔ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ سنگاپور میں جس فوج نے ہتھیار ڈالے اس کی نفری پچاسی ہزار تھی۔ اس پچاسی ہزار میں 45 ہزار ہندوستانی فوجی تھے۔ انگریزوں کی اپنی گورا فوج' آسٹریلیا کی فوج اور ہندوستان کی فوج کا بے شمار جانی نقصان ہُوا تھا۔ یہ پچاسی ہزار نفری وہ تھی جو آخر میں سرنڈر کے وقت زندہ رہ گئی تھی۔

ہتھیار ڈالنے کے دو تین روز بعد جاپانیوں نے ان جنگی قیدیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ انگریزوں کا تھا اور اس میں آسٹریلیا کی فوج بھی شامل تھی' یعنی سفید فام فوج کو الگ کر دیا گیا اور ہندوستانی فوج کو الگ لے گئے۔ ان ہندوستانی جنگی قیدیوں کی وہ ایک فوج بنانا چاہتے تھے جسے انہوں نے انڈین نیشنل آرمی کا نام دیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد سبھاش چندر بوس ان کے پاس پہنچ گیا۔

میں پہلے کسی باب میں سبھاش چندر بوس کا ذکر کر چکا ہوں' یہاں ذرا تفصیل سے اس کا تعارف کراؤں گا۔ سبھاش چندر بوس بنگالی ہندو تھا اور اس نے انگلینڈ میں کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں سے واپس آیا تو وہ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ لے کر اٹھا لیکن وہ دوسرے لیڈروں کی طرح تقریروں اور جلوسوں کے ذریعے ملک کو آزاد کرانے کے حق میں نہیں تھا بلکہ وہ جارحانہ طریقے اختیار کرنے کے حق میں تھا اور وہ دہشت گردی کا قائل تھا۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلح بغاوت کے بغیر انگریزوں سے ہندوستان کو آزاد نہیں کرایا جا سکتا۔

سبھاش چندر بوس پکّا کانگریسی تھا لیکن مہاتما گاندھی کا بڑا ہی سخت مخالف تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں مہاتما گاندھی کو جسے ہندو اپنا روحانی باپ کہتے تھے پوری طرح بے نقاب کیا تھا۔ اس نے مہاتما گاندھی کی منافقت سے ایسا پردہ اُٹھایا کہ اس کی اصل شخصیت اور ذہنیت کو ساری دنیا کے آگے رکھ دیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور

صفِ اوّل کے دوسرے کانگریسی لیڈر سبھاش چندر بوس کے ہم خیال تھے۔

جنگ شروع ہوئی تو سبھاش چندر بوس نے انگریزوں کے خلاف کچھ عملی کارروائیاں کیں لیکن گرفتار ہو گیا۔ ہندوستان میں کانگریس کی طرف سے بڑا سخت احتجاج ہُوا۔ انگریز جنگ کی صورت میں اور اپنی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے' ہندوستانیوں کو ناراض کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے نہ وہ کانگریس کے لیڈروں کو ناراض کرنا چاہتے تھے کیونکہ انہوں نے ہندوستانیوں کو بھرتی کر کے جنگ میں جھونکنا تھا۔ انہوں نے سبھاش چندر بوس کو فوراً" ہی رہا کر دیا۔ سبھاش چندر بوس نہ جانے کس راستے سے کس ذریعے سے جرمنی جا پہنچا اور برلن میں ہٹلر سے ملا جس نے فرانس پر حملہ کر کے جنگِ عظیم کا آغاز کیا تھا۔ جب جاپانیوں نے سنگاپور اور ملایا فتح کر لیا تو سبھاش چندر بوس جرمنی سے ملایا جا پہنچا۔ یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ ملایا میں جرمن جاسوس موجود تھے۔ وہ صرف جاسوس ہی نہیں بلکہ تخریب کار بھی تھے۔

ملایا پہنچ کر اس نے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھی۔ جاپانیوں نے انڈین آرمی کے تمام جنگی قیدیوں کو اسی لئے انگریزوں اور آسٹریلیا کے فوجیوں سے الگ کر لیا تھا۔ میں آپ کو انڈین نیشنل آرمی کی کچھ باتیں سناؤں گا۔

سبھاش چندر بوس نے انڈین آرمی کے تین کپتانوں کو انڈین نیشنل آرمی کے کمانڈر بنایا تھا اور انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے تھے۔ ان میں ایک سکھ تھا' ایک ہندو اور ایک مسلمان۔ مسلمان کا نام کیپٹن شاہ نواز تھا۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو کیپٹن شاہ نواز اور اس کا خاندان ہندوستان ہی میں رہے تھے اور اُس کا خاندان اس وقت بھی کانگریسی تھا اور بعد میں بھی کانگریسی رہا۔

سبھاش چندر بوس اس فوج کو منظم کرتا رہا اور میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ برما کے محاذ سے انہوں نے انڈین آرمی کے فوجیوں کو کس طرح اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ تمام فوجی بگھوڑے ملایا پہنچا دیئے گئے تھے جو جنگی قیدیوں سے ملے اور اس طرح انڈین نیشنل آرمی کی تشہیر ہوئی۔ سبھاش چندر بوس اگست 1945ء میں جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو میں اس طیارے کے کریش میں مارا گیا تھا جس میں وہ ٹوکیو گیا تھا۔ ایک دو دن بعد جاپان نے امریکہ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

انگریزوں کے اندازے کے مطابق انڈین نیشنل آرمی کی نفری پچیس ہزار ہو گئی

تھی لیکن صحیح تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ جاپانیوں نے انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں سے کہا تھا کہ وہ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جائیں تو انہیں تنخواہیں بھی ملیں گی اور ہر وہ سہولت ملے گی جو ایک فوج کے سپاہیوں کو ملتی ہے۔ بہت سے جنگی قیدیوں نے انکار کر دیا تھا۔ ان سب کے ساتھ جاپانیوں نے بہت ہی بُرا سلوک کیا تھا اور ان میں سے کوئی چند ایک ہی خوش قسمت زندہ رہے ہوں گے۔

ملایا کی شکست کے بعد انگریزوں کو پتہ چلا تھا کہ جاپانیوں نے ایک پلان بنا رکھا تھا اور اسی پلان کے تحت انہوں نے مشرق بعید پر حملہ کیا تھا۔ ان کا پلان یہ تھا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا کو انگریزوں سے آزاد کرائیں گے اور پھر انہیں آزاد ہی رہنے دیں گے۔ یہ بتانا آسان نہیں کہ جاپانی اپنے اس پلان میں کہاں تک مخلص اور سچّے تھے۔ البتہ انہوں نے جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کو یہی تاثر دے رکھا تھا کہ وہ انہیں انگریزوں سے آزاد کرانے آئے ہیں۔ یہ ایک بڑی وجہ تھی کہ برما ملایا کے لوگ جنگ سے پہلے ہی ان کے حامی اور معاون بن گئے تھے۔

پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ برطانیہ اور آسٹریلیا کے جنگی قیدیوں کے ساتھ جاپانیوں نے کیا سلوک کیا تھا۔ ان کی نفری چالیس ہزار تھی۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد جاپانیوں نے ان سفید فام قیدیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ سنگاپور کے قریب ہی چھوٹا سا ایک جزیرہ تھا جس میں بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک حصے کی نفری کو جاپانیوں نے اس جزیرے میں بھیج دیا اور دوسرے حصے کو ایک اور کیمپ میں رکھا۔ اس آدھی نفری میں سے وہ مزدور پارٹیاں مختلف جگہوں پر کام کرنے کے لئے بھیجتے تھے۔ ان میں سے وقتاً" فوقتاً" قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتے تھے لیکن جاتے کہاں؟ اُسی روز یا چند دنوں بعد پکڑے جاتے۔ انہیں جنگی قیدیوں کے سامنے گولی مار دی جاتی تھی یا کھڑا کر کے ان پر سنگینوں سے حملہ کیا جاتا اور ان کے جسموں کو چھلنی کر کے الگ پھینک دیا جاتا تھا۔

جزیرے میں جن سفید فام جنگی قیدیوں کو رکھا گیا تھا وہ آرام میں نہیں تھے۔ ان کے ساتھ درندوں جیسا سلوک ہوتا تھا۔ انہیں بارکوں اور کمروں میں انسان سمجھ کر نہیں بے جان چیزیں سمجھ کر یوں پھینکا جاتا جیسے یہ کوئی گودام ہو۔ جنگی قیدی مختلف بیماریوں سے مرتے رہتے تھے لیکن ان کا علاج نہیں ہوتا تھا۔ ملایا کے شمالی حصوں میں بھی فوجیوں

نے ہتھیار ڈالے تھے اور پھر جب جاپانی فوج نے برما سے انگریزوں کو بھگایا تو وہاں سے بھی انہیں بہت سے جنگی قیدی ملے تھے۔ ان میں جو سفید فام تھے انہیں جاپانیوں نے انہی قیدی کیمپوں میں بھیج دیا تھا جو ملایا میں قائم کئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا تھا جو ملایا کے جنگی قیدیوں کے ساتھ ہو رہا تھا۔

جاپانیوں نے برما بھی لے لیا تو انہوں نے ملایا کے جنگی قیدیوں کو برما اور اس کے جنوبی علاقوں میں سڑکیں بنانے اور دیگر کام کرنے کے لئے بھیجا۔ انہیں ایک ریل گاڑی پر لے جایا گیا تھا اور اس ریل گاڑی کو انگریزوں نے جنگ کے بعد موت کی ریل گاڑی کا نام دیا تھا۔ وہ اس لئے کہ اتنے لمبے سفر میں جاپانیوں نے جنگی قیدیوں کو بہت کم کھانے پینے دیا اور ان کی صحت کا ذرا سا بھی خیال نہ کیا اور قیدی ریل گاڑی میں مرتے رہے۔ جو مرجاتا اُس کی لاش گاڑی کے باہر پھینک دی جاتی تھی۔ ایک امریکی مصنف نے لکھا تھا کہ ملایا کی جنگ میں اتنے سفید فام فوجی نہیں مرے تھے جتنے قیدی کیمپوں میں مرے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچی تھی۔

میں جب کوالالمپور اپنے ساتھی فصیح احمد کے ساتھ جا رہا تھا تو راستے میں سفید فام جنگی قیدیوں کو ایک سڑک بناتے دیکھا تھا۔ یہ سب جنگی قیدی کیمپوں سے آئے تھے اور ان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا وہ میں سنا چکا ہوں.... کہا جا سکتا ہے کہ جاپانیوں کا یہ سلوک غیر انسانی تھا اور حقوق انسانی کی صریحاً" خلاف ورزی تھی۔ اس طرح انہیں بیماری کی اذیّت' زیادہ مشقت کی اذیّت' کم خوراک کی اذیّت اور غیر انسانی سلوک کی اذیّت سے تڑپا تڑپا کر مارنے کی بجائے ان سب کو ایک ہی بار گولی مار دی جاتی تاکہ انہیں نجات مل جاتی لیکن جن لوگوں نے انگریزوں کی غلامی دیکھی ہے اور جن مسلمانوں نے انگریزوں کی مُسلم کُشی اور اسلام دشمنی دیکھی ہے وہ یہی کہیں گے کہ اس قوم کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ان انگریزوں نے مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر درختوں کے ساتھ پھانسی دی تھی۔ انہوں نے سینکڑوں مسلمانوں کو توپوں کے منہ کے آگے رسّیوں سے بندھ کر گولے داغے تھے اور جو انگریز یہ تماشا دیکھتے تھے' وہ قہقہے لگاتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ ان انگریزوں نے اپنی اُس وقت کی ایک پلٹن نمبر 26 پنجابی کے دو سو پچاس مسلمان سپاہیوں کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر کے یوں سزائے موت دی تھی کہ ایک مسلمان سپاہی کو میدان میں کھڑا کرتے اور ہندو اور سکھ سپاہی

اسے رائفلوں کے آگے سنگینیں رکھ کر کے اس طرح مارتے کہ اس کا جسم سنگینوں سے چھلنی ہو جاتا تھا۔ اس طرح انہوں نے اڑھائی سو مسلمان سپاہیوں کو ہندو اور سکھ سپاہیوں سے مروایا تھا اور ان سب کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھینک کر کنواں بھروایا تھا۔ یہ واقعہ پنجاب کے ایک مقام اجنالہ کا ہے۔ ان انگریزوں نے 1857ء میں جس طرح دِلّی کو لُوٹا تھا اور جس طرح انہوں نے پردہ نشین عورتوں کو بھاگ جانے پر مجبور کیا تھا' اس کی تفصیلات پڑھیں یا سنیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور خون کھولنے لگتا ہے۔

شاید ان انگریزوں کو جاپانی اسی جرم کی سزا دے رہے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سب سے برتر اور بالاتر مخلوق سمجھتے تھے اور اپنے قبضے میں لئے ہوئے ملکوں کے لوگوں کو انہوں نے اپنا زر خرید غلام بنا رکھا تھا' یا جاپانی اس قوم کا تکبّر غرور توڑ رہے تھے اور انہیں یہ بتا رہے تھے کہ تم منافق اور گھٹیا قوم ہو اور تم اسی سلوک کے حق دار ہو جو تم اپنی نو آبادیوں میں وہاں کے لوگوں کو اَن پڑھ اور پسماندہ رکھ کر کرتے رہے ہو۔

جاپانیوں کی نیت جو کچھ بھی تھی' میں اپنی ذاتی رائے دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان انگریزوں کو پتھر توڑتے اور سڑکوں پر کام کرتے جاپانیوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی.... اسرائیلیوں نے آج تک شور بپا کر رکھا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمنی کے ہٹلر نے یہودیوں کے قتلِ عام کا حکم دیا تھا۔ وہاں لاکھوں یہودی عورتوں کو بڑے ہی ظالمانہ طریقوں سے ختم کیا گیا تھا۔ گیس چیمبر بنا دیئے گئے تھے جن میں اتنے زیادہ یہودیوں کو ٹھونس دیا جاتا کہ بعض دم گھٹنے سے مر جاتے تھے۔ دروازے بند کر کے اس کمرے میں زہریلی گیس کھول دی جاتی تھی۔ وہ سب مر جاتے تو ان کی لاشیں وہاں سے نکال کر اتنے ہی اور یہودی اس چیمبر میں داخل کر دیئے جاتے اور اس طرح بے انداز یہودیوں کو زہریلی گیس سے مارا گیا۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا تھا کہ بڑا ہی لمبا چوڑا اور گہرا گڑھا کھودا جاتا اور کچھ یہودیوں کو اُس کے کنارے کھڑا کر کے پیچھے سے مشین گنیں فائر کی جاتیں اور ان کی لاشیں گڑھے میں گر پڑتیں تھیں۔ اسی طرح یہودیوں کو گڑھے کے کنارے اسی طرح مار دیا جاتا اور یوں یہ عمل جاری رکھا جاتا حتیٰ کہ گڑھا بھر جاتا اور اس پر مٹی ڈال دی جاتی تھی۔ ان یہودیوں میں سے بہت سے ان قیدی کیمپوں میں بیمار ہو کر مر جاتے تھے جہاں انہیں پکڑ پکڑ کر لایا اور بند کیا جاتا تھا۔ جرمنوں نے یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی نہ بخشا۔

یہ انسان کُشی بہت بڑا جرم اور گناہ ہے لیکن اس کا پس منظر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہٹلر نے انہیں بلا جواز نہیں مارا تھا۔ یہ تو قرآن میں بھی آیا ہے کہ یہودی کینہ پرور قوم ہے اور جہاں بھی یہ قوم جاتی ہے وہاں درپردہ فتنہ پیدا کرتی اور وہاں کا نظام درہم برہم کر دیتی ہے۔ یہودیوں نے ہٹلر کو متاثر کر لیا تھا اور اسے جنگ پر اکسایا تھا۔ جب جرمنی جنگ میں الجھ گیا تو انہی یہودیوں نے اس کی پیٹھ پیچھے سے اس پر وار کرنا چاہا۔ اب وہ جرمنی سے اپنا مفاد پورا کرنا چاہتے تھے جس کی خاطر انہوں نے پسِ منظر میں رہ کر جنگ شروع کروائی تھی۔ ہٹلر کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ یہ تو اسے ہی تباہ کرنے کا پلان بنائے ہوئے ہیں۔ ہٹلر نے ان کے قتلِ عام کا ایسا حکم دیا کہ ان کی نسل ہی باقی نہ رہے۔

اسرائیل چونکہ ایک ملک بن گیا ہے جس کی اپنی حکومت اور اپنے ذرائع ہیں اور امریکہ' برطانیہ' فرانس وغیرہ اس کی مُٹھی میں ہیں اس لئے اسرائیل کا یہ پروپیگنڈہ ساری دنیا میں پہنچا ہُوا ہے کہ جنگِ عظیم میں ہٹلر نے ان کی نسل کُشی کی تھی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے بھی کچھ لوگ کم از کم اس معاملے میں یہودیوں کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان بے چاروں پر بہت ظلم ہُوا تھا لیکن جو لوگ جانتے ہیں کہ یہودی کیا ہے' وہ یہی کہتے ہیں کہ ہٹلر نے اُن کی نسل کُشی بلا جواز نہیں کی تھی۔

آپ نے "حکایت" میں پڑھا ہو گا اور شاید کہیں اور بھی پڑھا ہو گا کہ 1969ء میں اسرائیل کے اُس وقت کے وزیرِ اعظم بن گورین نے انگلینڈ میں کہا تھا کہ پاکستان اسرائیل کا دشمن نمبر ایک ہے اور ہم یعنی اسرائیلی بھارت کو اپنا اڈہ بنا کر پاکستان کو تباہ کریں گے۔

یہ تو بعد کی باتیں ہیں جب پاکستان بھی وجود میں آ گیا تھا اور اسرائیل بھی۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں' اس وقت نہ پاکستان کا وجود تھا نہ اسرائیل کا۔ میں نے کبھی پاکستان کا نام بھی نہیں سنا تھا' میں صرف یہ جانتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب میرے ذہن میں آج والی پختگی پیدا ہوئی تھی۔ یہ اُس وقت ہوئی جب میں نے سمندر دیکھا اور سمندر کے پار کے ملک دیکھے اور ابھی آگے چل کے آپ کو بتاؤں گا کہ میں نے اور کیا کچھ دیکھا اور وہ کون سے واقعات تھے اور کیسا ماحول تھا جس نے مجھے برائے نام مسلمان نہ رہنے دیا بلکہ مردِ مومن بنا دیا۔

میں انگریزوں کو مشقت کرتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اتنے میں ہمارا جاپانی افسر آ گیا

اور ہماری فوجی گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

○

ہماری گاڑی جنگل میں سے گزرتی ہوئی سڑک پر بڑی تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ یہ جنگل کس قسم کے تھے اور یہ بڑے جنگل سے بہت مختلف تھے۔ میں نے ایک دو اور جگہوں پر بھی انگریز جنگی قیدیوں کو کام کرتے دیکھا۔ وہاں بھی جاپانیوں کا ان قیدیوں کے ساتھ وہی سلوک تھا جو میں پہلے دیکھ آیا تھا۔

"فصیح!" — میں نے کہا — "اب یہ انگریز ہندوستان پر حکومت کرنے کے قابل نہیں رہے۔ میری یہ امید پکّی ہو گئی ہے کہ اب ہم ہندوستان میں آزاد ہندوستانیوں کی طرح داخل ہوں گے"۔

فصیح احمد نے تینوں ہندو ساتھیوں کی طرف دیکھا جو ہم سے ہٹ کر الگ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

"نہ بھائی!" — فصیح احمد نے میرے کان کے قریب اپنا منہ کر کے ذرا بلند سرگوشی میں کہا — "آزادی کے متعلق میری امیدیں تو خاک میں ملتی نظر آتی ہیں۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں کہ جاپانی پسپا ہو رہے ہیں۔ میں نے یہاں کے جاپانی افسروں سے پوچھا تھا۔ وہ خاصے گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ برما پر جوابی حملہ اکیلے انگریزوں نے نہیں کیا' ان کے ساتھ امریکہ بھی شامل ہے.... یہ بھی ذہن سے نکال دو کہ ہم مسلمان کبھی آزاد ہوں گے۔ آزادی ملی بھی تو ہندوؤں کو ملے گی اور ہم ان کے غلام ہو جائیں گے"۔

"تو پھر اس کا علاج کیا ہو گا؟" — میں نے پوچھا۔

"میرے بھائی!" — فصیح نے جواب دیا — "میں سیاست کو نہیں سمجھتا اور میں ہندوستان کے لیڈروں کی طرح نہ سوچ سکتا ہوں نہ بات کر سکتا ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی فوجی ہوں۔ مجھے ایک ہی علاج سمجھ میں آتا ہے اور یہ ہے کہ ہمیں ہندوؤں کے خلاف لڑنا پڑے گا جسے خانہ جنگی کہتے ہیں.... بہتر ہے کہ ایسی باتیں یہاں نہ کرو' یہ تین کافر ہمارے ساتھ ہیں' انہیں معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم ان کے خلاف باتیں کر رہے ہیں"۔

— ہم نے یہ موضوع الگ رکھ دیا اور کچھ دیر بعد ہماری گاڑی کوالالمپور میں داخل

ہوئی۔ خاصا بڑا شہر تھا اور وہاں جنگ کے اثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ کچھ عمارتوں کے تھوڑے تھوڑے حصے گرے ہوئے تھے۔ ان پر بم گرے تھے یا توپ خانے کے گولوں سے یہ عمارتیں گری تھیں۔ سفید فام جنگی قیدی وہاں سے ملبہ اٹھا اٹھا کر فوجی ٹرکوں میں پھینک رہے تھے۔

ہمیں چھاؤنی کے علاقے میں لے جا کر گاڑی سے اتارا گیا۔ میں نے اتر کر دیکھا تو یوں لگا کہ جیسے میں ہندوستان کی کسی چھاؤنی میں پہنچ گیا ہوں۔ ہر طرف ہندوستانی نظر آ رہے تھے۔ یہ انڈین نیشنل آرمی کے جوان تھے۔ بعض برآمدوں میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور بعض باہر کوئی نہ کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ فصیح احمد مجھے ایک حوالدار کے پاس لے گیا۔ وہ مسلمان حوالدار تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ فصیح نے اسے بتایا کہ میں نیا ہوں اور میں بھگوڑا ہو کر ادھر آیا تھا۔

اس حوالدار نے مجھ سے میری یونٹ پوچھی اور پھر میرا نام اور رجمنٹل نمبر لکھا۔ میرے باپ کا اور گاؤں کا نام بھی لکھا اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ فصیح احمد میرے ساتھ رہا۔ اس کمرے میں ہم تینوں تھے۔

"میری ایک دو باتیں ذرا غور سے سن لو" — حوالدار نے کہا — "مجھے اس وقت حوالدار نہیں بلکہ اپنا مسلمان بھائی سمجھنا۔ فصیح مجھے جانتا ہے۔ اگر تم یہ جذبہ لے کر یہاں آئے ہو کہ ہندوستان کو آزاد کراؤ گے تو یہ جذبہ دل سے نکال دو۔ صرف یہ جذبہ رکھو کہ مسلمان نہ انگریز کا غلام رہ سکتا ہے نہ ہندو کا.... اب یہ بتاؤ کہ تم کس ارادے اور کس خیال سے بھگوڑے ہوئے تھے؟"

"یہ بات دراصل میرے گاؤں سے شروع ہوتی ہے" — میں نے اسے اپنی پوری کہانی سنانے کے ارادے سے کہا۔

"مجھے سٹوریاں مت سناؤ" — حوالدار نے کہا — "میں نے یہ پوچھا ہے کہ تمہاری نیت اور تمہارا ارادہ کیا تھا!"

میں نے اسے بڑے ہی مختصر الفاظ میں بتایا کہ میں نے یہ جذبہ قبائلی پٹھانوں سے لیا ہے اور یہ بھی بتایا کہ میں ان کا قیدی ہو گیا تھا۔

"تمہاری یہ بات مجھے اچھی لگی ہے" — حوالدار نے کہا — "ہر مسلمان میں قبائلی پٹھانوں والا ہی جذبہ ہو سکتا ہے لیکن یہ سن لو کہ اس جذبے کی تسکین کا موقع

تمہیں یہاں نہیں ملے گا۔ میں جنگی قیدی تھا اور جب ہمیں کہا گیا کہ آئی این اے میں شامل ہو جاؤ تو تم آزاد ہندوستانی ہو گے تو میں فوراً اس فوج میں شامل ہو گیا اور سچی بات یہ ہے کہ میں جاپانیوں کی یہ بات نہ مانتا تو اب تک زندہ نہ ہوتا۔ یہ مجھ سے مشقت کرا کرا کے اور بھوکا پیاسا رکھ کر مار ڈالتے۔ پہلے پہل میں بھی یہی سمجھا تھا کہ ہم انگریزوں سے آزاد ہو جائیں گے لیکن جب سبھاش چندر بوس نے دیکھا کہ جاپانیوں نے تو برما تک کو فتح کر لیا ہے اور اب ہندوستان بھی ان کی جھولی میں آیا کے آیا تو ان ہندوؤں نے اپنی نیت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ہندو بڑی عیّار اور اوچھی قوم ہے۔ میں تمہیں مسلمان بھائی سمجھ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہاں اپنے دل کی اور مسلمان کی حیثیت سے اپنے جذبے کی بات نہ کرنا نہ ہی کسی ہندو کے خلاف بات کرنا اور کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے تمہیں یہ نصیحت کی ہے۔ یہاں ہندو افسر بھی ہیں۔ تمہیں ایک ہندو لیفٹیننٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا' وہ تمہارے دل کی بات معلوم کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم نے صرف یہ کہنا ہے کہ میں ہندوستان کی آزادی چاہتا ہوں اور ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تم صرف مسلمان ہو اور ہندو کو اچھا نہیں چاہتے تو یہ لوگ تمہیں مروا ڈالیں گے"۔

ایسی ہی باتیں فصیح نے میرے ساتھ کی تھیں اور وہی باتیں حوالدار نے کیں تو مجھے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں نے اپنی فوجی زندگی کیوں چھوڑی تھی۔ تھوڑا عرصہ اور سروس کر کے مجھے ترقی مل جانی تھی۔ میں نے یہ سوچا کہ جاپانیوں کو شکست ہو گئی تو کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل کر قبائلی پٹھانوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ یہ بات تو بڑی صاف تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان میں شکست نہ ہوئی تو میں ان کا بھگوڑا ہوں گا اور بھگوڑا بھی ایسا جو ان کے دشمن سے جا ملا تھا۔ میرا کورٹ مارشل ہو گا اور مجھے گولی مار دی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ مرنا ہی ہے تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے مروں گا۔

مجھے ایک نوجوان لیفٹیننٹ کے سامنے جا کھڑا کیا گیا۔ وہ ہندو تھا۔ حوالدار ساتھ تھا۔ اس نے میرے متعلق جو معلومات لکھی تھیں وہ اس لیفٹیننٹ کے آگے رکھ دیں اور حوالدار باہر نکل گیا۔

"شاباش جوان!" — ہندو لیفٹیننٹ نے کہا — "تم نے بہت اچھا کیا کہ انگریزوں کی فوج سے بھگوڑے ہو کر یہاں آ گئے ہو۔ اب ہم ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد

کرائیں گے۔ یاد رکھو جب تک تم انڈین نیشنل آرمی میں ہو' تمہارا دین اور دھرم یہ ہو گا کہ ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ ہندو تمہارا بڑا بھائی ہے کیونکہ ہندوستان میں ہندوؤں کی آبادی سب سے زیادہ ہے اور ملک کا سارا انتظام ہندو چلاتے ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھو کہ یہاں کسی نے پروپیگنڈہ کیا ہے کہ ہندو مسلمان کو ہندوستان میں اپنا غلام بنا لیں گے۔ ایسا پروپیگنڈہ مت سننا۔ جب ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو جائے گا تو تمہیں پتہ چلے گا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ تمہاری کایا پلٹ جائے گی اور تم ایک معمولی فوجی جوان نہیں ہو گے بلکہ تمہاری حیثیت اور اونچی ہو جائے گی"۔

اس لیفٹیننٹ نے فصیح احمد اور حوالدار کے خدشوں کی تصدیق کر دی۔ میرا خون تو بہت کھولا لیکن میں خاموش رہا۔ اگر مجھے وہاں آزادی حاصل ہوتی تو میں اس دُبلے پتلے ہندو لیفٹیننٹ کا گلا گھونٹ دیتا لیکن وہاں وہ افسر تھا اور میں اس کے ماتحت تھا۔ میں نے اس کی باتیں زہر سمجھ کر پی لیں۔ اُس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور میں اُسے بادلِ نخواستہ سیلوٹ کر کے باہر نکل آیا۔

باہر نکلا تو حوالدار اور فصیح احمد کچھ دور کھڑے تھے۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے پوچھا کہ لیفٹیننٹ نے کیا کہا ہے۔ میں نے انہیں لیفٹیننٹ کا ایک ایک لفظ سنایا اور یہ بھی کہا کہ میں تو اس لیفٹیننٹ کا گلا دبانے لگا تھا لیکن اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھا۔ حوالدار اور فصیح احمد ہنس پڑے اور بولے کہ اپنے آپ کو کنٹرول میں ہی رکھو.... یہ حوالدار اُس زمانے کے فوجیوں کی طرح اَن پڑھ یا بہت تھوڑا پڑھا لکھا نہیں تھا بلکہ اُس نے بھی دس جماعتیں پاس کی تھیں اور وہ سگنل کور کا تھا جس میں پڑھے لکھے فوجی ہی رکھے جاتے تھے۔ ویسے بھی وہ عقل اور ہوش کی باتیں کرتا تھا۔

"راز کی بات سنو میرے دوست!" — حوالدار نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا — "ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھنے والوں کی امیدیں خاک میں مل رہی ہیں کیونکہ جاپانیوں کا ایڈوانس یہ نہیں کہ رک گیا ہے بلکہ ایڈوانس پسپائی میں بدل گیا ہے۔ دو تین دن پہلے کی خبر یہ ہے کہ انگریزوں اور امریکیوں نے پورا برما جاپانیوں سے واپس لے لیا ہے اور یہاں جو جاپانی ہیں ان پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی یہاں سے پھر ایڈوانس کریں اور جوابی حملہ کریں لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب یہ سوچو

کہ جاپانی ملایا سے بھاگ گئے تو ہمارا کیا بنے گا"۔

یہ تو ایسا سوال تھا جس کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ساری کی ساری آئی این اے کو الالپور میں نہیں تھی یہاں تو اس کی تھوڑی سی نفری تھی' باقی مختلف شہروں میں بٹی ہوئی تھی اور اس کا ہیڈ کوارٹر سنگاپور میں بنایا گیا تھا۔

یہاں میں یہ بھی بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جب بڑے ہی لمبے عرصے بعد واپس اپنے وطن پہنچا تھا تو آئی این اے کے تین چار آدمیوں سے وقتاً" فوقتاً" ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے دو آدمی آئی این اے کی اور سبھاش چندر بوس کی بہت تعریفیں کرتے تھے۔ یہ وہ آدمی تھے جو ہندوؤں میں رہے تھے اور ہندوؤں کی فریب کاری اور عیاری کے جال میں آ گئے تھے۔ مجھے انگریزوں کی انڈین نیوی کا ایک چیف پٹی آفیسر بھی ملا تھا۔ وہ تو ہندوؤں کا مرید ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کو ہندوؤں نے نہ جانے کیسے کیسے لالچ دیئے تھے۔

ایک مہینہ اور کچھ دن گزر گئے۔ آئی این اے اور اس کے لوگوں کی باتیں تو بہت ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں یہاں بے محل ہوں گی۔ موٹی اور بنیادی بات آپ کو بتا دی ہے کہ آئی این اے دراصل ہندوؤں کی ایک سکیم تھی جو میں پہلے واضح کر چکا ہوں۔ اس ایک مہینے میں میرے ذہن میں اگر کوئی شک تھا تو وہ بھی صاف ہو گیا۔ میں نے ہندوؤں کو دیکھا' ان میں سے اکثر ایسے تھے جو بڑے تکبّر بلکہ رعونت سے بات کرتے تھے جیسے انہیں ہندوستان کی بادشاہی مل گئی ہو.... ایک روز آئی این اے کی جو نفری وہاں تھی' اس میں ہڑبونگ بپا ہو گئی اور فوراً" سب کو فال اِن کر کے یہ بتایا گیا کہ کل دس بجے سبھاش چندر بوس آ رہا ہے۔ ہمیں ویسے ہی ہدایات دی گئیں جیسی کسی جرنیل کے دورے سے پہلے فوجیوں کو دی جاتی ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ سبھاش چندر بوس کو بھی دیکھ لوں گا۔

وہاں سارا ماحول فوجی تھا۔ فوجی ہی ہونا تھا کیونکہ وہاں کوئی سویلین تو تھا نہیں' سب فوجی تھے اور پوری کی پوری تنظیم فوجی تھی۔ اس میں عہدے دار' سردار اور کمیشنڈ آفیسر بھی تھے۔ اگلی صبح ہمیں فال اِن کر کے پریڈ گراؤنڈ میں لے جایا گیا۔ ہمیں ایک چھوٹے سے بنائے ہوئے سٹیج کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد دو فوجی جیپیں آئیں۔ اگلی جیپ پر جاپان کا چھوٹا سا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اس جیپ میں سے سبھاش

چندر بوس دو جواں سال لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلا۔ دوسری جیپ میں سے دو جاپانی افسر باہر آئے۔ اُس وقت سبھاش چندر بوس پورا جرنیل بنا ہوا تھا۔ اس نے خاکی وردی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سٹیج پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک لڑکی اس کی دائیں طرف اور دوسری بائیں طرف کھڑی ہو گئی۔ یہ دونوں لڑکیاں بھی خاکی وردی میں تھیں۔ جاپانی افسران لڑکیوں کے پیچھے کھڑے ہوئے۔

ہم نے سبھاش چندر بوس کو رائفلوں کی سلامی دی جس طرح فوجی پریڈ میں دیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد سبھاش چندر بوس نے ہمارا معائنہ کیا اور پھر سٹیج پر جا کھڑا ہوا۔ اُس نے اُردو زبان میں مختصر سی تقریر کی۔ اُس کا لب و لہجہ بنگالیوں والا تھا۔ میں اُس کی تقریر کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ لفظ بہ لفظ آپ کو سناؤں۔ وہ فوجی وردی پہن کر سمجھا ہو گا کہ وہ واقعی فوجی بن گیا ہے اور آئی این اے کا جرنیل ہے لیکن مجھے تو وہ فوجی لگتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے نظر والی عینک چڑھا رکھی تھی۔ اُس کا چہرہ تو بھرا بھرا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اندر باہر سے ہندو ہے اور اس کی ذہنیت ہندوؤں سے بہتر نہیں۔ اس نے جب تقریر کی تو کوئی شک نہ رہنے دیا۔

اُس نے وہی باتیں کیں جو ہندو لیڈر کرتے رہتے تھے یعنی یہ کہ ہندو مُسلم بھائی بھائی ہیں اور کانگرس سارے ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ پھر اُس نے یہ خوش خبری سنائی کہ جاپانیوں کو بہت جلد ہندوستان پر بھی فتح حاصل ہو گی اور پھر ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور وہاں ہماری اپنی حکومت قائم ہو جائے گی.... اُس کے بولنے کا انداز بڑا ہی جوشیلا اور جذباتی تھا۔ اگر میں نے اس کے متعلق اور ہندوؤں کے متعلق پہلے باتیں نہ سنی ہوتیں تو میں سبھاش چندر بوس سے بہت ہی متاثر ہوتا۔ میں حیران اس پر ہُوا کہ اس نے یہ دو لڑکیاں اپنے ساتھ کیوں رکھی ہوئی ہیں۔ شکل و صورت سے دونوں بنگالی معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اپنے گاؤں واپس آ کر کچھ عرصہ بعد کسی انگریز کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی جو آئی این اے کے متعلق تھی۔ اس میں سبھاش چندر بوس کا ایک فوٹو دیا گیا تھا جب وہ جاپانیوں کے پاس تھا اور آئی این اے کی نفری کو خطاب کر رہا تھا۔ اس فوٹو میں بھی وہ دونوں لڑکیاں اس کے دائیں اور بائیں کھڑی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ کتاب کوئی دوست لے گیا اور آج تک واپس نہیں دی ورنہ میں وہ فوٹو یہاں پیش کرتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سبھاش چندر بوس مہاتما گاندھی کے بہت ہی خلاف تھا

لیکن اس کی ذہنیت اور دیگر باتیں مہاتما گاندھی جیسی ہی تھیں۔ مہاتما گاندھی بھی دو نوجوان لڑکیوں کو ساتھ رکھتا تھا اور جب باہر نکلتا تو اس کا ایک ہاتھ ایک لڑکی کے کندھے پر اور دوسرا دوسری لڑکی کے کندھے پر ہوتا تھا۔ سبھاش چندر بوس نے بھی اپنے ساتھ دو لڑکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک تو یہ ہندو دانہ ذہنیت کا مظاہرہ تھا اور میرا خیال ہے کہ جاپانیوں نے اسے کہا ہو گا کہ جنگ و جدل میں نوجوان لڑکیوں کا ساتھ ہونا بڑا ہی ضروری ہوتا ہے۔

○

میں نے کہا ہے کہ وہاں مجھے ایک مہینہ اور کچھ دن ہو گئے تھے۔ میں اُن دنوں کی دو چار باتیں آپ کو سنانا چاہتا ہوں اور یہ بھی دیکھیں کہ انسان زندہ رہیں تو ایسی جگہوں پر بھی بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں جہاں وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں بھی کبھی ملاقات ہو سکے گی.... وہاں آئی این اے کی جو نفری تھی' ان میں سارے ہی ہندوستان کے صوبوں کے جوان موجود تھے۔ ان میں پنجاب کے فوجیوں کی اکثریت تھی۔ ان میں میرے علاقے کے چند ایک جوان بھی تھے۔ میں نے یہ خاص طور پر دیکھا کہ یہ پلان تو ہندوؤں کا تھا لیکن آئی این اے میں اکثریت مسلمان فوجیوں کی تھی۔ ہندو تو بہت ہی تھوڑے تھے۔

میں اب آپ کو ملایا سے واپس اپنے علاقے میں لے آتا ہوں جہاں میں پیدا ہُوا اور جہاں سے میں فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ ایک روز ایک مسلمان لانس نائک ہسپتال سے فارغ ہو کر بارکوں میں آیا۔ میں جب سے یہاں آیا تھا وہ ہسپتال میں تھا۔ اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اُس سے ملاقات ہوئی تو میں یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ وہ ہمارے ہی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس کا گاؤں وہی تھا جہاں واجدہ بیاہی گئی تھی یعنی وہ واجدہ کے خاوند آصف کا گاؤں تھا۔ میں نے اُسے اپنا گاؤں بتایا تو وہ بہت زیادہ پیار سے ملا۔ بخدا یوں لگا جیسے بچھڑے ہوئے دو سگے بھائی ملے ہوں۔ یہ کسی اور یونٹ میں تھا اور جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ حوالدار کی طرح اُس نے بھی جاپانیوں کے ٹارچر سے بچنے کے لئے آئی این اے میں آجانا بہتر سمجھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس سے یہ پوچھا کہ اس کے گاؤں کا آصف کس حال میں ہے۔ میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ آصف کو میں نے بچایا اور میڈیکل کور کے حوالے کیا تھا۔

"وہ تو بے چارہ گھر میں معذور پڑا ہے" — اُس نے جواب دیا — "اُس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں اور جب ٹانگوں کے زخم ٹھیک ہوئے تو اسے گھر بھیج دیا گیا۔ میں اُس وقت چھٹی پر تھا جب آصف کو گھر لایا گیا تھا۔ اُسے دو فوجی گھر چھوڑنے آئے تھے۔ میری چھٹی پوری ہوئی تو میں واپس گیا۔ مجھے برما فرنٹ پر بھیج دیا گیا تھا"۔

"آصف نے ہمارے گاؤں سے شادی کی تھی" — میں نے کہا — "اُس کی بیوی کس حال میں ہے؟"

میں قصبے کا رہنے والا تھا جو آج اچھا خاصا شہر بن گیا ہے لیکن اُسے میں قصبے کو گاؤں بتاتا رہا کیونکہ فوج میں زیادہ تر گاؤں کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُس نے ایک بار پھر بڑی حیرت سے میرا نام اور میرے قصبے کا نام پوچھا اور میں نے اُسے دونوں نام بتائے۔ وہ کچھ دیر حیرت زدگی کی حالت میں مجھے دیکھتا رہا اور میں حیران کہ یہ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔

"یار!" — آخر اُس نے کہا — "تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو اور آصف نے اور اُس کی بیوی نے تمہیں وہاں ہیرو بنایا ہُوا ہے۔ میری ایک بہن آصف کی بیوی کی بڑی گہری سہیلی ہے اور وہ آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ آصف کی بیوی کا نام واجدہ ہے جو تم تو جانتے ہی ہو"۔

مجھ پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی جس میں حیرت بھی تھی اور جذباتیت بھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک باب میں تفصیل سے سنایا ہے کہ آصف کو میں نے محاذ پر کس طرح اتفاق سے زخمی حالت میں دیکھ لیا تھا اور اسے بچا بھی لیا تھا۔ اگر اسے میں نہ دیکھ سکتا تو میڈیکل کور کے جوان اُس تک کبھی نہ پہنچتے اور وہ خون بہہ جانے سے وہیں مر جاتا۔ وہ باب ایک بار پھر پڑھ لیں تاکہ آپ کی یاد تازہ ہو جائے۔ اس کے بعد میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ آصف کا انجام کیا ہُوا ہو گا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ زندہ پیچھے پہنچا ہو گا۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ہسپتال میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر یا نیچے سے کاٹ دی جائیں گی۔ اس کی ٹانگوں کی ہڈیاں چُور چُور ہو گئی تھیں جن کے جُڑنے کی اُمید ہی ختم ہو گئی تھی۔ اُس روز ایک مدت بعد میں نے آصف اور واجدہ کا نام سنا اور ایسے آدمی کی زبان سے سنا جو سب کچھ بتا سکتا تھا۔ میں نے اسے بڑی بیتابی سے کہا کہ وہ مجھے آصف اور واجدہ کی پوری بات سنائے۔

میں اُس کی سنائی ہوئی بات کو مکالموں میں پیش کرنے کی بجائے اپنی زبان میں سیدھے طریقے سے سنا دیتا ہوں۔ اس نے یہ ساری باتیں آصف کی زبان سے سُنی تھیں اور واجدہ کی باتیں اس کی بہن نے اس سے سُنی تھیں اور اُن دونوں کی آپس میں رازداری تھی۔ اس لئے ان دونوں کی سنائی ہوئی ساری بات بالکل صحیح اور مستند تھی.... مختصراً" بات یہ بنی کہ آصف کو برما فرنٹ سے پیچھے لے جا کر بذریعہ ہوائی جہاز کلکتے پہنچایا گیا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ برما فرنٹ پر ایک انجن والے چھوٹے جہاز استعمال کئے گئے تھے جو شدید زخمیوں کو پیچھے ڈھاکہ یا کلکتہ تک پہنچاتے تھے۔ یہ چھوٹے جہاز جنگ کے دوران یا شاید بعد میں توپ خانے کو دے دیئے گئے تھے اور ان میں اوپی اُڑ کر دشمن کی پوزیشنیں دیکھتے اور اپنے توپ خانے کو فائر آرڈر دیتے تھے۔ بہرحال جیسے بھی ہُوا آصف کو زندہ کلکتہ کے فوجی ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں' جیسا کہ توقع تھی' اس کی دو ٹانگیں گھٹنوں سے کاٹ دی گئیں۔ ایک ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے کٹی اور دوسری گھٹنے کے ذرا اوپر سے۔ تین مہینے بعد اسے فوج نے اپنے انتظام کے تحت اس کے گھر پہنچا دیا۔

اس کے گھر والوں کو پہلے ہی اطلاع دے دی گئی تھی کہ آصف محاذ پر زخمی ہو گیا ہے' زندہ ہے اور ٹھیک ہونے پر گھر پہنچا دیا جائے گا۔ وہ خوشحال گھرانہ تھا اس لئے اس کا باپ اور بھائی کلکتہ تک سفر کر سکتے تھے جو انہوں نے کیا اور آصف کو دیکھنے کلکتہ ہسپتال تک گئے۔ وہ جب گھر پہنچا تو اس کی حالت افسوسناک ہی تھی لیکن اُس کے گھر والوں کو یہ خوشی تھی کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے لئے روزگار کا اور ذریعۂ معاش کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان کی زمین اچھی خاصی تھی جو سال بھر کا اناج اور کچھ پیسے بھی دے دیتی تھی۔

آصف نے گاؤں پہنچ کر میرا نام لیا اور ہر کسی کو بتایا کہ میں نہ ہوتا تو وہ زندہ گھر نہیں پہنچ سکتا تھا اور اسے وہاں جنگل میں ہی برما کے درندے اور گِدھیں کھا جاتے۔ اُس نے ہر کسی کے ساتھ میرا ذکر ایسے کیا جیسے میں اس کے لئے رحمت کا فرشتہ تھا اور اسے نئی زندگی خدا نے نہیں بلکہ میں نے دی ہے۔ واجدہ چونکہ میرے قصبے کی رہنے والی تھی اور میرے ساتھ اس کا جو جذباتی تعلق تھا' وہ میں سنا چکا ہوں۔ اس نے جب آصف کی زبانی میرا یہ کارنامہ سنا تو اس نے میرے گھر جا اطلاع دی۔ اس دن سے کچھ پہلے بلکہ زیادہ پہلے میرے گھر والوں کو سرکاری اطلاع پہنچ گئی تھی کہ تمہارا بیٹا برما فرنٹ پر لاپتہ ہو گیا ہے۔ لاپتہ ہونا ایک سرکاری اصطلاح تھی۔ اس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ تمہارا بیٹا

مارا گیا ہے اور اس کی لاش نہیں ملی۔ آصف نے جا کر یہ خبر سنائی کہ میں تو زندہ ہوں۔ میرے والدین دوڑے ہوئے آصف کے گھر پہنچے اور آصف نے میرے باپ اور میری ماں کو بڑے ہی جذباتی انداز میں سنایا کہ میں نے اسے کس طرح بچایا ہے۔ میرے والدین اُس سے بار بار پوچھتے تھے کہ اس نے مجھے کہاں دیکھا تھا' کس حال میں دیکھا تھا اور کیا میرے زندہ رہنے کا امکان ہے یا نہیں۔ آصف نے انہیں یہ الفاظ کہے ـــــ "جس نے مجھے زندگی دی ہے اُسے اللہ زندہ رکھے گا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارا بیٹا زندہ ہے اور زندہ واپس آئے گا"۔

جب میرا یہ آئی این اے کا ساتھی مجھے آصف کے الفاظ سنا رہا تھا تو میں اتنا جذباتی ہو گیا کہ میرے آنسو بہہ نکلے۔ ان الفاظ کا مجھ پر ایسا اثر ہُوا کہ جیسے خداوند تعالیٰ نے مجھے مژدہ سنایا ہو کہ تم زندہ واپس پہنچو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے زندہ واپس پہنچنے کی ذرا سی بھی امید نہیں تھی۔ میں کہتا تھا کہ یہیں کہیں مارا جاؤں گا یا پکڑا جاؤں گا اور کورٹ مارشل میں مجھے گولی مار دی جائے گی۔

میرے اس ساتھی نے آصف کی بہت سی باتیں سنائی تھیں جنہیں میں ان الفاظ میں سمیٹ دیتا ہوں کہ وہ گاؤں میں میرے ہی نام کی تسبیح کرتا رہتا تھا۔ کوئی آ کر اس کے پاس بیٹھتا تو وہ سب سے پہلے میرا نام لیتا اور کہتا کہ وہ تو رحمت کا فرشتہ تھا جو اس جنگل میں آسمان سے اترا اور مجھے اٹھا کر نئی زندگی میں داخل کر دیا۔ یہ تو میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں کہ آصف تو میرا اتنا بڑا دشمن تھا کہ اس نے مجھے قتل کروا دینا تھا۔ اب مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے میرے لئے دعائیں نکل رہی تھیں اور مجھے پوری امید تھی کہ اللہ قبول فرمائے گا۔

یہ بات تو تھی آصف کی' میرے ملایا والے اس ساتھی نے واجدہ کی جو بات سنائی' اس نے میری کچھ اور ہی حالت کر دی۔ واجدہ نے اپنے دل کی یہ ساری باتیں میرے اس ساتھی کی بہن کے ساتھ کی تھیں اور بہن نے یہ باتیں اپنے گھر والوں کو سنائی تھیں۔ واجدہ کو جب پتہ چلا تھا کہ آصف زخمی ہو کر کلکتہ کے ہسپتال میں پڑا ہے تو اس کے دل کو خوشی سی ہوئی تھی کہ آصف سے اسے آزادی مل جائے گی۔ اُس نے تو یہ دعا بھی کی تھی کہ آصف زندہ گھر نہ پہنچے۔ یہ میری محبت کا اثر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُسے اپنے خاوند کی موت کی دعا کرنی چاہئے تھی یا نہیں' میں یہ بتا رہا ہوں کہ میری محبت اُس

کے دل میں کتنی گہری اُتری ہوئی تھی۔ اُس وقت واجدہ اپنے ماں باپ کے گھر میں تھی۔ اس نے آصف سے یہ بات منوا رکھی تھی کہ جب وہ گھر نہیں ہُوا کرے گا یعنی سروس میں ہُوا کرے گا تو واجدہ اپنے ماں باپ کے گھر میں رہا کرے گی۔ آصف کے والدین نے بھی اسے یہ اجازت دے دی تھی۔

آصف جب ٹھیک ہو کر گاؤں پہنچا تو واجدہ دل پر بوجھ لے کر اپنے سسرال گئی۔ آصف نے اسے بھی میرے متعلق اس طرح سنایا جیسے میں نہ ہوتا تو آصف زندہ ہی نہ رہتا۔ زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن آصف کچھ زیادہ ہی مجھ سے متاثر ہو گیا تھا۔ واجدہ نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ آصف نے اسے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ واجدہ میں ساری عمر کے لئے معذور ہو گیا ہوں۔ اگر تم مجھ سے پلّہ چھڑوانا چاہتی ہو تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور اگر خانی زندہ واپس آگیا تو اس کے ساتھ شادی کر لینا۔ یہ بات کہہ کر آصف کے آنسو نکل آئے اور وہ بہت رویا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مجھ جیسے اپاہج آدمی کو کون قبول کرتا ہے' یہ تو خدا کی طرف سے آئی تھی اور بندوں کا یہ حال ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔

آصف کے یہ الفاظ واجدہ کو ایسے لگے جیسے اُس کے دل میں تیر اُتر گیا ہو۔ اُس نے آصف سے کہا کہ میں نے تمہارے ساتھ اللہ اور رسول کا کلمہ پڑھ کر نکاح پڑھوایا تھا۔ تمہیں اللہ نے معذور کیا ہے تو میں اللہ کے حکم کے خلاف چلنے کا گناہ کبھی نہیں کروں گی۔ میں باقی عمر تمہاری خدمت میں گذار دوں گی۔

میرے ساتھی کی بہن نے اسے بتایا کہ واجدہ بالکل ہی بدل گئی اور اس نے صحیح معنوں میں اپنی زندگی اور اپنا آرام و سکون آصف کے لئے وقف کر دیا۔ واجدہ نے اپنی سہیلی کو یہ بھی بتایا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور وہ مجھے دل سے اتار نہیں سکتی لیکن آصف کے آنسو دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ اتنا جرّی اور جابر اور خوبرو جوان معذور ہو کر ایک عورت کے آگے سر جھکا رہا ہے۔ واجدہ نے اسے کہا کہ تم میرے خاوند ہو اور میں تمہاری عزت ہوں۔ میں تمہارا سر کبھی نیچے نہیں ہونے دوں گی.... واجدہ نے اپنے سُسرال کو حیران کر کے رکھ دیا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ آصف کی عبادت کرتی ہے۔

مجھ سے اب یہ نہ پوچھیں کہ میری جذباتی حالت کیا ہوئی۔ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ یہ بتا سکتا ہوں کہ کبھی افسوس ہوتا کہ واجدہ نے مجھے دھوکا دیا ہے اور مجھے دل

سے اُتار دیا ہے۔ کبھی میرا دل خوش ہو جاتا کہ واجدہ نے بہت بڑی نیکی کی ہے کہ اپنے معذور خاوند کو سینے سے لگا لیا ہے اور اپنی عاقبت سنوار لی ہے۔ کچھ ایسی ہی کشمکش تھی جس نے مجھے کسی ایک خیال پر ٹکنے نہ دیا اور میں اس خیال میں کھو گیا کہ میں زندہ واپس چلا گیا اور وہاں بھی زندہ رہا تو واجدہ کا میرے ساتھ اور میرا واجدہ کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ واجدہ سے ملوں گا ہی نہیں.... لیکن یہ تو خواب و خیال کی باتیں تھیں' ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ کبھی زندہ واپس جاؤں گا۔ (جاری ہے)

فصیح احمد کا تعلق انٹیلی جنس کے ساتھ تھا اس لئے کوئی ایسی راز کی بات ہوتی جو ہندوستانیوں تک پہنچانے والی نہ ہوتی' فصیح احمد کو معلوم ہو جاتی تھی۔ جاپانی اتنے کچّے نہیں تھے کہ ایک ہندوستانی کو راز کی باتیں بتا دیتے لیکن فصیح احمد بڑا ذہین اور ہوشیار جوان تھا' وہ کچھ نہ کچھ بُو سونگھ لیتا تھا۔

"لو خانی بھائی!" — ایک روز فصیح نے دفتر سے آکر مجھے بتایا — "اب اپنا اچھا برا سوچ لو"۔

اُس کی اتنی سی بات سے بھی میرا خون خشک ہو گیا۔ میرا چہرہ یقیناً" پیلا پڑ گیا ہو گا۔ میں نے اُس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"جاپانی فوج کو برما سے نکال دیا گیا ہے" — فصیح نے کہا — "ایک بات پہلے ہی سُن لو۔ یہ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ کسی اور کے ساتھ بات نہ کرنا۔ جاپانی بری طرح برما سے پسپا ہوئے ہیں اور بڑی زبردست لڑائی لڑی گئی ہے۔ جاپانیوں کا جانی نقصان بہت زیادہ ہوا ہے پھر بھی انہوں نے کچھ اور ہندوستانی قیدی پکڑ لئے ہیں"۔

"مجھے یہ بتاؤ فصیح!" — میں نے کہا — "تم نے کہا ہے کہ اپنا اچھا برا سوچ لو۔ یہ کیوں کہا ہے؟"

"ہم پکڑے جا سکتے ہیں" — فصیح نے کہا — "پہلے تو یہ امید ہے کہ جاپانی فوج ملایا میں جم کر مقابلہ کرے گی۔ ملایا کے شمالی علاقوں میں جاپانی بڑی زبردست مورچہ بندی کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی نیوی بھی اِدھر ہی اکٹھی کر لی ہے لیکن امریکیوں اور انگریزوں نے اتنا طاقتور حملہ کیا ہے کہ ملایا میں بڑی ہی خونریز جنگ ہو گی۔ ہو سکتا ہے

جاپانی ملایا سے بھی بھاگ جائیں۔ اس صورت میں ہم انگریزوں کی فوج کے ہاتھ چڑھ سکتے ہیں اس لئے میں نے کہا ہے کہ اپنا اچھا بُرا سوچ لو۔ اگر ہم پکڑے گئے تو ہم پر بھگوڑا ہونے کا اور باغی ہونے کا الزام لگے گا"۔

اتنے میں میرا دوست شفیع بھی ہمارے پاس آ بیٹھا۔ شفیع اس جوان کا نام تھا جو واجدہ کے سسرال گاؤں کا رہنے والا تھا اور اُس نے مجھے واجدہ اور اُس کے خاوند آصف کی پوری خبریں سنائی تھیں۔ وہ ہم دونوں کا پکّا دوست بن گیا تھا اور وہ تھا ہی دوستی کے قابل۔ فصیح نے اُسے بھی جاپانیوں کی برما سے پسپائی کی خبر سنا دی اور ہم دونوں نے اُسے کہا کہ وہ کسی اور کو نہ بتائے۔ ہم تینوں دوست سوچنے لگے اور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ جاپانی فوج ملایا سے بھی بھاگ گئی اور ہم یہیں رہ گئے تو کیا کریں گے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمیں فوج سے فرار اور دشمن کے ساتھ مل جانے کے جرم میں گولی مار دی جائے گی۔

"میرے دماغ میں ایک بات آتی ہے" — فصیح احمد نے کہا — "اگر ہم پکڑے گئے تو یہ بیان دیں گے کہ ہم تو جنگی قیدی ہو گئے تھے اور جاپانیوں نے ہم سے جانوروں جیسا کام کرانا شروع کر دیا اور اتنا بھوکا رکھا کہ ہمیں موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے زبردستی ہمیں آئی این اے میں شامل کر لیا اور ہم اب خود ہی پیچھے رہ گئے ہیں تاکہ اپنی فوج میں واپس چلے جائیں۔ اب تم دونوں سوچ لو کہ کہاں کہاں سے بھاگے تھے' اس کے مطابق اپنا کچھ نہ کچھ بیان تیار کر لو"۔

"میں تو بھگوڑا نہیں ہُوا تھا" — شفیع نے کہا — "میری بٹالین والوں کو بھی یقین ہو گا کہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا"۔

میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں کس طرح یہ ثابت کروں گا کہ میں بھگوڑا نہیں ہُوا تھا بلکہ میں جنگی قیدی ہو گیا تھا۔ بہرحال ہمارے لئے یہ مسئلہ زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ امید کی صرف ایک کرن نظر آتی تھی جو یہ تھی کہ جاپانی ملایا میں جم کر مقابلہ کریں گے اور انگریزوں اور امریکیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جاپانی جس جذبے سے لڑتے تھے' اس جذبے کو دیکھتے ہوئے میری یہ امید اور زیادہ روشن ہو جاتی تھی کہ جاپانی کم از کم ملایا سے نہیں بھاگیں گے اور ہو سکتا ہے جاپانیوں نے محاذ کو کنٹرول کرنے کے لئے ہی برما چھوڑ دیا ہو۔

"دیکھ لیں گے یار، کیا ہوتا ہے!" — فصیح احمد نے کہا — "جیسے حالات ہوں گے ویسے ہی اپنا رویّہ بنا لیں گے۔ صرف خیال رکھنا کہ ہمت اور عقل کو اپنے قابو میں رکھنا"۔

○

دن گزرتے جا رہے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ انڈین نیشنل آرمی کے ہندوستانی فوجیوں تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ جاپانی فوج برما سے پسپا ہو آئی ہے اور پسپا ہی ہوتی چلی آ رہی ہے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آئی این اے میں جو ہندو عہدیدار اور جوان تھے، اُن کا رویّہ بالکل ہی بدلتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے حاکم سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ تفصیلات میں پہلے ہی سنا چکا ہوں۔ یہ بھی سنایا ہے کہ آئی این اے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی بلکہ اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن ہندوؤں نے مسلمان فوجیوں کو اپنے ماتحت سمجھنا شروع کر دیا تھا۔

ایک روز ایک مسلمان حوالدار اور ایک ہندو حوالدار کے درمیان سیاسی بحث چل نکلی۔ ہمارے لئے حکم یہ تھا کہ سیاست بازی میں نہیں اُلجھنا اور اپنا اتحاد اور اتفاق نہیں چھوڑنا۔ ہمیں ہندو مسلم بھائی بھائی کا اصول اور نعرہ دیا گیا تھا۔ ان دونوں حوالداروں میں بات تو کچھ اور چلی تھی لیکن ہندو حوالدار نے باتوں باتوں میں یہ ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ وہ برتر اور اعلیٰ کلاس کا فرد ہے اور مسلمان اس سے نیچے درجے کے لوگ ہیں۔

مسلمان حوالدار برداشت کرتا رہا اور ہندو حوالدار سے یہی کہتا رہا کہ ہندوستان کی تمام قومیں ایک جیسی ہیں اور اُن میں کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ ہندو حوالدار نے آخر یہ الفاظ کہہ دیئے کہ تم ہندوستان میں ہمارے غلام ہو گے اور تم میرے بوٹ صاف کیا کرو گے۔ مسلمان حوالدار ہنس پڑا اور اُس نے طنزیہ اس حوالدار سے کہا، لالہ جی، وہ وقت آنے دیں، پھر دیکھیں گے کون کس کے بوٹ صاف کرتا ہے۔

"وہ وقت آیا ہی سمجھو!" — ہندو حوالدار نے کہا — "ہم تمہاری صرف وہ مسجدیں کھڑی رہنے دیں گے جو ہم چاہیں گے، باقی مسجدیں ہم گرا دیں گے یا کسی کے حوالے کر دیں گے کہ وہ اس میں رہائش اختیار کر لیں"۔

مسلمان حوالدار نے اس کا جواب ہندو حوالدار کو یہ دیا کہ اُس کے منہ پر پوری طاقت سے گھونسا مارا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔ ہندو حوالدار اٹھا تو مسلمان حوالدار نے

گھونسوں، تھپڑوں اور ٹھڈوں سے اس ہندو حوالدار کا حلیہ بگاڑ دیا۔

پھر ہم مسلمان حوالدار کو پکڑ نہ لیتے تو وہ اُس ہندو حوالدار کو شاید جان سے ہی مار ڈالتا۔ ہم سب نے اور ہندوؤں نے بھی ہندو حوالدار کو بچا لیا اور کوشش یہ کی کہ یہ معاملہ یہیں رفع دفع ہو جائے لیکن ہندو حوالدار اتنی پٹائی کے بعد ایک مسلمان کو بخشنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ دوڑا گیا اور جا رپورٹ کی کہ ایک مسلمان نے اسے مارا پیٹا ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمان حوالدار کو دفتر بلایا گیا اور کچھ دیر بعد ہمیں پتہ چلا کہ اسے پندرہ دنوں کے لئے لیبر کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔ لیبر کیمپ میں ویسی ہی مشقت کرائی جاتی تھی جیسی میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ جو انگریز جنگی قیدیوں سے لی جا رہی تھی۔

مسلمان حوالدار کو تو اُدھر سے ہی لیبر کیمپ میں لے گئے اور ادھر ہم سب کو فال اِن کر کے ایک ہندو لیفٹیننٹ نے لیکچر دیا۔ وہ دراصل کہہ تو یہ رہا تھا کہ ہندوستان کی تمام قوموں کے افراد ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں اور ہندوستان کی ملکیت اور حکومت میں سب شامل ہوں گے لیکن کوئی کوئی بات وہ ایسی کہہ دیتا تھا جس سے ہم سمجھ لیتے تھے کہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان پر ہندوؤں کی حکومت ہو گی اور مسلمان ان کے آگے سر جھکا کر رکھیں۔ آخر میں اُس نے یہ کہا کہ آئندہ کسی اور نے ایسی حرکت کی تو اسے ہمیشہ کے لئے لیبر کیمپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔

کسی مسلمان فوجی کو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اس ہندو حوالدار نے مسلمان حوالدار کو کیسی کیسی باتیں کہی تھیں جو کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا چاہئے تو یہ تھا کہ ہندو حوالدار کی رپورٹ کے بعد ان فوجیوں کی گواہی لی جاتی جنہوں نے ان دونوں حوالداروں کا بحث و مباحثہ سنا تھا اور پھر لڑائی بھی دیکھی تھی لیکن وہاں برتری ہندوؤں کو حاصل تھی اس لئے مسلمان حوالدار کو صفائی پیش کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا گیا۔ اس سے مسلمان فوجیوں میں بددلی پھیلنے لگی۔

برما کے جنگلوں میں اور پھر ملایا میں آ کر واجدہ مجھے کبھی کبھی یاد آیا کرتی تھی اور اس کے ساتھ اس کے خاوند آصف کا خیال آتا کہ وہ زندہ واپس پہنچ سکا تھا یا نہیں۔ کبھی یہ خیال بھی آ جاتا کہ آصف اگر مر گیا ہے تو شاید میں زندہ واپس چلا گیا تو واجدہ کے ساتھ شادی کر لوں گا۔ واجدہ کے ساتھ میری شادی ممکن نہیں تھی کیونکہ ذات پات کا فرق تھا۔ کبھی تو میں خیالی پلاؤ پکانے لگتا کہ واجدہ کو ساتھ لے کر کہیں بھاگ جاؤں گا۔

یہ یادیں میرے ذہن اور دل سے کم ہونے لگی تھیں۔ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ غیر یقینی سی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جس کے زیرِ اثر واجدہ اور آصف کی یادیں آہستہ آہستہ محو ہونے لگی تھیں لیکن شفیع نے آ کر ان یادوں کو پھر تازہ کر دیا۔ میں نے ذہن سے یہ اُتار دیا کہ واجدہ اب کبھی میری بن جائے گی۔ اُس نے اپنی زندگی آصف کے لئے وقف کر دی تھی' پھر بھی میں کبھی شفیع کو اپنے پاس بٹھا لیتا اور اس سے واجدہ اور آصف کی باتیں سنا کرتا تھا۔ اس سے مجھے ذرا تسکین سی ہو جاتی تھی۔

کوالالپور اچھا خاصا بڑا شہر تھا۔ اس کی زیادہ تر شہری آبادی بھاگ گئی تھی اور کچھ لوگ شہر میں ہی رہ گئے تھے۔ بھاگنے والے جاتے کہاں' ہر طرف جاپانی فوج پھیل گئی تھی۔ بھاگنے والے جنگلوں میں خجل خوار ہوتے رہے اور کچھ اُن شہروں کی طرف چل پڑے جن کے متعلق انہیں امید تھی کہ محفوظ ہوں گے لیکن پورے ملایا پر جاپانی فوج قابض ہو چکی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ واپس آنے لگے۔ یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنے لوگ بھوک پیاس اور بیماریوں سے مر گئے تھے۔ جاپانیوں نے ملایا سے بھی خوبصورت لڑکیاں اٹھا لیں اور اپنے قبضے میں رکھ لی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہاں کے شہریوں کو کوئی اور پریشانی نہ دی۔

ایک روز اڑھائی تین بجے کا وقت ہو گا کہ میں' فصیح اور شفیع ویسے ہی ٹہلتے ٹہلتے شہر سے باہر نکل گئے۔ شہر کے ساتھ ہی تھوڑے سے فاصلے پر سات آٹھ گھروں کی ایک آبادی تھی اور اس میں ایک مسجد بھی تھی۔ ہم اُدھر جا نکلے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے کبھی نماز پڑھی تھی یا نہیں' لیکن کسی بھی مسجد کو دیکھ کر ہمارے دل باغ باغ ہو جاتے تھے اور اس کے ساتھ یہ احساس بیدار ہوتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ایک عظیم قوم ہے۔

فصیح احمد نے کہا کہ ان چند ایک گھروں میں مسجد ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سارے گھر مسلمانوں کے ہوں گے' چلو اس آبادی میں چلتے ہیں۔ چلنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان میں سے کسی گھر میں جا گھسیں گے بلکہ اس آبادی میں سے گزریں گے اور مسلمانوں کو دیکھیں گے۔

ہم ان گھروں سے پچاس ساٹھ قدم دور ہوں گے کہ ایک عجیب منظر نظر آیا۔ پہلے ایک عورت کی چیخ و پکار سنائی دی پھر وہ عورت سامنے آ گئی لیکن اس حالت میں کہ ایک

سکھ نائیک نے اور ایک ہندو لانس نائیک نے اُس کے بازو پکڑے ہوئے تھے اور اُسے گھسیٹ کر ایک طرف لے جا رہے تھے۔

"میرے دوستو!" — فصیح احمد نے کہا — "اگر یہ عورت مسلمان ہوئی تو میں اس سکھ اور اس ہندو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔

اس علاقے پر فوج کا قبضہ تھا۔ فوجی ایسی حرکتیں کرتے ہی رہتے تھے۔ ایسی حرکتیں کرنے والے فوجیوں کو ان کے ساتھی فوجی نہیں روکتے تھے بلکہ لطف اٹھایا کرتے اور مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ ہم تینوں نے آپس میں طے کر لیا کہ آگے چل کر دیکھتے ہیں یہ عورت کس مذہب کی ہے۔ اگر مسلمان ہوئی تو ہم اسے ان فوجیوں سے چھڑا لیں گے۔ اس ارادے سے ہم نے اپنے قدم ذرا تیز کر لئے۔

ہم تینوں نے اپنے آپ کو لڑائی کے لئے تیار کر لیا۔ یہ تو بعد کی بات تھی کہ یہ عورت کس مذہب کی تھی' اس سکھ اور ہندو نے ایک ایسی حرکت کی کہ ہمارے دماغ خراب ہو گئے۔ حرکت یہ کی کہ اس عورت کو مسجد کے اندر لے گئے۔ ہم تینوں دوڑ پڑے۔ یہ اب ایک عورت کی نہیں بلکہ ایک مسجد کی بے حُرمتی تھی۔ ہم جب مسجد کے دروازے پر پہنچے تو ہندو اور سکھ عورت کو جُوتیوں سمیت مسجد کے اندر لے گئے تھے۔

یہ چھوٹی سی مسجد تھی جو زمین سے ذرا اوپر بنائی گئی تھی۔ اس کے دروازے کی تین یا چار سیڑھیاں تھیں۔ آگے چھوٹا سا صحن تھا پھر آگے چھوٹا سا برآمدہ اور آگے کمرہ تھا اس کے تین چار یا شاید دو تین دروازے تھے۔ برآمدے اور اندر والے کمرے میں صفیں اور چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔

ہم جب مسجد کے دروازے پر جا رکے تو مسجد سے ایک بزرگ صورت آدمی جس کی سفید داڑھی تھی' نکلا اور فوجیوں کو روکنے لگا کہ وہ اس عورت کے ساتھ یہ بدتمیزی نہ کریں یا کم از کم مسجد کی بے ادبی نہ کریں۔ سکھ نے عورت کا بازو چھوڑ کر اس بزرگ صورت انسان کا بازو پکڑا اور اسے اتنی زور سے باہر کو دھکا دیا کہ وہ صحن سے دروازے میں منہ کے بل آ گرا اور یوں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا جیسے وہ اٹھ ہی نہیں سکے گا۔ یہ بزرگ مسجد کے اندر کہیں بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی داڑھی اور اس کا لباس اور اس کے سر پر ٹوپی بتاتی تھی کہ یہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ کوئی عالم ہے اور مذہبی پیشوا ہے۔

ہم سے یہ برداشت نہ ہُوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بزرگ کو اٹھایا اور پھر ہم

تینوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس سکھ نائیک اور ہندو لانس نائیک پر جا پڑے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے پہلے اپنے جوتے اُتارے تھے۔ اس وقت تک وہ اُس عورت کو مسجد کے برآمدے میں لے گئے تھے۔

فصیح احمد عقل والا جوان تھا۔ اُس نے لڑائی جھگڑا روکنے کے لئے مجھے اور شفیع کو اپنے بازو سے پیچھے کر دیا ہم دونوں رک گئے۔ میں نے عورت کو دیکھا۔ وہ جوان عورت تھی اور اچھی شکل صورت والی تھی۔ شکل صورت کو چھوڑیں' وہاں فوجیوں کو صرف عورت کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ عورت بُری طرح رو رہی تھی اور ان دو کافروں نے اُسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔

"تم مسلمان ہو؟" — فصیح احمد نے عورت سے پوچھا۔

عورت نے اپنا سر زور زور سے اوپر نیچے ہلاتے ہوئے کہا — "مسلمان ہاں مسلمان...."

صحن سے اُس بوڑھے کی آواز آئی جسے سکھ نے دھکا دے کر باہر پھینک دیا تھا۔

"یہ مسلمان ہے" — بزرگ نے کہا — "میں مسجد میں ایسا نہیں ہونے دوں گا"۔

اُس بزرگ نے اتنی صاف اردو نہیں بولی تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ غصّے سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ وہ اندر آ گیا۔ ملایا کے لوگ اُردو نہیں بول سکتے تھے۔ مجھے یہ اطمینان ہُوا کہ کم از کم یہ بوڑھا کچھ نہ کچھ اُردو کے الفاظ تو جانتا ہے۔

سکھ یہ سمجھا کہ ہم بھی اسی جیسے فوجی ہیں اور ہم اس عورت میں حصہ وصول کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اُس نے کہا کہ یہ شکار ہمارا ہے' پہلے ہم اور پھر اسے ہم تمہارے حوالے کر کے چلے جائیں گے.... یہ باتیں پنجابی میں ہو رہی تھیں۔

"یہ کسی کا بھی شکار نہیں" — فصیح نے سکھ سے کہا — "اسے چھوڑ دو اور دوسری بات یہ دیکھو کہ تم نے مسجد کی بے ادبی کی ہے۔ جوتوں سمیت مسجد میں آ گئے ہو اور پھر مسجد میں تم بدکاری کرنا چاہتے ہو۔ ہم مسلمان ہیں اور یہ ہم برداشت نہیں کریں گے' تم ہمارے فوجی بھائی ہو اس لئے تمہیں ایک موقع ضرور دیں گے"۔

"جا اوئے نس جا ایتھوں!" — سکھ نے دو گالیاں دے کر اپنی دو آبے والی پنجابی

زبان میں کہا — "تُسی کتھے وے مسلے ایتھے آ وڑے او۔ وڈے آئے میت والے!" — (جاؤ اوئے' یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم کہاں کے مسلمان یہاں آ گئے ہو۔ بڑے آئے مسجد والے)۔

عورت ان دونوں کافروں کے ہاتھوں میں آزاد ہونے کو تڑپ رہی تھی اور سفید ریش بزرگ الگ کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا اور کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ شفیع سکھ کے بائیں پہلو کی طرف کھڑا تھا۔ سکھ کی یہ بے ہُودہ بات اس کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ شفیع نے اس کے منہ پر بائیں طرف سے بڑی زور سے گھونسا جما دیا۔ سکھ کی گرفت عورت پر ڈھیلی ہو گئی اور وہ دائیں طرف کو گرنے لگا۔ فصیح نے عورت کو کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور چھوڑ دیا۔ عورت ہندو کے ہاتھوں سے بھی آزاد ہو گئی۔

فصیح نے بڑی پھرتی سے سکھ کے منہ پر سیدھا گھونسا مارا اور سکھ دو تین قدم پیچھے گرا۔ ہندو باہر کو دوڑا لیکن میں نے اپنی ٹانگ کا اُسے ایسا اڑنگا دیا کہ وہ منہ کے بل گرا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اٹھ رہا تھا کہ میں نے اُس کے پہلو میں بڑی زور سے کک ماری۔ وہ پیٹھ کے بل پیچھے جا پڑا۔ میں نے اس کے دوسرے پہلو میں اسی طرح ایک اور کک ماری۔ مجھے معلوم تھا کہ اب یہ آسانی سے اُٹھ نہیں سکے گا۔ میرا خون ایسی بُری طرح اُبل رہا تھا کہ یہ خون میرے دماغ کو چڑھ گیا۔ ہندو میرے سامنے پیٹھ کے بل پڑا ہُوا تھا اور اس کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔ میں نے اپنا دایاں پاؤں اس کی شہہ رگ پر رکھ کر اوپر پورے جسم کا وزن ڈال دیا۔ وہ تڑپنے لگا اور دونوں ہاتھوں سے میرا پاؤں پکڑ کر ہٹانے لگا لیکن میں نے اور زیادہ زور سے پاؤں دبایا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ عورت ابھی مسجد میں ہے یا بھاگ گئی ہے' نہ میں نے یہ دیکھا کہ میرے دونوں دوست کیا کر رہے ہیں' البتہ آوازیں ایسی سنائی دے رہی تھیں کہ وہ سکھ نائیک کی بڑی اچھی مرمّت کر رہے ہیں۔

"مت چھوڑو.... کافر.... مت چھوڑو.... کافر!" — یہ آواز بزرگ ملائی کی تھی — "مار دو ان کو.... مت چھوڑو کافر کو!"

ہندو میرے پاؤں کے نیچے تڑپ رہا تھا اور میں پاؤں کا دباؤ بڑھاتا ہی چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ ہندو کا تڑپنا ختم ہو گیا اور جن ہاتھوں سے اُس نے میرا پاؤں پکڑا ہُوا تھا وہ ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور نیچے کو گر پڑے۔ اس کی آنکھیں پوری سے بھی زیادہ کھلی ہوئی تھیں اور اس کا

منہ اس طرح کھل گیا تھا کہ دانت نظر آ رہے تھے اور زبان تھوڑی سی باہر نکل آئی تھی۔ اُس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مر گیا ہے۔ میں نے پاؤں اُس کی شہہ رگ سے ہٹایا تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ کھلی ہوئی آنکھوں میں اور کھلے ہوئے ہونٹوں میں اب کوئی حرکت نہیں تھی۔

اُس وقت میں نے دیکھا۔ میرے دونوں دوستوں نے سکھ کو اس قدر مارا پیٹا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور بے سُدھ فرش پر پڑا تھا۔ میں ابھی تک دیوانگی کی کیفیت میں تھا۔ میں تو بالکل ہی وحشی بلکہ درندہ بن گیا تھا۔ میرے دوستوں نے دیکھا کہ سکھ بے ہوش اور بے سُدھ ہو گیا ہے تو انہوں نے اُسے ٹھڈ مارنے چھوڑ دیئے اور میری طرف دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر اور آنکھوں میں خون اُترا ہُوا تھا۔ اس وقت ہم تینوں دوست پکّے مسلمان تھے۔

"دوسرا کہاں ہے؟" — فصیح نے مجھ سے ہندو لانس نائیک کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو مر گیا ہے" — میں نے جواب دیا اور بتایا کہ میں نے اُسے کس طرح ختم کیا ہے۔

"پھر اسے بھی ختم کرو" — شفیع نے کہا — "اسے چھوڑ دیا تو یہ رپورٹ کرے گا پھر سوچ لو ہمارا انجام کیا ہو گا"۔

فصیح نے کوئی بات منہ سے نہ نکالی۔ بے ہوش سکھ کے پاس گھٹنوں کے بل ہو گیا اور اُس کی گردن اپنے دائیں ہاتھ میں اس طرح لے لی کہ اُس کی شہہ رگ کو دبا لیا۔ سکھ بے ہوشی میں بھی تڑپا کیونکہ اُس کی سانسیں رک گئی تھیں لیکن ہندو جتنا نہ تڑپ سکا اور جلدی ہی مر گیا۔

○

دونوں کو ختم کر کے ہم نے دیکھا کہ مسجد میں اللہ اور اس بزرگ کے علاوہ اور کون آ گیا ہے۔ چار اور آدمی آ گئے تھے جو شکل و صورت اور لباس سے مسلمان لگتے تھے۔ وہ عورت کی آہ و پکار سُن کر دوڑے آئے تھے۔

"مار دیا!" — بزرگ نے ہم سے کہا — "ٹھیک کیا.... بہت ٹھیک کیا" — اس نے ان چار آدمیوں کی طرف دیکھ کر اپنی زبان میں کچھ کہا۔

اُن میں سے ایک آدمی دوڑا گیا اور اُس نے مسجد کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی

چڑھا دی۔

○

وہ جو کہتے ہیں کہ قتل ایک لمحے کا پاگل پن ہوتا ہے' وہ سو فیصد ٹھیک کہتے ہیں۔ غصے میں آدمی پاگل پن کے قریب پہنچ جاتا ہے اور بعض انسانوں پر غصہ اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ اُن کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور چند لمحوں کے لئے ان پر پاگل پن طاری ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنی جان لے لیتے ہیں یا کسی کو قتل کر دیتے ہیں۔ ہم پر جو پاگل پن طاری ہُوا تھا' اس میں ہم اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔ اللہ کے گھر کی بے حرمتی اور اس کے ساتھ ہی ایک مسلمان خاتون کی بے حُرمتی کوئی بُزدل مسلمان بھی برداشت نہیں کر سکتا لیکن ہم نارمل ذہنی حالت میں آئے تو کچھ پریشان ہو گئے۔ میں آپ کو اپنا ردِعمل بتاتا ہوں۔ وہ یہ تھا کہ ہم تینوں نے دو فوجیوں کو قتل کر دیا تھا اور اب ہمیں اس کی سزا مل سکتی تھی۔

"ان لاشوں کو ہم یہاں تو نہیں چھوڑ سکتے" — فصیح نے کہا — "اگر ہم انہیں یہیں چھوڑ کر چلے گئے تو یہ مسلمان بے چارے مارے جائیں گے"۔

میں نے فصیح کی تائید میں کچھ کہا اور شفیع بھی کہنے لگا کہ اب سوچنا چاہئے کہ ان لاشوں کو کہاں غائب کریں۔ بزرگ ملائی سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور یہ بات کتنی ضروری ہے۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔

"مسجد میں کنواں ہے" — بزرگ نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا — "دونوں کو اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیتے ہیں"۔

"پھر آپ پانی کہاں سے لیں گے؟" — فصیح نے کہا — "کنواں ناپاک ہو جائے گا"۔

ہم نے مسجد کے اُس کونے کی طرف دیکھا جس طرف اس بزرگ نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں ہینڈ پمپ لگا ہُوا تھا اور اس کے ساتھ لکڑی کے تختے تھے۔ ان تختوں کے نیچے کنواں تھا۔ پانی ہینڈ پمپ سے نکالا جاتا تھا۔ بات تو ٹھیک تھی کہ لاشوں کو کنوئیں میں پھینک کر اوپر پھر تختے جما دیئے جاتے لیکن یہ کنواں ان لوگوں کے لئے بالکل ہی بے کار ہو جاتا۔ یہ بات بھی سوچنے والی تھی کہ لاشوں نے تھوڑے ہی عرصے بعد بدبو پیدا کرنی تھی جو ان لوگوں کو پکڑوا سکتی تھی۔ یہ تو بڑا ہی خطرناک مسئلہ تھا جس کا حل فوری طور پر سوچنا تھا۔

ہم زیادہ دیر وہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں واپس بھی جانا تھا اور اس طرح جانا تھا کہ ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے کہ ہم کس طرف سے آئے ہیں۔

بزرگ ملائی کا یہ حال تھا کہ ہمارے ساتھ اردو کے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہمارے ساتھ بات کرتا اور پھر اپنے چار آدمیوں کے ساتھ اپنی زبان میں بات کرتا تھا۔ ان سے مشورے لے رہا تھا کہ لاشیں کہاں پھینکی جائیں۔ ان میں سے دو آدمی کہتے تھے کہ ان کو آبادی سے کچھ دُور جا کر ایک گڑھا کھودیں گے اور لاشیں ان میں دبا دیں گے۔ ہم نے اس مشورے کو قبول نہ کیا کیونکہ رات کو جاپانیوں کی پٹرول پارٹی (گشتی پہرہ) گھومتی پھرتی رہتی تھی اس لئے پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔

وہ چار آدمی جو تجویز یا مشورہ پیش کرتے تھے' ان کا ترجمہ بزرگ ہمیں سناتا تھا۔ کئی تجویزیں سامنے آئیں اور اچانک بزرگ کے چہرے پر چمک سی آ گئی اور وہ تھوڑا سا مُسکرایا۔ اس نے بتایا کہ اس بستی میں دو گھر غیر مُسلموں کے ہیں اور دونوں خاندان یہاں سے چلے گئے تھے اور ان کے مکان خالی پڑے ہیں۔ اُس نے کہا کہ ایک مکان میں اسی طرح کا چھوٹا سا کنواں ہے جیسا مسجد میں ہے' اس پر تختے لگے ہوئے ہیں اور پانی نکالنے کے لئے ہینڈ پمپ استعمال ہوتا ہے۔ رات کو لاشیں اس کنوئیں میں پھینکی جا سکتی ہیں۔

یہ ایک ایسی تجویز تھی جو ہمیں اچھی اور بے خطر لگی.... آج کل آپ نے دیکھا ہو گا کہ کہیں پانی نکالنے کے لئے ہینڈ پمپ لگانا پڑے تو وہاں زمین میں بور کیا جاتا ہے اور جب پانی نکل آتا ہے تو ہینڈ پمپ کا پائپ وہاں ڈال دیتے ہیں اور ہینڈ پمپ پانی نکالنے لگتا ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں' اُس وقت کنواں کھودا جاتا تھا اور اس میں ہینڈ پمپ بھی لگا دیا جاتا تھا۔ بعض لوگ کنوئیں میں سے ڈول سے بھی پانی نکالتے تھے اور ہینڈ پمپ سے بھی اور بعض لوگ کنوئیں کے اوپر پھٹے لگا دیتے تھے اور صرف ہینڈ پمپ استعمال کرتے تھے۔ وہاں بھی ہم نے یہی سسٹم دیکھا۔

طے یہ ہُوا کہ لاشیں مسجد میں پڑی رہیں اور ہم تینوں دوست رات کو آئیں گے اور لاشیں اٹھا کر اُس مکان میں لے جائیں گے اور کنوئیں میں پھینک دیں گے۔ بزرگ نے کہا کہ ہم اگر نہ بھی آئیں تو وہ خود ہی یہ کام کر دیں گے لیکن ہم نے مناسب نہ سمجھا کہ ایسا خطرناک کام ان کے سپرد کیا جائے۔ وہ بھلے سے لوگ تھے اور انہوں نے مرنے

مارنے کا اور لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کبھی کام نہیں کیا تھا۔ ہم انہیں کسی مشکل میں ڈالنے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر یہی طے ہُوا کہ ہم رات کو پہنچ جائیں گے اور انہیں اندازاً وقت بتا دیا۔

لاشوں کو وہیں پڑے نہیں رہنے دینا تھا۔ ہم نے لاشوں کو گھسیٹا اور مسجد کے کمرے میں لے گئے اور ان کے اوپر صفیں اور چٹائیاں پھینک دیں۔ پھر دیکھا تو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوتا تھا کہ ان چٹائیوں وغیرہ کے نیچے لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے کمرے کے دروازے بند کر دیئے۔ بزرگ نے بتایا کہ نماز صحن میں پڑھا کرتے ہیں۔ وہ سردیوں کے دن نہیں تھے۔

اب ایک بات رہ گئی تھی جو فصیح کے دماغ میں آئی تھی۔ اُس نے بزرگ ملائی سے کہا کہ ان دونوں کی تلاش میں اگر کوئی فوجی ادھر آ نکلے اور پوچھے کہ دو فوجی ادھر آئے تھے تو وہ صاف انکار کر دیں اور کہیں کہ وہ زیادہ تر گھروں کے اندر رہتے ہیں اس لئے انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کون آیا تھا اور کون گزر گیا ہے۔ اس طرح کی کچھ باتیں بزرگ کو بتا کر ہم مسجد سے نکلنے لگے تو ان چار آدمیوں میں سے ایک نے ہم تینوں کے ساتھ باری باری ہاتھ ملایا اور ہم تینوں کے ہاتھ چومے اور پھر وہ زار و قطار رونے لگا۔ پتہ چلا کہ یہ عورت اس کی بیوی تھی۔ وہ کسی کام سے باہر نکلی تو آگے سے یہ دو کافر آ رہے تھے۔ انہوں نے اس عورت کو پکڑ لیا۔ اس کا خاوند ہمیں فرشتے سمجھ رہا تھا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کی عزت بچانے کے لئے آسمان سے اتارا تھا۔ ہم نے اس کی بہت دل جوئی کی اور کہا کہ مسلمان کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض تھا کہ ایک مسلمان عورت کی عزت کو بچائیں۔

ہم ان سے رخصت ہوئے اور وہیں سے شہر کی طرف آنے کی بجائے دوسری طرف نکل گئے اور خاصا چکر کاٹ کر واپس بارکوں میں آئے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہاں ہم رائفل یا کوئی ہتھیار اپنے پاس نہیں رکھا کرتے تھے۔ رائفلیں وغیرہ کوتوں میں بند ہوتی تھیں۔

ہم اپنی بارک میں پہنچے تو تین چار ساتھیوں نے پوچھا کہ ہم کہاں کی سیر کر کے آئے ہیں۔ ہم نے انہیں کوئی اور ہی جگہ اور سمت بتائی اور جھوٹ موٹ کی کچھ باتیں سنا کر انہیں مطمئن کر دیا۔ اب ہمیں رات کو بارک سے نکلنا تھا لیکن اُس وقت جب سب

سوئے ہوئے ہوں گے۔

ہو سکتا ہے میری یہ کہانی پڑھنے والے کچھ حضرات یہ شبہہ کریں کہ میں من گھڑت قصے سنا رہا ہوں۔ میں آپ سب سے یہ بات کہنا چاہوں گا کہ یہ واقعہ اور ایسے کچھ اور واقعات پڑھنے سے پہلے ذہن سے شری اور اپنے گاؤں کا ماحول نکال دیں اور ذہن میں دو تین باتیں رکھ لیں۔ پہلی بات یہ کہ ہم کچھ زیادہ ہی دلیر اور نڈر تھے۔ میں نے شروع میں آپ کو سنایا ہے کہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کس طرح ایک پیر کو مارا پیٹا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں جہاں کا واقعہ سنا رہا ہوں وہاں کے ماحول اور فضا کو تصور میں لانے کی کوشش کریں۔ اُس ماحول میں موت کی حکمرانی تھی۔ وہاں سوائے کُشت و خون کے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہاں تو یہ حال تھا کہ اس خیال سے کشت و خون کرتے چلے جاتے تھے کہ کسی بھی لمحے ہمارا اپنا خون ہو جائے گا۔ وہاں ہمارا اپنا قانون چلتا تھا۔ اپنے قانون سے مطلب یہ نہیں کہ ہم آزاد تھے' ہمارے اوپر جاپانی تھے جو ظالم قوم تھی۔

میں آج اُن دنوں کو یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں کہ اس سکھ نائیک اور ہندو لانس نائیک کو قتل کرنے سے پہلے میں برما کے جنگل میں کچھ آدمیوں کو قتل کر آیا تھا۔ آج وہ ہمت مجھ میں آ نہیں سکتی۔ یہ بھی سوچیں کہ مسجد کی بے حُرمتی کون مسلمان برداشت کر سکتا ہے۔ آج میرے جسم میں وہ طاقت نہیں رہی جو جوانی میں ہُوا کرتی تھی لیکن آج بھی کسی مسجد کی بے حُرمتی کی بات سنتا ہوں تو خون میں وہی ابال اٹھتا ہے جو کوالالمپور کی اس مسجد کی بے حُرمتی کو دیکھ کر اٹھا تھا۔ کشمیر' بوسنیا اور فلسطین وغیرہ میں مسلمانوں کے قتلِ عام اور مسجدوں کی بے حُرمتی کی خبریں تو دل میں مرنے مارنے کا جذبہ بیدار کر دیتی ہیں لیکن خون پی کے رہ جاتا ہوں۔

○

ذہن میں ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ کبھی تو میں خوش اور مطمئن ہو جاتا تھا کہ میں نے اللہ کی راہ میں بہت بڑی نیکی کی ہے۔ کچھ دیر بعد اطمینان اور مسرت کی اس کی کیفیت میں زلزلہ سا آ جاتا اور یہ سوچ آ جاتی کہ کسی نے ہمارے مقتولوں کو آبادی میں جاتے دیکھ لیا ہو گا اور جب پتہ چلے گا کہ دونوں لاپتہ ہیں تو ان کی تلاش میں فوجی وہاں تک پہنچ جائیں گے اور اس بزرگ کو اور اس بستی کے مسلمانوں کو ایسی اذیتیں دیں گے کہ وہ بتا دیں گے کہ ان دونوں کو کس نے قتل کیا ہے۔ یہ سوچ مجھے پریشان کر دیتی اور

دل پر بوجھ سا آ پڑتا لیکن میں اپنے آپ کو یوں تسلی دیتا کہ مر ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ اپنے مستقبل کے متعلق تو کچھ پتہ ہی نہیں تھا کیسا ہو گا اور میں کس انجام کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہوں۔

میں نے اپنے دوستوں کو نہ بتایا کہ میں کیا محسوس کر رہا ہوں۔ شام کو ہم تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ہم سرگوشیوں میں یہی باتیں کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ فصیح اور شفیع بھی میری طرح کچھ گھبرائے گھبرائے تھے۔

ہمارے دونوں مقتول ہماری ہی بٹالین کے تھے۔ صرف کمپنیاں الگ الگ تھیں۔ رات ساڑھے آٹھ بجے گنتی ہُوا کرتی تھی۔ تمام کمپنیاں الگ الگ ہوتی تھیں اور دیکھا جاتا تھا کہ کوئی غیر حاضر تو نہیں۔ اگلے روز کے احکام اور پروگرام گنتی کے بعد بتائے جاتے تھے۔

گنتی کا وقت ہو گیا اور جب گنتی سے ہمیں ڈسمس کیا گیا تو اس کے تھوڑی دیر بعد یہ خبر ہماری کمپنی تک بھی پہنچ گئی کہ فلاں سکھ نائیک اور ہندو لانس نائیک لاپتہ ہیں۔ پہلے تو یہ خیال گزرا کہ وہ گنتی سے غیر حاضر ہیں۔ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ گنتی سے غیر حاضری فوجی قانون کے تحت جرم تھا۔ گنتی کے بعد ہم بارک میں آ گئے اور سوچنے لگے کہ سب سو جائیں تو ہم اپنے کام کے لئے نکلیں۔

تقریباً" ایک گھنٹے بعد سکھ نائیک کی کمپنی کا ایک حوالدار ہماری بارک میں آیا اور اُس نے اعلان کے انداز سے کہا کہ فلاں نائیک اور لانس نائیک لاپتہ ہیں' اگر کسی نے انہیں دیکھا ہو تو بتائے کہاں دیکھا تھا۔ ہمارے زیادہ تر ساتھیوں نے کہا کہ انہوں نے نہیں دیکھا۔ فصیح کے دماغ میں بڑی اچھی بات آ گئی۔

فصیح نے اس حوالدار کو یہ جھوٹی اطلاع دی کہ اس نے ان دونوں کو فلاں طرف جاتے دیکھا تھا.... فصیح نے جس علاقے کا نام لیا تھا وہ اس شہر کا ایک محلّہ تھا جو بدنام علاقہ تھا۔ وہ طوائفوں کا علاقہ تھا جہاں فوجیوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن حکم کے باوجود کوئی کوئی فوجی وہاں جا پہنچتا تھا۔ سنا تھا کہ اچھی اچھی طوائفوں کو جاپانی اپنے ساتھ لے گئے ہیں پھر بھی وہاں کچھ طوائفیں موجود تھیں۔

میں نے بھی آگے بڑھ کر سکھ حوالدار کو بتایا کہ میں بھی فصیح کے ساتھ تھا اور ہم نے انہیں اُس طرف جاتے دیکھا تھا۔ حوالدار نے بڑی پریشانی کا اظہار کیا۔ دو فوجیوں کا لاپتہ ہو جانا

معمولی سی بات نہیں تھی۔ فصیح نے حوالدار سے کہا کہ وہ ہمیں اجازت لے دے تو ہم اُس علاقے میں جا کر ان دونوں کو ڈھونڈیں گے اور امید ہے وہ کسی نہ کسی گھر سے مل جائیں گے اور یہ بھی خیال ہے کہ وہ شراب زیادہ پی گئے ہوں گے اور کسی طوائف کے گھر میں یا کسی گلی میں بے سُدھ پڑے ہوئے ہوں گے۔

یہ حوالدار خود بھی سکھ تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ اس کوشش میں ہے کہ یہ سکھ نائیک کہیں مل جائے اور اسے سزا سے بچالے۔ سکھ ہو کر وہ اس سکھ کو سزا سے بچانا چاہتا تھا۔ میں نے اور فصیح نے اُسے کہا کہ ہم چلے جاتے ہیں اور اسے کہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح میں، فصیح اور شفیع اس سکھ حوالدار کو تسلی دے کر چلے گئے۔

ہم بارکوں میں سے نکلے اور اس بدنام علاقے کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف کا رُخ کر لیا جدھر مسلمانوں کے وہ چند ایک گھر تھے.... وہ آبادی دُور نہیں تھی۔ ہم وہاں جا پہنچے اور بزرگ ملائی کے دروازے پر دستک دی۔ پتہ چلا کہ وہ مسجد میں ہے۔

ہم تینوں مسجد میں گئے اور جوتے اتار کر اندر گئے تو وہاں بزرگ بھی موجود تھا اور چار کی بجائے اب پانچ آدمی اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ رات کو بلیک آؤٹ ہوتا تھا اس لئے مسجد میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم بہت جلدی میں ہیں اس لئے یہ کام فوراً" ہو جانا چاہئے۔

بزرگ نے بتایا کہ وہ اُس مکان میں جا کر کنوئیں کے اوپر سے تختے اکھاڑ چکے ہیں۔ اب صرف یہ کرنا ہے کہ لاشیں اٹھا کر کنوئیں میں پھینکنی ہیں اور اوپر تختے جما دینے ہیں... ہم فوراً" لاشوں تک پہنچے اور ہم سب نے مل کر لاشیں اٹھالیں اور مسجد سے نکل گئے۔ ڈر یہ تھا کہ جاپانی نہ دیکھ لیں۔

کنوئیں والا گھر دُور نہیں تھا۔ مسجد سے پچیس تیس قدم دُور تھا۔ ہم بڑے اطمینان سے لاشوں کو اٹھائے اس گھر میں جا داخل ہوئے۔ ان آدمیوں نے آواز نکالے بغیر تختے ایک طرف کر دیئے اور ہم نے دونوں لاشیں کنوئیں میں پھینک دیں۔ کنوئیں سے بڑی زور کی آواز اٹھی جس سے ہم ڈر گئے۔ ہم ڈرتے اس لئے تھے کہ یہ آواز کچھ دور تک پہنچی ہو گی اور کوئی نہ کوئی اس آواز پر اِدھر آجائے گا لیکن اللہ نے مہربانی کی کہ کوئی بھی نہ آیا۔

ان سب آدمیوں نے مل کر تختے کنوئیں پر پھر رکھ دیئے۔ لاشیں ٹھکانے لگ چکی تھیں۔ ہم نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے یہ ملائی بزرگ معلوم نہیں کیوں بڑا ہی اچھا لگا تھا۔ اس کا

انداز ایسا تھا جو متاثر کرتا تھا۔ وہ یقیناً" عالم اور دانشمند تھا۔ اُس نے ہمیں کہا کہ ہم کچھ دیر کے لئے اُس کے گھر چلیں لیکن ہم جلدی میں تھے۔ میں دِلی طور پر اس کے گھر جانا چاہتا تھا یا اس کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کرنا اور کچھ باتیں سننا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہم کل یا کسی بھی دن اُس کے پاس ضرور آئیں گے۔ اُن سب نے ہمارے ساتھ ہاتھ ملائے اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ ہم بہت تیز چل رہے تھے۔

راستے میں ہم تینوں نے بیان ملا لئے کہ سکھ حوالدار کو کیا بتائیں گے۔ اپنی بارک میں جانے کی بجائے ہم اُس کے پاس چلے گئے اور بتایا کہ ہم اس علاقے میں گھوم پھر رہے تھے کہ ایک گلی میں سے اچانک دو جاپانی فوجی سامنے آگئے۔ انہوں نے ہمیں بڑے غصے میں کہا جو ہم نہ سمجھ سکے۔ وہ یقیناً" یہی کہہ رہے تھے کہ ہم فوراً" وہاں سے بھاگ جائیں اور گندی گلیوں میں نہ گھومیں پھریں۔ اس طرح ہم وہاں سے آگئے۔

اس حوالدار کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ ہم کتنا بڑا جھوٹ بول رہے ہیں۔ ہم خوش تھے کہ اصل کام کر آئے تھے۔ اب ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اگلے روز یہ خبر ہر کسی تک پہنچ گئی کہ فلاں سکھ نائیک اور فلاں ہندو لانس نائیک لاپتہ ہیں اور وہ طوائفوں کے محلے میں گئے تھے۔ ہمیں خبریں ملتی رہیں کہ جاپانی فوج کی ملٹری پولیس کو اطلاع دی گئی تھی اور طوائفوں کے گھروں کی تلاشی بھی ہوئی تھی لیکن اس سکھ اور ہندو کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ہر کوئی اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ کوئی کہتا کہ وہ بھاگ گئے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا تھا کہ وہ بھاگ کر گئے کہاں ہوں گے۔ آخر اس پر سب نے اتفاق کیا کہ کسی بات پر جاپانیوں نے انہیں گولی مار دی ہے۔ ہم تینوں دوستوں نے افواہیں پھیلانی شروع کر دیں اور مشہور یہ کیا کہ وہ دونوں طوائفوں کے محلے میں گئے تھے اور وہاں جاپانی فوجیوں کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا تھا اور جاپانیوں نے انہیں کہیں لے جا کر گولی مار دی ہے۔

○

اسلام کا جذبہ بھی کیا جذبہ ہے۔ میں کتابوں کی باتیں نہیں بلکہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بات کر رہا ہوں۔ اسلامی جذبہ جسے میں جذبۂ جہاد کہوں گا، کچھ وقت کے لئے دب سکتا ہے، مر نہیں سکتا۔ میری اُس زندگی پر غور کریں۔ میں کیا تھا؟.... ایک آوارہ اور بھگوڑا.... میں نے اپنی داستان کے آغاز میں صاف الفاظ میں بتایا ہے کہ میں کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ میں ایک نہیں متعدد انسانوں کا قاتل بھی بن چکا تھا لیکن جہاں اسلام پر ایک مسجد کی بے

حُرمتی اور ایک مسلمان خاتون کی بے حُرمتی کی صورت میں زد پڑی' میں یکسر بدل گیا اور میرے اندر وہ مسلمان بیدار ہو گیا جس میں اسلام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہُوا تھا۔ میں ایک عقیدے کے طور پر مانتا ہوں کہ ہر مسلمان میں یہ جذبہ اللہ تبارک تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سمویا ہے۔ جس مسلمان میں یہ جذبہ نہیں وہ مسلمان بھی نہیں۔

یہ تو تھی اسلامی جذبے کی بات' اب دیکھئے اسلام کا رشتہ بھی کیا رشتہ ہے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ بزرگ جو ہمیں مسجد میں ملا تھا' میری روح پر غالب آ گیا تھا۔ اس کے ساتھ میرا کوئی اور تعلق نہیں تھا نہ کوئی لالچ تھا لیکن میں اسے ایک بار پھر ملنے کے لئے بے تاب ہُوا جا رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور وہ مجھے عالم اور دانشور لگتا تھا۔ مسجد میں جو چار پانچ ملائی آئے تھے اور جنہوں نے لاش کو ٹھکانے لگانے میں ہماری مدد کی تھی' مجھے یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ میرا گہرا تعلق یا رشتہ ہے۔ اسلام کے سوا اور کیا رشتہ ہو سکتا تھا!

کچھ دنوں بعد میں اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ پھر اسی چھوٹی سی بستی میں جا پہنچا جہاں وہ بزرگ ملا تھا۔ اُس کا گھر ہم نے اس شام دیکھ لیا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک دی تو اسی نے دروازہ کھولا اور ہمیں اندر لے گیا۔ گھر تو غریبانہ سا تھا لیکن اتنی صفائی اور ایسا سلیقہ کہ کمرے میں بیٹھ کر بڑا ہی پیارا سا سکون محسوس کیا۔ اس کی ایک وجہ تو اس بزرگ کا تقدّس تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں بڑی ہی لمبی مدت بعد ایک گھر میں داخل ہُوا تھا۔ مجھے تو یوں لگتا تھا جیسے ساری عمر جنگلوں میں جنگلی جانوروں کی طرح گذار دی ہے۔ جب کسی کو قتل کرنے کی نوبت آتی تھی تو میں درندہ بن جاتا تھا۔ اس گھر میں بیٹھ کر مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ میں کوشش نہ کرتا تو میرے آنسو نکل آتے۔ یہ جذبات کی انتہا تھی۔ اس بزرگ کی بیوی بھی تھی جو اسی جیسی بوڑھی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر نوکرانی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے اُردو کہاں سے سیکھی ہے۔ اُس نے بتایا ملایا میں ہندوستان کے کچھ لوگ بھی آباد تھے۔ ان میں مسلمان بھی تھے' ہندو' سکھ اور عیسائی بھی تھے۔ وہ زیادہ تر وہاں تجارت پیشہ تھے یا عام قسم کے دکاندار۔ کچھ ملازم بھی تھے۔ اُس بزرگ نے کچھ کچھ اُردو ان لوگوں سے سیکھ لی تھی لیکن زیادہ تر اردو اس نے بنگال اور ہندوستان میں سیکھی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُردو لکھنے میں اُسے دشواری ہوتی ہے لیکن

سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی' البتہ بولتے وقت الفاظ ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔

اُس وقت تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی میں وہ وقت بھی آئے گا کہ میں اپنا یہ سارا سفرنامہ یا یہ داستان قلمبند کروں گا۔ اگر اُس وقت یہ سوچا ہوتا تو میں ہر بندے کا اور ہر جگہ اور مقام کا نام لکھ لیتا۔ بہت سے نام ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ وہ ماحول اور وہ فضا یاد رہ گئی ہے۔ یہ بزرگ اس حد تک متاثر کر رہا تھا کہ اس کا نام میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا۔ اس کا نام فیض الحق تھا اور اس کے آگے بھی وہ کچھ لکھتا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔ وہ ملائی زبان کا لفظ ہو گا۔ ماشیر تھا یا ماسیر' اسی قسم کا کوئی لفظ تھا۔ مجھے فیض الحق اچھی طرح یاد رہ گیا ہے.... فیض الحق کا باپ عالم دین تھا اور اسی نے فیض الحق کو دین یا دینی تعلیم کے راستے پر ڈالا تھا۔ جوانی کی عمر میں فیض الحق بنگال گیا اور ڈھاکہ میں ایک سال کسی دینی مدرسے میں رہا اور وہاں کے عالموں سے فیض حاصل کیا۔ انگریزوں کے دور میں بھی ڈھاکہ مسجدوں کا شہر کہلاتا تھا۔ بنگال' خصوصاً" مشرقی بنگال جو بعد میں مشرقی پاکستان بنا اور اب بنگلہ دیش ہے' مجاہدین کا ملک چلا آ رہا ہے۔ اس خطے نے سراج الدّولہ اور تیتو میر جیسے مجاہدین پیدا کئے ہیں۔

علم کی جستجو میں فیض الحق دلی تک گیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب فیض الحق کی جوانی پرانی بات ہو گئی تھی۔ وہ بنگال سے واپس کوالالمپور آ گیا تھا اور کچھ برسوں بعد پھر نکل کھڑا ہوا اور ہندوستان کے چند ایک شہروں میں قیام کرتا دلی چلا گیا اور وہاں سے دیوبند بھی گیا اور اُس کا یہ سارا وقت علمائے دین سے علم حاصل کرتے گزرا۔ اُس نے کئی علمائے دین کے نام لئے تھے جن میں سے مجھے ایک بھی یاد نہیں رہا۔ اس وقت مجھے اسلام کے ساتھ روحانی دلچسپی تھی' علماء سے میں ناواقف تھا۔ البتہ اپنے قصبے کی تینوں مسجدوں کے مولویوں کے نام جانتا تھا یا جس مولوی نے ہمیں دینیات پڑھائی تھی' اس کا نام یاد رہا اور اب بھی یاد ہے۔ فیض الحق نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ ہم جانتے تھے کہ جو شہری یہاں رہتے ہیں' انہیں راشن پانی کی تنگی ہے۔ ہم نے فیض الحق سے پوچھا کہ اُسے اگر کھانے پینے کی اشیاء کی تنگی ہو تو ہمیں بتائے' ہم اُسے چاول وغیرہ دے سکتے ہیں۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اسے کوئی تنگی نہیں اور وہ صبر اور شکر سے زندگی گذارنے والا انسان ہے.... ہمارے پاس کوئی راشن نہیں تھا جو ہم اسے دیتے۔ پکا پکایا کھانا لنگر سے ملتا تھا۔ ہم اگر کسی کو کچھ دیتے تو وہ چوری یا ہیرا پھیری کر کے حاصل

کرتے اور پھر دیتے۔ فیض الحق کے لئے تو میں بہت بڑا جرم کرنے کو بھی تیار تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور میں نوٹ کر رہا تھا کہ وہ الفاظ ڈھونڈ رہا ہے اور انہیں جوڑ جاڑ کر بولتا ہے۔ میں اس کی باتیں صاف اردو میں لکھوں گا۔

"ان تمام علاقوں پر یہ آفت نازل ہونی ہی تھی" — فیض الحق نے کہا — "جاپانی فوج ایک آسمانی آفت تھی جو نازل ہوئی اور برما تک پہنچ گئی۔ لوگ کہتے ہیں جاپانی فوج ہندوستان پر بھی قابض ہو جائے گی لیکن یہ صحیح نہیں اور ایسا نہیں ہو گا۔ جاپانی فوج جہاں تک چلی گئی ہے وہاں سے واپس آ جائے گی' آگے نہیں بڑھے گی"۔

"کیا آپ کو جنگ کی تازہ بہ تازہ خبریں ملتی رہتی ہیں؟" — میں نے پوچھا۔

"مجھے جو خبریں ملتی ہیں وہ اللہ کی طرف سے ملتی ہیں" — فیض الحق نے جواب دیا — "ہمارے پاس نہ تو ریڈیو ہے نہ کوئی اخبار ملتا ہے' اب تو یہاں کوئی اخبار چھپتا ہی نہیں"۔

"پھر آپ کو شہر کے لوگوں سے خبریں مل جاتی ہوں گی!" — فصیح احمد نے کہا۔

"شہر کے لوگوں کو کچھ بھی معلوم نہیں آگے کیا ہو رہا ہے" — فیض الحق نے کہا — "آپ خود فوجی ہیں' آپ جانتے ہیں کہ شہریوں کو فوج کی صحیح خبریں نہیں دی جایا کرتیں.... میں تمہیں ایک خبر دیتا ہوں جو مجھے پوری امید ہے بالکل صحیح ہو گی۔ اگر آپ کو معلوم نہیں تو اپنے فوجی ذرائع سے معلوم کر لیں.... جاپان کی فوج برما سے بھاگ آئی ہے اور برما پر پھر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا ہے"۔

یہ تو فصیح احمد مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ جاپانی برما سے پسپا ہو آئے ہیں لیکن یہ بزرگ فیض الحق یہ دعویٰ کر رہا تھا کہ اُسے اللہ کی طرف سے خبریں ملتی ہیں۔ میں اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اللہ سے وہ کس طرح خبریں حاصل کرتا ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ یہ بزرگ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

"کیا جاپانی ملایا میں جم کر لڑیں گے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں!" — فیض الحق نے جواب دیا — "میں دیکھ چکا ہوں کہ جاپانی فوج جس طرح آسمانی آفت بن کر آئی تھی اسی طرح یہ فوج تباہ ہو گی جیسے اس پر کوئی آسمانی آفت گری ہو۔ مجھے بہت بڑا انقلاب نظر آ رہا ہے جو ملایا میں آئے گا' دنیا ہی بدل جائے گی"۔

فیض الحق میرے لئے پُراسرار سی شخصیت بنتا جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ہماری جو

باتیں ہوئیں اور جو باتیں اس نے کیں' اس سے مجھے یہ تاثر ملا کہ اس کے پاس روحانی علم یا کشف کی طاقت ہے جس سے یہ ہر بات معلوم کر لیتا ہے۔ آپ نے روحانی عامل' جوتشی' پیر اور شاہ جی دیکھے ہوں گے اور ان میں سے کسی کے ساتھ آپ کا واسطہ بھی پڑا ہو گا۔ آپ کو تجربہ ہُوا ہو گا کہ یہ لوگ بڑے لمبے چوڑے دعوے کیا کرتے ہیں اور بڑ ہانکنے کے انداز سے بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے سائلوں کو متاثر کرنے کے لئے اپنی کرامات بڑھ چڑھ کر بیان کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں غیب کی ہر بات معلوم ہو جاتی ہے لیکن فیض الحق کا انداز کچھ اور ہی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا جس میں مجھے تقدس نظر آ رہا تھا اور وہ پُراعتماد لہجے میں بات کرتا تھا۔

"کیا آپ کو کشف ہوتا ہے؟" — میں نے پوچھا — "کوئی روحانی علم یا عمل آپ کے ہاتھ میں ہے؟"

"آپ کے ملک ہندوستان میں ایک شہر الٰہ آباد نام کا ہے" — فیض الحق نے کہا — "میں نے وہاں کچھ عرصہ گذارا ہے اور یہ عرصہ ایک بزرگ عالم کے سائے میں گزرا تھا۔ میں نے ان کی بہت خدمت کی تھی اور وہ شاید میری نیت اور میری روح کا راز سمجھ گئے تھے' انہوں نے مجھے اپنے فیض سے کچھ حصہ عطا کر دیا اور میرا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست قائم کر دیا۔ انہوں نے مجھ سے وظیفے بھی کروائے' چلے بھی کروائے اور ریاض بھی کروایا اور میرے آگے ڈھکے چھپے طبق بے نقاب ہو گئے"۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیبی طاقت دی ہے" — فصیح احمد نے کہا — "کیا آپ اس طاقت سے ملایا کی تباہی کو روک نہیں سکتے تھے؟ اگر آپ چاہتے تو ہو سکتا تھا جاپانیوں کی فوج ساحل سے دُور ہی رہتی اور وہیں سے واپس چلی جاتی"۔

"میں آپ کو ایک بات سمجھانے کی کوشش کروں گا" — فیض الحق نے کہا — "اللہ جس کام کا حکم دیتا ہے اسے بندہ روک نہیں سکتا۔ میں دیکھ چکا ہوں' سب کچھ نظر آ گیا ہے۔ اللہ اس خطّے میں جو خونی انقلاب لایا ہے یہ اسلام کے حق میں ہو گا۔ اگر آپ لوگ پڑھے لکھے ہیں اور اس علاقے کا نقشہ دیکھا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سارے خطے میں جزیرے ہی جزیرے ہیں۔ کچھ چھوٹے ہیں کوئی بہت ہی چھوٹے ہیں' کوئی بڑے ہیں اور کوئی بہت ہی بڑے ہیں۔ ملایا پر اور اس کے ساتھ والے جزیروں پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور یہاں ان ہی کی بادشاہی تھی۔ اس سے نیچے اور آگے جو چھوٹے

بڑے جزیرے ہیں ان پر یورپ کی ایک قوم کی حکومت تھی جسے ڈچ کہتے ہیں اور اُردو میں اسے ولندیزی کہا جاتا ہے۔ جاپان کی فوج ان دونوں قوموں کے لئے آسمانی آفت بن کر نازل ہوئی تھی اور ان سب کو یہاں سے بھگا دیا اور ان کی فوجوں کو قتل بھی کیا اور قید بھی کر لیا۔ اب جاپان کی فوج کا وہی انجام ہو گا اور یہاں پھر وہی دونوں قومیں واپس آئیں گی لیکن اب پہلے کی طرح یہاں بادشاہی قائم نہیں کر سکیں گی۔ ابھی اس خطّے میں اور زیادہ خون بہے گا اور آخر میں دنیا دیکھے گی کہ یہ سارا خطّہ ایک مسلمان ملک بن گیا ہے اور ہو سکتا ہے یہ دو مسلمان ملک بن جائیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جاپانیوں کو اسی لئے بھیجا تھا کہ پرانے بادشاہوں کے تختے اُلٹ جائیں اور پھر یہاں اسلام کا جھنڈا بلند ہو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ سارا خطّہ مسلمانوں کا خطّہ بن جائے گا لیکن خون خرابہ بہت ہو گا"۔

میں نے فیض الحق کی اس بات پر زیادہ توجہ نہ دی اور نہ ہی اسے اہمیت دی۔ یہ تو مانا جا سکتا تھا کہ جاپانی شکست کھا جائیں گے لیکن یہ تسلیم کرنا خاصا مشکل تھا کہ انگریز اور ولندیزی ان ملکوں سے نکل جائیں گے اور یہاں مسلمانوں کی حکمرانی قائم ہو گی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ملایا اور اس سے آگے والے جزیرے جو آج انڈونیشیا کہلاتے ہیں' ان میں مسلمان غالب اکثریت میں آباد تھے لیکن یہ تمام مسلمان محکوم اور غلام تھے' ان کے پاس کوئی فوجی طاقت نہیں تھی۔ اگر ان میں کوئی دم خم تھا تو وہ جاپانی فوج نے ختم کر ڈالا تھا۔ انہیں بے گھر کر دیا گیا اور ان کی عزتیں بھی لوٹ لی تھیں۔ یہ تو اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

یہ تو میرے اُس وقت کے تاثرات ہیں جب میں اس بزرگ کے گھر میں بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن جنگ کے کچھ ہی عرصہ بعد دو مسلمان ملک دنیا کے نقشے پر ابھرے.... ایک ملائیشیا اور دوسرا انڈونیشیا.... آج فیض الحق مجھے بہت یاد آ رہا ہے۔ اُس کے پاس روحانیت کا علم تھا اور وہ کشف کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اُس وقت اُس نے ایک اور بات بھی کہی تھی اور میں بے اختیار ہنس پڑا تھا کیونکہ وہ خواب و خیال کی بات لگتی تھی۔

"تم اس انقلاب کو اپنے ملک ہندوستان میں بھی دیکھو گے" — فیض الحق نے کہا — "وہاں بھی انگریزوں کا تختہ اُلٹ جائے گا اور ایک یا دو مسلمان ملک وجود میں آئیں

گے"۔

کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ہندوستان میں پاکستان کے وجود کا ظہور ہو گا اور پاکستان دو حصوں میں ہو گا اور پھر اگر پاکستان آدھا رہ بھی گیا تو ایک اور مسلمان ملک وجود میں آئے گا جس کا نام مشرقی پاکستان کی بجائے بنگلہ دیش ہو گا۔

"محترم بزرگ!" — میں نے کہا — "ہمیں کچھ بتائیں کہ ہماری منزل کیا ہے اور ہم کس انجام کو پہنچ رہے ہیں؟"

فیض الحق نے ہم تینوں کے چہروں کو باری باری بڑے غور سے دیکھا اور آنکھیں بند کر کے اوپر کو مُنہ کر لیا اور پھر سر جھکا لیا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے وہ دل ہی دل میں کچھ پڑھ رہا ہو۔ دو تین منٹ وہ اسی کیفیت میں رہا پھر اُس نے سر اٹھا کر باری باری ہم تینوں کو دیکھا۔

"کون کب مرے گا' یہ راز صرف اللہ جانتا ہے" — فیض الحق نے انگلی آسمان کی طرف کر کے کہا — "مجھے جو کچھ نظر آیا ہے وہ ظاہری طور پر ٹھیک نظر نہیں آتا لیکن جو بھی طوفان تم تینوں کے لئے آ رہا ہے' وہ تمہیں اِدھر اُدھر اڑاتا' گراتا اور اُٹھاتا گزر جائے گا اور پھر پوری امید ہے کہ تم اپنی زندگی کے ٹھیک راستے پر چل پڑو گے.... کچھ اور خون نظر آتا ہے"۔

میں نے اُسے کہا کہ وہ ہمیں کوئی روحانی عمل یا کوئی وظیفہ بتا دے جو ہم باقاعدگی سے کرتے رہیں تاکہ ہماری مشکلیں آسان ہو جائیں اور ہمارا انجام بھی اچھا ہو۔

"نہیں میرے عزیز!" — فیض الحق نے کہا — "میں تمہیں کوئی وظیفہ نہیں بتاؤں گا۔ وجہ یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو پاک صاف نہیں رکھ سکو گے اور نہ ہی پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھ سکو گے۔ تم ایسے ماحول میں ہو جہاں شراب بھی چلتی ہے اور خنزیر بھی کھایا جاتا ہے اور وہ کون سی بدی ہے جو فوجی نہیں کرتے۔ وظیفوں کا اثر دیکھنا ہو تو اپنی روح کو بدی سے پاک کر لو۔ وظیفہ اللہ کا کلام ہوتا ہے۔ اس کی بے حُرمتی الٹ اثر کر جاتی ہے.... میں تمہیں ایک بات بتا دیتا ہوں۔ یہ تو بتا دیا ہے کہ اپنی روح کو بدی سے پاک رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے سے کمزور آدمی پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ کسی پر فتح حاصل کر لو تو اسے اپنا محکوم یا غلام نہیں بنانا۔ ہر اُس چیز سے بچنا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ تم نے یہ بہت بڑی نیکی کی ہے کہ ایک مسلمان عورت کی آبرو کو کافروں

سے بچایا ہے اور انہیں اللہ کے گھر کی بے حرمتی کرنے کی سزا دی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا اور ضرور دے گا۔ میں تمہیں یہ بتا رہا ہوں کہ تم بھی روحانی طاقت حاصل کر سکتے ہو۔ راز کی بات میں نے تمہیں بتا دی ہے"۔

"اب ایک اور بات بتائیں" — میں نے پوچھا — "آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ جاپانیوں نے انڈین نیشنل آرمی کے نام سے ہندوستان کے فوجیوں کی ایک فوج بنائی ہے۔ اس کا انجام کیا ہو گا!"

"بکھر جائے گی" — فیض الحق نے جواب دیا — "تمہاری یہ فوج کچھ بھی نہیں کر سکے گی"۔

"ہم اسی فوج میں ہیں" — فصیح نے پوچھا — "اگر انگریزوں کی فوج آ گئی تو کیا ہمیں اس کے خلاف لڑنا چاہئے؟"

"وہاں تک شاید نوبت ہی نہیں آئے گی" — فیض الحق نے جواب دیا — "اگر انگریزوں کی فوج آ گئی تو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا۔ تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی"۔

ہمیں وہاں بیٹھے بہت ہی وقت گزر چکا تھا۔ ہم اتنی دیر تک غیر حاضر نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم وہاں سے اٹھے اور جب باہر نکلے تو میں ایک کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ فیض الحق نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن اس کی کچھ باتیں اور پیشگوئیاں ایسی تھیں جو مجھے قابلِ اعتبار نہیں لگتی تھیں۔ کبھی خیال آتا کہ یہ بزرگ بے بنیاد باتیں کرتا ہے اور کبھی یہ خیال آتا کہ یہ شخص عالمِ دین ہے اور جو کچھ کہہ رہا ہے وہ صحیح ثابت ہو گا.... ہم تینوں دوست اس کی باتوں کے متعلق باتیں کرتے واپس اپنی بارک میں آ گئے۔

○

فیض الحق اللہ کے ان چند ایک بندوں میں سے تھا جنہیں میں باقی عمر بھول نہیں سکوں گا۔ ملایا میں میرا ارادہ تھا کہ میں اس کے پاس جاتا رہا کروں گا اور اس سے دینی تعلیم لوں گا۔ دینی تعلیم سے میری مراد وہ تعلیم نہیں جو مسجدوں کے مولوی لیا کرتے ہیں اور سمجھتے کچھ بھی نہیں' میرا مقصد یہ تھا کہ اس سے روحانیت کے کچھ سبق لوں گا۔ روحانیت سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں روحانی عامل بننا چاہتا تھا' میرا مقصد روح کی تسکین تھا اور اصل مقصد یہ تھا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ میرا رابطہ قائم ہو جائے

لیکن میں ایک ہی بار جا سکا کیونکہ ملایا کے حالات اچانک پلٹا کھا گئے۔

فیض الحق کی ایک پیشگوئی فوراً" ہی پوری ہو گئی۔ اُس نے کہا تھا کہ جس طرح جاپانی فوج آسمانی آفت بن کر انگریزوں اور ولندیزیوں پر گری تھی اسی طرح جاپانی فوج پر بھی ایسی آفت گرے گی کہ وہ اسے آسمانی آفت سمجھیں گے۔

اب جاپانی برما سے اپنی پسپائی کو ہم سے نہیں چھپا سکتے تھے۔ کوالالمپور میں جاپانیوں کی جو فوج تھی اس میں ہمیں بھگدڑ سی مچی نظر آنے لگی تھی۔ ایک یا دو یونٹیں تھوڑے سے نوٹس پر تیار ہوتیں اور انہیں ریل گاڑی پر سوار کر دیا جاتا تھا۔ اُسی روز یا اگلے روز ایک دو یونٹیں نئی وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ جاپانی افسروں کو میں نے ایمرجنسی کی حالت میں بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ فصیح نے مجھے اندر کی خبریں سنائی تھی کہ جاپانی بہت زیادہ نقصان اٹھا کر برما سے پسپا ہوئے ہیں اور ملایا میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔ ایک خبر یہ بھی سنی کہ امریکہ' برطانیہ اور آسٹریلیا کی نیوی کے بحری جنگی جہاز بڑی تیزی سے برما کی طرف سے ملایا اور سماٹرا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ افواہ تھی یا صحیح خبر کہ ان بحری جہازوں نے ساحل سے گولہ باری بھی شروع کر دی تھی۔

میں نے پچھلے باب میں تفصیل سے سنایا ہے کہ جاپانیوں نے ملایا اور سنگاپور کس طرح فتح کئے تھے اور انگریزوں کی فوج نے کس طرح ہتھیار ڈالے تھے۔ اب اگر میں تفصیل سے سنانے لگوں کہ اتحادیوں نے یعنی امریکہ اور برطانیہ نے کس طرح جوابی حملہ کیا اور وہ کس طرح ملایا تک پہنچے تھے تو بات بہت ہی لمبی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کچھ قارئینِ کرام اس میں بوریت محسوس کریں۔ میں اس جوابی حملے کی بات مختصر کروں گا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ انڈین نیشنل آرمی جس کی نفری 25 ہزار بتائی گئی تھی' کہاں کہاں بکھری پڑی تھی اور اس سے کیا کام لیا جا رہا تھا۔ میں صرف اپنی بٹالین کا ذکر کروں گا کیونکہ بات وہی اچھی لگتی ہے جو اپنی آنکھوں دیکھی ہوئی ہو.... ایک روز جاپانی افسروں نے ہم میں سے تقریباً" ایک سو جوان منتخب کر کے الگ کر لئے۔ ان میں مجھے اور فصیح احمد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ہمیں کچھ دور لے جا کر الگ بارکوں میں رکھا گیا اور ہمیں وہاں بتایا گیا کہ ہمیں کمانڈو ٹریننگ دی جائے گی اور ہم دشمن یعنی انگریزوں اور امریکیوں کی

فوج کے مورچوں کے پیچھے جا کر حملے کیا کریں گے۔ عام فہم زبان میں یوں کہہ لیں کہ ہمیں شب خون اور چھاپے مارنے کی ٹریننگ دینی تھی۔ آئی این اے کو جنگ میں یوں جھونکنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ جاپانیوں کی حالت کچھ زیادہ ہی پتلی ہو گئی تھی اور انہیں کمک نہیں مل رہی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ جاپانیوں نے آئی این اے کی 25 ہزار نفری کو دو اڑھائی سال راشن کھلایا تھا اور اس کی ٹہل سیوا کی تھی۔ اب جاپانی اس سے اپنا حق وصول کرنا چاہتے تھے۔

جنگ کے بہت بعد جب میں نے جنگِ عظیم کی کتابیں پڑھی شروع کی تھیں تو مجھے پتہ چلا تھا کہ جاپانیوں کی حالت کیا ہو گئی تھی۔ بحرالکاہل میں بے انداز جزیرے تھے جن میں کچھ چھوٹے تھے اور بعض ذرا بڑے تھے اور کچھ بہت ہی وسیع و عریض تھے۔ ان میں فلپائن بھی ایک جزیرہ ہے جو ایک ملک ہے۔ ایسے بے شمار جزیرے بحرالکاہل میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جاپان نے اپنی نیوی سے اور نیوی کے طیارہ بردار بحری جہازوں سے اس قدر اچانک اور تیز حملہ کیا تھا کہ راستے میں آنے والا ہر جزیرہ جاپان کی جھولی میں گرتا چلا گیا۔ جاپانی نیوی اور فوج نے پورے کا پورا فلپائن بھی لے لیا اور اس پر باقاعدہ قابض ہو گئی۔ اس طرح سارے جزیروں پر قابض ہوتے ہوئے جاپانی نیوی ملایا اور پھر برما تک پہنچ گئی تھی۔

اِدھر انگریزوں نے امریکی فوج کی مدد سے برما پر جوابی حملہ کیا اور برما سے جاپانی فوج کو بھگا دیا' اُدھر امریکہ نے اپنی تمام تر نیوی بحرالکاہل میں پھیلا دی اور ایک طرف سے جزیروں پر حملے شروع کر دیئے اور خونریز لڑائیوں کے بعد جاپانیوں سے جزیرے چھین لئے۔ امریکیوں نے فلپائن پر حملہ کر کے وہاں جاپانیوں کو شکست دی اور ان سے ہتھیار ڈلوا لئے۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں جسے آپ قدرت کا کھیل کہہ سکتے ہیں۔ میں نے پچھلے باب میں بتایا ہے کہ سنگاپور اور ملایا میں انگریزوں کی جو فوج تھی اس کا کمانڈر جنرل پرسیول تھا۔ اس نے جاپانیوں کے آگے ہتھیار ڈالے اور جنگی قیدی بن گیا تھا۔ اس کی 85 ہزار فوج جاپانیوں کے ہاتھ جنگی قیدی بنی تھی۔ امریکیوں نے جوابی حملہ کر کے فلپائن پر قبضہ کر لیا اور وہاں جو جاپانی فوج تھی اس سے ہتھیار ڈلوا لئے۔ ایک جاپانی جرنیل نے سرینڈر کے کاغذات پر دستخط کئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ملایا اور سنگاپور والا

انگریز جنرل پرسیول فلپائن میں ہی ایک قیدی کیمپ میں تھا۔ اُسے قیدی کیمپ سے نکال کر جاپانیوں کے سرینڈر کی تقریب میں شامل کیا گیا اور اس نے جاپانی جرنیل سے سرینڈر کے کاغذات پر دستخط کروائے تھے' یعنی ایک جنگی قیدی نے فاتح فوج کے جرنیل سے ہتھیار ڈلوانے کی رسم پر اُس کے دستخط کروائے۔

○

بحرالکاہل میں جب امریکہ نے حملہ کیا تو امریکہ کی نیوی اور جاپان کی نیوی کے درمیان جو بحری جنگ لڑی گئی تھی' وہ جنگوں کی تاریخ کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ ہولناک جنگ تھی۔ جاپان کی فوج اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی زیادہ اس نے نیوی تیار کر رکھی تھی۔ اس میں کئی ایک طیارہ بردار بحری جہاز تھے۔ امریکہ کی نیوی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس میں بھی طیارہ بردار جنگی جہاز تھے۔ اگر آپ اس بحری جنگ کی تفصیلات پڑھیں تو اس میں آپ کو کچھ دلچسپیاں بھی ملیں گی۔ بحری جہاز بہت دُور دُور سے ایک دوسرے پر گولے برساتے ہیں۔ اتنی دُور سے کہ اکثر اوقات پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ جس بحری جہاز پر گولے فائر کر رہے ہیں وہ کہیں اپنا ہی نہ ہو۔ امریکہ کی نیوی کے بعض جہاز رات بھر گولے برساتے رہے اور اس گولہ باری میں ایک دو جہاز اِدھر کے اور ایک دو اُدھر کے تباہ ہو گئے۔ صبح معلوم ہُوا کہ ادھر بھی امریکہ ہی کے بحری جہاز تھے۔ وہ ایک دوسرے کو جاپانی سمجھ کر گولہ باری کرتے رہے اور اپنے ہی جہازوں کو تباہ کر کے ڈبوتے رہے۔

دونوں طرف بحری جنگی جہازوں میں فوج بھی ہوتی تھی۔ جب جزیرے پر حملہ کیا جاتا وہاں پہلے نیوی ساحل کے قریب جا کر گولہ باری کرتی تھی اور پھر جہازوں میں سے فوج کو اتار دیا جاتا تھا جو جزیرے میں جا کر جنگ لڑتی تھی۔ چونکہ امریکہ کی نیوی سارے بحرالکاہل میں پھیل گئی تھی اور امریکی فوج نے جسے میرین کہا جاتا ہے' کئی ایک جزیرے لے لئے تھے اس لئے جاپان کے لئے مشرقِ بعید یعنی ملایا برما کو کمک دینا ناممکن ہو گیا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ جاپانیوں کو برما سے پسپا ہونا پڑا اور ملایا میں جم کر لڑنا بھی ان کے لئے آسان نہیں رہ گیا تھا کیونکہ ان کے پاس نفری کی بھی کمی ہو گئی تھی اور رسد کی بھی۔ انہیں ایمونیشن بھی کم پڑتا نظر آ رہا تھا۔ رسد کے تمام راستے بند ہو گئے تھے۔

امریکیوں نے جو جزیرے جاپان سے چھین لئے تھے وہ آسانی سے امریکہ کے ہاتھ

نہیں آئے تھے۔ جاپانیوں نے ہر جزیرے میں ایسا جم کر مقابلہ کیا کہ امریکہ کی جس نفری نے حملہ کیا تھا وہ آدھی سے بھی کم رہ گئی۔ امریکہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ اُس کے پاس بمبار طیارے خاصے زیادہ تھے۔ وہ اتنی زیادہ بمباری کرتے تھے کہ یوں لگتا تھا کہ یہ پورا جزیرہ سمندر میں ڈوب جائے گا۔ یہاں میں صرف ایک بڑے جزیرے کی تھوڑی سی بات سناؤں گا۔

اس جزیرے کا نام گواڈل کینال ہے۔ اس پر امریکیوں نے یوں حملہ کیا کہ اس کے بحری جہازوں نے ساحل کے قریب آ کر جزیرے پر گولہ باری کی اور اوپر سے بمبار طیاروں نے بے پناہ بمباری کی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس جزیرے میں کوئی انسان' کوئی حیوان اور کوئی پرندہ بھی زندہ نہیں رہ گیا ہو گا۔ تب بحری جہازوں سے فوج کو ساحل پر اتارا گیا۔

فوج جنگی انداز اور ترتیب سے جزیرے کے جنگلات میں داخل ہوئی اور اس توقع پر داخل ہوئی کہ ایک بھی جاپانی سپاہی زندہ نہیں ہو گا' پتہ چلا کہ جاپان کی فوج کا ہر جوان زندہ و بیدار ہے اور وہ کسی امریکی کو اس جزیرے میں زندہ نہیں رہنے دے گا۔ جاپانی فوج نے ایسی بے جگری سے اور ایسے شدید جذبے سے حملہ روکا کہ امریکی فوج کو بے طرح جانی نقصان ہونے لگا۔ تھوڑے سے وقت میں امریکی فوج کی حالت ایسے ہو گئی جیسے جاپانیوں نے اس کا قتل عام کیا ہو۔

امریکہ کے اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر اپنی فوج کے ساتھ تھے۔ زندہ قومیں جو زندہ رہنا چاہتی ہیں' اپنے عوام کو دھوکے میں نہیں رکھا کرتیں اس لئے ان کے اخباروں اور اخباری رپورٹروں پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی نہ وہ دستورِ زبان بندی کے پابند ہوتے ہیں۔ رپورٹروں نے اپنے اپنے اخباروں کو اس حملے کی صحیح خبریں بھیجیں تو امریکہ کے اخبار اور عوام تڑپ اٹھے۔ جنگی مبصروں نے اس حملے کے جرنیل پر شدید نکتہ چینی کی اور اخباروں نے اڈیٹوریل لکھے کہ حملہ بڑے ہی ناقص طریقے سے کیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں اپنی فوج کو مروایا گیا ہے۔ کسی نے لکھا کہ طیاروں سے بمباری بہت تھوڑی کی گئی یا غلط جگہوں پر کی گئی اور کسی نے لکھا کہ نیوی نے گولہ باری صحیح طرح اور پوری تعداد میں نہیں کی وغیرہ وغیرہ۔ مختصر یہ کہ اتنے زیادہ جانی نقصان پر امریکہ میں اپنے جرنیلوں اور ہائی کمانڈ کے خلاف بہت ہی احتجاج کیا گیا۔

وہاں کی کمانڈ میں رد و بدل کیا گیا اور کمک بھیجی گئی۔ از سرِ نو بمبار طیاروں سے بمباری اور بحری جہازوں سے گولہ باری کی گئی اور پہلے سے زیادہ جنگی طاقت سے فوج نے حملہ کیا۔ جاپانیوں نے اس حملے کا بھی مقابلہ پہلے کی طرح کیا اور اب دونوں طرف بے انداز جانی نقصان ہُوا۔ امریکی فوج کو ایسی مشکلات کا سامنا ہُوا جیسے وہ اس جزیرے سے جاپانیوں کو نکال نہیں سکے گی۔

اڑھائی تین مہینوں کی بڑی ہی خونریز لڑائی کے بعد جاپانی ہمت ہار بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا جانی نقصان بہت زیادہ ہو گیا تھا اور انہیں کہیں سے بھی کمک نہیں مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ اُن کے پاس راشن بھی نہیں رہا تھا لیکن جاپانیوں نے ہتھیار نہ ڈالے۔ اس کی بجائے انہوں نے خودکشی شروع کر دی۔

میں نے واپس آ کر ایک امریکی جنگی وقائع نگار کی کتاب پڑھی تھی جس میں اُس نے اس جزیرے کی لڑائی کا آنکھوں دیکھا حال پوری تفصیل سے لکھا تھا۔ یہ وقائع نگار امریکہ کی حملہ آور فوج کے ساتھ اس جزیرے میں گیا تھا۔ اُس نے لکھا کہ امریکہ کی فوج آگے بڑھتی گئی اور جاپانیوں کے دفاعی مورچوں سے فائر آتا رہا جو آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور کچھ دیر بعد فائر اتنا کم ہو گیا کہ اِکی دُکی گولی فائر ہوتی تھی۔ امریکی فوجی جن جاپانی مورچوں میں جاتے وہاں انہیں جاپانیوں کی لاشیں ہی ملتی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر تو گولیوں سے مرے تھے اور جنہیں گولی نہیں لگی تھی انہوں نے اپنی سنگینی رائفلوں سے اتار کر اپنے اپنے دل میں اتار لی تھیں۔ ہتھیار ڈالنے کی بجائے انہوں نے خودکشی کر لی تھی۔

صرف وہ چند ایک جاپانی جنگی قیدی بنائے گئے جو شدید زخمی حالت میں بے ہوش پڑے تھے۔ ان سے کچھ باتیں معلوم ہوئیں کہ ان کی فوج نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ شکست کی صورت میں زندہ رہنے والے خودکشی کر لیں گے۔

امریکی دستے آگے بڑھتے گئے۔ اب آگے سے ایک بھی گولی نہیں آ رہی تھی۔ ایک جاپانی سپاہی ایک مورچے سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل یا مشین گن نہیں تھی۔ مورچے کے آگے مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ یہ جاپانی اس ڈھیر کے اوپر چڑھ گیا۔ تب دیکھا کہ اُس کے ایک ہاتھ میں گرینیڈ تھا۔ اُس نے اپنی سٹیل ہیلمٹ اتاری اور گرینیڈ سے پن نکال کر گرینیڈ اپنے سر پر رکھا۔ پھر سٹیل ہیلمٹ سر پر رکھ لی۔ چار پانچ سیکنڈ بعد گرینیڈ

پھٹا اور یوں معلوم ہوا جیسے یہ جاپانی سپاہی ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اس کے جسم
ٹکڑے اوپر کو بھی گئے اور دائیں بائیں اور آگے پیچھے کو بھی۔

آگے ایک زمین دوز جگہ بنائی گئی تھی۔ یہ ایک کمرہ سا تھا جو اس ڈویژن کے جر
کا ہیڈ کوارٹر تھا جو جزیرے کے دفاع میں وہاں موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ جرنیل نے ج
دیکھا کہ اب حملہ آور کو روکا نہیں جا سکتا اور ہتھیار ڈالنے پڑیں گے تو اس نے اپنے سی
افسروں کو بلایا اور باقاعدہ تقریب منعقد کر کے ایک لمبا خنجر اپنے دل میں اتار لیا۔ اس
بعد تمام افسروں نے اپنے اپنے خنجر اپنے دلوں میں اتار لئے۔ یہ دراصل خنجر نہیں ب
چھوٹی سی تلوار ہوتی تھی جسے سیر کہتے ہیں۔

جب امریکی فوج جزیرے کے آگے والے ساحل تک پہنچے تو ایک عجیب منظر نظ
آیا۔ جاپانی فوجی جو زندہ رہ گئے تھے وہ سمندر میں اُتر گئے تھے لیکن ان میں سے ایک بھ
تیرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اس جنگی وقائع نگار نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ سینکڑو
جاپانی سپاہی چلتے چلتے سمندر میں داخل ہوئے اور چلتے گئے اور پانی اوپر ہی اوپر آتا گیا حت
کہ پانی ان کے منہ تک آ پہنچا اور پھر وہ سب سمندر میں غائب ہو گئے۔ یہ انہوں نے
احتجاجی خودکشی کی تھی۔

میں نے پچھلے کسی باب میں بتایا ہے کہ جاپان کے فوجی بڑے فخر سے خودکشی
کرتے تھے اور خودکشی کرتے وقت اپنے بادشاہ کا نام لیتے تھے یعنی یہ کہ میں شہنشاہ جاپا
کے نام پر اپنی جان دے رہا ہوں۔

○

اس طرح چار پانچ اور بڑے جزیروں میں جرنیلوں نے اور بریگیڈ کمانڈروں نے او
یونٹ کمانڈروں نے بھی خودکشی کی تھی۔ فوج نے بھی اجتماعی خودکشی کی۔ جو جوان
خودکشی کرتے تھے' ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی کیونکہ اتنی بے جگری سے لڑتے
تھے کہ لڑتے ہوئے ہی مارے جاتے تھے۔ یوں خودکشی کر لینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
ان لوگوں میں اپنے ملک کی بے پناہ محبت تھی اور وہ قومی خودداری اور قومی وقار پر اپنی
جانیں قربان کرنا معمولی سی بات سمجھتے تھے۔ جہاں تک اس جذبے کا تعلق ہے' وہ تو قابلِ
داد ہے لیکن یہ فوجی نکتہ نگاہ سے ایک احمقانہ فعل ہے۔ اس کا نتیجہ جاپانیوں نے جنگ
میں ہی دیکھ لیا۔ وہ اس طرح کہ ان کی فوج کی نفری بڑی تیزی سے کم ہوتی گئی اور نوبت

یہاں تک پہنچی کہ کمک کا سوال ہی ختم ہو گیا۔

اُس کی سب سے بڑی سزا ان جاپانی فوجیوں کو ملی جو ملایا' سماٹرا' جاوا وغیرہ کے علاقوں میں لڑ رہے تھے۔ وہ تو اب دفاعی جنگ لڑ رہے تھے اور ان کی شکست یقینی ہو گئی تھی کیونکہ انہیں کمک نہیں مل رہی تھی اور رسد تک سے محروم ہو گئے تھے۔ ایک طرف سے امریکہ کی نیوی دندناتی چلی آ رہی تھی اور دوسری طرف سے برطانیہ اور آسٹریلیا کی نیوی ساحلوں تک آ گئی تھیں اور ان کی توپوں کے گولے ملک کے اندر گر رہے تھے۔

اب میں اپنی بات سناتا ہوں۔ میں بتا رہا تھا کہ ہمیں جاپانیوں نے کمانڈو ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ یہ ٹریننگ بڑی ہی سخت تھی۔ راتوں کو سونے بھی نہیں دیتے تھے۔ راتوں کو جاگنا' بھوکا اور پیاسا رہنا بھی ہماری ٹریننگ میں شامل تھا۔ ہاتھوں میں رائفل یا کوئی گن پکڑ کے کہنیوں اور پیٹ کے بل ایک ایک میل روزانہ رینگنا ایک معمول بن گیا تھا۔ ہمیں پتھروں پر اور کانٹوں پر بھی رینگنے کی مشق کروائی جاتی تھی۔ درختوں پر بندروں کی طرح چڑھنے کی اور درختوں سے کودنے کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ سات آٹھ قدم لمبائی چوڑائی میں آگ جلا کر ہمیں کہا جاتا تھا کہ اس میں سے دوڑ کر گزرو۔ دلدل میں سے گزرنا بھی ہماری ٹریننگ میں شامل تھا۔

پندرہ بیس روز گزر گئے تو مجھے اپنے متعلق یہ شک ہونے لگا کہ میں انسان نہیں جنگل کا جانور بن گیا ہوں۔ اپنا جسم اپنا نہیں لگتا تھا۔ کبھی تو یوں محسوس ہوتا جیسے دماغ اور جسم کا رشتہ ٹوٹ گیا ہو۔ جسمانی طور پر میں نے اپنے آپ میں یہ تبدیلی دیکھی کہ جسم پھرتیلا ہو گیا تھا اور فارغ رہ رہ کر جسم پر جو چربی چڑھتی جا رہی تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔

یہ تو جسم کی بات تھی۔ کبھی اپنا جسم دیکھ کر تھوڑی سی خوشی ہوتی تھی کہ میں جسمانی طور پر سمارٹ ہو گیا ہوں لیکن ذہنی طور پر میں ٹھیک نہیں تھا اور میرا دوست فصیح احمد بھی ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اس پریشانی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے' اب یہ پریشانی اس لئے بڑھ گئی تھی کہ ہمیں اپنی ہی فوج کے خلاف جاپانیوں نے لڑانا تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ جاپانیوں کے مقدر میں شکست لکھ دی گئی تھی۔ میں اور فصیح کہیں فارغ بیٹھتے تو اکثر اس مسئلے پر باتیں کیا کرتے تھے۔ ہمیں نظر یہ آ رہا تھا کہ ہم انڈین آرمی کے خلاف لڑتے ہوئے پکڑے جائیں گے تو ہمیں سیدھی سزائے موت ملے گی.... ہمارے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا نہ ہم پیش گوئی کر سکتے تھے کہ کیا ہو گا۔ آخر ہم اپنے آپ

کو اور اپنی قسمت کو اللہ کے حوالے کر کے دل ہی دل میں دعا کیا کرتے تھے کہ جو ہو ہماری بہتری کے لئے ہو۔

ڈیڑھ پونے دو مہینوں بعد ہمیں ایک روز ٹرکوں میں بٹھایا گیا' ہمارے ساتھ مختصر سا سامان تھا' مثلاً" تین تین کمبل' ہتھیار اور ایمونیشن۔ ایمونیشن کا اچھا خاصا ذخیرہ دو ٹرکوں پر لادا گیا تھا۔ ہم جو ہندوستانی تھے' ہماری تعداد ایک سو تھی اور ہمارے ساتھ ایک سو جاپانی فوجی تھے۔ وہ بھی شاید کمانڈو تھے۔ ٹرک چل پڑے اور شہر سے نکل گئے۔ میں ان علاقوں سے تو واقف تھا ہی نہیں کہ آج بتا سکتا کہ ہمیں کہاں سے کہاں لے جایا گیا۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہم شمال مغرب کی طرف جا رہے تھے اور اُس طرف برما تھا اور راستے میں سیام آتا تھا جو آج کل تھائی لینڈ کہلاتا ہے۔

ڈیڑھ دو بجے کا وقت ہو گا۔ ہم گھنے جنگل میں جا رہے تھے۔ ایک جگہ یہ کانوائے رُک گیا اور ہمیں ڈبوں کا راشن کھانے کو دیا گیا۔ معلوم نہیں یہ کیا کیا تھا۔ بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے جو کچھ بھی تھا کھا لیا۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ جاپانی فوج راشن کی شدید قلت محسوس کرنے لگی تھی۔ سپاہیوں کے لنگر میں کبھی ایک وقت کے لئے کھانا بھی نہیں پکتا تھا اور اس صورت میں سپاہیوں کو امیر جنسی راشن دیا جاتا تھا۔

ہمیں بھی راستے میں یہی ایمرجنسی راشن دیا گیا۔ یہ جاپانی تو شاید شوق سے کھاتے ہوں گے' ہم ہندوستانیوں نے یہ اس لئے کھا لیا کہ بھوک لگی ہوئی تھی اور پیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالنا ہی تھا.... ہمارا کانوائے پھر چل پڑا اور شام گہری ہو گئی تو چھوٹی سی ایک چھاؤنی میں جا رُکا۔ ہمیں ٹرکوں سے اُتارا گیا اور رات اس چھاؤنی میں گزری۔ رات کو بھی ہمیں ایمرجنسی راشن دیا گیا۔

صبح جاگے ہی تھے کہ ہوائی جہازوں کی گونج سنائی دینے لگی جو آگے ہی آگے بڑھتی آئی اور گرج کی صورت اختیار کر گئی۔ فوراً" ہی بعد اس قدر زوردار دھماکے ہوئے کہ ہماری بارک ہل گئی اور زمین کانپ اٹھی۔ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہوائی جہاز بمباری کر رہے ہیں۔ زمین سے مشین گنیں ان پر آگ اگلنے لگیں۔ باہر اس قدر بھاگ دوڑ برپا ہو گئی جیسے قیامت آ گئی ہو۔ ہم سب بارک سے نکل کر باہر چلے گئے اور جہاں کہیں کھدی ہوئی خندق نظر آئی گھس گئے لیکن وہاں کوئی محفوظ پناہ نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ ہوائی جہاز اتحادیوں کے یعنی امریکیوں اور انگریزوں کے ہیں۔ خندق سے مجھے آسمان کا

منظر نظر آ رہا تھا۔ بمبار ہوائی جہاز گھوم گھوم کر آتے اور بم گراتے تھے۔ ان پر طیارہ شکن مشین گنیں اور توپیں فائر کر رہی تھیں۔ توپوں کے گولے اوپر جا کر پھٹتے تھے لیکن اس اتنے زیادہ فائر کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہوائی جہاز بم گرا رہے تھے۔

میرا خیال ہے کہ آدھا گھنٹہ بمباری ہوئی ہو گی اور پھر میں نے بمبار ہوائی جہازوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہاں ایک جگہ ایمونیشن سٹور کیا ہُوا تھا۔ اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ ایک بم عین اس کے اوپر گرا اور پھر جو دھماکہ ہُوا تو یوں لگا جیسے میں اس جہان سے اٹھ کر اگلے جہان میں پہنچ گیا ہوں۔ اس ذخیرے میں توپوں اور ٹینکوں کے گولے بھی تھے جو مسلسل پھٹ رہے تھے۔ یہ دھماکوں کا ایسا سلسلہ تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ گولے ذرا اُوپر جا کر پھٹتے اور ان کے ٹکڑے دُور دُور تک پھیلتے اور گرتے تھے۔

ہوائی حملہ ختم ہُوا تو ایک اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ بعض جگہوں پر آگ لگ گئی تھی۔ اس آگ پر قابو پانا تھا اور پھر زخمیوں کو اٹھانا تھا۔ ہم سب جو اس حملے میں ٹھیک ٹھاک رہے تھے' اُٹھ کر جاپانیوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ میں پہلی بار جنگ کی یہ قیامت دیکھ رہا تھا۔ برما فرنٹ پر ایک جھلک دیکھی تھی لیکن ایسی نہیں۔ وہاں سے تو میں بھگوڑا ہو آیا تھا لیکن یہاں سے بھگوڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اگر ہو بھی جاتا تو کہاں جاتا؟

اس بمباری میں جاپانیوں کا بے تحاشا نقصان ہُوا تھا۔ اتحادی ہوا بازوں نے بالکل ٹھکانے پر بمباری کی تھی۔ میں نے بعض جاپانی دیکھے جن کے جسم آدھے آدھے رہ گئے تھے۔ کسی کی ٹانگ نہیں تھی اور کسی کا بازو نہیں۔ میں نے ایسی لاشیں بھی دیکھیں جن کے سر غائب ہو گئے تھے یا گردنیں ذرا ذرا سی جسموں کے ساتھ جڑی رہ گئی تھیں۔ پیٹ چاک بھی دیکھے جن سے انتڑیاں باہر نکل کر بکھر گئی تھیں۔ بے شمار زخمی بے ہوشی کی حالت میں تھے۔ جنہیں ذرا کم زخم آئے تھے اور وہ ہوش میں تھے' وہ اپنے آپ کو دہشت زدگی کے عالم میں گھسیٹ رہے تھے۔ ہم جو زندہ اور ٹھیک ٹھاک تھے' ان کٹی پھٹی لاشوں کو اور بے ہوش زخمیوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک جگہ اکٹھا کرنے لگے۔ میری وردی خون سے لال ہو گئی۔ ذہن اور دل پر جو اثر ہوا وہ الگ تھا۔ کبھی تصوّر میں بھی نہیں آتا تھا کہ میں یہ کام بھی کروں گا۔ یہ مجبوراً" اور حکماً" کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی آتا تھا کہ ایک روز میرا جسم بھی اس پردیسی زمین پر پڑا ہو گا اور نہ جانے یہ کتنے ٹکڑوں میں

کٹ چکا ہو گا۔

دل پر ایسی گرفت آئی کہ مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ میں فصیح احمد کو ڈھونڈنے لگا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ اور سلامت ہے لیکن معلوم نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ مجھے نظر آیا اور میں دوڑ کر اُس تک پہنچا۔ میں جو اتنا دلیر جوان تھا' دہشت سے بزدل بن گیا تھا۔ میری اُس وقت یہ ضرورت تھی کہ فصیح احمد میری دلجوئی کرے لیکن وہ خود میری طرح دہشت زدہ اور جذباتی ہو گیا تھا۔

جہاں چھوٹی سی یہ چھاؤنی تھی اور جاپانی فوجیوں کی گہما گہمی تھی اور یہاں ہر طرف زندگی رواں دواں تھی' سپاہی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہے تھے اور ہم جو تھوڑی دیر پہلے جاگے تھے اور سوچ رہے تھے کہ آج کا دن نہ جانے کیسا ہو اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اچانک موت یوں ہم پر جھپٹ پڑے گی۔ جہاں کچھ دیر پہلے زندگی سرگرم عمل تھی وہاں اب خون ہی خون تھا اور کچی زمین اس خون کو خشک کر رہی تھی۔ وہ زمین تو یوں لگتا تھا جیسے انسانوں کے خون کی پیاسی ہو۔

یہ دراصل جاپانیوں کے پچھلے مورچے تھے۔ یہاں سے اگلے مورچوں کو کمک بھیجی جاتی تھی لیکن جاپانیوں کے دشمن نے اس کمک کو اور پچھلے مورچوں کو تباہ و برباد کر دیا جس سے اگلے مورچوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ یہ اس محاذ کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ دفاعی محاذ یا یہ دفاعی مورچے دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر اتحادی بمباروں نے اس حصے کو تباہی تک پہنچا دیا تھا تو انہوں نے تمام تر مورچوں کا یہی حشر کیا ہو گا۔

ہم اگلے مورچوں سے زیادہ دُور نہیں تھے۔ رات کو ہمیں توپوں کی دُور کی دھم دھم سنائی دیتی رہی تھی۔ یہ دھماکے جاپانی توپوں کے بھی تھے اور اتحادی توپوں کے بھی۔

○

غالباً" تین بج رہے تھے جب ہمارے جاپانی افسر دوڑے آئے اور انہوں نے ہمارے حوالداروں کو جاپانی زبان میں کہا کہ تمام کمانڈو اور جوانوں کو گاڑیوں میں بٹھاؤ اور اس سے پہلے یہ اپنی وردیاں اتار کر دوسری پہن لیں۔ ہمارے یہ دونوں حوالدار کچھ زیادہ عرصے سے جاپانیوں کے ساتھ تھے' وہ ان کی زبان سمجھ لیتے تھے۔ ہمیں حکم ملا تو ہم نے بڑی تیزی سے خون آلود وردیاں اتاریں اور ایک جوڑا وردی کا جو ہمارے ساتھ تھا' وہ پہن لیا۔ ہمیں نہ کھانے کو کچھ دیا گیا نہ ہمیں ہاتھ منہ دھونے دیا گیا' سامان لپیٹا' ہتھیار

اٹھائے اور دوڑ کر ٹرکوں میں بیٹھ گئے۔ اب ہمیں ٹرکوں میں اس طرح نہ بٹھایا گیا جس طرح یہاں تک پہنچے تھے۔ ایک ایک ٹرک میں پندرہ سے بیس تک جوانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ بڑی کھلی جگہ تھی لیکن اب ایک ایک ٹرک میں تیس سے چالیس تک جوان بھر دیئے گئے کیونکہ ہمارے کانوائے کے کچھ ٹرک بمباری سے تباہ ہو گئے تھے اور یہی تین چار ٹرک باقی رہ گئے تھے۔ پتہ چلا کہ چار پانچ کمانڈو بھی بمباری میں مارے گئے ہیں۔ ہمارا یہ چھوٹا سا کانوائے چل پڑا۔

○

اب ہمارے ٹرکوں کے نیچے کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ کچی سی ایک پگڈنڈی تھی جو چند میل آگے جا کر کسی اور طرف مُڑ گئی اور ہمارے ٹرک دوسری طرف مڑے۔ ہمارے نیچے پتھر تھے اور گھنا جنگل تھا جو ہمیں گھیرے ہوئے تھا۔ ٹرک آہستہ آہستہ چلتے اس جنگل میں راستہ بنا رہے تھے۔ کچھ حصہ ایسا آیا جہاں درخت بہت کم تھے اور زمین بھی کچھ ہموار تھی۔

وہاں پہنچے اور ٹرک ذرا تیز ہوئے تو ہوائی جہاز آ گئے۔ ہم نے اوپر دیکھا۔ یہ لڑاکا طیارے تھے۔ ہمارے ڈرائیوروں نے بڑی تیزی سے ٹرک درختوں کے نیچے لے جا کر روک لئے اور ہم سب کود کر اِدھر اُدھر جا پناہ گزین ہوئے۔

ہوائی جہازوں نے ہمارے اوپر خاصی نیچے پرواز کرتے ہوئے ایک دو چکر کاٹے اور چلے گئے۔ وہ جاپانیوں کے پچھلے مورچوں کی طرف گئے تھے۔ ذرا ہی دیر گزری تھی کہ ہمیں فضا میں مشین گنیں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم نے اُس طرف اوپر دیکھا تو ہوائی جہاز آپس میں لڑ رہے تھے۔ اِدھر سے جاپانی ہوائی جہاز آ گئے تھے اور فضائی معرکہ لڑا جا رہا تھا۔

میں نے تین ہوائی جہاز فضا میں پھٹتے اور شعلے بنتے دیکھے۔ پھر ایک ہوائی جہاز میں سے دھواں نکلنے لگا اور اس کا ہوا باز پیراشوٹ کے ذریعے جہاز سے نکل گیا۔ یہ معرکہ ہم سے کچھ دُور پیچھے لڑا جا رہا تھا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ کس کے ہوائی جہاز زیادہ گرے۔ اس کے بعد یہ معرکہ اس طرح ختم ہُوا کہ جاپانی ہوائی جہاز جو بچ گئے تھے' واپس چلے گئے اور اتحادیوں کے ہوائی جہاز ایک بار پھر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ ہمیں ٹرکوں میں بیٹھنے کا حکم ملا۔ ہم دوڑ کر سوار ہوئے اور ٹرک پھر چل پڑے۔

سورج غروب ہونے کے ایک یا ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ایک جگہ جا رُکے۔ یہ جاپانیوں کی کوئی بڑی پوسٹ تھی۔ ہمیں حکم اپنے دونوں ہندوستانی حوالداروں سے ملتے تھے۔ وہاں ہمیں وہی ایمرجنسی راشن دیا گیا جو ہم نے زہر مار کیا اور پھر یہ بتایا کہ ہم آج رات آرام کریں گے۔ ذرا اس آرام پر غور کریں۔ ہمیں کہا گیا کہ کہیں بھی زمین پر کمبل بچھاؤ اور سو جاؤ۔ میں نے فصیح کو ساتھ لیا اور ایک درخت کے نیچے جا کر کمبل بچھائے اور لیٹ گئے۔ ہمارے جسموں کا حال یہ تھا جیسے ہم اتنا لمبا سفر پیدل چل کر آئے ہوں۔ جسم ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جسم کا یہ حال ٹرک نے پتھروں اور ناہموار زمین پر اُچھل اُچھل کر کیا تھا۔

میرے ذہن پر عجیب سا بوجھ تھا۔ اگر میں آج کی عام زبان میں بات کروں تو کہوں گا کہ مجھے ڈیپریشن محسوس ہو رہی تھی۔ اس میں کچھ خوف تھا اور یہ تاثر بھی کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے۔ وہاں ہم کوئی خوشگوار توقع یا امید اپنے دل میں پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ وہاں تو موت ہی موت تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ موت سے کیسے بچا جائے۔ فصیح نے جب باتیں شروع کیں تو معلوم ہُوا کہ اُس کا بھی یہی حال ہے۔ ہمارے ساتھ دوسرے ساتھی بھی تھے جن میں چار سکھ تھے اور چند ایک ہندو تھے اور اکثریت سلمانوں کی تھی۔ سکھ اچھے تھے جو ایک دوسرے کو ننگی گالیاں دے کر دل خوش کر رہے تھے۔

وہ رات کچھ تڑپتے اور کچھ سوچتے اور کچھ سوتے گزر گئی اور جب صبح طلوع ہوئی تو ہم اٹھے اور دیکھا کہ ہم کہاں ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کہیں بھی نہیں۔ کوئی آبادی نہیں تھی۔ ہر طرف جنگل تھا اور کہیں چٹانیں اور کہیں ہری بھری ٹیکریاں تھیں اور کچھ دور اونچے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ یہ اگلے مورچے تھے۔

درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کے نیچے ایک جاپانی افسر نے جو شاید بریگیڈ کا کمانڈر تھا' اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا ہُوا تھا' باقی جو کچھ بھی تھا وہ زمین کے نیچے تھا۔ مورچے کھُدے ہوئے تھے اور افسروں نے گڑھے کھود کر ان کے اندر اپنے دفتر بنائے ہوئے تھے۔ ان گڑھوں کے اوپر درختوں کے ٹہن کاٹ کر رکھے گئے تھے۔ مطلب یہ کہ یہ سارے کا سارا ماحول کیموفلاج کیا ہُوا تھا.... ہمیں چائے دی گئی۔ اس کے ساتھ ڈبل روٹی کے چار چار پیس تھے اور ان پر ذرا سا جام لگا ہُوا تھا۔

ہم چائے پی چکے تو سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا اور ہمارے دونوں حوالدار سامنے

کھڑے ہو گئے۔ جاپان کے تین چار افسر آئے اور انہوں نے ہمارے حوالداروں کے ساتھ کچھ باتیں کیں۔ حوالداروں نے ہماری طرف منہ کر لیا اور انہوں نے آپس میں کوئی بات چیت کی۔ پھر ایک حوالدار ہم سے مخاطب ہُوا۔

"آزاد ہند کے جوانو!" ـــــ حوالدار نے کہا ـــــ "اب اپنے دیش کی آزادی کے لئے قربانیاں دینے کا وقت آ گیا ہے۔ تم جانتے ہو یہاں کیوں آئے تھے۔ ہندوستان کی فوج جو دراصل انگریزوں کی غلام فوج ہے' ہمارے مقابلے کے لئے آ گئی ہے۔ تمہیں اس لئے کمانڈو ٹریننگ دی گئی ہے کہ ہمارے پاس اتنی نفری نہیں کہ بٹالین کا مقابلہ بٹالین کر سکے۔ تم میں سے ایک ایک جوان پوری ایک کمپنی کو ختم کر سکتا ہے بشرطیکہ تم دل میں وہ جذبہ زندہ رکھو جو تمہیں یہاں لایا تھا۔ تم جانتے ہو فوج میں لیکچر نہیں دیئے جاتے بلکہ حکم دیئے جاتے ہیں اور یہ بتایا جاتا ہے کہ کیا کارروائی کرنی ہے۔ یہ میں تمہیں ابھی بتاؤں گا۔ تمہیں اپنے آپ میں یہ جذبہ پیدا کرنا ہے کہ جو حکم تمہیں دیا جائے گا اس پر اپنی جان قربان کرنی پڑے تو کر دو گے"۔

حوالدار نے ہمیں فوجی زبان میں جو کمانڈو مشن بتایا' وہ یہ تھا کہ ہمارے سامنے انڈین آرمی کی ایک بٹالین کے مورچے تھے۔ ان مورچوں کے پیچھے ایک گڑھا تھا جسے آپ ایک خاصا کشادہ کھڈ کہہ لیں' اس میں ہر طرح کا ایمونیشن رکھا ہُوا تھا اور اس پر درختوں کے ٹہن وغیرہ ڈال کر کیموفلاج کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ذخیرہ اس بٹالین کے لئے تھا۔ کام یہ تھا کہ ہم نے دُور کا چکر کاٹ کر اس بٹالین کے مورچوں کے پیچھے جانا تھا اور اس ایمونیشن کے ذخیرے کو دو تین گرینیڈ پھینک کر تباہ کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہمارے مشن میں شامل تھا کہ جب دھماکہ ہو گا تو بٹالین کے جوان اس طرف کو دوڑے آئیں گے یا کوئی بھی وہ حرکت کریں' ہم نے ان پر فائر کرنا تھا تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچایا جا سکے۔

یہ ایک طرح کا شب خون تھا جو ہم نے انڈین آرمی کی اس بٹالین کے مورچوں پر مارنا تھا اور اس سے پیشتر اس کا ایمونیشن تباہ کرنا تھا.... یہ سوچ کر مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ اگر مجھے اس کمانڈو پارٹی میں بھیجا گیا تو میں اپنے ہی بھائیوں پر شب خون ماروں گا اور کیا میرا یہ فعل جائز ہو گا یا نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ہمارے سامنے میری ہی بٹالین ہو جس سے میں بچھوڑا ہُوا تھا۔ میری بٹالین بھی تو آخر برما فرنٹ پر آئی تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس صورت میں اس بٹالین کے جوانوں پر فائر کرنا چاہئے یا نہیں۔

میں اس مسئلے پر فصیح احمد کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی حوالدار ہمیں مشن کی بریفنگ دے رہا تھا۔ جب وہ بریفنگ دے چکا تو اس نے آٹھ آدمیوں کی ایک پارٹی الگ کر لی اور ان آٹھ جوانوں میں مجھے بھی شامل کر لیا گیا۔ پہلے ہی کمانڈو آپریشن میں میرا نام آ گیا اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں کتنا دلیر ہوا کرتا تھا مگر میرا دل کانپنے لگا اور میں نے دل میں یہ دعا بھی کی کہ کوئی ایسی آفت آ پڑے یا کوئی ایسی وجہ پیدا ہو جائے کہ میں اس مشن سے نکل جاؤں لیکن حکم بڑا ہی اٹل تھا اور حوالدار نے ہم آٹھوں جوانوں کو الگ کر کے تفصیل سے بتانا شروع کر دیا کہ ہمارا راستہ کون سا ہو گا اور ہمارا عمل کیا ہو گا اور اگر فلاں صورتِ حال پیدا ہو جائے تو یوں کرنا اور اگر یوں ہو جائے تو پھر اس طرح کرنا وغیرہ وغیرہ۔

آخر احکام اور ہدایات کا سلسلہ ختم ہوا اور ہمیں یہ حکم ملا کہ دن کو آرام کر لو شام کے بعد جب اندھیرا ذرا گہرا ہو گا تو ہماری روانگی ہو گی۔ وہاں سے ہٹے تو میں فصیح کے قریب چلا گیا اور اُس کے ساتھ بات کی کہ میں اپنے ہی فوجیوں پر کس طرح فائر کھولوں گا اور اگر وہ جوان مسلمان ہوئے تو مشکل پیدا ہو جائے گی کیونکہ میں ان پر فائر نہیں کر سکوں گا۔ فصیح نے کچھ سوچ کر اور کچھ سمجھ کر مجھے بتایا کہ تمہاری جان خطرے میں آ جائے تو پھر کسی کی پرواہ نہ کرنا۔ اس کے علاوہ اُس نے مجھے کام کی باتیں بتائیں۔

○

سورج غروب ہونے کے بعد ہمیں کھانا دیا گیا۔ یہ بھی ایمرجنسی راشن تھا لیکن پہلے سے یہ بہتر تھا۔ پتہ چلا کہ یہ افسروں کو دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری خاطر تواضع کی جا رہی تھی۔ ہمیں ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔ ہم آٹھ جوان تھے۔ ان میں ایک نائیک تھا اور اس پارٹی کا کمانڈر ایک جاپانی سارجنٹ تھا۔ وہ ہماری زبان نہیں سمجھتا تھا۔ ہم اُس کی نہیں سمجھتے تھے لیکن مشن میں کوئی بات نہیں کی جاتی' اشاروں سے باتیں ہوتی ہیں اور اشارے سمجھ لئے جاتے ہیں۔ ہمارے حوالدار نے ہمیں آخری ہدایات دیں اور ہم چل پڑے۔

میں قدم قدم کی تفصیل نہیں سناؤں گا' اتنی سی بات سمجھ لیں کہ ہمیں سامنے والی انڈین بٹالین کے مورچوں کے بائیں طرف سے گزر کر پیچھے جانا تھا۔ ہماری طرف سے

بائیں سائیڈ تھی اور اس بٹالین کی طرف سے دائیں سائیڈ تھی۔ ہم جاپانی سارجنٹ کے پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ اُسے پوری طرح معلوم تھا کہاں جا کر مُڑنا ہے اور کس طرح اور کس راستے سے اس بٹالین کے ایمونیشن ڈمپ پر پہنچنا ہے۔ ہمیں مکمل خاموشی اختیار کرنی تھی۔ کوئی راستہ نہیں تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ درخت کہیں بہت ہی زیادہ تھے اور کہیں بہت ہی کم۔ ہم اندھیرے میں چلے جا رہے تھے۔ میں نے اتنا محسوس کیا کہ زمین نیچے کو جا رہی ہے۔ آگے کھڈ آ گئے جس میں ہم سب باری باری گرے اور اٹھ کر چل پڑے۔ کوئی کسی کے ساتھ بات نہیں کر رہا تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے' میرے دل و دماغ پر ہیجانی کیفیت بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم کم و بیش دو گھنٹے چلتے رہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ہم بہت نیچے چلے گئے تھے اور وہاں سے جب ہم ذرا دائیں کو مُڑے تو زمین اوپر کو جا رہی تھی۔ اُسے آپ پہاڑی کہہ لیں یا زمین کی بلندی کہہ لیں۔ یہ پہاڑ جیسی ڈھلان نہیں تھی بلکہ زمین تھوڑی تھوڑی اوپر کو اُٹھ رہی تھی۔ ہم ذرا بائیں کو مُڑے اور ایک ٹیکری کے پیچھے چلے گئے۔ ہمارے سروں کے اوپر سے توپوں کے گولے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف کے توپ خانے ایک دوسرے پر آگ برسا رہے تھے۔ کبھی تو یوں لگتا جیسے یہ گولوں کی چیخیں نہیں بلکہ ایک ویرانے میں چڑیلیں اور بدروحیں چیختی چلاتی ایک دوسری پر جھپٹ رہی ہوں۔ توپ کا فائر کیا ہوا گولہ جب سر کے اوپر سے گزرتا ہے تو اس کی آواز چیخوں جیسی ہوتی ہے۔ کچھ اور آگے جا کر جاپانی سارجنٹ نے ہمیں روک لیا۔ وہ صرف یہ اشارہ کر رہا تھا کہ ہم بیٹھ جائیں۔ وہ شاید ہمیں کچھ دیر کے لئے آرام دینا چاہتا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد اُس نے ہمیں اٹھایا اور ہمارے آگے آگے چل پڑا۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی ہو گی کہ ایمونیشن ڈمپ کہاں ہے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور ہم آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ چونکہ زمین اوپر کو اُٹھ رہی تھی اس لئے ہماری رفتار کم ہو گئی تھی۔ چلتے ہوئے آگے کو جھکنا پڑتا تھا۔ رفتار کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زمین کھڈوں والی تھی۔

اس پارٹی کا ہر جوان کئی کئی بار گرا تھا اور میں تین بار گرا تھا اور ایک بار دائیں گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ میں ذرا لنگڑا کر چلنے لگا۔ ہم جب ٹارگٹ پر پہنچے تو میرا خیال ہے رات آدھی گزر گئی تھی۔ دو ٹیکریاں تھیں جن میں سے ایک تو ذرا اونچی تھی اور دوسری

ذرا نیچے یعنی اس کی بلندی کوئی خاص نہیں تھی۔ جاپانی سارجنٹ نے ہمیں وہاں روک لیا اور اشاروں میں بتانے لگا کہ ٹارگٹ کہاں ہے اور پھر اس نے اشاروں میں ہمیں یہ بھی سمجھا دیا کہ جب اس بٹالین کے جوان مورچوں سے باہر آئیں تو اُن پر فائر کھول دینا۔ اس نے ہم سب کو بکھیر دیا۔ ہم نے یہ کارروائی اکٹھے رہ کر نہیں کرنی تھی۔

یہ تو ہمیں حوالدار نے بریفنگ میں بتایا تھا کہ ہم جائیں گے اکٹھے لیکن ہماری واپسی اکیلے اکیلے ہو گی۔ اُس نے کہا تھا کہ ہر جوان اپنی جان کا خود ذمہ دار ہو گا۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہارا کوئی ساتھی زخمی ہو جائے تو اُسے اٹھانے کی اور ساتھ لانے کی کوشش نہیں کرنی ورنہ اُس کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ جہاں کہیں چھپنے کی جگہ مل جائے چھپ جانا اور اگر سات آٹھ دن گزر جائیں تو پرواہ نہیں' اپنے آپ کو بچا کر واپس لانا ہے۔

جاپانی نے ہمیں بکھیر دیا۔ ایمونیشن والے کھڈ میں گرینیڈ اس جاپانی نے ہی پھینکنے تھے۔ میں اس ٹارگٹ سے کچھ دُور چلا گیا۔ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ انڈین آرمی کے مورچے کہاں ہیں اور ان کے جوان کدھر سے آئیں گے۔ میرے ہاتھ میں جاپان کی بنی ہوئی سٹین گن تھی جو انڈین آرمی سٹین گن سے خاصی مختلف تھی۔

○

ایک گھنٹہ گزرا ہو گا کہ مجھ سے تقریباً" پچاس گز دُور بڑا ہی خوفناک دھماکہ ہُوا اور یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے جو گرینیڈوں کے تھے اور خوفناک دھماکہ ایمونیشن ڈمپ کا تھا جو یکبارگی پھٹ گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہاں مارٹر گنوں کے گولے بھی تھے۔ بٹالین میں عام طور پر رائفلوں اور مشین گنوں کا ایمونیشن ہوتا ہے۔ ایک شعلہ کچھ دُور اوپر گیا اور اس کے بعد پھٹتے ایمونیشن کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ مورچوں میں سے ہندوستانی جوان نکلیں گے۔

اچانک آسمان روشن ہو گیا۔ ایک روشنی تو اس دھماکے کی تھی اور پھر ایمونیشن کے بکس جل اٹھے تھے' اس آگ کی روشنی بھی تھی اور وہاں جو بٹالین مورچوں میں تھی اُس نے روشنی راؤنڈ فائر کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک ہی بار چھ چھ سات سات اور آٹھ آٹھ روشنی راؤنڈ فائر ہوتے تھے۔ وہ بجھتے تو اور فائر کئے جاتے تھے۔ ان کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ درختوں کے پتے بھی نظر آ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے

مشین گنیں اور رائفلیں فائر ہونے لگیں۔ گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے نیچے تقریباً" پچاس گز دور اپنی انڈین آرمی کے جوان نظر آئے اور وہ پھیل گئے۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی کہ ان پر فائر کروں لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ میں نے ایک بھی گولی فائر نہ کی۔ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جو اُس وقت مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ میں نے اتنا بھی نہ سوچا کہ یہ فوجی اب اس سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیں گے اور ہم لوگ پکڑے جائیں گے۔ میں تو جیسے سُن ہو کے رہ گیا تھا۔

آسمان پر روشنی راؤنڈ روشن ہو رہے تھے اور زمین پر اتنا زیادہ فائر کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور سر کے اوپر سے گولیاں سیٹیاں بجاتی گزر رہی تھیں۔ میں ذرا بلندی پر تھا۔ میں نے پیچھے کو سرکنا شروع کر دیا۔ مجھے اب یہ سوچنا تھا کہ کس طرف سے نکلوں اور [illegible] کا رستہ اختیار کروں۔ ایک خیال آ گیا۔ وہ یہ تھا کہ میں نے ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں کیا تھا۔ میں نے واپس جا کر بتانا تھا کہ میں اپنا تمام ایمونیشن فائر کر آیا ہوں اور جھوٹ بولنا تھا کہ میرے سامنے میرے فائر سے اتنے جوان مرے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سٹین گن ہوا میں فائر کرنی شروع کر دی اور وہاں سے پیچھے ہی پیچھے ہٹتا رہا۔

پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ میں ایک طرف کو سرکتا گیا تاکہ اس قیامت سے نکل جاؤں۔ مجھے امید تو تھی کہ میں نکل جاؤں گا لیکن کچھ دُور جا کر میری اُمید خاک میں مل گئی کیونکہ اس طرف بھی روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے اور اُدھر سے مشین گنوں کا فائر بھی آنے لگا۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ رات کے وقت جب کوئی نظر نہیں آتا تو مشین گن دائیں بائیں گھما کر فائرنگ کی جاتی ہے جیسے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ اندھیرے میں بھاگنے والے اس فائر کی زد میں آ ہی جاتے ہیں۔ میں اب جنگل کا کیڑا مکوڑا بن گیا تھا۔ آڑ دیکھ دیکھ کر میں رینگتا تھا اور اس فائر سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں ذرا اونچی ٹیکری آ جاتی تو میں اٹھ کر جھکا جھکا دوڑ پڑتا مگر مجھے یہ احساس رہا ہی نہیں کہ میں کس سمت کو جا رہا ہوں۔ کہیں اونچی ٹیکری آ جاتی اور کہیں بالکل ہی ہموار زمین آ جاتی اور کہیں کھڈ آ جاتا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ میں کدھر سے آیا تھا اور کدھر جا رہا ہوں۔

تھکن کا یہ عالم کہ اب ٹانگیں گھسیٹنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اگر مجھ میں لڑنے کا اور

مرنے مارنے کا جذبہ ہوتا تو میں جوش و خروش میں ہوتا اور تھکا ہوا جسم بھی تر و تازہ رہتا۔ وہاں تو میری اندرونی کیفیت ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ میرے تو اعصاب جواب دے گئے اور میں ایک ایسی جگہ جا کر رک گیا جہاں ذرا بلندی تھی اور جھاڑیاں بڑی گھنی تھیں اور گھاس بھی تھی۔ یقین کریں کہ میں نے وہاں یہ دعا بھی کی کہ ایک گولی آئے اور میرے سینے سے پار ہو جائے اور یہی میری نجات کا ذریعہ ہے۔

جسم سے جان نکل گئی اور میں وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ سامنے جو کوئی بھی آئے فائر کر دوں لیکن میرے اندر سے آواز آتی تھی کہ چپ کر کے بیٹھے رہو۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا بیٹھے رہنا بھی کوئی ارادی فعل نہیں تھا۔ مجھ میں ذرا سی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔ ایک خیال ذہن پر غالب تھا کہ ہو سکتا ہے اس بٹالین میں میرے علاقے کے نوجوان ہوں اور وہ مارے جائیں اور ایسا بھی ہو گا کہ میرے ہاتھوں میرے مسلمان بھائی مارے جائیں گے۔ بہرحال میں بیٹھا رہا اور شاید مجھے اونگھ بھی آئی تھی اور پھر میں سر جھٹک کر بیدار بھی ہوا تھا اور اس طرح وقت گزرتا گیا' گزرتا گیا اور پو پھٹنے لگی۔ اب یہ فکر لگ گیا کہ اب کہاں چھپوں گا۔ اب تو پکڑے جانا لازمی اور یقینی ہو گیا تھا۔

مجھے اپنے قریب ہی کسی کی باتوں کی آواز آئی اور قدموں کی آہٹ بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے جھاڑی کے پتے ایک طرف کر کے دیکھا تو مجھے ایک حوالدار نظر آیا جو مجھ سے بمشکل دس قدم دُور سے گزر رہا تھا اور وہ میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ اُس کی چال اور اس کا دائیں بائیں دیکھنا صاف بتا رہا تھا کہ وہ کچھ تلاش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ ہمیں ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش نہ کی۔

میں نے جھاڑی کے پتے چھوڑ دیئے تاکہ پوری طرح چھپا رہوں لیکن جھاڑی سے سرسراہٹ سی اٹھی۔ وہ حوالدار چونک کر رک گیا اور اُس نے میری طرف دیکھا۔ تب مجھے شک ہُوا کہ یہ چہرہ جانا پہچانا ہے۔ اس کے سر پر سٹیل ہیلمٹ تھی میں پیچھے ہٹنے لگا' جھاڑی میں اور حرکت ہوئی۔ حوالدار نے ایک دو قدم میری طرف اٹھائے اور سٹین گن ہپ کے ساتھ لگا کر بلند آواز سے کہا کہ جو کوئی بھی ہو باہر آجاؤ ورنہ گولی چلا دوں گا۔ تب میں نے اُسے پہچان لیا۔

وہ حوالدار میری ہی بٹالین کا تھا اور میں جب بھگوڑا ہُوا تھا' اس وقت وہ نائیک تھا۔ وہ اتنا دلیر تھا کہ اُسے یہ بھی ڈر نہ تھا کہ جھاڑی میں جو کوئی بھی چھپا ہُوا ہے وہ اُس پر فائر کرے گا۔ میں نے اسے قریب آنے دیا۔ وہ مجھ سے چار پانچ قدم دور رہ گیا۔ میں ذرا بلندی پر تھا جسے آپ چھوٹی سی ٹیکری کہہ سکتے ہیں۔

"حوالدار امیر خان!" — میں نے کہا — "بے خوف ہو کر آگے آجاؤ اور مجھے دیکھ لو"۔

"ہو کون تم؟" — امیر خان نے پوچھا اور آگے بڑھتا آیا۔

جب وہ میرے سر پر آگیا تو میں جھاڑیوں سے اٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے چونک کر حیرت زدگی کے عالم میں مجھے دیکھا اور بولا — "خانی؟.... تم؟"

میں نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچ کر اُسے جھاڑی کی اوٹ میں بٹھا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے انتہائی مختصر الفاظ میں بتایا کہ میں جاپانیوں کی ایک پٹرول پارٹی کے ہاتھ چڑھ گیا تھا اور انہوں نے مجھے جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ پھر میں نے اُسے بتایا کہ جنگی قید میں میں تو مشقت اور بھوک سے مرنے والا ہو گیا تھا۔ جاپانیوں نے مجھے کہا کہ میں انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو جاؤں تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے گولی مار دیں گے۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے رضامندی ظاہر کر دی اور اس طرح زندہ رہا۔ اب یہاں چھپا بیٹھا ہوں اور بیٹھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اپنا آدمی آئے اور مجھے اپنی یونٹ میں لے جائے۔

"فکر نہ کر گرائیں!" — حوالدار امیر خان نے کہا — "اپنا یہی بیان رکھنا۔ میں تمہیں اپنے کمپنی صوبیدار اشرف صاحب تک لے چلوں گا.... تم انہیں جانتے ہو.... اپنے ہی گرائیں ہیں۔ وہ تمہیں بچا لیں گے"۔

یہ حوالدار میری تحصیل کا رہنے والا تھا اور جس صوبیدار کا اُس نے نام لیا تھا وہ بھی ہماری تحصیل کا تھا۔ میں جس وقت بھگوڑا ہُوا تھا اس وقت وہ جمعدار (نائب صوبیدار) ہُوا کرتا تھا۔ حوالدار امیر خان نے میرے جسم میں روح پھونک دی اور میں اٹھ کھڑا ہُوا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔

وہ چھاؤنی نہیں تھی، نہ بارکیں تھیں وہ جنگ کا محاذ تھا۔ مورچوں کا وسیع علاقہ تھا جہاں خیمہ کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں پوری بٹالین مورچوں میں تھی اور دُور دُور تک بکھری ہوئی تھی۔ یہ بڑا ہی گرم محاذ تھا اور یہاں خونریز لڑائیاں لڑی گئی تھیں۔ گذشتہ رات اس بٹالین پر کمانڈو ریڈ ہُوا تھا جسے شب خون کہہ لیں۔

حوالدار امیر خان مجھے صوبیدار اشرف کے پاس لے جا رہا تھا۔ یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ صوبیدار اشرف کہاں ہے۔ وہاں تو کھلبلی مچی ہوئی تھی اور ہر کوئی بھاگ دوڑ رہا تھا۔ ہماری کمانڈو پارٹی کا یہ شب خون کامیاب رہا تھا۔ حوالدار امیر خان مجھے ساتھ لئے چلا جا رہا تھا اور یہ بھی بتا رہا تھا کہ رات کو بٹالین کا کتنا نقصان ہُوا ہے۔ ایک تو اس بٹالین کا جو دراصل میری بٹالین تھی، پورے کا پورا ایمونیشن ڈمپ اُڑ گیا تھا۔ اس میں گرینیڈوں کے بکس بھی تھے اور مارٹر گنوں کے گولے بھی۔ چھوٹے ایمونیشن کا کوئی حساب کتاب ہی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ہماری پارٹی نے جس کا انچارج ایک جاپانی افسر تھا، اس بٹالین کو جانی نقصان بہت پہنچایا تھا۔ ایمونیشن کے دھماکے کے ساتھ ہی بٹالین جب مورچوں سے نکلی تو میری پارٹی نے سٹین گنوں اور سب مشین گنوں سے ایسا ظالمانہ فائر کیا تھا کہ بہت سے جوان مارے گئے اور زخمی بھی بہت ہوئے تھے۔

حوالدار امیر خان نے مجھے بتایا کہ انہیں رات کو ہی پتہ چل گیا تھا کہ یہ کسی جاپانی بٹالین یا بریگیڈ کا حملہ نہیں بلکہ یہ اُن کا کمانڈو آپریشن ہے۔ اسی لئے بٹالین کے مورچوں سے بے طرح روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے تھے۔ بٹالین نے ہماری کمانڈو پارٹی کو گھیرے میں لینے کی بہت کوشش کی تھی لیکن کسی کو زندہ نہ پکڑ سکے۔ بٹالین کی طرف سے بھی

لیوں کا جو چھڑکاؤ ہُوا تھا، اس سے میری پارٹی کے کئی جوان مارے گئے تھے۔ اب بٹالین تمام نفری سارے علاقے کی تلاشی لے رہی تھی کہ کمانڈو پارٹی کا کوئی زخمی مل جائے۔ نہیں ابھی تک کوئی زخمی زندہ نہیں ملا تھا۔ جو کمانڈو بھی ملا وہ مرا ہوا تھا۔ تلاش ابھی ک جاری تھی۔ تقریباً ساری بٹالین اس تلاشی میں سارے علاقے میں بکھر گئی تھی۔ ہری طرف کوئی دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ ہر کوئی بھاگ دوڑ رہا تھا۔ یہ تو کسی کو توقع ہی نہیں تھی کہ میں دو سال لمبی غیر حاضری کے بعد واپس آ جاؤں گا۔ حوالدار امیر خان نے مجھے بتایا تھا کہ سرکاری طور پر تو مجھے لاپتہ قرار دیا گیا تھا لیکن سب کہتے تھے کہ میں مارا جا چکا ہوں۔

اس علاقے کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں، گھنے جنگل کا علاقہ تھا جس میں ٹیکریاں بھی تھیں اور ذرا ہٹ کر پہاڑیاں بھی تھیں اور یہ ٹیکریاں بھی اور پہاڑیاں بھی درختوں سے، جھاڑیوں اور اونچی گھاس سے لدی ہوئی تھی۔ وہاں سے کسی آدمی کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ حوالدار امیر خان مجھے ساتھ لئے بڑا ہی تیز تیز اِدھر اُدھر گھوم پھر رہا تھا۔ صوبیدار اشرف کمپنی صوبیدار تھا اس لئے میں سمجھتا تھا کہ اس کمانڈو شب خون کے بعد کتنا مصروف اور کتنا فکر مند ہو گا۔ آخر صوبیدار اشرف ایک نشیب میں اترتا نظر آ گیا۔ وہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے صوبیدار اشرف کے پاس لے جانا فوجی قاعدے قانون کے مطابق نہیں تھا۔ مجھے سب سے پہلے صوبیدار میجر کے پاس لے جانا چاہئے تھا اور صوبیدار میجر نے مجھے ایجوٹنٹ کے پاس اور ایجوٹنٹ نے مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پاس لے جانا تھا۔ اُس وقت میری حیثیت ایک بھگوڑے کی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں انگریزوں کے ساتھ مل جانے کا اور شب خون مارنے کا مجرم بھی تھا لیکن حوالدار امیر خان مجھے صوبیدار اشرف کے پاس اس لئے لے جا رہا تھا کہ وہ میری بات سن کر مجھے بچانے کا کوئی طریقہ یا ذریعہ سوچ لے گا۔

اگر میری داڑھی اسی طرح لمبی ہوتی جس طرح برما کے جنگلوں میں تھی تو مجھے اپنی پلٹن کا کوئی بھی فرد پہچان نہ سکتا لیکن جاپانیوں کے پاس آ کر میں نے داڑھی بہت چھوٹی کروا لی تھی جس سے میرا چہرہ قابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ حوالدار امیر خان نے مجھے صوبیدار اشرف کے سامنے جا کھڑا کیا تو صوبیدار اشرف نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں اُس وقت جاپانی فوج کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ غصے سے صوبیدار اشرف کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ

مجھے آئی این اے کا کوئی ہندوستانی فوجی سمجھا اور یہ تو اسے سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہ لگی کہ گذشتہ رات کی کمانڈو پارٹی میں ایک جوان میں بھی تھا لیکن حوالدار امیر خان ہنس پڑا۔

"ہنستے کیوں ہو!" — صوبیدار اشرف نے امیر خان سے کہا اور مجھے گالی دے کر بولا — "مارو گولی اسے اور یہیں ختم کر دو۔ دیکھو انہوں نے کتنا نقصان کیا ہے۔ ہندوستانی ہو کر ہندوستانیوں کا نقصان کیا ہے"۔

صوبیدار اشرف بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اس کی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ میرے ہونٹوں پر شاید مسکراہٹ آ گئی تھی۔ صوبیدار اشرف نے آگے ہو کر مجھے اور غور سے دیکھا۔

"اپنا گرائیں ہے صوبیدار صاحب!" — حوالدار امیر خان نے کہا اور میرا نام لیا پھر بولا — "یہ رات دشمن کی پارٹی کے ساتھ آ تو گیا تھا لیکن ایک جگہ چھپ گیا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی اور صبح اس نے خود مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ وہ اپنی بٹالین میں واپس آنا چاہتا ہے"۔

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ صوبیدار اشرف میرے ساتھ فوراً" بغل گیر ہو جاتا اور پیار و محبت کی باتیں شروع کر دیتا۔ وہ انڈین آرمی کا صوبیدار تھا اور اپنی ذمہ داریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اُس کی کمپنی کا باقی بٹالین کی نسبت زیادہ نقصان ہُوا تھا کیونکہ جس طرف میری پارٹی نے شب خون مارا تھا اس طرف اسی کمپنی کے مورچے تھے۔

"اب تو اُس نے یہی بیان دینا ہے" — صوبیدار اشرف نے کہا — "پکڑا جو گیا ہے۔ نیشنل آرمی میں تمہیں کیا ملتا ہے جو اپنی آرمی میں نہیں ملتا تھا" — اُس نے حوالدار امیر خان سے پوچھا — "اسے میرے پاس کیوں لے آئے ہو؟ لے جاؤ اسے صوبیدار میجر کے پاس۔ میں یہ بتا دیتا ہوں کہ اسے کسی نے جنگی قیدی نہیں بنانا۔ سی او صاحب کہیں گے کہ اسے گولی مار دو"۔

"پہلے تو آپ اس کی بات سن لیں صوبیدار صاحب!" — حوالدار امیر خان نے کہا — "اپنا گرائیں ہے اور اس پر جاپانیوں نے پہلے ہی بہت ظلم کیا ہے۔ یہ تو جنگی قیدی تھا لیکن انہوں نے اسے اتنا زیادہ مارا پیٹا کہ یہ مجبوراً" آئی این اے میں شامل ہو گیا"۔

میں نے جو جھوٹ بولا تھا' وہ بولا۔ میں نے جھوٹ جوڑ جوڑ کر ذرا لمبا بیان دیا جس کا

مطلب یہ تھا کہ مجھے جاپانیوں کی ایک پٹرول پارٹی نے پکڑ لیا اور یہاں لے آئے تھے۔ پھر میں نے کہا کہ قیدی کیمپ میں ہم سے اتنی مشقت کرائی جاتی تھی جو گدھا بھی مشکل سے کر سکے لیکن کھانے کو بہت ہی تھوڑا دیا جاتا تھا جس سے آپ یہ سمجھ لیں کہ فاقے کرنے پڑتے تھے۔ میں تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا اور میں نے تین چار دنوں بعد مر جانا تھا۔ میرے دوسرے ساتھیوں کا بھی یہی حال کر دیا گیا تھا۔ میں نے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہوئے کہا کہ ہم جب پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے اور موت صاف نظر آنے لگی تو جاپانیوں نے کہا کہ نیشنل آرمی میں شامل ہو جاؤ ورنہ آج سے تمہارا پانی بھی بند کر دیا جائے گا۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ ہم نیم غشی کی حالت میں نیشنل آرمی میں شامل ہوئے تھے۔

صوبیدار اشرف نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے جاپانیوں نے کس مقام سے پکڑا تھا۔ میں نے ایک اور جھوٹ بولا اور اُسے ایک جگہ بتا دی۔

"کس کے ساتھ بات کر رہے ہو؟" — صوبیدار اشرف نے کہا — "میں صوبیدار ہوں کمپنی کا لانگری نہیں ہوں۔ وہاں تک جاپانیوں کی ہوا بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں بھی اُسی پوزیشن میں تھا.... دیکھ بھائی میاں! سچی بات بتا دو اور میں پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کروں گا"۔

"اسی لئے تو اسے آپ کے پاس لایا ہوں صوبیدار صاحب!" — حوالدار امیر خان نے کہا — "اس کی بات پر میں نے بھی یقین نہیں کیا تھا۔ آخر اپنا گرائیں ہے' اگر ہم نے اسے آگے کر دیا تو اس کا کورٹ مارشل ہو جائے گا اور اس کو سزائے موت ملے گی۔ اس کے ماں باپ پر رحم کریں صوبیدار صاحب اور اسے بچانے کا کوئی ذریعہ سوچیں"۔

صوبیدار اشرف نے میرے ہاتھ سے سٹین گن چھین لی اور اس کی نالی دیکھی۔

"دیکھو اس کی گن!" — اس نے حوالدار امیر خان سے کہا — "معلوم نہیں اس نے اس سٹین گن سے کتنی میگزینیں خالی کر دی ہوں گی"۔

"مجھ سے کوئی قسم لے لیں صوبیدار صاحب!" — میں نے کہا — "میں نے تھوڑے سے راؤنڈ ہوائی فائر کئے تھے کہ میرا پارٹی کمانڈر یہ نہ کہے کہ میں نے ایک بھی گولی فائر نہیں کی۔ یہ تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ میں جس پلٹن پر ریڈ کرنے آیا ہوں یہ میری اپنی پلٹن ہے۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ میرے ہاتھوں کوئی میرا ہندوستانی بھائی نہ

مرے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ یہیں چھپا رہوں گا اور صبح اپنا یہ ہتھیار پلٹن کے حوالے کر دوں گا پھر میرے ساتھ جو بھی سلوک کرتے ہیں کرتے رہیں"۔

"میں یہ مان لیتا ہوں" — صوبیدار اشرف نے کہا — "تم دس جماعتیں پڑھے ہوئے ہو اور میں نے صرف چار جماعتیں پڑھی تھیں لیکن میری عقل کا مقابلہ تمہاری عقل نہیں کر سکتی.... تم صاف کہہ دو کہ بھگوڑے ہوئے تھے۔ تم جنگی قیدی نہیں ہوئے تھے"۔

حوالدار امیر خان نے بھی مجھے یہی بات کہی اور میں نے سچ بول دیا۔

"یہ تمہارا قصور نہیں" — صوبیدار اشرف نے کہا — "یہ تعلیم کا قصور ہے۔ اگر تم مجھ سے کسی ان پڑھ آدمی سے مشورہ لے لیتے تو وہ تمہیں یہی مشورہ دیتا کہ انگریزوں کے پاس بہت بڑی طاقت ہے اور تم ان سے آزاد نہیں ہو سکتے"۔

حوالدار امیر خان نے اور میں نے مل کر اس کی منت سماجت کی تو اس نے کہا کہ چونکہ تم نے اب سچ بول دیا ہے اور میں اپنا یہ وعدہ پورا کروں گا کہ تمہیں بچالوں گا لیکن تم وہی جھوٹ بولنا جو میرے آگے بولا تھا.... اس نے مجھے ایک بیان زبانی یاد کرا دیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک اور طرف چلا گیا۔ وہ مجھے صوبیدار میجر کے پاس لے جا رہا تھا۔ پہلا صوبیدار میجر مسلمان تھا۔ پتہ چلا کہ وہ برما میں مارا گیا ہے۔ اب ایک سکھ صوبیدار میجر تھا۔

صوبیدار اشرف اور حوالدار امیر خان نے اس سکھ صوبیدار میجر سے کہا کہ میں رات کو ہی خود ہی پہنچ گیا تھا اور میں نے اپنی سٹین گن سے ایک راؤنڈ بھی فائر نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ہی میری جگہ بیان دیا کہ میں جنگی قیدی تھا اور بھوکا پیاسا رکھ کر زبردستی آئی این اے میں شامل کر لیا گیا اور اب مجھے موقع ملا اور میں واپس آ گیا ہوں۔

صوبیدار میجر نے مجھے ایجوٹنٹ کے پیش کیا وہاں میں نے وہی بیان دیا جو صوبیدار اشرف نے بتایا تھا۔ پھر مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پیش کیا گیا۔ اس کے آگے بھی میں نے یہی بیان دیا۔ صوبیدار اشرف نے اور صوبیدار میجر نے بھی میری سفارش کی اور مجھے بے گناہ سمجھ کر بری کر دیا گیا۔

اگر یہ کوئی چھاؤنی ہوتی اور جنگ نہ ہوتی اور میں اس طرح بھگوڑا ہو کر واپس آتا تو کسی نے میرے جھوٹ پر اعتبار نہیں کرنا تھا۔ میرا کورٹ مارشل ہوتا اور اس کی مجھے

انتہائی سزا ملتی لیکن وہ میدانِ جنگ تھا اور وہ گرم میدان جنگ تھا جہاں ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی اور حالات بالکل ہی نارمل نہیں تھے۔ اس لئے مجھے چھوڑ دیا گیا اور کمانڈنگ آفیسر نے فیصلہ دیا کہ میں اپنی کمپنی میں چلا جاؤں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس روز بٹالین بہت ہی مصروف تھی اس لئے انگریز افسروں نے میرے جھوٹے بیان پر اعتبار کر لیا اور مجھ پر کوئی جرح نہ کی۔ دو روز بعد مجھے کمانڈنگ آفیسر نے بلایا۔ اس کے پاس ایک انگریز میجر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے انہوں نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ میجر انٹیلی جنس آفیسر ہے اور مجھ سے آئی این کے متعلق معلومات لینے آیا ہے۔ اس میجر کا تعلق ڈویژن یا بریگیڈ ہی سے ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے آئی این اے کے متعلق تمام باتیں بتائیں اور ان دونوں انگریز افسروں کو خوش کرنے کے لئے کچھ ایسے جھوٹ بھی بولے جو آئی این اے کے خلاف جاتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آئی این اے کی تنظیم، ڈسپلن اور مورال کیسا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آئی این اے میں زیادہ تر وہ جوان ہیں جو جنگی قیدی ہو گئے تھے اور ان میں لڑنے کا مورال خاصا کمزور ہے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ آئی این اے کے ہندوؤں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح وہ جو کچھ پوچھتے رہے میں بتاتا رہا اور یہ بھی بتایا کہ ہمیں کوالالمپور میں کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور وہی ان کا یعنی جاپانیوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دو" — میرے کمانڈنگ آفیسر نے پوچھا — "اگر ہم کوالالمپور میں ریڈ کرنے کے لئے کمانڈو پارٹی بھیجیں تو کیا تم اس پارٹی کو ٹھیک طرح گائیڈ کر سکو گے؟"

"ہاں صاحب!" — میں نے جواب دیا — "صرف گائیڈ ہی نہیں کر سکوں گا بلکہ اس جگہ خود ریڈ کروں گا جہاں بھرپور وار کرنے سے جاپانیوں کی کمر ٹوٹ جائے گی"۔

کچھ اور باتیں پوچھ کر مجھے فارغ کر دیا اور یہ بھی کہا کہ تیار رہنا۔

○

میری کمانڈو پارٹی کی تیرہ لاشیں ملی تھیں جو ایک جگہ اکٹھی کی گئی تھیں۔ میں نے یہ لاشیں خاص طور پر جا کر دیکھی تھیں۔ میں دراصل یہ دیکھ رہا تھا کہ فصیح احمد زندہ نکل گیا تھا یا مارا گیا ہے۔ وہ زندہ نکل گیا ہو گا، اُس کی لاش لاشوں میں نہیں تھی۔ پارٹی کمانڈر جو

جاپانی تھا وہ بھی مارا گیا تھا۔

برما فرنٹ سے لے کر ملایا کے ان مورچوں میں پہنچنے تک میری بٹالین کی آدھی نفری ماری جا چکی تھی۔ اس نفری میں تین انگریز افسر بھی تھے جنہیں میں جانتا تھا اور جن کے ساتھ میری سلام دعا تھی' وہ مارے گئے تھے۔ پرانے لوگ موجود تھے جنہوں نے مجھے دیکھا تو بہت ہی حیران ہوئے۔

مجھے ایک کمپنی میں شامل کر لیا گیا۔ صوبیدار اشرف اسی کمپنی کا صوبیدار تھا اور حوالدار امیر خان بھی اسی کمپنی کی ایک پلاٹون میں تھا۔ دو روز بعد بریگیڈ نے کوالالپور کی طرف ایڈوانس کیا.... اب میں اگر یہ سنانا شروع کر دوں کہ ہم نے ایڈوانس کیا تو راستے میں جاپانیوں نے مزاحمت کی یا نہ کی یا ہم کہاں جا پہنچے اور وہاں جو لڑائی ہوئی وہ کس طرح ہوئی اور پھر وہاں سے ہم کدھر گئے تو یہ بات بڑی ہی لمبی ہو جائے گی۔ یہ جنگ کی تفصیلات ہوں گی جن کے ساتھ آپ کو اتنی دلچسپی نہیں ہو گی اور ہونی بھی نہیں چاہئے۔ میں اتنا ہی بتانا کافی سمجھتا ہوں کہ جاپانیوں کے قدم اکھڑ چکے تھے اور اب یہ قدم جم نہیں رہے تھے۔ یہ میں پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ جاپانیوں کی سپلائی لائن اور کمک کٹ چکی تھی۔ انگریزوں کا اور امریکیوں کا حملہ بڑا ہی زوردار اور زبردست طاقت والا تھا۔ اب جاپانی کہیں گھات لگا کر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی فوج پر فائرنگ کر سکتے تھے لیکن کہیں جم کر لڑنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

میں اُس جنگ کی بات کروں گا جو میرے اندر شروع ہو گئی تھی۔ میں تو انگریزوں سے آزاد ہونے چلا تھا لیکن اللہ نے مجھے ایسے جنگلوں میں پھینک دیا جو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں نے بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ وہ جنگل اور وہاں کی زندگی خواب کی طرح یاد آنے لگی لیکن یہ سوچتے سوچتے کہ وہ زندگی بڑی ڈراؤنی تھی' یہ خیال بھی آ جاتا کہ وہ تو بڑی پیاری اور بے فکری کی زندگی تھی' اگر میں جنگ ختم ہونے تک وہیں رہتا یا وہیں کا ہو کے رہ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

دراصل میرے اندر ایک انقلاب آ گیا تھا۔ میں اسی بٹالین سے بھاگا تھا اور کئی بار خیال آیا تھا کہ پکڑا گیا تو میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے سزائے موت ہی مل جائے لیکن میں واپس بٹالین میں ہی آ گیا اور خیریت گزری۔ مجھے مطمئن ہو جانا چاہئے تھا لیکن میرے اندر تلخیاں سی پیدا ہونے لگیں۔ بار بار یہ خیال آتا کہ ایسا ہُوا کیوں؟ کیا

اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی گناہ کی سزا دی تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے جسمانی اور روحانی طور پر پختہ کرنے کا یہ سبب بنایا تھا کہ مجھے جنگلوں میں پھینک دیا؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر میں اللہ کے حضور سرخرُو تھا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں نے مجھے اپنے جسم پیش کئے تھے جو میں نے قبول نہ کئے بلکہ ان کی عزتیں بچائیں۔

پھر مجھے اس انقلاب سے یہ فائدہ ملا کہ ہندوؤں کو میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ کس ذہنیت کے لوگ ہیں۔ یہ ہندو انگریزوں کے بعد ہم مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔ آئی این اے میں جو ہندو تھے انہوں نے تو ہمیں اپنا غلام سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ میں پہلے سنا چکا ہوں۔

ایسا خیال فوج میں بھرتی ہونے تک مجھے کبھی نہیں آیا تھا — "کیا مسلمان ہمیشہ غلام رہیں گے؟" — مجھ میں آزادی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے تو میں کہا کرتا تھا کہ انگریزوں سے آزاد ہونا ہے لیکن ہندوؤں نے میرے اس جذبے کو اور مضبوط کر دیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزاد نہیں ہونا چاہئے ورنہ یہ بہت بڑا دھوکہ ہو گا۔ میں ان چند ایک سیدھے سادے بلکہ کم عقل مسلمانوں میں سے تھا جو "ہندو مسلم بھائی بھائی" میں یقین رکھتے تھے۔ میں ہندو مسلم اتحاد کا قائل تھا اور یہی سوچ کر میں آئی این اے میں شامل ہوا تھا۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ ہیں لیکن آئی این اے میں جا کر ہندوؤں نے میری آنکھیں کھول دیں اور اس کے بعد کچھ اور واقعات بھی ہوئے جن میں ہندوؤں نے اپنا آپ اور زیادہ واضح کر کے دکھا دیا' مثلاً" انڈونیشیا کی جنگ آزادی... آگے چل کر میں انڈونیشیا کی جنگ آزادی کی کچھ تفصیلات سناؤں گا۔

بریگیڈ جب ایڈوانس کر رہا تھا تو میں اپنے ان خیالوں میں کھویا ہُوا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ انٹیلی جنس کے انگریز میجر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کوالالپور پر یعنی جاپانیوں اور آئی این اے کے ہیڈ کوارٹر پر کمانڈو ریڈ کیا جائے تو کیا میں گائیڈ کروں گا۔ میں نے کہا تھا کہ ضرور گائیڈ کروں گا۔ اب مجھے خیال آنے لگا کہ اللہ کرے ان انگریزوں کو یہ ضرورت محسوس ہو کہ کوالالپور پر شب خون مارا جائے اور مجھے ساتھ لے جائیں' پھر میں آئی این اے کے کسی بھی ہندو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

میں دراصل بتانا یہ چاہتا ہوں کہ میرے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی تھی اور یہ

بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے خیالوں اور میری سوچوں میں کوئی اور ہی رنگ پیدا ہو رہا ہے اور میرا دماغ کچھ پختہ شروع ہونا ہو گیا ہے۔ فوج سے بھگوڑا ہو کر برما کے جنگلوں میں جانے تک میں اچھے کردار کا آدمی نہیں تھا۔ اگر آپ کو یاد ہے تو میں نے اپنی اس داستان کے آغاز میں بتایا ہے کہ میں فوج میں کیوں بھرتی ہُوا تھا۔ میں ذریعۂ معاش کے خیال سے فوج میں نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ اور ہی مجبوری تھی۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ میں نے اپنے دوست حمید کے ساتھ مل کر ایک پیر کو کس طرح پھینٹی لگائی تھی۔ یہ شریف لوگوں کا کام نہیں تھا جو میں نے حمید کے ساتھ مل کر کیا تھا۔ پھر جس طرح میں کوہاٹ چھاؤنی میں واجدہ سے ملتا رہا' وہ بھی کوئی شرافت نہیں تھی لیکن اب میرے خیالات کچھ اور ہو گئے تھے اور ان سوچوں میں گم ہو کر مجھے کوالالمپور والا فیض الحق یاد آنے لگا۔ اس کی شخصیت نے مجھے بہت ہی متاثر کیا تھا۔ میں تو علم و فضل کے حصول کی خاطر اس کی شاگردی میں بیٹھنا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اب میں دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگنے لگا کہ فیض الحق سے ملنے کا ایک اور موقع پیدا ہو جائے اور میں اس سے پوچھوں کہ میرے اندر یہ جو کشمکش پیدا ہو گئی ہے' یہ کیا ہے اور میں کس طرح اس پر قابو پا سکتا ہوں۔

فیض الحق کی یہ بات مجھے یاد آنے لگی کہ دنیا دیکھے گی کہ یہ سارا خطّہ یعنی ملایا وغیرہ ایک مسلمان ملک بن گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ دو مسلمان ملک بن جائیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں تو کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جاپانیوں کو اسی لئے بھیجا تھا کہ پرانے بادشاہوں کے تختے اُلٹ جائیں اور پھر یہاں اسلام کا جھنڈا بلند ہو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہندوستان میں بھی انگریزوں کا تختہ اُلٹ جائے گا اور ایک یا دو مسلمان ملک وجود میں آئیں گے.... میں اُس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ خطّہ اپنے آپ ہی مسلمان ملک بن جائے گا اور کیا ہندوستان میں بھی بغیر کسی کوشش کے ایک یا دو مسلمان ملک وجود میں آئیں گے؟ کوشش کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہُوا کرتا۔ اس کے لئے' خصوصاً" آزادی حاصل کرنے کے لئے' جان کے نذرانے دینے پڑتے ہیں۔ میں فیض الحق سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں کم عقل ہوں اور آپ دانشمند ہیں' مجھے بتائیں کہ یہ ملک کس طرح وجود میں آئیں گے اور اگر انہیں وجود میں لانا ہے تو میرا فرض کیا ہو گا۔

آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ میں اُس وقت کے جن خیالات کا اظہار کر رہا ہوں' وہ

ادھورے ادھورے اور کچّے کچّے سے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں کہ ان کا کوئی سر پیر نہیں۔ یہی تو میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اُس وقت میری عقل خام تھی لیکن میرے اندر ایک روشنی جل اٹھی تھی جو مجھے کوئی اور راستہ دکھا رہی تھی اور میں ابھی اس راستے کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنی بٹالین میں واپس آ کر غلطی کی ہے۔ مجھے وہ قبائلی پٹھان یاد آ گئے جن کا میں قیدی ہو گیا تھا۔ میری نظروں کے سامنے وہ بوڑھا پٹھان آ گیا جس نے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی تھی اور میں سمجھ گیا تھا۔ میرے اندر آزادی کی تڑپ اسی بوڑھے پٹھان نے اور اسی گھر کی عورتوں نے پیدا کی تھی۔ میں پھر انگریزوں کی آرمی میں آ گیا تو میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے میں نے اس حُرّیت پسند قبائلی پٹھان کے ساتھ وعدہ خلافی ہی نہیں غداری کی ہے۔

قبائلی پٹھان یاد آئے تو ان کی جنگ آزادی بھی یاد آ گئی۔ میں اپنے آپ میں ایسی شرمساری محسوس کرنے لگا جیسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی ہو۔ خیال آیا کہ میں انہی کے پاس رہ جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔ اب میں ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ سوچتے سوچتے دماغ میں یہ آئی کہ ایک بار پھر کوالالمپور جانے کا اتفاق ہُوا تو میں فیض الحق کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ باقی عمر اُس کے ساتھ گذاروں گا اور فوج میں واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے مجھے روحانی اطمینان فیض الحق کے ہاں ہی سے ملے گا۔

○

دن کا ایک بج رہا تھا جب بریگیڈ رک گیا اور حکم ملا کہ گاڑیوں سے اُتر آؤ اور کھانا کھا لو۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا اور میرے اندر کی کشمکش کچھ نرم پڑ گئی۔

کھانے کا نام سنا تو بھوک محسوس ہونے لگی۔ ہم گاڑیوں سے اتر ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارے درمیان اور پیچھے اور ہر طرف توپوں کے گولے پھٹنے لگے۔ جاپانیوں نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ ان کے توپ خانے بے پناہ گولہ باری کر رہے تھے۔ ہم سب بھاگم بھاگ جہاں آڑ ملی وہاں جا چھپے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے بریگیڈ کا توپ خانہ ایکشن میں آ گیا اور ادھر سے بھی گولہ باری شروع ہو گئی۔

مجھے بڑ کی قسم کا ایک درخت نظر آیا جس کا تنا بہت ہی پھیلا ہُوا تھا۔ میں دوڑ کر اُس

درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ توپ کے گولے کا دھماکہ کوئی غیر فوجی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس سے کانوں کے پردے تو سُن ہو ہی جاتے ہیں' مسلسل دھماکوں سے بعض فوجیوں کا دماغ جواب دے جاتا ہے اور وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہیں لیکن ہماری بٹالین میں کوئی ایسا کیس نہ ہوا کیونکہ یہ بٹالین دو سال سے یہ دھماکے برداشت کر رہی تھی اور اُس کے افسر اور جوان اتنے پختہ ہو گئے تھے کہ اب یہ دھماکے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

میں نے اس گولہ باری میں جو کچھ دیکھا وہ آج تک نہیں بھولا اور مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ ہماری بٹالین کی B کمپنی کا ایک سکھ حوالدار ایک آڑ سے اٹھ کر معلوم نہیں کیوں ایک طرف کو دوڑ پڑا شاید اسے کسی افسر نے بلایا ہو گا۔ وہ ابھی راستے میں ہی تھا کہ توپ کا ایک گولہ اس سے تین چار قدم آگے اور دوسرا گولہ اس کے بالکل قریب پیچھے پھٹا۔ ان دونوں گولوں کا اُڑایا ہُوا گرد و غبار صاف ہوا تو یوں پتہ لگتا تھا جیسے سکھ ہوا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اس کے جسم کے ٹکڑے دُور دُور تک جا گرے۔ میں فوجی تھا وہاں ایسے کئی منظر دیکھے تھے اس لئے اس سکھ حوالدار کے اُڑ جانے کا بلکہ اس دنیا سے غائب ہونے کا میرے دل پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دنیا' یہ زمین اور آسمان مسلسل ایک دھماکہ بن گئے ہوں۔ گرد و غبار اتنا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اپنے توپ خانے کے گولے سروں کے اوپر سے چیختے چلاّتے گزر کر جا رہے تھے۔ ہمارے علاقے میں پھٹتے گولوں کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ اس قدر بارود کی بدبُو پھیل گئی اور اس قدر گرد نتھنوں میں داخل ہونے لگی کہ دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کسی کے چیخنے چلاّنے اور دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گرد و غبار میں سے ایک ہندو سپاہی دوڑتا نکلا اور میرے سامنے آ کر گر پڑا۔ مجھے تو یہ توقع تھی کہ یہ زخمی ہو گا لیکن وہ زخمی نہیں تھا وہ کانوں پر ہاتھ رکھے چیخ چلا رہا تھا۔ کبھی وہ کھڑا ہو جاتا اور کھڑے کھڑے زور سے گرتا اور تڑپنے لگتا۔

اگر وہ ذرا سا بھی زخمی ہوتا تو اس کی وردی وہاں سے سُرخ ہوتی لیکن وہ ذرا سا بھی زخمی نہیں تھا۔ دھماکوں نے اس کے دماغ پر اثر کر دیا تھا۔ میں نے اُسے پکڑنے یا سنبھالنے کی یا اسے تسلّی دلاسہ دینے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ وہ بھی جیسے میری موجودگی سے ناواقف تھا۔ دو تین مرتبہ وہ میرے بالکل سامنے' قریب آ کر گرا تو بھی اس

نے میری طرف نہ دیکھا۔ آخر وہ اٹھا اور ایک طرف دوڑ پڑا۔

اسے Shell Shock کہتے ہیں۔ اگر یہ معمولی سا ہو تو متاثرہ شخص کچھ دیر بعد نارمل حالت میں آ جاتا ہے لیکن یہ شدید ہو تو پھر نوبت مینٹل وارڈ میں داخل کرنے تک پہنچ جاتی ہے اور اکثر شدید کیس ٹھیک بھی نہیں ہُوا کرتے.... میں اس ہندو جوان کو جانتا تھا۔ یہ میری بٹالین کا پرانا سپاہی تھا' بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ لاپتہ ہی ہو گیا تھا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ مارا گیا تھا یا اسے کیا ہُوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ پاگل پن میں دوڑتا گیا اور کہیں دور جنگل بیابان میں نکل گیا ہو گا اور اُدھر ہی مر گیا ہو گا یا درندوں کی خوراک بن گیا ہو گا۔

ہماری گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ دو گاڑیاں تو بالکل ہی اُڑ گئیں تھیں اور دو تین گاڑیوں کو آگ لگ گئی۔ ڈرائیوروں کو حکم ملا کہ گاڑیوں کو آگے لے جا کر بکھیر دیں۔ مطلب یہ تھا کہ گاڑیاں جاپانیوں کے گولوں کی زد سے آگے لے جائیں۔

جاپانیوں نے جس شدت سے گولہ بازی شروع کی تھی' اس کے فوراً بعد انفنٹری اور ٹینکوں سے حملہ کیا جاتا ہے۔ بریگیڈ کو آرڈر مل گیا تھا کہ سب اپنی اپنی پوزیشن لے لیں چونکہ حملہ آ رہا ہے۔ کچھ دیر تک حملہ نہ آیا تو بریگیڈ کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ گاڑیاں وہیں رہ گئیں اور بریگیڈ نے ایڈوانس شروع کر دیا۔

توقع تو یہ تھی کہ اُدھر سے جاپانی فوج آ رہی ہو گی' اِدھر سے ہمارا بریگیڈ ایڈوانس کر رہا تھا اور بڑی شدید اور خونریز لڑائی لڑائی جائے گی لیکن جاپانیوں کی طرف سے حملہ نہ آیا' اس کی بجائے ہمارا بریگیڈ جاپانیوں کے مورچوں تک جا پہنچا' تب جاپانیوں نے حملہ روکنے کی کوشش کی لیکن جاپانیوں کے پاس اب اتنی جنگی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ بریگیڈ کا حملہ روک سکتے۔

تھوڑی سی دیر بعد جاپانیوں کا توپ خانہ خاموش ہو گیا اور اُس کی فوج کچھ تو ماری گئی اور باقی پسپا ہو گئی۔ ہماری بٹالین کو پیچھے رکھا گیا تھا جسے ریزرگارد کہا جاتا ہے۔ آخر ہماری بٹالین کو بھی ایڈوانس کا حکم ملا۔

اب ہم پیدل جنگل میں جا رہے تھے۔ چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ ہم سے بہت آگے ہو رہی تھی۔ چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ہر طرف جاپانیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ میں نے اپنے بریگیڈ کی لاشیں نہیں دیکھی تھیں'

البتہ مجھے یقین تھا کہ ہمارا بریگیڈ بھی اسی طرح اپنی لاشیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ جاپانیوں کی گولہ باری تھی ہی قیامت خیز جس میں سینکڑوں اموات متوقع تھیں۔

ہمیں وہیں رکنے کا حکم ملا۔ شام کے غالباً" چار بج رہے تھے۔ جنگ کی بھیانک اور ہولناک آوازیں اور دھماکے خاموش ہو چکے تھے۔ موت نہ جانے کتنے سو جانیں لے کر چلی گئی تھی۔ وہ دن لڑائی کے بعد کی مختلف مصروفیات میں گزر گیا اور ہم نے رات آسمان تلے گذار دی۔

صبح ہوئی تو ہمیں ناشتہ دیا گیا۔ جب دن کی روشنی پھیلی تو ہم نے دیکھا کہ چند فرلانگ دُور چھوٹی سی ایک بستی تھی۔ ایسی ہی دو اور بستیاں کچھ دور نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ جاپان کے جن ٹروپس نے مزاحمت کی تھی' انہیں بالکل ختم کر دیا گیا ہے اور جو جاپانی بچ گئے تھے وہ بھاگ گئے ہیں۔ جاپانیوں کا توپ خانہ دور تھا اس لئے وہ اپنی توپیں لے گئے تھے۔ اُس روز ہمارے کرنے کا کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے اپنے ایک کلرک دوست کو ساتھ لیا اور اس بستی میں چلا گیا جو قریب ہی نظر آ رہی تھی۔

یہ بستی اس علاقے میں تھی جو ہماری بٹالین کی ذمہ داری میں تھا۔ میں نے اپنی بٹالین کے چند ایک جوان اس بستی میں جاتے اور کچھ جوان بستی میں سے نکلتے دیکھے۔ یہ سب لوٹ مار کے لئے وہاں گئے تھے لیکن پتہ چلا کہ بستی خالی ہے اور یہاں کے رہنے والے مدت ہوئی یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ میں اپنے ساتھی کے ساتھ ویسے ہی ٹہلتا ٹہلتا بستی کے اندر چلا گیا۔ میری نیّت لُوٹ مار کی نہیں تھی۔

اپنی بٹالین کا ایک مسلمان لانس نائیک ملا۔ اس نے بتایا کہ اس بستی میں جاپانی فوجیوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا جو وہ خالی کر کے بھاگ گئے تھے.... یہ پندرہ بیس گھروں کی بستی تھی۔ مکان چھوٹے چھوٹے تھے اور معمولی قسم کے تھے لیکن باہر سے صاف ستھرے لگتے تھے۔ بستی بالکل خاموش تھی۔

ہم دونوں دوست آہستہ آہستہ چلتے ایک گلی میں جا رہے تھے۔ جاپانیوں کا یہاں اگر بریگیڈ تھا یا جو ٹروپس تھے' ان کے ہیڈ کوارٹر کے لئے یہ بستی موزوں تھی۔ ہم دونوں ساتھیوں نے سوچا بھی نہیں کہ ان مکانوں کے اندر جا کر دیکھیں' شاید کوئی قیمتی یا کام کی چیز ہاتھ آ جائے۔

ہم ایک مکان کے سامنے سے گزرے۔ اُس کا باہر والا دروازہ کھلا تھا۔ ہم نے اندر

ایک لاش پڑی دیکھی جو کسی فوجی کی نہیں تھی۔ ہم رک گئے اور اس گھر کے دروازے میں جا کھڑے ہوئے۔ وہ ایک عورت کی لاش تھی جس کا خون فرش پر بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔ عورت کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ نقش و نگار سے وہ ملائی یا بری لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جوان لڑکی ہی تھی۔ خون اس کے سر سے بہتا رہا تھا۔ گولی کا سوراخ کنپٹی پر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ کس طرح مری تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جاپانیوں نے یہ ذلیل حرکت کی تھی کہ وہ جہاں بھی جاتے تھے وہاں کی نوجوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ رکھ لیتے تھے۔ یہ ان ہی لڑکیوں میں سے ایک ہو گی اور جب جاپانیوں کو یہاں سے بھاگنا پڑا تو اس کی کنپٹی پر ریوالور یا رائفل رکھ کر گولی مار گئے۔

ہم وہاں سے چل پڑے اور جاپانیوں کی اس حرکت کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ آگے جا کر ہم ایک اور گلی میں مُڑ گئے۔ ایک مکان کے اندر سے کرب ناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ ہم رک گئے۔ کبھی یہ چیخیں بلند ہو جاتیں اور پھر یہ ہائے ہائے جیسی آوازوں میں بدل جاتیں۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کچھ کہے سنے بغیر دونوں اندر چلے گئے۔ جس کمرے سے یہ کرب ناک آوازیں آ رہی تھیں اس کے دروازے میں جا رکے۔ ہمارے سامنے ایسا منظر تھا جو کبھی دیکھا تھا نہ کبھی دیکھوں گا۔ فرش پر کمبل بچھے ہوئے تھے اور ایک عورت بچے کو جنم دے رہی تھی۔ وہاں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ جنگ کی ڈسی ہوئی دنیا میں جہاں موت کی حکمرانی تھی' ایک انسان جنم لے رہا تھا۔

ہم اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے نہ ہمیں معلوم تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ یہ عورت جوان تھی اور ملایا کی ہی رہنے والی تھی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ جس بچے کو وہ جنم دے رہی ہے وہ اس کے خاوند کا نہیں۔ اس عورت کو بھی جاپانیوں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہو گا۔ خود تو بھاگ گئے اور اسے اس مصیبت میں چھوڑ گئے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اپنے میڈیکل آفیسر کو جا کر بتاتے ہیں۔

"وہ نہیں آئے گا" — میرے ساتھی نے کہا — "وہ آ بھی گیا تو کیا کر لے گا.... چلو چلیں"۔

میرے دل پر ایسا بوجھ آ پڑا کہ مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ میں اس عورت کی مدد کرنا

چاہتا تھا لیکن میں مجبور اور بے بس تھا۔ ہم وہاں سے چلنے لگے تو اس عورت نے ہاتھ جوڑے اور پھر دائیں ہاتھ کی انگلیاں اکٹھی کر کے منہ کے ساتھ لگائیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کچھ کھانے پینے کو مانگ رہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی کا بازو پکڑا اور بڑی تیزی سے باہر نکل آئے۔ اپنے ساتھی سے کہا اور کچھ نہیں تو اسے کھانے پینے کے لئے ہی کچھ لا دیتے ہیں۔ میں دوڑ پڑا اور میرا ساتھی بھی میرے ساتھ دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے اور میں نے جلدی جلدی سے کھانے کی کچھ چیزیں اکٹھی کر لیں۔

فیلڈ یعنی محاذ پر ہمیں نہایت اچھا راشن ملا کرتا تھا جسے اُس وقت کی فوجی زبان میں ڈبل راشن کہا کرتے تھے۔ میں نے پانی کی بوتل بھی اٹھالی۔ میرے ساتھی نے بھی میری طرح کچھ چیزیں کھانے کے لئے اکٹھی کر لی تھیں۔ ہم وہاں سے چلنے ہی لگے تھے کہ دور سے ہوائی جہازوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔

یہ گھن گرج فوراً" ہی ہمارے سروں پر پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی ہم پر مشین گنوں کی گولیوں کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ نیچے سے طیارہ شکن مشین گنیں ان پر فائر کرنے لگیں۔ یہ جاپانیوں کے لڑاکا بمبار طیارے تھے۔ انہوں نے دو تین جگہوں پر بم بھی گرائے جن کے دھماکے بڑے ہی زوردار تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

ہم اُس عورت اور نوزائیدہ بچے کو تو بھول ہی گئے اور اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

جاپانی ہوا باز بڑے ہی نڈر اور دلیر تھے۔ وہ اتنی کم بلندی پر آ کر مشین گن فائرنگ کرتے تھے کہ یوں لگتا تھا یہ ہوائی جہاز درختوں سے ٹکرا جائیں گے۔ میں نے چار ہوائی جہاز دھواں چھوڑتے ہوئے گرتے دیکھے۔ یہ ہوائی جہاز ہمارے بریگیڈ کا راستہ روکنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

میں گن نہیں سکا' یہ ہوائی جہاز کتنے تھے۔ اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ بے شمار تھے۔ دراصل جاپان کی ہائی کمانڈ آخری بازی لگا رہی تھی.... میں آپ کو جاپانیوں کی دلیری کی دلچسپ بات سناتا ہوں۔ ہر ملک کی ایئر فورس کے پائلٹ جب لڑاکا بمبار طیاروں کو اُڑاتے ہیں تو ان کے ساتھ پیراشوٹ لازماً" ہوتے ہیں۔ پائلٹ کے لئے یہ حکم ہوتا ہے کہ جہاز کے اندر فضا میں ذرا سی بھی خرابی پیدا ہو جائے یا انجن سے ہلکا ہلکا سا دھواں نکلنے لگے تو فوراً" جہاز سے نکل آئے اور پیراشوٹ کے ذریعے زمین پر اُتر آئے۔ میں نے جنگ کے بعد پڑھا تھا کہ جاپان واحد ملک ہے جس کے لڑاکا بمبار پائلٹ بغیر پیراشوٹ کے

اڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہارا ہوائی جہاز فضا میں بگڑ جائے یا اسے گولیاں لگ جائیں تو اس کے ساتھ ہی جاؤ اور مر جاؤ۔ یہ دلیری نہیں حماقت تھی۔ ہوائی جہاز کی نسبت پائلٹ کو زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہوائی جہاز کو پائلٹ نے اُڑانا ہوتا ہے اور اسی نے دشمن کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر اپنے بگڑے ہوئے اور مجروح ہوائی جہاز سے پائلٹ نکل آئے گا اور زمین پر خیریت سے پہنچ جائے گا تو وہ دوسرا ہوائی جہاز لے کر فضا میں چلا جائے گا۔ ذرا غور کریں' ہوائی اڈے پر ایک ہزار لڑاکا ہوائی جہاز تیار کھڑے ہوں اور پائلٹ ایک بھی نہ ہو تو یہ سارے ہوائی جہاز محض بے کار ہوں گے اور زمین پر کھڑے کھڑے دشمن کا بڑا ہی آسان نشانہ بنیں گے۔

یہ تو ہم نے دیکھا تھا کہ جاپانی پائلٹ جب حملہ کرنے آتے تھے تو بہت ہی نیچے آ جاتے جیسے انہیں اپنی جان کا ذرا سا بھی خیال نہ ہو۔ یہ بھی جاپان کی ایک کمزوری تھی کہ اس نے اپنے تجربہ کار پائلٹ ضائع کر دیئے تھے۔ میں نے جنگ کے کچھ عرصہ بعد امریکہ کے ایک جنگی وقائع نگار کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی جس میں اس نے لکھا تھا کہ جاپانی فائٹر بمبار پائلٹ بغیر پیراشوٹ کے اُڑا کرتے تھے۔ میں نے اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کیا تھا کیونکہ کوئی بھی ملک تجربہ کار ہوابازوں کو ایسے خطرے میں نہیں ڈال سکتا اور نہ ہی ڈالنا چاہتا ہے کہ اس کے ہواباز بغیر پیراشوٹ کے اُڑیں۔ آخر جاپانی ایئر فورس کے ایک سابق لڑاکا پائلٹ سبورو سکائی کی لکھی ہوئی ایک کتاب پڑھی جس میں اس نے اپنے ملک کے اس احمقانہ اور ظالمانہ حکم پر کڑی نکتہ چینی کی تھی کہ ہوابازوں کو بغیر پیراشوٹ کے جنگی مشن پر بھیجا جاتا تھا۔ پھر مجھے یقین آیا۔

میں اُس عورت کی بات کر رہا تھا جو جنگ کے محاذ پر بچے کو جنم دے رہی تھی۔ ہوائی حملہ ختم ہُوا تو مجھے اس عورت کا خیال ہی نہیں رہا کیونکہ ہر طرف چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ ان حالات میں میں اس بستی میں نہیں جا سکتا تھا۔ فوجی کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اِدھر اُدھر دیکھتا کہ اپنے ساتھی زخمی پڑے ہوں گے اور انہیں مدد کی ضرورت ہو گی اور انہیں اٹھا اٹھا کر ایک جگہ اکٹھا کرنا ہے۔ اس غرض کے علاوہ میرے اندر کچھ جذبات بھی تھے جن کے تحت میں اپنے قریبی اور عزیز دوستوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں بھی اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگا۔ وہاں تو ہر طرف خون ہی خون تھا۔ وہ جنگل تھا اور وہاں کوئی زمین دوز پناہ گاہ نہیں تھی۔ ہم نے درختوں کے نیچے پناہ لی تھی

مگر درختوں کی شاخیں ہوائی جہازوں کی فائر کی ہوئی گولیوں کو نہیں روک سکتی تھیں۔ مختصر یہ کہ ہماری بٹالین کو اچھا خاصا جانی نقصان پہنچا تھا۔

یہ تو جنگ کی قیامت خیزی تھی جس کی تفصیلات نہ ہی سناؤں تو اچھا ہے' میں آج اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو میرے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ مختصر بات یہ کہ ہم موت کے پروں کے نیچے زندگی گذار رہے تھے۔ انہی پروں کے نیچے ہمیں پناہ ملتی تھی اور اسی موت کے پنجے کسی بھی وقت جسے چاہتے دبوچ کر زندگی سے اٹھا کر اس جہان میں پھینک دیتے تھے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔

وہ رات آئی اور گزر گئی۔ اگلے روز دن کے پچھلے پہر ذرا مہلت ملی تو میں اسی ساتھی کو جو ایک روز پہلے میرے ساتھ بستی میں گیا تھا' ساتھ لے کر بستی کی طرف چل پڑا۔ وہ بستی تو ہمیں کیمپ سے ہی نظر آ جاتی تھی لیکن اس روز نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم اپنے اس عارضی کیمپ سے نکل گئے تو بھی ہمیں وہ بستی نظر نہ آئی۔ میں نے حیرت زدگی کے عالم میں اپنے ساتھی سے پوچھا کہ بستی کہاں گئی؟ میرا ساتھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا جدھر بستی تھی۔

کچھ اور آگے گئے تو بستی نظر آ گئی لیکن اب وہ مکان نہیں تھے بلکہ کھنڈر تھے۔ چند ایک دیواریں کھڑی نظر آتی تھیں باقی سب ملبے کے ڈھیر تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ جاپانی ہوائی جہازوں نے بستی پر بم گرائے ہیں۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ بستی میں اب کچھ نہیں رہا' ہم دونوں ساتھی کھانے کی چیزیں اور پانی کی دو بوتلیں اٹھائے بستی کی طرف چلتے ہی گئے اور اس طرف گئے جہاں اس عورت کا گھر تھا۔ اس طرف کوئی ایک دو مکان سلامت کھڑے تھے باقی گر پڑے تھے۔ اس مکان والی گلی میں ملبہ بکھرا ہوا تھا جس پر سنبھل سنبھل کر چلتے ہم اس عورت کے مکان تک پہنچ گئے لیکن اس مکان کا بھی کھنڈر رہ گیا تھا۔ گلی کی طرف والی دیوار کھڑی تھی اس میں دروازہ بھی محفوظ تھا اور کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے دیکھا مکان کا باقی حصہ تباہ ہو چکا تھا۔ ہم دونوں ملبے پر چڑھ گئے اور صحن دیکھا۔

ایک تو وہ منظر دیکھا تھا کہ تن تنہا عورت بچے کو جنم دے رہی تھی جسے دیکھ کر مجھ پر نیم غشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی لیکن اب صحن میں جو مجھے نظر آیا وہ معلوم نہیں میں نے کس طرح برداشت کیا۔ نوزائیدہ بچے کا ذرا جتنا ایک بازو کندھا اور سر صحن میں پڑے

ہوئے تھے۔ اس کے باقی جسم کا کچھ پتہ نہیں تھا کہاں غائب ہو گیا ہے۔ اس کے قریب اس بدقسمت بچے کی ماں کا جسم اس حالت میں پڑا ہوا تھا کہ اُس کا پیٹ اور سینہ بالکل ہی پھٹ گئے تھے اور ان کے اندر کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

"اچھا ہوا" — میں نے اس طرح کہا کہ جیسے اپنے آپ کے ساتھ بات کی ہو — "خدا کو ان پر رحم آ گیا اور انہیں دنیا سے اٹھا لیا ہے"۔

میرے ہاتھ میں کھانے کا جو سامان تھا وہ اسی صحن میں پھینک دیا اور پانی کی بوتل جو میں اس بچے کی ماں کے لئے لایا تھا وہ بھی پھینک دی۔ میرے دوست نے بھی ایسے ہی کیا اور ہم دونوں سر جھکائے ہوئے ملبے سے اترے اور پھر بستی میں سے نکل آئے۔ کچھ دور تک ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

"یہ ہے جنگ!" — میرے ساتھی نے کہا — "ہم تو فوجی ہیں' مرنے کے لئے ہی محاذ پر آئے ہیں لیکن سوچو یار! ان معصوموں کو کن گناہ کی سزا ملی ہے؟"

"میں کچھ اور سوچ رہا ہوں" — میں نے کہا — "یہ خطّہ نہ انگریزوں کا ہے نہ امریکوں کا اور نہ جاپانیوں کا لیکن وہ اس خطّے پر یہاں آ کر لڑ رہے ہیں اور معصوم جانیں تباہ ہو رہی ہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ کیوں لڑ رہے ہیں؟.... صرف اس لئے کہ کوئی ماں بچے کو جنم دے تو وہ ان کا غلام ہو جن کے پاس ایک دوسرے کو قتل کرنے کی طاقت ہے"۔

یہ جنگ کی ہولناکی کے دو تین بھیانک واقعات ہیں جو آپ کو سنائے ہیں۔ میں نے محاذ پر جو منظر دیکھے' اگر وہ سب سناؤں تو آپ کے اعصاب جواب دے جائیں۔ ذرا تصور میں لائیں کہ آپ کا ایک دوست تھا جو رات کو آپ کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا اور آپ سب جُوا کھیل رہے تھے۔ ہنستے کھیلتے آپ سو جاتے ہیں اور آپ کا دوست اگلے روز ایک ڈیوٹی پر بھیجا جاتا ہے۔ دن کے پچھلے پہر آپ دیکھتے ہیں کہ اس دوست کا ایک بازو ایک گیدڑ اٹھائے بھاگا جا رہا ہے اور آپ کے دوست کا باقی جسم گِدھ کھا رہے ہیں۔

اب میں آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہوں' صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ اُس روز اپنے جتنے ساتھی مارے گئے تھے ان کی لاشیں اکٹھی کی گئیں۔ ان میں جو مسلمان تھے ان کی لاشیں ایک جگہ رکھ کر ہم نے جنازہ پڑھا اور ایک ہی گڑھا کھود کر اُن سب کو اُس گڑھے میں رکھا اور مٹی ڈال دی۔ اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں

کی آخری رسوم ادا کیں اور انہیں جلا ڈالا۔

ان سب کی جانیں صرف اس لئے گئیں کہ ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے اور زیادہ مضبوط ہو جائیں اور ہم غلامی کی زنجیروں سے کبھی بھی نہ نکل سکیں۔

○

اُس روز بہت سے امریکہ اور برطانیہ کے بمبار ہوائی جہاز سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ وہ جاپانیوں پر جوابی ہوائی حملہ کرنے جا رہے تھے۔ ہمارا بریگیڈ وہاں سے ایڈوانس کر گیا۔ ہمیں بہت دُور کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ یہ بمبار طیارے بم گرا رہے تھے۔ کم و بیش دو گھنٹوں بعد بمبار طیارے واپس آئے اور ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔

ایک روز ہم کوالالپور میں داخل ہو گئے۔ میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ اتنا ہی بتانا کافی ہو گا کہ جاپانیوں نے کوالالپور کا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن دفاع اس قدر کمزور تھا کہ وہ دو دن بھی نہ ٹھہر سکے اور شہر خالی کر گئے۔

یہاں میں ایک واقعہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری بٹالین میں ایک لانس نائیک ہُوا کرتا تھا جو گجرات شہر کا یا اس شہر کے ساتھ والے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایک حوالدار بھی تھا جو اس کا رشتہ دار تھا۔ اس لانس نائیک کی شادی برما فرنٹ پر جانے سے سال یا ڈیڑھ سال پہلے ہوئی تھی۔ اس کا رشتہ دار حوالدار ہمیں سنایا کرتا تھا کہ یہ لانس نائیک ایسا زن مرید ہُوا کہ اس نے اپنے ماں باپ کے ساتھ بدتمیزی شروع کر دی۔ لڑکا بڑی ہی چالاک اور بدطینت تھی۔ اُس نے اس شخص پر ایسا قبضہ کیا کہ اسے مالِ غنیمت کے طور پر اپنے والدین کے حوالے کر دیا۔

لڑکی کے والدین نے لڑکے پر صرف قبضہ ہی نہ کیا بلکہ اس کے دماغ میں اس کے والدین کے خلاف باتیں ڈالتے رہتے اور وہ بغیر تحقیقات کے جا اپنے والدین کی بے عزتی کرتا۔ اس کی بیوی نے اس کے والدین کو اپنے نوکر سمجھ لیا۔ گھر میں اس لڑکی کی بادشاہی بن گئی۔ گھر میں وہی ہوتا تھا جو یہ لڑکی چاہتی تھی۔ یہ لانس نائیک جب چھٹی جاتا تو اس کی بیوی اُس کے پاس آتی تھی ورنہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر رہتی تھی۔ جب چاہتی سسرال میں آ جاتی اور وہاں اپنا حکم چلاتی اور ان بوڑھوں کی بے عزتی کرتی اور پھر جب چاہتی اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی تھی۔

حوالدار نے ہمیں بتایا کہ اس لانس نائیک کی ماں اور اس کا باپ بیچارے سوائے رونے دھونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے یا وہ پیروں فقیروں کے ہاں جا کر ان کے آگے اتے رگڑتے رہتے ہیں۔ یہ پیر فقیر انہیں بتاتے ہیں کہ تمہارے بیٹے پر اس کی بیوی اور بوی کی ماں نے جادو چلا رکھا ہے۔ اس طرح یہ ماں باپ بے چارے لُٹتے ہیں اور پھر ہاں کوئی انہیں بتاتا ہے کہ جائیں اور ان کی مراد پوری ہو گی تو وہ اُدھر کو اُٹھ دوڑتے ہیں ور نذرانے دے دے کر اور رو رو کر زندگی گذار رہے ہیں۔

مجھے زیادہ تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اپنے معاشرے میں س قسم کے بہت سے بیٹے دیکھے ہوں گے جو شادی ہوتے ہی ماں باپ اور بہن بھائیوں سے نظریں پھیر لیتے ہیں اور بیوی کو وہ آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق سمجھتے ہیں اور شاید یہ بھی ان کا عقیدہ بن جاتا ہے کہ بیوی ناراض ہو گئی تو قیامت آ جائے گی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایسے ناخلف اور نافرمان بیٹے دیکھے ہوں گے۔ یہ لانس نائیک ان ہی یٹوں میں سے تھا جس نے اپنی بیوی کو دیوی بنا لیا تھا اور خود اس کا پجاری بن گیا تھا۔ اس بیٹے نے اپنے ماں باپ' دو بہنوں اور دو بھائیوں کے لئے یہ مسئلہ بھی کھڑا کر دیا تھا کہ ائیداد میں سے اس کا حصہ دیا جائے۔ ان کی اراضی خاصی زیادہ تھی اور اس کے وسرے بھائی یہ جائیداد تقسیم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ حوالدار نے ہمیں بتایا کہ یہ پتہ چل گیا تھا کہ اُس کی بیوی اور بیوی کے والدین اسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنا حصہ الگ کر لے اور اس کے بعد یہ زمین اپنی بیوی کے نام رجسٹری کرا دے۔ اس مسئلے پر اس لانس ائیک نے اپنے باپ کی بہت بے عزتی کی تھی اور اپنی بہنوں کو بھی گالی گلوچ کی تھی اور کہا تھا کہ ان کا کوئی حصہ نہیں بنتا۔

برما فرنٹ پر آنے سے پہلے یہ لانس نائیک پانچ سات دنوں کی چھٹی پر گھر گیا تھا۔ چھٹی ختم کر کے جب رخصت ہُوا تو ماں باپ سے دعائیں لے کر رخصت ہونے کی بجائے انہیں الٹی میٹم دیا کہ وہ اب چھٹی آئے گا تو اپنا حصہ الگ کر لے گا۔ اگر اس کی بات نہ مانی گئی تو پھر وہ بتائے گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور گھر والے ساری عمر پچھتاتے رہیں گے۔ اس طرح یہ اپنے ماں باپ' بھائیوں اور بہنوں کو روتا چھوڑ کر بڑے فخر اور غرور سے آیا تھا۔

ماں باپ اپنی اولاد کو بددعا نہیں دیا کرتے' اولاد خواہ کتنی ہی ناخلف ہو اور ماں باپ کو خواہ سولی پر کھڑا کئے رکھے لیکن اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو خود ہی حرکت میں آتا ہے

اور مظلوم کو اس کا حق مل جاتا ہے.... میں نے جاپانی توپ خانے کی گولہ باری کا ذکر کیا ہے۔ اس نے ہمارے بریگیڈ کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ گولہ باری ختم ہونے کے بعد ہمیں زخمیوں اور لاشوں کو اُٹھانے کا حکم ملا۔ ہم سب جو صحیح اور سلامت تھے' اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگے اور جہاں کوئی زخمی نظر آیا اسے فوراً" اٹھایا اور وہاں تک لے گئے جہاں مرہم پٹی کا انتظام تھا۔ ہماری وردیاں خون سے لال ہو گئی تھیں۔ ہم نے خون میں نہائی ہوئی لاشیں بھی اٹھائی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دو ساتھی میرے ہاتھوں میں مر گئے تھے۔

میرے ساتھ میرا وہی ساتھی تھا جو بستی میں میرے ساتھ گیا تھا۔ ہم نے ایک زخمی کو دیکھا جو چیخ اور چلّا رہا تھا۔ ہم دونوں دوڑتے اس تک پہنچے۔ اُدھر سے دو اور جوان آ گئے۔ دیکھا تو یہ وہی لانس نائیک تھا جس نے اپنے ماں باپ کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کی ٹانگیں آگے کو تھیں۔ سامنے سے اس کی قمیض پھٹی ہوئی تھی اور اس کی انتڑیاں اور پیٹ باہر نکل آیا تھا اور یہ اندر کے اعضاء اس کی ٹانگوں پر بکھر گئے۔ وہ ابھی زندہ ہی نہیں بلکہ ہوش میں بھی تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ کسی گولے کا ٹکڑا اس کا پیٹ ایک طرف سے دوسری طرف تک کاٹ گیا ہے۔ اس کا بچنا ممکن نہیں تھا۔ انتڑیاں یقیناً" کٹ گئی ہوں گی۔ پھر بھی ہم اسے تسلّی دینے لگے کہ اس کا یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا اور ڈاکٹر انتڑیاں اور پیٹ اپنی جگہ بٹھا دے گا۔

"مت جھوٹ بولو" — وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ — "جھوٹ مت بولو' میں مر رہا ہوں۔ خدا کے لئے میرے باپ کو اور میری ماں کو' میرے بھائیوں اور میری بہنوں کو کہنا کہ مجھے بخش دیں' میں نے انہیں بہت تکلیفیں پہنچائی ہیں اور میں نے ان کی بے عزتی کی ہے' اللہ کا واسطہ ہے' انہیں کہنا مجھے بخش دیں" — اس نے اپنے ایک رشتہ دار حوالدار کا نام لیا اور کہا — "خدا کے واسطے اسے بلاؤ' وہ میرا گرائیں ہے اور میرا رشتہ دار بھی ہے۔ وہ مجھے میرے ماں باپ سے بخشوا دے گا.... میں نے دنیا میں ہی جہنم دیکھ لیا ہے"۔

وہ کبھی لیٹ جاتا کبھی بیٹھ جاتا اور اسی طرح بولتا ہی چلا گیا۔ وہ رو رو کر یہی کہہ رہا تھا کہ میرے ماں باپ کو' میرے بھائیوں اور بہنوں کو کہنا مجھے بخش دیں' میں ان کا گناہگار

ہوں.... اسی طرح بولتے بولتے وہ ایک طرف کو لڑھک گیا اور ہم سمجھے کہ ابھی اس کی آخری سانس بھی نکل جائے گی لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ابھی اسے اور اذیت دینا چاہتے تھے۔ وہ پھر اٹھا لیکن کھڑا نہیں ہُوا۔ جس پوزیشن میں بیٹھا تھا اسی پوزیشن میں بیٹھ گیا۔ اس کی انتڑیاں وغیرہ اور آگے نکل آئیں اور بکھر گئیں۔ وہ بار بار جُھک کر انہیں دیکھتا تھا اور پھر ہمیں رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگتا۔ کبھی تو اُس کی زبان بالکل ہی بند ہو جاتی اور کبھی وہ یکلخت انتہائی بلند آواز سے بولنے لگتا۔ پھر اس نے اپنے باپ کو اور پھر ماں کو پکارنا شروع کر دیا۔ دو مرتبہ وہ پیچھے کو گرا لیکن دونوں بار پھر سیدھا ہو گیا۔

مجھے برما کا جنگل یاد آیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے ایک آدمی کو اذیت سے نجات دلانے کے لئے اُس کے سر میں گولی مار دی تھی۔ اس لانس نائیک کو ایسی تکلیف دہ نزع کی حالت میں دیکھ تو مجھے یہی طریقہ سُوجھا کہ اس کے سر میں گولی مار دوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ حاضر سروس تھی۔ میں اسے اس جہنم سے نکال نہیں سکتا تھا۔ اس نے اگلے جہان جہنم میں ہی جانا تھا لیکن اس کی جو حالت تھی وہ عبرت ناک تھی۔ ہم نے اسے اٹھایا تو اس کی انتڑیاں زمین پر گر پڑیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس کا سر ڈھلک گیا تھا اور اس کی سانسوں کا سلسلہ رک گیا تھا۔ ہم نے اسے بلکہ اس کی لاش کو اٹھایا۔ اس کی انتڑیاں اور پیٹ کے اعضاء وہیں رہ گئے اور ہم اسے وہاں رکھ آئے جہاں لاشیں اکٹھی کی جا رہی تھیں۔

میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ہر مسلمان کو صرف یہ یاد دلاؤں گا کہ والدین' خصوصاً" ماں کے احترام کے متعلق اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک بار نہیں کئی بار حکم دیا ہے۔ وہ ضرور دیکھ لیں البتہ ایک بات کہنے والی ہے جو میں کہوں گا۔ انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ بے صبر ہے اور ناشُکرا ہے۔ گناہگار انسان اپنے جیسوں کا انجام دیکھ کر بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ اس انجام کو نہیں پہنچے گا۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ کم عقل تھے جو بُرے انجام کو پہنچے۔ اپنے آپ کو وہ دانش مند سمجھتا ہے۔

○

کوالالمپور اتحادیوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پورے کا پورا ملایا جاپانیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن جاپان کی فوج کا مورال نہیں

توڑا جا سکا تھا۔ میں پہلے سنا چکا ہوں کہ جاپانی سپاہی ہتھیار ڈالنے کی بجائے جان دینے کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ ایسا جذبہ تھا جو ان جاپانیوں نے ملایا میں شکست کھا کر بھی زندہ رکھا۔ وہ ایک فوج کی حیثیت سے ختم ہو گئے تھے لیکن اب وہ انفرادی جنگ لڑ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب انہیں ہتھیار ڈالنے پڑیں گے لیکن وہ لڑتے ہوئے مرنا چاہتے تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اور بعض اکیلے جنگلوں میں چلے گئے اور انہوں نے اپنی ہی جنگ شروع کر دی۔ وہ دُور سے کسی انگریز' امریکی یا ہندوستانی فوجی کو آتا دیکھتے تو اس پر فائر کھول دیتے تھے۔ وہ ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے۔ اس طرح اتنی بڑی جنگ جیتی نہیں جا سکتی البتہ جاپانیوں کا جذبہ قابلِ تعریف تھا۔

ہم ریڈیو سے خبریں سنا کرتے تھے۔ بحرالکاہل میں سمندری جنگ لڑی جا رہی تھی لیکن جاپانی وہ جنگ بھی ہار رہے تھے اس لئے انہوں نے خُودکُش ہوا باز بھیجنے شروع کر دیئے تھے۔ یہ تفصیل پہلے سنا چکا ہوں۔ ایک ہوا باز اپنے طیارے کے ساتھ بم باندھ کر کسی امریکی بحری جہاز کے اوپر جا کر گرتا تھا۔ اس کی ایک جان جاتی تھی لیکن وہ اتنے بڑے بحری جہاز کو تباہ کر دیتا تھا لیکن جاپان کا یہ طریقہ بھی ناکام ہو گیا۔ امریکہ کے بحری بیڑے نے جاپان کو تقریباً" گھیرے میں لے لیا تھا اور امریکہ کے ہوائی بیڑے نے جاپان کے بڑے شہروں خصوصاً" ٹوکیو کو ملبے کے ڈھیر بنا ڈالا تھا۔ آخر اگست 1945ء میں امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر دو ایٹم بم گرا کر جنگ کا بالکل ہی خاتمہ کر دیا۔

جب جنگ ختم ہو گئی تو میں ایک روز اپنے دوست حمید کے ساتھ فیض الحق کے گھر چلا گیا۔ وہ گھر میں موجود تھا۔ اُس نے اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ کہنے لگا کہ میں نے تمہارے لئے بہت دعائیں کی تھیں۔ اللہ نے میری دعائیں سن لیں اور تم خیریت سے واپس آ گئے ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اب انڈین نیشنل آرمی میں نہیں بلکہ اپنی اسی پلٹن میں واپس چلا گیا ہوں جہاں سے بھگوڑا ہوا تھا۔

"میرے عزیز!" — عالم فاضل فیض الحق نے کہا — "تمہیں دراصل اُس عورت کی دعاؤں نے بچایا ہے جس کی تم نے عزت بچائی تھی"۔

میں نے خوشی کا اظہار کیا کہ اُس کی دعاؤں سے میں اُس سزا سے بھی بچ گیا ہوں جس کی مجھے ہر لحہ توقع تھی۔ ایک تو میں بھگوڑا تھا اور اس سے بڑا جرم یہ کہ میں انگریزوں کے دشمن سے جا ملا تھا۔ اب میں واپس اپنے گھر جا سکوں گا.... میں ابھی کچھ

اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن فیض الحق نے آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اُس کا یہ تاثر ایسا تھا کہ میں چپ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا پھر اُس نے سر جھکا لیا۔

"ابھی نہیں" — اُس نے سر اٹھا کر کہا — "مجھے ایک اور جنگ نظر آ رہی ہے جس میں تم بھی شامل ہو گے لیکن ایک خیال رکھنا.... کسی مسلمان پر گولی نہ چلانا۔ اپنی جان دے دینا لیکن کسی مسلمان کی جان نہ لینا"۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر یقیناً" حیرت زدگی کا تاثر تھا۔ ایک سوال میری آنکھوں میں چمک رہا ہو گا جسے فیض الحق سمجھ گیا۔

"تمہیں اس سے زیادہ حیران ہونا چاہئے" — فیض الحق نے کہا — "ابھی میں تمہیں ساری بات نہیں بتا سکوں گا۔ تم انگریز کے فوجی ہو۔ میں اشارے اشارے سے تمہیں یہ ذرا سی بات بتا رہا ہوں' یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں نے تم میں ایک جذبہ دیکھا ہے۔ ابھی میں اتنا ہی کہوں گا کہ اس جذبے کو مرنے نہ دینا"۔

"محترم بزرگ!" — میں نے کہا — "مجھے کچھ تو بتا دیں تاکہ میں ذہنی طور پر تیار رہوں"۔

اس نے آج کے انڈونیشیا کے جزیروں کے نام لئے اور کہا کہ یہ سارا ملک مسلمانوں کا ہے جس پر یورپ کی ایک قوم' ولندیزی' حکومت کرتی رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ جاپانیوں نے یہ ملک فتح کر لیا تو مسلمانوں کی حکومت بنا دی لیکن اس پر اپنا کنٹرول رکھا۔ اب جاپانی وہاں سے پسپا ہو گئے ہیں اور وہاں کے مسلمان آزادی کی جنگ لڑیں گے تو بڑی خونریز جنگ ہو گی۔ ابھی میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں تمہیں پکی بات کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ابھی مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تم انگریز کے ساتھی ہو۔ تم کیونکہ مسلمان ہو اس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ تمہیں پہلے ہی بتا دوں کہ مسلمان کا فرض کیا ہے اور اس کا جذبہ کیا ہونا چاہئے.... اُس نے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا اور اُس نے جہاد کی باتیں شروع کر دیں۔

جب یہ عالم دین' فیض الحق' جہاد کی باتیں کر رہا تھا اس وقت مجھے وہ قبائلی بُوڑھا یاد آ رہا تھا جس کے گھر میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ وہ پسماندہ اور بالکل اَن پڑھ آدمی تھا لیکن اُس نے میرے خیالات بدل ڈالے اور میرے ایمان میں تازگی پیدا کر دی تھی۔ میں اُسی کی

باتوں کے زیرِ اثر فوج سے بھگوڑا ہُوا تھا اور اب ایک عالم فاضل بزرگ اسی طرح کی باتیں کر رہا تھا اور میں اپنے اندر ایک نئی روح محسوس کرنے لگا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ یہ بزرگ بولتا چلا جائے اور میں سنتا رہوں۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس روحانی طاقت ہے اور کشف کی طاقت بھی۔ وہ تو یقیناً" تھی لیکن میں نے اس ملاقات میں محسوس کیا کہ وہ دانشمند انسان تھا اور اس کی عقل مستقبل کے پردے چاک کر سکتی تھی۔ وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی باتیں کر رہا تھا اور یہ تو کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس قدر ایماندار اور دیندار آدمی تھا۔

میں اُس روز بہت دیر اُس کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا اور میں نے اُس سے کئی ایک باتیں پوچھیں اور اس نے میرے کچھ شکوک و شبہات رفع کر دیئے۔ میں وہاں سے بادلِ نخواستہ اٹھا۔

میں اُس کے پاس پھر جانا چاہتا تھا لیکن اگلے ہی روز حکم ملا کہ کوئی آدمی باہر نہ جائے اور ہر وقت تیاری کی حالت میں رہے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں یعنی ہماری بٹالین کو کہیں اور بھیجا جا رہا ہے.... ہمیں زیادہ دن انتظار نہ کرنا پڑا۔ صرف دو دن گزرے تو ہمیں ٹرکوں پر بٹھا کر ساحل پر لے گئے اور نیوی کے ایک جہاز میں سوار کرا دیا۔ ایک رات اس بحری جہاز میں گزری۔ اگلے روز علی الصبح بحری جہاز چل پڑا۔ ہمیں اپنی منزل کا کچھ پتہ نہ تھا۔

ہم ملاکا کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے تھے۔

ہم تین دن اس بحری جہاز میں سوار رہے اور چوتھے دن جہاز ایک بندرگاہ میں جا کر رکا اور اس میں لنگر ڈال دیئے۔ ہمیں جہاز سے اترنے کا حکم ملا تو ہمیں پتہ چلا کہ یہ جکارتہ ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جکارتہ انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے۔ اُس وقت انڈونیشیا کا وجود نہیں تھا اور یہ نام کبھی کسی نے سنا بھی نہیں تھا۔

جکارتہ سے ہمیں ریل کے ذریعے ایک اور جگہ لے جایا گیا جس کا نام سیمارانگ تھا۔ یہ ہماری منزل تھی۔ وہاں عارضی سی بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا۔ ہمیں یہ نہ بتایا گیا کہ یہاں ہمیں کیوں لایا گیا ہے۔ بظاہر کوئی خاص کام نہیں تھا۔

یہ چھوٹی سی ایک چھاؤنی تھی جس میں ہماری بٹالین کے علاوہ ایک بٹالین راجپوتانہ رائفلز کی بھی تھی۔ یہ اچھا خاصا شہر تھا اور ہمیں اجازت مل گئی تھی کہ ہم شہر میں گھوم پھر سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ ان علاقوں پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور ان کی شکست کے بعد یہ علاقے واپس لے لئے گئے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ یہ علاقے پہلے بھی انگریزوں کے تھے اور اب پھر ان کے ہو گئے ہیں لیکن کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ وہاں ولندیزیوں کی حکومت تھی اور اب پھر یہاں ولندیزی آ جائیں گے۔

ہماری بٹالین کو دراصل یہاں Occupation Force کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔ اس فورس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو ملک فتح کر لیا جاتا ہے اس کے بڑے شہروں میں اپنی فوج رکھی جاتی ہے تاکہ قبضہ برقرار رہے اور وہاں کے لوگ فاتح فوج سے واقف ہو جائیں۔ میں یہ دیکھ کر کچھ حیران ہُوا کہ ہمیں کھلی چھٹی دے دی گئی تھی کہ ہم شہر میں گھومیں پھریں اور لوگوں سے ملیں ملائیں۔ فوج کا ڈسپلن بڑا ہی سخت ہوتا ہے لیکن وہاں ڈسپلن میں بھی نرمی کر دی گئی تھی۔ ہماری روزمرّہ کی جو ڈیوٹی ہوتی تھی وہ ہم پوری کرتے تھے' اس کے بعد ہم پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔

یہ میں کچھ عرصے بعد سمجھا کہ فوجیوں کو اس طرح کھلا کیوں چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ بالکل وہی انداز تھا جو پرانے زمانے کے بادشاہ اختیار کیا کرتے تھے۔ ہم کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں کہ فلاں بادشاہ نے فلاں ملک فتح کر لیا تو اس کی فوج نے وہاں کے لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی عورتوں کو بے آبرو کیا۔ وہاں کی خوبصورت لڑکیاں بادشاہ کو اور بڑے حاکموں کو پیش کی جاتی تھیں۔ لوٹ مار الگ ہوتی تھی۔ اس کا مطلب ایک تو اپنے لشکر کو انعام دینا ہوتا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ مفتوحہ ملک کے لوگوں کا قومی تشخص اور وقار بالکل ختم کر دیا جائے تاکہ کسی بھی وقت یہ بغاوت نہ کر سکیں۔ ہوتا ایسے ہی تھا کہ مفتوحہ ملک کو ہر پہلو سے تنگ دست اور پریشان کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً" خوراک کے ذرائع محدود کر دیئے جاتے تھے تاکہ لوگ روٹی کے نوالے کو ترسیں اور اپنے فاتحین کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔ پھر ان کی عورتوں کو اس قدر رنج اور بے آبرو بنا دیا جاتا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی تھی اور ان کے مرد اپنا خون پینے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور آہستہ آہستہ مرد بھی اس بے عزتی کو قبول کر کے اپنے قومی کردار سے محروم ہو جاتے تھے۔ یہ صرف مسلمان تھے جنہوں نے مفتوحہ ملکوں میں ظلم اور کردار کشی کی بجائے حقوق العباد کا رواج ڈالا تھا اور مفتوحین کو یہ احساس دلایا تھا کہ وہ فاتحین سے حقیر نہیں بلکہ ان کے بھی مساوی حقوق ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام بڑی تیزی سے پھیل گیا

تھا۔

جنگِ عظیم ختم ہوئی تو امریکہ اور برطانیہ نے اپنی فوجوں کو اسی طرح کھلا چھوڑ دیا تھا۔ مقصد مفتوحین کی کردار کشی تھا۔ میں اپنی بات سنانے سے پہلے جاپان کی بات سناتا ہوں۔ جاپان پر امریکہ کا قبضہ ہو گیا تو امریکی فوج وہاں جا کر مقیم ہو گئی۔ میں نے جنگ کے بہت بعد کتابیں پڑھنی شروع کیں تو مجھے امریکی فوجیوں کے متعلق بہت سا مواد پڑھنے کو ملا۔

چونکہ زمانہ بدل چکا تھا اور اب جدید تہذیب شروع ہو گئی تھی اس لئے قدیم بادشاہوں والا طریقہ اختیار نہ کیا گیا کہ مفتوحہ لوگوں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی عورتوں کو بے آبرو کرو اور سرِعام برہنہ کر کے انہیں نچاؤ۔ اب مہذب طریقہ اختیار کیا گیا جس کا اصل مقصد بادشاہوں والا ہی تھا۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ امریکی فوجیوں نے جاپان کی لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں لگانی شروع کر دیں اور انہیں عشق و محبت کے جال میں الجھا لیا۔ جاپان تباہ و برباد ہو گیا تھا اور وہاں راشن پانی کی بہت ہی تنگی ہو گئی تھی۔ امریکی فوجی وہاں کی لڑکیوں کو اپنے ساتھ لگا کر انہیں کھانے پینے کا سامان دیتے رہے اور یہ لڑکیاں اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرتی رہیں۔

جاپان نے آگ اُگلتی توپوں اور مشین گنوں کے سامنے بھی اپنا قومی کردار زندہ رکھا تھا لیکن ان کے اپنے ملک کی تباہی اور بھوک نے ان کا کردار اس طرح تباہ کیا کہ ان کی لڑکیوں نے امریکی فوجیوں کو قبول کر لیا اور اپنا آپ ان کے حوالے کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ جاپانی لڑکیوں کے ناجائز بچے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

امریکہ کی فوج کوئی زیادہ عرصہ جاپان میں نہیں رہی تھی۔ جاپان کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے امریکی فوج واپس چلی گئی تھی۔ امریکی فوجیوں نے جن جاپانی لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں لگائی تھیں' انہیں انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ وہ انہیں امریکہ لے جائیں گے لیکن یہ فوجی انہیں بتائے بغیر واپس چلے گئے۔ بعض فوجیوں کے دلوں میں سچی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی دوست لڑکیوں کو ساتھ لے گئے اور باقاعدہ شادی کر لی۔ امریکہ میں آج بھی ایسے آدمی اور عورتیں نظر آتی ہیں جن کے چہروں کے نقش و نگار جاپانی ہیں۔ یہ امریکہ اور جاپان کی ملی جلی نسل ہے لیکن جو لڑکیاں پیچھے رہ گئی تھیں ان کا وہی حال ہُوا کہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی۔

میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ امریکہ کے فوجی واپس چلے گئے تو صرف ٹوکیو میں آٹھ ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے جن کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا اور ان بچوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے باپ کون ہیں اور کہاں ہیں۔ امریکہ کے اخباروں نے اور سیاسی حلقوں نے بھی اپنی حکومت پر تنقید کی تھی اور مطالبہ کیا تھا کہ ان معصوم بچوں کا کیا قصور ہے۔ جنگ ان بچوں نے یا ان کی ماؤں نے تو نہیں لڑی تھی۔

مختصر بات یہ کہ امریکہ کے فوجی جاپان کا قومی کردار اور وقار تباہ و برباد کر آئے تھے۔ وہاں یوں بھی ہُوا کہ جوان بیویاں اپنے خاوندوں کو چھوڑ کر امریکی فوجیوں کی دوست بن گئیں اور انہیں امریکیوں نے یہ سبز باغ دکھائے کہ وہ انہیں امریکہ لے جائیں گے۔ امریکی فوجی ان کے بغیر امریکہ چلے گئے اور پیچھے ان کے لئے سوائے ذلّت اور رسوائی کے کچھ بھی نہ رہا۔ ان کے خاوندوں نے بھی انہیں دھتکار دیا تھا۔

○

اب میں انڈونیشیا کی بات کروں گا۔ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ ابھی انڈونیشیا کا کوئی وجود نہیں تھا اور نہ ہی یہ نام کبھی کسی کی زبان سے سنا تھا۔ میں انڈونیشیا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ بات سناتے ہوئے مجھے بہت سے جزیروں کے نام لینے پڑتے ہیں جس میں خاص دشواری ہوتی ہے۔ بہتر یہ سمجھا کہ اس سارے علاقے کو انڈونیشیا کہنا شروع کر دوں کہ مجھے بات کرنے میں اور آپ کو بات سمجھنے میں آسانی رہے۔

ایک اور بات ابھی سے کہہ دیتا ہوں' وہ یہ ہے کہ انڈونیشیا کے متعدد شہروں اور قصبوں میں ہماری بٹالین گئی تھی۔ میں ہر مقام کا ذکر نہیں کروں گا' آپ یوں سمجھیں کہ میں اس سارے خطّے کی بات کر رہا ہوں۔ میں وہاں کے بڑے شہروں کا نام پہلے ہی بتا دیتا ہوں — جکارتہ' بنڈونگ' جوگ' سوراباجا' سیمارانگ — ان شہروں کے کچھ مشاہدات تو میرے اپنے ہیں اور باقی دوسری یونٹوں کے فوجیوں نے مجھے سنائے تھے۔ اس طرح میں اس خطّے کی جنگ کے فوراً بعد کی صحیح تصویر پیش کروں گا۔

یہ تو میں چند مرتبہ پہلے بتا چکا ہوں کہ اس خطّے پر ولندیزیوں کی حکومت تھی جو دو سو سال سے چلی آ رہی تھی۔ یہاں کی آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی جو اب بھی ہے بلکہ اب زیادہ ہے۔ جاپانیوں نے یلغار کی تو ڈچ یعنی ولندیزی وہاں سے بھاگ گئے اور انگریز ان کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ جاپانیوں نے یہ چال چلی کہ وہاں مسلمانوں کی حکومت

قائم کر دی لیکن اسے اپنے کنٹرول میں رکھا۔ مسلمانوں سے یہ کہا کہ اب یہاں انہی کی حکومت رہے گی لیکن یہ صریحاً" فریب تھا۔ جاپانیوں کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے مسلمان جو جنگجو معلوم ہوتے ہیں' ان کے خلاف نہ اُٹھ کھڑے ہوں۔

پھر میں سنا چکا ہوں کہ جاپانیوں کو شکست ہو گئی تو انگریزوں نے اپنی فوج یہاں لا کر چھوڑ دی جس طرح جاپانیوں نے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو دھوکا دیا تھا کہ اب یہاں ہمیشہ ان کی حکومت رہے گی اسی طرح انگریزوں نے ولندیزیوں کو جھانسہ دیا کہ وہ ان کی حکومت بحال کر دیں گے لیکن میں نے خود دیکھا کہ انگریزوں نے ولندیزیوں کی کردار کُشی شروع کر دی اور انہیں حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ ولندیزیوں کی فوج تو برائے نام تھی جو جاپانیوں کی قید میں چلی گئی تھی لیکن ولندیزی باشندے کہیں بھی نہ جا سکے اور وہ وہیں رہے۔

ولندیزی یورپ کی قوم ہے' رنگ گورے ہیں اور نقش و نگار بھی اچھے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ولندیزی بڑے خوبصورت لوگ تھے۔ انگریزوں نے ان کے راشن پانی کا کوئی بندوبست نہ کیا۔ فاتح فوج کو اگر اپنی رعایا سے ہمدردی اور دلچسپی ہو تو وہ سب سے پہلے اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہے لیکن ولندیزیوں کو بلکہ وہاں کے مسلمانوں کو بھی ہر پہلو سے تنگدست اور پریشان رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی فوج کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ یہاں کے لوگوں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ دوستیاں لگائیں۔

اب یہاں مسلمان اور کافر کا فرق دیکھیں۔ مسلمان الگ تھلگ نظر آتے تھے اور ان کی لڑکیاں جو خاصی خوبصورت تھیں' ایک خاص وقار سے گھومتی پھرتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں ولندیزی لڑکیاں فوجیوں کو پھانستی پھرتی تھیں۔ فوجیوں کو بڑا ہی اچھا راشن ملنا شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں فوج کا راشن زیادہ تر دال روٹی تھا یا بڑا گوشت۔ یہ بھی مسلمانوں کے لئے۔ ہندو اور سکھ دال اور سبزیاں کھاتے تھے لیکن میدانِ جنگ میں اور جنگ کے بعد مفتوحہ علاقے میں ہندوستانی فوجیوں کو پھل فروٹ کے ڈبے' بسکٹوں کے ڈبے اور اس طرح کا اور یورپی راشن بھی ملنے لگا تھا۔ سگریٹ مفت ملتے تھے۔ یقین جانیئے کہ وہاں سگریٹ یا بسکٹ کے ایک پیکٹ کے عوض نہایت خوبصورت لڑکی دوست بن جاتی تھی۔ میں نے بڑے شریف قسم کے فوجیوں کو دیکھا کہ وہ ولندیزی لڑکیاں ساتھ لئے پھرتے تھے۔

وہاں سینما ہال بھی چل پڑے تھے بلکہ چلا دیئے گئے تھے۔ میرے فوجی بھائی کبھی اکیلے فلم دیکھنے نہیں جاتے تھے' ایک ایک ولندیزی لڑکی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔

یہاں میں آپ کو ایک دلچسپ بات سناتا ہوں جس سے آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں ولندیزی لڑکیوں کی اخلاقی حالت کیا تھی اور ہماری اپنی فوج کی اخلاقی حالت کیا ہو گئی تھی۔ ہماری بٹالین میں ایک صوبیدار صاحب ہُوا کرتے تھے جن کی شرافت اور اسلام پسندی ضرب المثل بنی ہوئی تھی۔ میں ان کا نام نہ ہی لوں تو اچھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود تو اس دنیا میں نہ ہوں لیکن ان کی آل اولاد تو ضرور ہو گی۔ یہ جمعدار' صوبیدار اور صوبیدار میجر جنہیں آج کل جے سی او کہا جاتا ہے' اُس وقت وی سی او کہا جاتا تھا۔ بٹالین کی لائنوں میں یہ VCO الگ الگ کمروں میں رہتے تھے۔

ایک روز مجھے اس صوبیدار کے ساتھ ایک کام پڑ گیا جو سرکاری کام تھا۔ میں کلرک تھا اس لئے میں جس کے پاس بھی جانا چاہتا چلا جاتا تھا اور کلرکوں کو خصوصی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ صوبیدار کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دروازے پر دستک نہ دی نہ ہی ہم لوگوں میں اتنا اخلاق و آداب ہُوا کرتا تھا۔ میں نے کواڑ پر ہاتھ رکھا تو دروازہ کھل گیا اور میں اندر چلا گیا اور دیکھا صوبیدار صاحب ٹانگیں نیچے لٹکائے چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ان کی گود میں ایک فرسٹ کلاس جوان ولندیزی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے اور چونچلے ہو رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر لڑکی پر تو کچھ بھی اثر نہ ہُوا بلکہ وہ پہلے کی طرح ہنستی ہی رہی لیکن صوبیدار صاحب کا یہ حال کہ بُری طرح چونکے اور بدک کر لڑکی کو گود سے دھکیلنے لگے۔

"یار؟" — اچھا ہُوا تم آ گئے — "صوبیدار صاحب نے مجھے کہا — "اس کچری کو یہاں سے نکالو۔ دیکھو زبردستی آ کر میری گود میں بیٹھ گئی ہے۔ میرا نماز کا ٹائم ہو رہا ہے.... یار اسے اپنے ساتھ لے جاؤ' یہ جان ہی نہیں چھوڑتی"۔

صوبیدار صاحب کو سہولت یہ حاصل تھی کہ ہم لوگ ولندیزیوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے اور ولندیزی ہماری نہیں سمجھتے تھے۔ اگر یہ ولندیزی لڑکی پنجابی سمجھ سکتی تو وہ فوراً" بتا دیتی کہ کون کس کی جان نہیں چھوڑ رہا۔ میں ہنس پڑا اور آہستہ سے کہا' کوئی بات نہیں صوبیدار صاحب' سب عیش موج کر رہے ہیں' نمازیں واپس ہندوستان میں جا کر پڑھ لینا۔ صوبیدار صاحب نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور لڑکی کو گود سے نکال کر چارپائی پر بٹھا لیا اور میری بات سننے لگے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم ولندیزیوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے اور وہ ہماری نہیں سمجھتے لیکن بدکاری اور بداخلاقی کی اپنی ایک زبان ہے جو دنیا کے ایک کونے کا گناہگار دوسرے کونے کے گناہگار کی بھی سمجھ لیتا ہے۔ اس میں زبان کو حرکت دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ میں نے اس صوبیدار کی مثال صرف اس لئے دی ہے کہ مجھے زیادہ تفصیلات نہ سنانی پڑیں اور آپ سمجھ جائیں کہ وہاں کیا صورتِ حال بن گئی تھی۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے وہاں بھی حقّے بنا لئے تھے۔ خود حُقّے پیتے تھے اور سرکاری راشن کے سگریٹ ولندیزی لڑکیوں کو دے کر انہیں جہاں چاہے لے جاتے تھے۔

معلوم نہیں آپ یقین کریں گے یا نہیں' میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ اس خطّے کی مسلمان عورتوں کا کردار ولندیزی عورتوں سے بالکل الگ تھا۔ وہ اپنے سروں پر بڑا رومال باندھ کر رکھتی تھیں اور ہندوستانی فوجیوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ ہمارے بعض فوجیوں نے مسلمان عورتوں پر بھی طبع آزمائی کی کوشش کی تھی اور بعض کی تو وہاں کے مسلمانوں نے ایسی پٹائی کی کہ ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ہم جو مسلمان فوجی تھے' ہمیں مسلمانوں کا کردار پتہ چل گیا۔ ویسے بھی مسلمان ہوتے ہوئے ہم مسلمانوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بڑی جلدی ساری فوج میں مشہور ہو گیا کہ وہاں کی کسی مسلمان عورت کو میلی آنکھ سے بھی نہ دیکھنا۔ مسلمان فوجیوں نے یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ وہاں کی مسلمان عورتوں کی عزت کے محافظ بن گئے۔ انہوں نے ہندو اور سکھ فوجیوں کو بھی خبردار کر دیا کہ کسی مسلمان عورت کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالنا ورنہ ہم اس کا انتقام لیں گے۔ ہندو سکھ اور مسلمان فوجیوں میں اس مسئلے پر کچھ کھچاؤ سا پیدا ہو گیا تھا لیکن ولندیزی عورتیں اتنی زیادہ تھیں کہ یہ کھچاؤ جلدی ختم ہو گیا۔

یہ نہ سمجھئے کہ یہ ولندیزی لڑکیاں غریب یا متوسط گھرانوں کی تھیں' حقیقت یہ ہے کہ ان میں اونچے گھرانوں کی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ ان میں ایک کلاس وہ تھی جسے حکمرانوں کی کلاس یا حاکموں کی کلاس کہہ لیں۔ وہ اپر کلاس تھی۔ اس کلاس کی لڑکیوں نے انگریز اور ہندوستانی افسروں کے ساتھ دوستیاں لگا لی تھیں بلکہ ان میں اکثر افسروں کے ساتھ ہی راتیں بسر کرتی تھیں۔ دوسرے فوجیوں کو اتنی کھلی اجازت مل گئی تھی کہ بعض فوجی پوری پوری رات اُن عورتوں کو بیرکوں میں ساتھ رکھتے تھے۔ اب ان فوجیوں

نے بھی شراب پینی شروع کر دی تھی جو شراب کی بُو سے بھی بھاگا کرتے تھے۔

اب میں آپ کے سامنے قدرت کے نظام کا اور انتقام کا ایک پہلو رکھتا ہوں۔ میں تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ جاپانی فوج نے مفتوحہ علاقوں سے نوجوان اور خوبصورت لڑکیاں اٹھا کر اپنے ساتھ مورچوں میں رکھ لی تھیں۔ پھر ان کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا' اس کی دو مثالیں پیش کر چکا ہوں۔ ایک یہ کہ ایک عورت کو ہم نے دیکھا جس کے سر میں گولی لگی ہوئی تھی اور ایک عورت ایک بچے کو جنم دے رہی تھی۔ جاپانی فوج جب بھاگی تو ان بدنصیب لڑکیوں کو یونہی بھٹکتا چھوڑ گئی تھی۔ جاپانی فوج کا قومی کردار اور جذبہ قابلِ تعریف ہی سہی لیکن مفتوحہ علاقوں کی عزت کے ساتھ وہ جس طرح کھیلے وہ قابلِ نفرت تھا۔ قدرت نے یعنی اللہ تعالیٰ کے نظام نے یہ انتقام لیا کہ جاپان کی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ امریکی فوجیوں نے بالکل وہی سلوک کیا اور ناجائز بچے پیدا کر کے خود امریکہ چلے گئے۔

انڈونیشیا کے کوئی کوئی مسلمان ٹوٹی پھوٹی اردو بول اور سمجھ سکتے تھے۔ یہ دکاندار اور تاجر لوگ تھے اور ان میں ہندوستان کے دینی مدرسوں کے پڑھے ہوئے آدمی بھی تھے۔ ان کے ساتھ ہماری راہ و رسم چل پڑی تھی جس کی تفصیلات آگے چل کر سناؤں گا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جنگ سے پہلے جب وہاں ولندیزیوں کی حکومت تھی تو وہ مسلمانوں کو غالب اکثریت میں ہونے کے باوجود سیکنڈ کلاس نہیں بلکہ تھرڈ کلاس شہری سمجھتے تھے اور انہیں اپنی انتہائی گھٹیا رعایا بنا کر رکھتے تھے۔ یورپ کے دل میں اسلام دشمنی تو بڑی پرانی ہے' یہ اسلام دشمنی ولندیزیوں میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ نے ان سے یہ انتقام لیا کہ انہیں بھوکا اور محتاج بنا دیا اور اس قوم کی عورتوں نے خود فوجیوں کو پھانسنا اور اپنا آپ پیش کرنا شروع کر دیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ معزز گھرانوں کی ولندیزی لڑکیاں باقاعدہ طوائفیں بن گئی تھیں۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ راشن پانی دے دو اور پورے گھر کے لئے دو۔ بعض ہندوستانی فوجی سٹوروں میں چوریاں کر کے بھی ان کے گھروں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔

کچھ عرصے بعد ایک اور بھیانک صورت پیدا ہو گئی۔ وہاں کی طوائفیں بھی معزز گھرانوں کی عورتیں بن کر فوجیوں کے پاس آنے لگیں۔ میں اس صورتِ حال کی ساری وجوہات کھل کر بیان نہیں کر سکوں گا کیونکہ یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ فوجی اس بے

حیائی کی وجہ سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہونے لگے تھے۔

میں ان بیماریوں کے نام لکھ دیتا ہوں۔ ان میں ایک ہے آتشک دوسری ہے سوزاک۔ یہ بیماریاں اتنی عام نہیں ہوئی تھیں لیکن فوجی ان بیماریوں میں مبتلا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ فوجی کا ان دونوں میں سے کسی ایک بیماری میں مبتلا ہو جانا جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ غلیظ عورتوں کے پاس جاتا رہا ہے۔ اُس کی اسے سزا ملتی تھی۔ عام طور پر فوجی یہ بیماریاں چھپا لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بیماری جڑ پکڑ لیتی اور لاعلاج کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ دو ہندوستانی فوجیوں نے ان بیماریوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی۔ اسے بدکاری کی سزا کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔

میں وہاں بمصریا جنگی وقائع نگار کی حیثیت سے نہیں گیا تھا کہ مجھے ہر ایک بات کا علم ہوتا رہتا یا میں خود وہاں کی ہائی کمانڈ سے ملتا اور اندر کی باتیں معلوم کر سکتا۔ میں حوالدار کلرک تھا۔ کچھ باتیں اپنی آنکھوں دیکھیں اور چونکہ میرا زیادہ تر رابطہ اپنی بٹالین کے افسروں کے ساتھ رہتا تھا اس لئے وہ باتیں مجھے معلوم ہو جاتی تھیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔ ظاہر یہ کیا جا رہا تھا کہ اس خطّے میں ولندیزیوں کی حکومت تھی اس لئے انگریزوں نے اپنی فوج یہاں اس لئے رکھی ہے کہ پھر ولندیزیوں کی حکومت قائم کر کے اسے پختہ اور مستحکم کر دیا جائے۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ انگریزوں اور امریکیوں کو ولندیزیوں کے ساتھ اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی تھی؟.... یہ میں بتا چکا ہوں کہ ولندیزی مسلمانوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ یہ پوری کی پوری دنیائے صلیب کا رویّہ ہے جو صلیبی جنگوں سے اب تک چلا آ رہا ہے۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا تھا کہ انگریز خود یہاں کے حکمران بننے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے اور وہ ولندیزیوں کو آگے کر کے مروانا چاہتے تھے۔ بہرحال اس خطّے میں اُس وقت تین اتحادی تھے۔ انگریز، امریکی اور ولندیزی۔ حکومت کسی کی بھی قائم ہو جاتی، تینوں کا ایک مقصد تو مشترک تھا وہ یہ کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم نہ ہو۔

پھر اچانک ہی فوج میں نقل و حرکت شروع ہو گئی اور صاف پتہ چلنے لگا کہ کوئی اور ہی ایمرجنسی پیدا ہو گئی تھی۔ میری بٹالین کو وہاں سے کہیں اور بھیج دیا گیا اور دوسری یونٹوں کو بھی اِدھر اُدھر کر کے نئی یونٹیں آ گئیں اور یوں سمجھیں ایک نئی تنظیم ہونے لگی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ان اتحادیوں پر کوئی مصیبت آن پڑی ہے۔ ہمیں جلد ہی

پتہ چل گیا کہ یہ نئی مصیبت کیا آن پڑی ہے.... وہاں کے مسلمانوں نے باقاعدہ جنگِ آزادی شروع کر دی تھی۔ یہ جلسے اور جلوسوں والی جنگِ آزادی نہیں تھی بلکہ مسلمانوں نے ان تینوں اتحادی طاقتوں کو جنگ کا الٹی میٹم دے کر جنگ شروع کر دی تھی۔ وہاں کے مسلمانوں نے جنگی ٹریننگ جاپانیوں سے لی تھی۔

جاپانیوں نے مسلمانوں کو جو ٹریننگ دی تھی، اس کا پس منظر یہ ہے کہ جاپانیوں نے اس خطّے پر قبضہ کیا اور برما تک جا پہنچے تو انہیں ہر لحہ توقع تھی کہ امریکہ اور برطانیہ جوابی حملہ کریں گے۔ جاپان کی ہائی کمانڈ نے یہ تو یقیناً سوچا ہو گا کہ اپنے ملک سے اتنی دور جا کر جو محاذ کھولا ہے، اسے طاقتور بنانے کے لئے جاپان سے مزید فوجیں بھیجنی ایک دشوار کام تھا۔ جاپانیوں نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس خطّے کے مسلمان عوام کا تعاون اور اعتماد حاصل کر لیا۔ یہ اس طرح حاصل کیا کہ ان کی ایک آزاد حکومت بنا دی جس کا سربراہ احمد سوئیکارنو تھا۔ احمد سوئیکارنو ایک انقلابی لیڈر تھا۔

جاپانیوں نے مسلمانوں کی جو حکومت بنائی تھی یہ کچھ اس طرح تھی جس طرح انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں اسمبلیاں بنائی تھیں اور ظاہر یہ کیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنے فیصلے خود کرتے ہیں، حالانکہ یہ محض ایک دکھاوا تھا۔ ایسے ہی جاپانیوں نے مسلمانوں کی جو حکومت بنائی اس کا نام وہاں کی زبان میں جو رکھا اس کا مطلب تھا "مرکزی عوامی تنظیم" اس میں وہاں کے مقامی لوگوں کو رکھا گیا اور احمد سوئیکارنو کو سربراہ تو بنا دیا گیا لیکن اس تنظیم میں اکثریت جاپانیوں کی تھی لیکن انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اہم امور اور مسائل کے متعلق فیصلے کرنے سے پہلے مسلمان ممبروں کی رضامندی لازمی طور پر حاصل کی جائے۔ جاپانیوں نے اس حکومت کے بڑے بڑے عہدے انڈونیشیا کے مسلمانوں کو دیئے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی ایک الگ فوج بنا دی۔

اس فوج کو جاپانیوں نے اسلحہ اور بارود دیا اور بڑی محنت سے انہیں جنگی ٹریننگ دی۔ صرف اس فوج کو ہی نہیں بلکہ شہریوں کو جن میں نوجوانوں کو خاص طور پر شامل کیا گیا تھا، فوجی اور جنگی ٹریننگ دے دی گئی۔ اس طرح یہ ساری قوم باقاعدہ فوجی بن کر جنگ کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ یہ حیران ہونے والی بات نہیں کہ وہاں کی مسلمان لڑکیاں بھی اسلحہ بارود استعمال کرنے کی ٹریننگ میں پیش پیش تھیں اور انہوں نے فوجیوں کی

طرح باقی فوجی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی۔ میں نے ان لڑکیوں کو بعد میں گوریلا جنگ لڑتے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔

جس وقت جاپانی برما سے پسپا ہو رہے تھے اور ان کے کہیں بھی پاؤں جم نہیں رہے تھے اُس وقت انڈونیشیا کے مسلمانوں کی یہ فوج جو جاپانیوں نے تیار کی تھی' ایک لاکھ بیس ہزار نفری تک پہنچ گئی تھی۔ جاپانی پوری طرح مطمئن تھے کہ وہ اس فوج کو انگریزوں اور امریکیوں کے خلاف لڑائیں گے اور مشرق بعید میں ان کے پاؤں جمے رہیں گے لیکن وہاں کے مسلمان کچھ اور ہی پلان بنائے ہوئے تھے۔ وہاں کے لیڈروں کا لیڈر احمد سوئیکارنو تھا اور دوسرے کا نام ہاتا تھا۔ وہ بھی مسلمان تھا۔ اس کے علاوہ بھی لیڈر تھے جنہوں نے یوں کیا کہ ظاہری طور پر جاپانیوں کے ساتھ لگے رہے اور انہیں یقین دلائے رکھا کہ وہ اتحادیوں کے خلاف ان کی جنگ لڑیں گے لیکن انہوں نے جاپان کی غلامی کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ بڑے ہی دانشمند اور دُور اندیش تھے۔ انہوں نے جاپانیوں سے صرف جنگی تربیت حاصل ہی نہیں کی تھی بلکہ ملک کے سرکاری انتظام چلانے کے طور طریقے بھی سیکھ لئے تھے۔ انہوں نے عزم کر رکھا تھا کہ اب وہ کسی کے بھی غلام نہیں رہیں گے۔ وہ صرف موقعے کی تلاش میں تھے۔

وہ پکّے مسلمان تھے۔ ہم وہاں کی مسجدیں دیکھا کرتے تو ہماری روحیں بھی خوش ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی خوبصورت مسجدیں تھیں اور انہیں وہ لوگ دل و جان سے صاف سُتھرا رکھتے تھے.... ان لیڈروں نے جب دیکھا کہ برما سے جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے ہیں اور ان کی پسپائی شروع ہو گئی ہے تو انہوں نے یہ دیکھنے کے لئے انتظار کیا کہ ملایا میں جاپانی کیا کرتے ہیں۔ جب دیکھا کہ ملایا میں بھی جاپانیوں کے مورچے جم نہیں رہے اور وہ پیچھے ہی ہٹتے آ رہے ہیں تو ان انڈونیشی مسلمانوں نے جاپانیوں کے اسلحہ بارود کے گوداموں' سٹوروں اور اسلحہ خانوں پر قبضہ کر لیا لیکن یہ چھوٹے ہتھیار تھے یعنی رائفلیں اور مشین گنیں وغیرہ۔ جاپانیوں کو توقع تھی کہ وہ ان مسلمانوں کو فوراً ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس توقع پر انہوں نے مسلمانوں پر ہلہ بولا لیکن مسلمان ایسی بے جگری سے لڑے کہ جاپانیوں نے پسپا ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس سے اندازہ کریں کہ وہاں کے مسلمانوں کا جذبہ کتنا مستحکم تھا۔ یہ وہی جاپانی فوج تھی جس نے امریکہ اور برطانیہ جیسی طاقتوں کو بحرالکاہل اور مشرقِ بعید سے بے دخل کر دیا تھا لیکن انڈونیشی مسلمانوں نے

چھوٹے ہتھیاروں سے جاپانیوں کو شکست دے دی۔

اس کا فائدہ امریکہ اور برطانیہ کو ملا کیونکہ مسلمانوں نے جاپانیوں کے لئے اس خطّے کی زمین تنگ کر دی تھی اور انہیں خاصا کمزور بھی کر دیا تھا۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ جاپانیوں کو وہاں سے بڑی تیزی سے پسپا ہونا پڑا۔

جاپانی پسپا ہو گئے تو ولندیزی پھر آن پہنچے۔ وہاں کے مسلمانوں نے انہیں بتایا کہ اب یہاں ان کی حکومت ہے اور وہ ایک آزاد قوم ہیں۔ ولندیزی تو انڈونیشیا کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان مسلمانوں کو ابھی تک وہی مسلمان سمجھا جنہیں وہ حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور وہ ان کی رعایا تھے لیکن اب انڈونیشیا کے مسلمان باقاعدہ فوجی بلکہ ایک جنگی طاقت بن چکے تھے۔ انہوں نے ولندیزیوں کو ایک ہی ہلّے میں گھٹنوں بٹھا دیا۔ ہمیں جب ملایا سے یہاں بھیجا گیا تھا' اُس وقت ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیوں بھیجا گیا ہے' واپس ہندوستان کیوں نہیں بھیجا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انڈونیشیا کے مسلمان گوریلا قسم کی جنگِ آزادی شروع کر چکے تھے۔ پہلے ہمیں اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اب انڈین آرمی کی یونٹوں کو انڈونیشی مسلمان گوریلوں کے خلاف لڑنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا تھا۔

انڈونیشی مسلمانوں کی یہ جنگِ آزادی اس قدر منظم اور ان کے وار اور ضربیں اس قدر کاری تھیں کہ امریکہ اور برطانیہ چونک اٹھے اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اس اُبھرتی ہوئی طاقت کو دبایا نہ گیا تو یہاں مسلمان حکومت مضبوط ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے مزید فوجیں اس خطّے میں اتار دیں۔ ایک تو یہ فوج تھی جس میں ہماری بٹالین بھی تھی' اس کے بعد آسٹریلیا کی فوج بھی بلا لی گئی اور انڈین آرمی کی مزید یونٹیں ہندوستان سے بلائی گئیں اور پھر امریکہ سے بھی فوج آ گئی اور پھر امریکہ اور برطانیہ کے فضائی بیڑوں نے بھی اس خطّے میں آ ڈیرے ڈالے۔ اس طرح انڈونیشیا میدانِ جنگ بن گیا۔ اتنی بڑی طاقت کے سامنے جس کے پاس ٹینک بھی تھے' لڑاکا بمبار طیارے بھی تھے اور توپ خانوں کا کوئی حساب کتاب ہی نہ تھا' انڈونیشی مسلمانوں کے پاس مشین گنیں اور رائفلیں تھیں۔ یہ رائفلیں اور مشین گنیں جاپانی ساخت کی تھیں۔ ان کا ایمونیشن ختم ہو گیا۔ مسلمانوں نے ولندیزیوں سے جو ایمونیشن چھینا تھا وہ جاپانی ہتھیاروں میں استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی دشواری تھی۔ مسلمانوں نے اتحادیوں کے ٹھکانوں پر شب

خون مارنے شروع کر دیئے اور خاصا اسلحہ اور ایمونیشن اکٹھا کر لیا۔ تب اتحادیوں کو پتہ چلا کہ انڈونیشی مسلمان تو ایک باقاعدہ فوج کی طرح منظم ہے اور اس تنظیم کو توڑنا آسان کام نہیں۔

انڈونیشی مسلمانوں کی اس جنگ آزادی کو عالمی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس پر کتابیں لکھی گئی تھیں۔ ایک کتابیں وہ تھیں جو عام لوگوں کے پڑھنے کے لئے ہیں' ان کے علاوہ فوجی اور جنگی امور کے ماہرین نے الگ کتابیں لکھی تھیں جن میں ان حریت پسندوں کے طریقہ جنگ کو "تکنیکی لحاظ سے پیش کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شمالی ویت نامیوں نے امریکہ کو اور 1954ء میں شمالی کوریا والوں نے بھی گوریلا جنگ کے ذریعے شکست دی تھی لیکن ویت نامیوں کو بھی اور کوریا والوں کو بھی روس اور چین کی بھرپور مدد حاصل تھی۔ انڈونیشیا کے حریت پسندوں کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کہیں سے بھی کوئی مدد حاصل نہیں ہوئی تھی۔

امریکہ اور برطانیہ والے پہلے تو یہ سمجھتے رہے کہ ان مسلمانوں کے پاس پتے کچھ بھی نہیں' انہیں تو فوراً" زیر کر لیا جائے گا لیکن ان اتحادیوں کو جب انڈونیشیا کے حریت پسندوں کے ہیڈ کوارٹر کے آپریشن آرڈروں کی کچھ کاپیاں ملیں تو ان کے ہوش ٹھکانے آئے اور تب انہیں پتہ چلا کہ ان کا سامنا معمولی سے اور غیر منظم سے گوریلوں کے ساتھ نہیں۔ میں ایسے ایک آپریشن آرڈر کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ انڈونیشی مسلمانوں کے ہیڈ کوارٹر سے جاری ہُوا تھا جس پر ان کے ایک کمانڈر ناسوشن کے دستخط تھے۔ ملاحظہ فرمائیں:

".... ہر گوریلا ٹولی کا کمانڈر اپنے بالائی کمانڈر کے ساتھ رابطہ رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ ہر کمانڈر اپنے گوریلا جوانوں کو یہ سمجھائے کہ ہم متحرک (موبائل) جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمارے نہ اگلے مورچے ہیں نہ پچھلے۔ ہمارا کوئی فلیک نہیں' ہمارے لئے پیش قدمی اور پسپائی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دشمن پر حملہ کرو اور دیکھو کہ دشمن کی نفری زیادہ ہو گئی ہے اور تم گھیرے میں آ جاؤ گے تو فوراً" وہاں سے پیچھے آ جاؤ اور بکھر جاؤ۔ اکیلے اکیلے ہو جاؤ تاکہ دشمن بھی تمہاری تلاش میں بکھر جائے۔ دشمن بکھر گیا تو سمجھو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.... فتح ہماری ہو گی۔ آزادی یا موت"۔

اس کے نیچے کمانڈر ناسوشن کے دستخط تھے۔

گوریلا فورس کے پاس ایمونیشن کی کمی ہو گئی تو ان کے ہیڈ کوارٹر سے ایک آپریشن آرڈر جاری ہُوا جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

".... رائفلوں اور مشین گنوں کے ایمونیشن کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے دشمن کی کنوائیوں پر شب خون پہلے سے زیادہ مارو اور ایمونیشن اکٹھا کرو۔ ہر پارٹی کا کمانڈر اپنے جوانوں کو سختی سے بتائے کہ ایمونیشن احتیاط سے استعمال کرے۔ پتہ چلا ہے کہ بعض جوان اندھا دھند فائر کر دیتے ہیں۔ اس طرح ایمونیشن ضائع ہوتا ہے۔ ہر گوریلا جوان اس اصول پر عمل کرے کہ ایک گولی ایک دشمن.... ایک بھی گولی ضائع نہ ہو.... آزادی یا موت"۔

میں زیادہ دلچسپ' سنسنی خیز اور ایمان افروز تفصیلات سنانے سے پہلے اتحادیوں کے ہیڈ کوارٹر کا ایک آپریشن آرڈر پیش کر رہا ہوں۔ اس آرڈر میں فوجی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں' میں انہیں عام فہم زبان میں پیش کرتا ہوں۔ یہ چھوٹا سا ایک اقتباس ہے:

"اس آپریشن کا مقصد ہے ایک گوریلا گروہ کا خاتمہ.... فوج اس طرح حملہ کرے گی — مغربی سمت سے تین بٹالین' مشرقی سمت سے دو بٹالین اور ایئر فورس کے لڑاکا طیارے' جنوب سے چار پلاٹونیں' شمال سے ایک بٹالین ایڈوانس کرے گی۔ اس حملے کو توپ خانے کی سپورٹ حاصل ہو گی۔ فضا میں دیکھ بھال کے لئے ایک آسٹر طیارہ ہو گا... جس یونٹ کمانڈر کو ضرورت محسوس ہو وہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے رائل ایئر فورس سے لڑاکا ہوائی جہاز بلوا سکتا ہے.... توپ خانہ یونٹ کمانڈروں کے دیئے ہوئے ٹارگٹ پر فائر کرے گا"۔

یہ جنگی طاقت جو اس آپریشن آرڈر میں بیان کی گئی ہے دو بریگیڈوں جتنی ہے۔ دو بریگیڈوں کو استعمال کیا گیا کس کے خلاف؟.... صرف ایک گوریلا گروہ کے خاتمے کے لئے۔

یہ ساری دنیا نے دیکھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کے ایک بھی گوریلا گروہ کا خاتمہ نہیں کیا جا سکا تھا۔

میں انڈونیشی مسلمانوں کا ایک واقعہ سناتا ہوں جو ناقابل یقین لگتا ہے لیکن اس کے گواہ برطانیہ کے دو اخبار ہیں اور ہندوستان کے انگریزی اخباروں میں بھی یہ تصویر چھپی تھی۔ بعد میں مَیں نے ایک کتاب میں یہ واقعہ پڑھا تھا اور اس کتاب کا مصنف ایک

امریکی وقائع نگار تھا..... ہوائی جہازوں کی لڑائیاں فضا میں ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز کو ہوائی جہاز ہی گرا سکتا ہے یا طیارہ شکن گنیں ہوائی جہاز کو مار سکتی ہیں لیکن کون مان سکتا ہے کہ انڈونیشیا کے جنگلی نے برچھی سے ایک لڑاکا طیارہ گرا لیا تھا۔ یہ لڑاکا ہوائی جہاز انگریزوں کی ایئر فورس کا اس وقت کا تیز رفتار ہوائی جہاز تھا جسے Spitfire کہتے تھے۔

انڈونیشیا کے گوریلے جنگلوں میں ہی رہتے تھے۔ اُس وقت انڈونیشیا کے جنگل بڑے ہی گھنے اور دشوار گذار تھے۔ وہاں کسی کو ڈھونڈ نکالنا آسان کام نہیں تھا۔ اتحادیوں نے گوریلوں کے خلاف اپنے لڑاکا بمبار طیارے استعمال کئے تھے۔ برطانیہ کی ایئر فورس جسے رائل ایئر فورس کہا جاتا تھا" کا ایک لڑاکا ہوائی جہاز وہاں کے ایک جنگل کے اوپر بہت کم بلندی پر اُڑ رہا تھا۔ ایئر فورس کی زبان میں اُسے درختوں کی بلندی پر اڑنا کہتے ہیں۔ اس ہوائی جہاز کے پائلٹ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ نیچے سے اس پر طیارہ شکن گنیں فائر ہوں گی اس لئے وہ اتنی خطرناک کم بلندی پر اڑ رہا تھا۔ نیچے ایک انڈونیشی برچھی ہاتھ میں لئے کہیں جا رہا تھا۔ اُس نے ہوائی جہاز کو اتنا نیچے اُڑتے دیکھا تو وہ ایک اونچی ٹیکری پر چڑھ گیا۔

ایک بار یہ ہوائی جہاز اُس کے اوپر آ گیا۔ ہوا باز نے تو اس کی طرف توجہ ہی نہ دی ہو گی لیکن یہ جنگلی سا انڈونیشی ہوائی جہاز کو دیکھتا رہا۔ کچھ دُور جا کر ہوائی جہاز پھر اس کی طرف آیا۔ اب کے اس کی بلندی اور زیادہ کم ہو گئی تھی۔ ادھر یہ انڈونیشی بلند ٹیکری پر کھڑا تھا۔

جب طیارہ اُس کے قریب آیا تو اُس نے یہ برچھی اس طرح ہاتھوں میں تان لی جس طرح وہ شیر پر پھینکا کرتا تھا۔ ہوائی جہاز اُس کے اوپر سے گزرنے لگا تو اس نے پوری طاقت سے برچھی پھینکی۔ اس جنگلی انڈونیشی کو یقیناً" پتہ نہیں ہو گا کہ ہوائی جہاز کا نازک حصہ کون سا ہوتا ہے۔ ہوائی جہاز کی باڈی ایک پتلی سی دھات کی بنی ہوئی ہوتی ہے جو ایلومینیم سے بھی پتلی ہوتی ہے لیکن اس میں ہوا کا انتہائی تیز دباؤ برداشت کرنے کی مضبوطی ہوتی ہے لیکن یہ دھات ذرا سی بھی ضرب سے برداشت نہیں کر سکتی اور گولی اس میں سے نہایت آسانی سے گزر جاتی ہے۔ اس جنگلی کی برچھی ہوائی جہاز میں ایسی جگہ اُتر گئی جہاں آگے غالباً" پٹرول کی نالی تھی یا ہو سکتا ہے یہ پٹرول کی ٹینکی میں لگی ہو۔ ہوائی جہاز کی پٹرول کی ٹینکیاں اس کے پروں میں ہوتی ہیں۔ بہرحال ہُوا یہ کہ ہوائی جہاز

کے انجن کا پٹرول رکنے لگا اور اُس کی پرواز ڈانواں ڈول ہو گئی۔ پائلٹ کے بیان کے مطابق اُسے ذرا سا بھی شک نہ ہُوا کہ اس کے طیارے کے نیچے برچھی لگی ہوئی ہے جو ابھی تک طیارے میں ہی ہے۔

ہوائی جہاز سے پٹرول زیادہ بہہ رہا تھا اور انجن کو کم مل رہا تھا۔ انجن رُکتا اور خود ہی چل پڑتا تھا۔ اس صورتِ حال میں پائلٹ نے اپنے اڈے کا رخ کر لیا۔

وہ اپنے اڈے پر پہنچ تو گیا لیکن ہوائی جہاز اس کے قابو سے نکلا جا رہا تھا۔ نیچے سے سب نے دیکھا اس کے طیارے کے نیچے ایک بانس سا لٹک رہا ہے۔ سب حیران ہوئے کہ یہ کیا ہو سکتا ہے۔ اتفاق سے ہوائی اڈے پر ایک اخباری رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی موجود تھا۔ یہ لوگ گوریلا آپریشن اور اس کے خلاف کارروائیوں کی خبریں لینے آیا کرتے تھے۔ فوٹو گرافر نے اس ہوائی جہاز کی تصویر لے لی۔ یہ تصویر ساری دنیا میں مشہور ہوئی۔

جب پائلٹ طیارہ اُتار رہا تھا یعنی لینڈنگ کے لئے رن وے پر آیا تو اس کا پٹرول بالکل ہی ختم ہو گیا۔ ہوائی جہاز رن وے پر ٹھیک طرح اترنے کی بجائے بڑی زور سے گرا اور اسے بہت بڑا نقصان پہنچا۔ پائلٹ تو بچ گیا لیکن ہوائی جہاز وقتی طور پر یا شاید ہمیشہ کے لئے بے کار ہو گیا۔ پائلٹ نے بیان دیا کہ اب اسے یاد آتا ہے کہ اس نے ایک آدمی کو بلند جگہ کھڑے دیکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں برچھی تھی لیکن اس کی طرف اس نے ایسی توجہ نہیں دی تھی جیسی کسی مشکوک آدمی کو دی جاتی ہے۔ بعد میں یہ پتہ چل گیا تھا کہ وہ ایک جنگلی آدمی تھا جو برچھی سے شکار کھیلا کرتا تھا۔ یہ سمجھنا اور یقین کرنا مشکل نہیں کہ برچھی ہوائی جہاز کی باڈی یا ونگ میں کس طرح اتر گئی تھی۔ ہوائی جہاز کی رفتار بہت تیز تھی اور ادھر سے اس شخص نے برچھی پوری طاقت سے ماری تھی۔ اس طرح ہوائی جہاز کی رفتار اور برچھی پھینکنے والے کی طاقت نے برچھی کا کام آسان کر دیا اور برچھی ہوائی جہاز میں اُتر گئی۔

اس واقعہ کے بعد رائل ایئر فورس نے ایک حکم جاری کیا تھا کہ جنگل کے اوپر اُڑتے ہوئے کوئی پائلٹ پانچ سو فٹ کی بلندی سے نیچے نہ اُڑے۔

○

لب انڈین آرمی کو انڈونیشی حریت پسند گوریلوں کے خلاف استعمال کیا جانے لگا۔

میری بٹالین بھی کمپنی کمپنی اور پلاٹونوں پلاٹون ہو کر بکھر گئی۔ ہر کمپنی اور ہر پلاٹون کو الگ الگ ٹاسک اور مشن دے دیا گیا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر ایک قصبے میں رہا۔ میں بٹالین ہیڈ کوارٹر میں تھا۔ آگے میرا کوئی کام نہ تھا۔ جب انڈین آرمی گوریلوں کے خلاف ایکشن میں آئی تو ایک اور ہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ انڈین آرمی کے مسلمان اہلکار اِدھر سے بھاگ کر انڈونیشی گوریلوں سے ملنے لگے۔ حریت پسندوں کا نعرہ — "مردیکا" — ہر طرف مشہور ہو گیا تھا۔ مردیکا کے معنی ہیں آزادی۔ جب انڈین آرمی کے مسلمان ادھر سے بھاگ کر گوریلوں کے پاس جانے لگے تو ایک اور نعرہ مشہور ہو گیا — "مسلم سمہ سمہ"..... اس کا مطلب ہے — "مسلمان ایک ہیں" — یہی نعرہ تھا جو ایک روز مجھے بھی انڈونیشی حریت پسندوں کے پاس لے گیا اور میں نے ان کے پاس خاصا عرصہ گذارا۔ یہ بات سنانے سے پہلے میں ایک بڑا ہی جذباتی اور ولولہ انگیز واقعہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ واقعہ تمام تر ہندوستانی یونٹوں میں مشہور ہو گیا تھا۔ یہ غالباً" بنڈونگ کے علاقے کا واقعہ ہے۔ میں نے یہ واقعہ سنا تھا اور جس کا یہ کارنامہ ہے وہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ وہ آٹھ پنجاب کی بٹالین کا حوالدار تھا اور اس کا نام حوالدار اکبر تھا۔ اتفاق سے میں نے اسے دو تین مرتبہ دیکھا بھی تھا۔ چھ فٹ کا بڑا خوبرو جوان تھا۔ یہ تو میں سنا چکا ہوں کہ ولندیزی عورتوں کا کردار کس قدر گھٹیا اور شرمناک تھا۔ وہ فوجیوں کے ساتھ راشن پانی کے لئے اور بسکٹوں اور سگریٹوں کے ڈبوں کے لئے اور شراب اور بیئر کے لئے دوستی لگاتی تھی لیکن ایک ولندیزی لڑکی حوالدار اکبر پر ایسی فریفتہ ہوئی کہ اسی کی ہو کے رہ گئی۔ حالانکہ ولندیزی لڑکیوں کا وطیرہ یہ تھا کہ وہ اُس کی ہوتی تھیں جن سے انہیں راشن ملتا تھا۔ آج کسی کے ساتھ اور کل کسی اور کے ساتھ لیکن یہ لڑکی اپنے دل میں حوالدار اکبر کی محبت لے بیٹھی۔

یہ بھی پتہ چلا کہ یہ لڑکی اکبر کو عیسائی ہو جانے کی ترغیب دیتی رہتی تھی لیکن اکبر ایک لڑکی کی خاطر اپنا مذہب چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی یہ محبت قائم رہی۔ اکبر نے لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ محبت مذہب نہیں دیکھا کرتی۔ اگر مذہب کوئی دیکھنا ہے اور تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں اپنا مذہب چھوڑنا پڑے گا۔ لڑکی اس کے پاس آتی رہی اور دونوں اکٹھے گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ یہ گواہی ہر کوئی دیتا تھا

کہ اس ولندیزی لڑکی نے کسی دوسرے فوجی کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ایک روز حوالدار اکبر کی کمپنی یا پلاٹون گوریلوں کے خلاف ایک مشن پر گئی۔ اطلاع ملی تھی کہ گوریلوں کا ایک گروہ فلاں جگہ موجود ہے۔ کمپنی وہاں تک پہنچی تو گوریلوں نے فائر کھول دیا۔ ادھر کمپنی بھی پوزیشن میں ہو گئی اور دونوں طرف سے بے پناہ فائر ہونے لگا۔ کمپنی کی نفری زیادہ تھی۔ نظر یہی آ رہا تھا کہ کمپنی ان گوریلوں کو گھیرے میں لے کر پکڑ لے گی یا سب کو ختم کر دے گی۔

گوریلوں کی طرف سے نعرہ بلند ہُوا — "مردیکا" — پھر دوسرا نعرہ بلند ہُوا — "مسلم سمہ سمہ" — حوالدار اکبر اچانک اپنی پوزیشن سے اٹھا اور اس نے بڑی ہی بلند آواز سے نعرہ لگایا — "مردیکا" — اور گوریلوں کی طرف دوڑ پڑا اور پھر اس نے دوڑتے دوڑتے دوسرا نعرہ لگایا — "مسلم سمہ سمہ" — وہ گوریلوں سے جا ملنے کے لئے دوڑا جا رہا تھا۔ وہ مردیکا مردیکا کے نعرے لگاتا جا رہا تھا۔

کمپنی کمانڈر ایک انگریز کیپٹن تھا۔ اس بدبخت نے پیچھے سے حوالدار اکبر پر فائر کر دیا اور اکبر گوریلوں اور اپنی کمپنی کے درمیان گر پڑا۔ اس کی لاش اٹھانے کے لئے گئے تو گوریلوں نے فائر بہت زیادہ کر دیا۔ اس فائر سے دو تین جوان مارے گئے۔

حوالدار اکبر گوریلوں تک نہ پہنچ سکا اور گوریلے کمپنی کے گھیرے سے نکل گئے۔ اکبر کو وہیں کہیں یا غالباً" بنڈونگ میں دفن کر دیا گیا۔

وہ لڑکی اُسے ملنے آئی تو اُسے بتایا گیا کہ اکبر اس طرح مارا گیا ہے۔ اُسے اکبر کی قبر بھی دکھائی گئی۔ لڑکی کا تو یہ عالم تھا جیسے اُس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہو۔ وہ زیادہ تر اکبر کی قبر پر ہاتھ پھیرتی اور دھاڑیں مار مار کر روتی رہتی تھی۔ گھر والے اسے وہاں سے اٹھانے آتے تو وہ کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ آخر ایک روز اُس نے چلّا کر نعرہ لگایا — "مردیکا.... مردیکا" — اور جنگل کی طرف دوڑ پڑی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ واپس نہیں آئی تھی اور اسے انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایک خبر یہ بھی سنی تھی کہ وہ مسلمان ہو گئی تھی لیکن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

انڈونیشی حریت پسندوں کی جنگِ آزادی نے ایسی کئی ایک ولولہ انگیز اور ایمان افروز کہانیوں کو جنم دیا تھا۔ یہ تو تمہید ہے جو میں نے باندھی ہے' آگے جا کر تفصیلات پیش کروں گا اور آپ ایک روز مجھے بھی اور انڈین آرمی کے بے شمار مسلمانوں کو بھی انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ مردیکا کا نعرہ لگاتے دیکھیں گے۔ (جاری ہے)

میری یہ روئیداد انڈونیشیا میں داخل ہو گئی ہے اور اس نے میرے لئے ایک مشکل پیدا کر دی ہے۔ مشکل یہ کہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کون سی بات حذف کروں اور کون سی سناؤں۔ وہاں گذارا ہُوا ایک ایک لمحہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ جی چاہتا ہے ہر لمحے کی بات سناؤں لیکن یہ ممکن نہیں۔ ممکن تو یہ بھی نہیں کہ میں بعض باتیں حذف کر دوں۔ بہرحال چیدہ چیدہ باتیں ضرور سناؤں گا۔

برما کے جنگل کی بات کچھ اور تھی۔ وہ تو پُراسرار اور خطرناک جگہ تھی جہاں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا اور ہُوا بھی لیکن وہاں میں اپنی ذات کو اور اپنے دین و ایمان کو بھی بھول گیا تھا' البتہ اپنے کردار کو جسے آپ ایمان کہہ لیں' کچھ کہہ لیں' قائم رکھا تھا۔ وہاں مجھ پر جو گزری اور میں نے وہاں جو دیکھا' وہ الف لیلیٰ کی داستانیں لگتی ہیں لیکن انڈونیشیا میں آکر ایک ہی بات ذہن اور دل میں بیٹھ گئی کہ یہ ایک مسلمان قوم ہے' حریّت پسند ہے اور میں بھی مسلمان ہوں۔ میں ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں کہ اُس وقت دنیا کے اس خطے کو انڈونیشیا نہیں کہتے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان جزیروں کے جھرمٹ کو انڈونیشیا کا نام دیا جائے گا اور ایک دن یہ اسلامی مملکت ہو گی۔ میں نے کفر کے خلاف جہاد دیکھا ہے تو انڈونیشیا میں دیکھا ہے۔

اس سے پہلے جہاد شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی علاقے میں دیکھا تھا۔ میں دو تین بار کہہ چکا ہوں کہ میرا ایمان وہیں بیدار ہُوا تھا۔ میں نے ملایا میں جب اپنی یونٹ میں جانے کا فیصلہ کیا تھا تو وہ مایوسی کے عالم میں کیا تھا۔ میں کچھ بھٹک سا گیا تھا۔ میرے دل نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ تو تجمل خوار ہونے والی بات ہے' بہتر ہے انگریزوں کی

فوج میں واپس چلے چلو لیکن انڈونیشیا میں ہمیں جب وہاں کے حریّت پسند مسلمانوں کے خلاف مورچہ بند کیا گیا تو میرا ایمان پہلے سے زیادہ بیدار ہو گیا اور میں اپنے آپ کو پکّا مسلمان سمجھنے لگا۔

میں نے انڈونیشیا میں جو دیکھا اور جو کیا' وہ تو سناؤں گا ہی لیکن میں بہتر سمجھتا ہوں کہ انڈونیشی حریّت پسندوں کے متعلق غیروں نے بعد میں جو لکھا تھا' اس کی تھوڑی سی جھلک پہلے ہی دکھا دوں۔ اگر میں نے ان کی تعریفوں کے پُل باندھنے شروع کر دیئے تو آپ کہیں گے کہ یہ شخص مبالغہ آرائی کر رہا ہے اس لئے پہلے میں آپ کو غیروں کی رائے سناتا ہوں۔

انڈونیشیا کا زیادہ تر علاقہ جنگلاتی ہے اور جنگل اتنے گھنے ہیں کہ بعض جگہوں پر تو آسمان بھی نظر نہیں آتا۔ بہت سے علاقے پہاڑیوں اور چٹانوں والے ہیں اور جزیرے تو بے شمار ہیں۔ میں اگر فوجی نقطۂ نظر سے بات کروں تو یہی کہوں گا کہ یہ علاقہ گوریلا جنگ کے لئے موزوں تھا لیکن علاقے کا موزوں ہونا ہی کافی نہیں ہُوا کرتا' لڑنے والوں میں جذبہ نہ ہو تو قدرت کی عطا کی ہوئی ان سہولتوں سے اور نہایت اچھے ہتھیاروں سے بھی وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے منظّم گوریلا جنگ لڑی اور زمین کے خدوخال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کی تعریف امریکہ' برطانیہ اور دوسرے ملکوں نے بھی کی تھی کہ جس طرح انڈونیشی مسلمان لڑے ہیں اس طرح کوئی اور قوم جنگِ آزادی نہیں لڑ سکی۔

امریکہ سے ایک ماہانہ پرچہ نکلتا ہے جس سے آپ یقیناً" واقف ہوں گے۔ اس کا نام "ریڈرز ڈائجسٹ" ہے۔ انگریزی کا یہ پرچہ ساری دنیا میں جاتا ہے اور لوگ اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس پرچے میں چھپا ہوا ایک ایک لفظ حقیقت ہوتا ہے اور یہ پرچہ مبالغہ آرائی سے پاک ہوتا ہے۔ میں جب مدت بعد اپنے وطن واپس آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ "ریڈرز ڈائجسٹ" ہمارے ہاں اتنا زیادہ مقبول ہے جتنا اپنا اُردو کا کوئی پرچہ نہیں ہوتا۔

ایک بار میں نے اس پرچے میں انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کے متعلق تفصیلی مضمون پڑھا۔ چونکہ میں نے یہ جنگ ابتدا سے فتح تک دیکھی تھی' میں انڈونیشی مسلمانوں کے دوش بدوش کفّار کے خلاف لڑا بھی تھا' اس لئے میں نے یہ مضمون بڑے

شوق سے پڑھا۔ مضمون اُس اخباری رپورٹر نے لکھا تھا جس نے یہ ساری جنگِ آزادی اپنی آنکھوں دیکھی تھی۔ اُس نے امریکہ کی ایئرفورس کے ہوابازوں کو بہت خراجِ تحسین پیش کیا تھا کہ وہ اتنی کم بلندی پر جا کر انڈونیشی مجاہدین پر بمباری اور فائرنگ وغیرہ کرتے تھے جہاں درختوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا کر تباہ ہو جانے کا خطرہ ہوتا تھا۔ اُس نے انڈونیشی مسلمانوں کے جذبے کی اور ان کے قربانیاں دینے کے انداز کی بھی تعریف کی لیکن اپنی ایئرفورس کی بات اس طرح کر رہا تھا جیسے اس کے ملک کے ہوابازدنیا کی ایک بہت بڑی طاقت کے خلاف لڑ رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انڈونیشی مجاہدین کس شدت سے لڑے تھے اور انہوں نے دنیا کی اُس وقت کی بڑی طاقتوں کو بے حال کر دیا تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ تین ملکوں کی فوجیں انڈونیشی مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لئے لڑ رہی تھیں.... امریکہ' برطانیہ' ولندیزی اور آسٹریلیا اور ہندوستان کی افواج جو انگریز کے ماتحت تھیں.... امریکہ اور برطانیہ کے ہوائی بیڑے بھی انڈونیشی حریت پسندوں پر آگ برسا رہے تھے۔ ان کے بحری جنگی جہاز بھی آگ اگلتے رہتے تھے۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے مضمون میں مصنف نے لکھا کہ امریکہ کے ہوائی جہاز بہت کم بلندی پر جا کر جنگلوں میں بمباری اور فائرنگ وغیرہ کرتے تھے اور خیال یہ ہوتا تھا کہ اتنی زیادہ بمباری سے اس جنگل میں کوئی جاندار زندہ نہیں رہا ہو گا لیکن نیچے سے انڈونیشی مجاہدین ہوائی جہازوں پر رائفلوں اور مشین گنوں سے فائرنگ کرتے تھے۔ انہوں نے چند ایک ہوائی جہاز گرا بھی لئے تھے۔

امریکی ایئرفورس کے ہوائی جہاز آگ برسا کر چلے جاتے تو برطانیہ کی رائل ایئرفورس کے ہوائی جہاز آ جاتے تھے۔ ان دونوں ملکوں کے جاسوس انڈونیشیا میں موجود تھے۔ وہ اکثر اوقات صحیح نشاندہی کرتے تھے کہ فلاں جنگل میں فلاں جگہ گوریلوں کا ایک گروہ اس وقت موجود ہے یا فلاں جگہ گوریلوں کا کمانڈر کانفرنس کر رہا ہے اور وہاں گوریلوں کا اچھا خاصا جمگھٹا ہے۔ ہوائی جہاز فوراً وہاں پہنچتے اور عین اُس مقام پر بمباری کرتے لیکن دشمن کے جاسوس جب خبریں بھیجتے کہ گوریلوں کا کتنا نقصان ہُوا ہے تو وہ صفر ہُوا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کے گوریلا کمانڈروں نے بلندیوں پر دیکھ بھال کی پوسٹیں بنا رکھی تھیں جو دور سے ہوائی جہاز آتے دیکھ کر ہر کسی کو خبردار کر دیتی تھیں۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" کے اس مضمون میں انڈونیشی حریت پسندوں کی بہادری کی جہاں تعریفیں کی گئی تھیں' وہاں ان کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ امریکیوں کو یہ بالکل پسند نہیں کہ مسلمان آزادی کی جدوجہد کریں۔ اس مضمون کے مصنف نے مسلمانوں کا ذکر اس طرح کیا جیسے کوئی گھٹیا سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے جن کا قطعاً "حق نہیں تھا کہ انہیں آزادی دی جاتی بلکہ یہ لوگ غلام ہی رکھے جانے کے قابل تھے۔ مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کو دبا کر تہہِ تیغ کر کے رکھا جائے اور کہیں کوئی نئی اسلامی مملکت وجود میں نہ آئے۔ صحیح الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ امریکہ' برطانیہ اور ہالینڈ نے انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کو صلیبی جنگ قرار دے دیا تھا اور وہ تمام تر دنیائے صلیب کو دعوت دے رہے تھے کہ وہ انڈونیشی مسلمانوں کو تہہِ تیغ کرنے کے لئے تعاون کرے۔

○

پھر کچھ عرصہ بعد میرے ہاتھ میں انگریزی کا ہی ایک اور پرچہ آ گیا تھا۔ مجھے اس پرچے کا نام یاد نہیں رہا' یہی یاد رہ گیا ہے کہ یہ ہفت روزہ پرچہ تھا اور امریکہ سے نکلتا تھا۔ اس پرچے میں بھی انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کے متعلق ایک مضمون تھا۔ اس مضمون میں تو انڈونیشی مسلمانوں کو لٹیرے اور قزاق کہا گیا تھا لیکن جس جذبے سے انڈونیشی لڑے' اس کی اس نے تعریف کی تھی۔ تعریف کا انداز یہ نہیں تھا کہ اس نے لکھا ہو کہ انڈونیشی ایک قوم ہیں اور آزادی چاہتے ہیں بلکہ اس نے تعریف اس طرح کی تھی جیسے ڈاکوؤں کے کسی گروہ کی دلیری کی بات کر رہا ہو۔

تعصب کے باوجود اُس نے امریکی ایئرفورس کے ایک ہواباز کی کہانی لکھی۔ اس نے لکھا کہ یہ ہواباز کئی بار انڈونیشی گوریلوں کے ٹھکانوں پر اور اُن کے جمگھٹوں پر بمباری اور مشین گن فائرنگ کے لئے گیا اور اس نے ہر بار صحیح بمباری کی۔ ایک بار وہ دو ہوائی جہازوں کے ساتھ گیا' یعنی تین لڑاکا بمبار ہوائی جہاز گئے جن میں ایک اس پائلٹ کا تھا۔ مضمون میں اس کا نام بھی لکھا تھا جو میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ ان تینوں ہوابازوں نے اس جنگل پر جس کی نشاندہی کی گئی تھی' درختوں کی بلندی پر اُڑتے ہوئے وہ تمام بم جگہ جگہ گرائے جو وہ لے گئے تھے اور اس کے بعد مشین گنیں اس طرح فائر کیں جس طرح فوارے سے پودوں کو پانی دیا جاتا ہے۔

پھر ہُوا یہ کہ ان تین میں سے دو ہواباز واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ ان کا تیسرا

ساتھی غوطے میں گیا اور پھر اٹھا نہیں۔ انہوں نے اس ہوائی جہاز میں سے دھواں نکلتے نہیں دیکھا تھا جس سے یہ کہا جا سکتا کہ اُسے یعنی اُس کے انجن میں گولیاں لگ گئی تھیں اور وہ اوپر اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ان ہوابازوں نے اپنے تیسرے ساتھی کے ہوائی جہاز کو کسی درخت یا پہاڑی سے ٹکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔

ان دونوں نے بیان دیا کہ جب ان کا یہ ساتھی اوپر نہ اٹھا تو یہ سمجھ لیا گیا کہ وہ ہٹ ہو گیا اور کریش کر گیا ہے۔ دونوں ہوابازوں نے بڑی کم بلندی پر جا کر نیچے دیکھا اور بہت دیر وہیں نیچے نیچے پرواز کرتے رہے۔ آخر انہوں نے جنگل کے ایک نشیب میں سے دھواں اٹھتا دیکھا۔ یہ سیاہ دھواں تھا جو یقیناً" اُس ہوائی جہاز کا تھا جو گر پڑا تھا۔ یہی کہا جا سکتا تھا کہ اس کا ہوباز مارا گیا ہے۔ امریکہ کی ایئر فورس یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ان کا یہ ہوباز مارا گیا ہے یا کہیں اور گر کر زندہ ہے تو کیا وہ جنگی قیدی بنا لیا گیا ہے؟.... امریکی ایئر فورس نے ریڈ کراس والوں سے کہا کہ وہ اس پائلٹ کے متعلق معلوم کر دیں۔

میں نے پچھلے باب میں بتایا ہے کہ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی ایک باقاعدہ اور منظم گوریلا جنگ تھی۔ ان کی باقاعدہ ہائی کمانڈ تھی اور اس کے نیچے دوسرے ہیڈ کوارٹر تھے جو سارے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے اور ان ہیڈ کوارٹروں کے تحت گوریلا گروہ تھے جنہیں باقاعدہ ایک سکیم اور پلاننگ کے تحت آپریشن آرڈر ملتے تھے اور وہ لڑتے تھے۔ ریڈ کراس والوں نے انڈونیشی کمانڈ سے رابطہ قائم کیا تو وہاں سے فوری طور پر کوئی جواب نہ ملا اور یہ کہا گیا کہ ایک امریکہ ہوباز کو مار گرایا گیا ہے اور وہ زندہ بھی ہے لیکن اس کے متعلق ابھی وہ کچھ بھی نہیں بتا سکتے۔ ریڈ کراس کے نمائندے بہت حیران ہوئے کہ یہ کیا بات ہوئی۔ کہہ دیا جاتا کہ اُسے مار گرایا گیا تھا اور وہ زندہ ہے یا ہوائی جہاز کریش ہُوا تو وہ مر گیا تھا۔

ڈیڑھ دو مہینے بعد ریڈ کراس والوں کو بتایا گیا کہ امریکہ کا وہ لڑاکا ہوباز زندہ ہے اور ریڈ کراس اپنے نمائندے کو ہائی کمانڈ میں بھیج دے.... یہ عالمی ریڈ کراس تھی جسے قیدی کیمپ دیکھنے کا بھی حق حاصل تھا۔ اس کے دو تین نمائندے انڈونیشی گوریلوں کے ہائی کمانڈ کے ہیڈ کوارٹر میں گئے تو انہیں بتایا گیا کہ یہ امریکی ہوباز اپنی مرضی سے جنگل میں ذرا جگہ دیکھ کر اُتر آیا تھا اور اُس کا ہوائی جہاز اُترا تو گیا لیکن آگے جگہ تھوڑی تھی اس لئے درخت سے ٹکرا گیا لیکن رفتار اتنی کم تھی کہ جہاز تو بے کار ہو گیا لیکن ہوباز صحیح

اور سلامت باہر نکل آیا۔

وہ انڈونیشی گوریلوں کا جنگی قیدی تھا اور اسے قیدی بنا بھی لیا گیا لیکن اُس نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے اُترا ہے اور وہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ رہے گا.... ریڈ کراس کے نمائندوں نے یہ بات سنی تو وہ مسکرائے جیسے انڈونیشی ہائی کمانڈ والوں نے ان کے آگے جھوٹ بولا ہو۔ یہ لگتا ہی جھوٹ تھا۔ کون مان سکتا تھا کہ ایک امریکی ہوباز جنگل میں اُتر گیا ہو اور ان گوریلوں سے ملا ہو جن پر اسے بمباری کے لئے بھیجا گیا تھا۔ ریڈ کراس والے نہ مانے۔

ہائی کمانڈ سے انہیں کہا گیا کہ انہیں کسی کا کوئی ڈر نہیں۔ اگر یہ امریکی ہوباز جنگی قیدی ہے تو وہ جنگی قیدی ہی ہے۔ اگر آپ لوگ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں تو اسے بلا لیا جائے گا اور آپ اُسے الگ بٹھا کر پوچھ سکتے ہیں۔ ہائی کمانڈ کے افسر نے یہ بھی کہا کہ ڈیڑھ دو مہینے بعد اس لئے انہیں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اتنا عرصہ وہ اس امریکی ہوباز کی جانچ پڑتال کرتے رہے تھے کہ وہ کہاں تک سچ بول رہا ہے کہ وہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ آن ملا ہے۔ انڈونیشی اُسے جھوٹا اور فریب کار سمجھتے تھے' آخر انہیں ڈیڑھ دو مہینے بعد اعتبار آ گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں جس پرچے کا حوالہ دے رہا ہوں' اس میں لکھا تھا کہ ہوباز کو بلایا گیا اور اسے ریڈ کراس کے نمائندوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس ہوباز نے کہا کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر انڈونیشیا میں اُترا ہے۔ ریڈ کراس والوں کو شک تھا کہ اس کی کسی نہ کسی طریقے سے برین واشنگ کی گئی ہے یا اسے ایسی دوائیاں پلائی گئی ہیں جنہوں نے اس کے ذہن سے اس کا ماضی نکال دیا ہے اور یہ انہی گوریلوں کا ہو کے رہ گیا ہے۔

امریکی ہوباز نے اس کی تردید کی اور کہا کہ وہ بھی ڈاکٹر کو یا کسی ماہر نفسیات کو یا جو کوئی پوری چھان بین کر سکتا ہے اور اس کے سامنے جانے کو تیار ہے اور وہ پوری طرح اس کا چیک اپ کر لے۔ اُس نے کہا کہ اسے پتہ چلا کہ جن پر وہ بمباری اور گن فائرنگ کرتا ہے' وہ کوئی باقاعدہ فوج نہیں اور وہ اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

اُس نے یہ بھی کہا کہ پہلے ان لوگوں پر ولندیزی اس طرح حکومت کرتے رہے کہ انہیں زر خرید غلام بنائے رکھا اور یہ لوگ اپنے حقوق سے محروم رہے۔ پھر جاپانی آ گئے اور انہوں نے انہیں اور ہی مشکلات اور پریشانیوں میں ڈال دیا۔ یہ صحیح ہے کہ جاپانیوں

نے ان کی اپنی حکومت بنا دی تھی لیکن یہ جاپانیوں کی ایک فریب کارانہ چال تھی۔ انہوں نے ان لوگوں کو دوستی اور محبت کا جھانسہ دے کر دوست بنا لیا تھا اور یہ دوستی ایک اور ہی قسم کی غلامی تھی۔ اب یہ لوگ اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں تو انہیں آزاد کیوں نہیں کیا جاتا۔ امریکہ اور برطانیہ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اتنے غیور اور پُروقار لوگوں کو اپنا غلام بنالیں اور ان کی زمین پر قبضہ کرلیں۔

ریڈ کراس کے یہ نمائندے امریکہ اور برطانیہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اس امریکی ہوا باز سے کہا کہ اس کی سوچ بہت ہی غلط ہے اور یہ لوگ جو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں' یہ کسی اور مذہب کے لوگ ہیں۔ ریڈ کراس کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی کیونکہ ریڈ کراس کے ہاں دوست اور دشمن کا کوئی تصوّر نہیں ہوتا۔ یہ تنظیم لڑنے والے دونوں ملکوں کی یکساں طور پر خیرخواہ ہوتی ہے لیکن اس تنظیم کے ان نمائندے برداشت نہیں کرسکے تھے کہ ایک امریکی مسلمانوں سے جا ملے۔

انڈونیشی ہائی کمانڈ نے اس امریکی ہوا باز کے فوٹو لے کر ریڈ کراس کے نمائندوں کو دیئے اور کہا کہ یہ ساری دنیا کو دکھاؤ اور دنیا کے آگے سچ بولو کہ جن لوگوں کا ضمیر پاک اور صاف ہے' وہ کس کے ساتھ ہیں۔ ریڈ کراس کے نمائندوں نے بڑی مایوسی کے عالم میں یہ فوٹو لئے اور چلے گئے۔

انڈونیشی ہائی کمانڈ کو اس امریکی ہوا باز پر یہ شک تھا کہ ان کے ساتھ رہ کر جاسوسی کرے گا اور انہیں دھوکہ دے گا لیکن اُس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی اور وہ ہائی کمانڈ میں ان کا ایڈوائزر بن گیا۔ وہ افسوس کا اظہار کرتا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کے پاس ہوائی جہاز نہیں ورنہ وہ ان ہوائی جہازوں کو امریکہ اور برطانیہ کے خلاف استعمال کرتا۔

امریکہ والوں نے اس ہوا باز کی خبر کا بلیک آؤٹ کیا تاکہ کسی اور کو پتہ نہ چل سکے ورنہ اس جیسے اور کئی فوجی اِدھر سے بھاگ کر اُدھر انڈونیشی گوریلوں کے پاس چلے جائیں گے۔ ظاہر ہے امریکہ نے اس ہوا باز کو جنگی قیدی قرار دے دیا ہو گا۔ اس کے بعد اتنا پتہ چلا کہ یہ امریکی ہوا باز انڈونیشیا میں ہی رہا تھا' اس نے یہیں شادی کرلی تھی اور پھر معلوم نہیں وہ کہاں رہا' البتہ یہ مصدقہ اطلاع تھی کہ وہ اپنے ملک واپس نہیں گیا تھا۔ اس رسالے میں یہ تو نہیں لکھا تھا کہ اُس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا یا نہیں' یہ میں کہتا ہوں کہ اُس نے یقیناً" اسلام قبول کرلیا ہو گا۔

اب ایک اور عجیب و غریب واقعہ سنئے۔ یہ میں نے انڈونیشیا میں بھی سنا تھا لیکن اتنا م اور مختصر سا سنا تھا کہ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ یہ اُس وقت نے سنا تھا جب برسوں بعد انڈونیشیا کے حریّت پسندوں نے امریکہ اور برطانیہ کو ت دے کر آزادی حاصل کرلی تھی اور میں وہیں رکا رہا تھا۔

میں جب مدت بعد پاکستان واپس آیا تو "ریڈرز ڈائجسٹ" ہی کا ایک اور پرچہ ہاتھ یہ پرچہ مجھے اتنا اچھا لگنے لگا تھا کہ میں کوشش کرتا تھا کہ ہر مہینے مجھے ملے اور میں پڑھا ں۔ بہرحال ایک اور پرچہ ہاتھ لگا تو اس میں وہی واقعہ تفصیل سے لکھا ہُوا تھا جس کا نے ابھی ذکر کیا ہے۔

انڈونیشیا میں یہ واقعہ سنا تو ایک تو یہ بہت ہی مختصر اور بغیر کسی ثبوت اور شہادت کے ا گیا تھا اور میں نے ایک اور وجہ سے بھی اسے قابلِ قبول نہ سمجھا کہ یہ بات جذبات آکر ویسے ہی گھڑلی گئی ہے لیکن "ریڈرز ڈائجسٹ" میں ایک امریکی سارجنٹ کا لکھا ہی واقعہ پڑھا تو مجھے یقین آیا کہ یہ تو بالکل سچ ہے۔

یہ سارجنٹ امریکہ کی فوج کا سارجنٹ تھا اور وہ انڈونیشیا کے حریت پسندوں کے کئی سال لڑا تھا۔ اُس نے انڈونیشیا کے ایک آدمی کا ذکر کیا ہے جس کا نام یوسف تھا وہ امریکی فوج کا مخبر بن گیا تھا۔ اُسے امریکہ کے افسروں نے باقاعدہ امریکہ کی فوج میں ا کرلیا تھا اور اُسے کارپورل کا عہدہ دیا تھا۔ کارپورل ہماری فوج کے نائیک کے برابر ہے۔

یہ کوئی حیرت والی بات نہیں کہ ایک انڈونیشی مسلمان امریکہ کی فوج کا وفادار بن گیا صرف یوسف ہی نہیں' کئی اور انڈونیشی مسلمان انگریزوں اور امریکیوں کی فوج کے بن گئے تھے اور اپنے ہی بھائیوں کے خلاف مُخبری کرتے تھے۔ اگر کسی کے متعلق پتہ جاتا کہ یہ شخص جو ہمارے ساتھ اتنے پیار سے اٹھتا بیٹھتا ہے' یہ تو ہمارے دشمن کا ہے تو اُسے وہیں گولی مار دی جاتی تھی۔ میں نے ایسے تین مسلمان مُخبروں کو دیکھا تھا ں میرے سامنے گولی مارنی گئی تھی۔

اس امریکی سارجنٹ نے اپنی کہانی میں لکھا کہ وہ انڈونیشی گوریلوں کے خلاف کئی لیا اور اُس نے خونریز جھڑپیں لڑیں۔ پھر لکھا کہ انڈونیشی گوریلوں کو مارنا اور پکڑنا بڑا شکل اور خطرناک کام تھا کیونکہ ان کا جاسوسی کا نظام اتنا تیز اور مضبوط تھا کہ انہیں

پہلے ہی پتہ چل جاتا تھا کہ فلاں طرف سے دشمن کی فوج آ رہی ہے۔ وہ اس فوج کے
نہ کسی دستے کو گھات لگا کر مار ڈالتے یا بھگا دیتے تھے۔ انڈونیشیا کے حریت پسند فوج
ترتیب میں تو لڑتے ہی نہیں تھے۔ وہ گوریلا گروہوں کی صورت میں شب خون یا چھ
مارتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ انہیں کون خبر دیتا تھا
فلاں طرف سے فوج کا ایک دستہ یا اتنی نفری آ رہی ہے۔

اس امریکی سارجنٹ نے لکھا کہ کارپورل یوسف اس قدر وفادار آدمی تھا کہ
سارجنٹ ہر کارروائی میں اسی کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ سارجنٹ نے کچھ حیرت
انداز سے لکھا کہ انڈونیشیا کا مسلمان ہو کر وہ امریکہ کا وفادار کیونکر ہو گیا تھا اور وفادار
ایسا کہ جان تک قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔

سارجنٹ نے تین چار واقعات لکھے۔ ہر ایک واقعہ ایک ہی جیسا تھا' مثلاً" وہ
کی فوج کی ایک پلاٹون یعنی چالیس پچاس آدمیوں کے ساتھ گوریلوں کے کسی گرو
خلاف گیا۔ گوریلے بیدار ہو گئے یا انہیں پہلے ہی پتہ تھا' انہوں نے اس پلاٹون کو گھ
میں لے لیا۔ کارپورل یوسف ہر بار غائب ہو گیا اور سارجنٹ یہ سمجھا کہ وہ مارا گیا
لیکن ہر بار وہ واپس آ گیا اور پتہ چلا کہ وہ گوریلوں میں جا گھسا تھا اور دست بدست
میں اُس نے دو تین گوریلوں کو مار ڈالا اور دو دفعہ وہ خود بھی زخمی حالت میں واپ
تھا۔

سارجنٹ نے لکھا کہ کارپورل یوسف کی بہادری کے بعض کارنامے ایسے نا
یقین تھے جیسے اُس نے معجزہ کر دکھایا ہو۔ وہ ایسی صورتِ حال سے بھی نکل آتا تھا
میں یہ یقین ہو جاتا تھا کہ آج وہ واپس نہیں آئے گا۔ صرف یہ سارجنٹ ہی نہیں
اس کمپنی کے افسر بھی اُس کی تعریف کرتے تھے۔ ایک روز اس سارجنٹ نے اُسے کہ
وہ اتنی دلیری نہ دکھایا کرے ورنہ وہ مارا جائے گا۔

یوسف نے مسکرا کر کہا کہ وہ کبھی بھی نہیں مارا جائے گا اور جب وہ مرے گا تو
اور ہی موت مرے گا' لڑائی میں نہیں مرے گا.... سارجنٹ ہنس پڑا۔ وہ سمجھا کہ
شخص امریکہ کی وفاداری میں اتنا جذباتی ہے کہ سوچ سمجھ کر کچھ بھی نہیں کر رہا بلکہ
کچھ کرتا ہے جذبات سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ سارجنٹ نے اُسے کہا کہ وہ اپنے

کو جیب میں رکھا کرے۔

یوسف نے کہا کہ اُس کے خنجر کے دستے میں ایک تعویز پڑا ہوا ہے۔ جب تک یہ
تعویز اُس کے پاس رہے گا وہ لڑائی میں نہیں مارا جائے گا۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے خنجر کا
دستہ اوپر کھینچا تو دستہ خنجر سے الگ ہو گیا۔ اس خنجر میں اُس نے سرخ کپڑے میں بندھا
ہوا کاغذ کا ٹکڑا دیکھا' ایک چھوٹا سا ٹکڑا دکھایا اور کہا کہ یہ تعویذ اُسے ایک بزرگ نے دیا تھا اور
کہا تھا کہ یہ تعویذ اُس کی زندگی کا ضامن ہے اور وہ لڑائی میں نہیں مرے گا.... یہ کہہ کر
اس نے یہ تعویذ دستے میں ڈالا اور دستہ پھر خنجر پر چڑھا لیا۔

خنجروں کے بلیڈ بالکل سیدھے ہوا کرتے ہیں لیکن انڈونیشیا والوں کے خنجروں کے
بلیڈ سیدھے نہیں ہوتے تھے بلکہ سانپ کی شکل کے تھے۔ یعنی زِگ زَیگ تھے۔ یہ خنجر
زیادہ خطرناک زخم دیتا تھا۔ کسی کے جسم میں یہ خنجر اترتا اور جب نکلتا تو وہاں سے گوشت
کھینچ کر باہر لے آتا تھا۔

سارجنٹ نے اپنی کہانی میں لکھا کہ اُس نے یوسف کی یہ بات سنی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ
نفس اندھی عقیدت رکھنے والا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا اس
کی زندگی کا ضامن بن جائے۔ اس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ مسلمان ان توہمات کو
صحیح مانتے ہیں۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ اسے کارپورل یوسف پر رحم بھی آیا کہ یہ شخص
اپنے کسی بزرگ کے جھانسے میں آ کر ضرورت سے زیادہ دلیری اور بہادری کے
مظاہرے کرتا ہے اور کسی روز یہ بہت بُری موت مرے گا۔ اُس نے یوسف سے یہ بات
کہہ ہی دی اور کہا کہ یہ محض توہم پرستی ہے اور وہ جذباتی عقیدت کو نہیں بلکہ حقیقت
کو سامنے رکھا کرے۔

یوسف نے مسکراتے ہوئے سارجنٹ سے کہا کہ ایک روز میں یہ بھی ثابت کر دوں
گا کہ یہ تعویذ جس کے پاس بھی ہو وہ لڑائی میں نہیں مرے گا۔ سارجنٹ نے اُسے کہا کہ
اگر کسی روز یہ تعویذ مجھے دے دینا' میں تمہاری طرح گوریلوں میں جا گھسوں گا اور دیکھتا
ہوں میں زندہ واپس آتا ہوں یا نہیں۔ سارجنٹ نے لکھا کہ یہ بات سن کر یوسف ہنس پڑا
اور سارجنٹ سمجھ گیا کہ یہ تعویذ کسی قیمت پر کسی کو نہیں دے گا۔

○

سارجنٹ نے اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بتایا کہ دیکھو یہ مسلمان کیسی چیزوں کو

مانتے ہیں اور یہ صریحاً توہم پرستی ہے۔ سارجنٹ بعض اوقات افسوس سے کہا کرتا کہ کارپورل یوسف کتنا اچھا اور کتنا دلیر آدمی ہے لیکن توہم پرستی اس کی ایک کمزوری ہوئی ہے اور یہ ایک حماقت ہے۔

آگے چل کر سارجنٹ نے اپنی کہانی یوں لکھی کہ ایک روز اس کی پلاٹون کو پھر حکم ملا کہ فلاں علاقے میں گوریلوں کا ایک گروہ موجود ہے اور اس گروہ کو گھیرے میں لے کر ایسا شدید حملہ کرنا ہے کہ ایک بھی بچ کر نہ نکل سکے۔ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ اس گروہ کی نفری کچھ زیادہ ہے۔

سارجنٹ کی تحریر کے مطابق گوریلوں پر ان حملوں کا تسلسل روزمرہ کا معمول تھا۔ سارجنٹ اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کی بٹالین کی دوسری کمپنیاں بھی گوریلوں کے خلاف جنگل کے مختلف حصوں میں لڑ رہی تھی۔ سارجنٹ اس گوریلا گروہ کے خلاف کارروائی ویسی ہی کارروائی سمجھا جیسے وہ پہلے کرتا آیا تھا۔ اُس نے اپنی پلاٹون کو تیار کیا اور معمول کے مطابق پلاٹون کو ہدایات دیں اور چل پڑے۔

پلاٹون اُس مقام تک پہنچ گئی جہاں اسے بتایا گیا تھا کہ یہ گوریلا گروہ موجود ہو گا لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سارجنٹ نے اپنی پلاٹون کو پھیلا دیا اور چند سپاہیوں کو اپنے ہراول کے طور پر لگا دیا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ گوریلوں کا یہ گروہ کچھ دیر پہلے وہاں سے چلا گیا ہے۔ جنگل مکمل خاموش تھا اور کسی خطرے کا ذرا سا بھی اشارہ نہیں مل رہا تھا۔

سارجنٹ نے اور زیادہ محتاط ہو کر کمپنی کو ایک خاص ترتیب میں کر لیا۔ وہ کم و بیش ایک میل آگے چلے گئے اور ایسی جگہ آ گئی جہاں دائیں اور بائیں دو اونچی ٹیکریاں تھیں اور یہ ٹیکریاں درختوں سے بھرپور تھیں۔ گھاس اور قدرتی پودے بھی بے شمار تھے۔ اور چٹانوں کے درمیان جگہ کشادہ تھی۔

آگے گئے تو ٹیکریاں اور زیادہ پیچھے ہٹتی گئیں۔ سامنے ایک اور ایسی ٹیکری تھی جس نے راستہ روک رکھا تھا۔ یوں سمجھیں کہ ایک کشادہ میدان تھا جسے ٹیکریوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

جوں ہی پلاٹون اس کشادہ جگہ پہنچی تین اطراف سے اس قدر زیادہ فائر اچانک کھل گیا جیسے مینہ برستا ہے۔ ایک ہی بار رائفلوں اور مشین گنوں نے آگ اگلنی شروع کر دی۔ سارجنٹ کے اندازے کے مطابق اُس کی آدھی پلاٹون تو وہیں ختم ہو گئی تھی

سارجنٹ نے چلا چلا کر اپنی پلاٹون کو ہدایات دیں اور جو بچ گئے تھے انہوں نے اِدھر اُدھر آڑ لے لی اور جوابی فائر کرنے لگے۔ سارجنٹ اپنے جوانوں کو بار بار للکارتا تھا اور کہتا تھا کہ پسپا نہیں ہونا' یہ گوریلے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکتے۔

کارپورل یوسف بھی حسبِ معمول اس کے ساتھ تھا۔ وہ پانچ چھ سپاہی ساتھ لے کر ایک اور طرف چلا گیا تاکہ گوریلوں پر پیچھے سے فائر کر سکے۔ وہ گوریلوں کے عقب میں جانے میں کامیاب ہو گیا اور ایسا کارگر فائر کیا کہ ایک طرف کی ٹیکری پر جو گوریلے تھے انہیں مار ڈالا اور جو بچے وہ بھاگ گئے۔

سارجنٹ جانتا تھا کہ جو بچ گئے ہیں وہ گوریلے بھاگے نہیں بلکہ دوسری ٹیکریوں پر چلے گئے ہوں گے۔ سارجنٹ نے تو جیسے قسم کھالی تھی کہ آخری سپاہی اور آخری دم تک لڑنا ہے۔ سپاہی بھی دلیری سے پوزیشنیں بدل بدل کر لڑ رہے تھے۔

کارپورل یوسف نے پھر چند ایک سپاہی ساتھ لئے اور دوسری ٹیکری کے عقب میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

مختصر یوں ہے کہ سارجنٹ کے پاس سپاہی کم رہ گئے تھے لیکن اُس نے ایسے جذبے سے ان سپاہیوں کو لڑایا کہ گوریلے پیچھے ہٹنے لگے اور پھر وہ نکل گئے لیکن نقصان بے انداز کر گئے۔

جب گوریلوں کی طرف سے فائر بالکل ہی رک گیا تو سارجنٹ اپنی پوزیشن سے اٹھا اور اپنے سپاہیوں کو دیکھنے لگا۔ اُسے بیشتر سپاہی مرے ہوئے یا شدید زخمی حالت میں ملے۔ چند ایک ہی صحیح اور سلامت تھے۔ اُس نے کارپورل یوسف کو ڈھونڈنا شروع کیا' اسے آوازیں بھی دیں لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔

آخر اسے ایک جگہ یوسف پڑا مل گیا۔ وہ دوڑتا ہوا یوسف تک پہنچا۔ یوسف کی وردی خون سے لال ہو چکی تھی اور گولیاں ایسی لگی تھیں کہ اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ سارجنٹ لکھتا ہے یوسف اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ سارجنٹ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے تسلی دی کہ وہ اُسے کیمپ تک لے جائے گا اور وہ بچ جائے گا۔

کارپورل یوسف نے مسکرا کر کہا کہ وہ نہیں بچ سکے گا اور وہ یہاں سے نکلنے کی سوچ کر رکے نہیں۔ سارجنٹ نے دیکھا کہ یوسف کی زندگی چند لمحے ہی رہ گئی ہے۔

"یوسف!" — سارجنٹ نے افسوس کے لہجے میں کہا — "آج تمہارا سرخ تعویذ تمہیں دھوکہ دے گیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ان چیزوں پر اتنا عقیدہ نہیں ہونا چاہئے"۔

"آج میرے خنجر میں وہ تعویذ ہے ہی نہیں" — یوسف نے کہا — "میں نے آج صبح وہ تعویذ تمہارے خنجر کے دستے میں ڈال دیا تھا.... دیکھ لو"۔

یہ کارپورل یوسف کے آخری الفاظ تھے اور اُس کے ساتھ اس کا سر ڈھلک گیا اور وہ مر گیا۔

سارجنٹ کے پاس بھی ویسا ہی خنجر تھا۔ گوریلا آپریشن میں چاقو اور خنجر ساتھ رکھے جاتے ہیں۔ سارجنٹ نے فوراً اپنا خنجر بیلٹ میں سے کھینچ کر نکالا اور پھر اس کا دستہ اوپر کو کھینچا تو اس میں سے سرخ کپڑے میں لپٹا ہُوا وہ تعویذ گرا جو یوسف نے کچھ روز پہلے اپنے خنجر سے نکال کر دکھایا تھا۔ سارجنٹ نے یوسف کی لاش سے خنجر کھینچا اور اس کا دستہ دیکھا۔ اُس میں تعویذ نہیں تھا۔ تعویذ معلوم نہیں کس وقت یوسف نے سارجنٹ کے خنجر میں ڈال دیا تھا۔

سارجنٹ نے آخر میں لکھا کہ میں آج بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ اُس تعویذ کی کرامت تھی کہ یوسف کے پاس نہ رہا تو وہ مر گیا اور یہ میرے پاس تھا اور میں اتنے خوفناک فائر اور معرکے میں بچ نکلا۔ اُس نے لکھا کہ تین چار مرتبہ گوریلوں کی کسی مشین گن کی پوری بوچھاڑ میرے قریب زمین پر لگی اور میں سمجھتا کہ ابھی ایسی ایک اور بوچھاڑ آئے گی اور میرے جسم کو چیرتی پھاڑتی گزر جائے گی لیکن یہ معجزہ تھا کہ میں زندہ رہا۔

آخر میں اُس نے لکھا کہ یہ خنجر اور تعویذ آج بھی میرے پاس ہے اور میں اسے اکثر دیکھتا ہوں تو کارپورل یوسف یاد آجاتا ہے۔ میرے آنسو نکل آتے ہیں اور میں اُس کے سرخ تعویذ کو بڑے پیار اور احترام سے اپنے خنجر کے دستے میں ڈال کر رکھتا ہوں۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ کہانی "ریڈرز ڈائجسٹ" میں پڑھی تھی۔ "ریڈرز ڈائجسٹ" یہودیوں کا پرچہ ہے۔ یہودیوں نے یہ کہانی شائع نہیں کرنی تھی۔ کردی تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ یقیناً اس تعویذ سے متاثر ہوئے ہوں گے اور یہی سمجھ کر چھاپی ہوگی کہ یہ کہانی بالکل سچی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس تعویذ میں اتنی کرامات تھی یا نہیں لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ انڈونیشیا میں کچھ صوفی اور اولیاء اللہ بھی ہو گزرے ہیں۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی ایسا بزرگ ہوگا جس نے یہ تعویذ یوسف کو دیا ہوگا۔

○

یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں جو مجھے امریکہ کے پرچوں میں سے معلوم ہوئی تھیں۔ میں اب آپ کو واپس جنگِ آزادی کے میدان میں لئے چلتا ہوں۔ میں نے شاید پہلے بھی کہا ہے کہ انڈونیشی مسلمانوں کی یہ مسلح جنگِ آزادی کوئی معمولی جنگ نہیں تھی۔ اس پر کتابیں لکھی گئی تھیں اور امریکہ اور برطانیہ کی فوج نے انڈونیشی مسلمانوں کی اس گوریلا جنگ سے ایسے سبق حاصل کئے تھے کہ انہوں نے کچھ پمفلٹ اور کتابیں بھی لکھیں اور اپنی فوج میں تقسیم کی تھیں۔

اب میں بہت پیچھے سے بات شروع کروں گا' یعنی جب ہمیں یہاں لایا گیا تھا۔ میں اپنی بٹالین کی بات کروں گا کیونکہ اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ اس لئے ہر بات سچّی ہوگی۔ باقی تو باتیں بھی سچّی ہیں لیکن وہ میں نے دوسری یونٹوں کے لوگوں سے سنی تھیں.... میں تو بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ ہمیں انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے لایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ابھی معلوم ہی نہیں تھا کہ ان جزیروں' جاوا سماٹرا وغیرہ کے لوگوں نے جنگ آزادی کی ابتدا کر دی ہے۔ ہم یہی جانتے تھے کہ ان علاقوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ میں مختلف جگہوں اور مقامات کے نام نہیں لکھوں گا کیونکہ یہ دو چار نہیں بے شمار تھے جن میں سے زیادہ تر کے نام میرے ذہن سے اُتر گئے ہیں۔ نام بھی ایسے تھے جن کا تلفظ بھی اُلٹا سا تھا۔ تاہم یاد نہ رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اُس وقت سوچا بھی نہ تھا کہ عمر کے کسی حصے میں جا کر یہ داستان لکھوں گا۔ فوجیوں کا لکھنے لکھانے کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ہماری بٹالین کو چھوٹے سے ٹیک قصبے سے تقریباً ایک میل دور کیمپ میں رکھا گیا۔ ہم نے وہاں خیمے لگا لئے اور اب اگلے حکم کا انتظار کرنے لگے۔ اگلا حکم یہی ہو سکتا تھا کہ ان جنگلوں میں جو جاپانی چھپے ہوئے رہ گئے ہیں' انہیں پکڑنا ہے۔ یہ تو بتا چکا ہوں کہ ایٹم بموں نے جنگ کا خاتمہ کر دیا تھا۔

میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ جاپانی ہتھیار ڈالنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ ہتھیار دینے سے پہلے وہ اپنی جان دے دیا کرتے تھے۔ ہماری بٹالین میں عام خیال یہی تھا کہ اِدھر اُدھر چھپے ہوئے جاپانیوں کو ڈھونڈنا اور پکڑنا ہے۔ ہمارے اس خیال کی تصدیق اس طرح بھی ہو گئی کہ پہلے روز ہی ہماری ایک پٹرول پارٹی (گشتی پارٹی) کیمپ سے کچھ دُور گئی۔ اس پر فائرنگ ہوئی اور دو جوان مارے گئے۔ اس پارٹی کی نفری پندرہ سولہ تھی۔ اُنہوں نے اس جگہ کو گھیرے میں لے لیا جدھر سے فائر آیا تھا۔ کچھ دیر گولیوں کا تبادلہ ہُوا۔ دشمن کی طرف سے آنے والا فائر کچھ زیادہ نہیں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ تین چار رائفلیں ہیں جو فائر کر رہی ہیں۔ آخر یہ رائفلیں بھی خاموش ہو گئیں۔ گھیرا تنگ کر کے قریب پہنچے تو وہاں دو جاپانی سپاہی مرے پڑے تھے۔ یہ فائر انہوں نے ہی کیا تھا۔

یہ پٹرول پارٹی جب واپس آئی تو اس نے اپنے دو جوانوں کی لاشیں اٹھا رکھی تھیں اور جاپانیوں کی دو رائفلیں بھی تھیں اور انہوں نے بتایا کہ دو جاپانی فوجیوں نے ان پر فائر کیا تھا اور اُنہیں مار دیا گیا ہے۔ اس طرح ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا کہ اب ہمیں جنگلوں میں پھیلا دیا جائے گا اور ہم جاپانیوں کو ڈھونڈتے رہیں گے۔

ہُوا بھی ایسے ہی۔ اُس روز کے بعد زیادہ نفری کی پٹرول پارٹیاں اِردگرد کے جنگل میں، کچھ دُور دُور تک بھیجی گئیں۔ کوئی اور جاپانی نہ ملا لیکن پٹرول پارٹیوں کو روزانہ بھیجا جانے لگا اور رات کو بھی پٹرول پارٹیاں باہر بھیجی جاتی تھیں۔

○

ایک روز ہماری ایک کمپنی کی پچیس آدمیوں کی پٹرول پارٹی رات کو بھیجی گئی۔ اس کا کمانڈر ایک جمعدار (نائب صوبیدار) تھا۔ اُس کے ساتھ ایک حوالدار اور دو نائیک بھی تھے۔ یہ ہماری بٹالین کی بی کمپنی تھی جو ہندوؤں کی کمپنی تھی۔ اس میں ایک بھی مسلمان یا سکھ نہ تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ بٹالین میں دو مسلمان کمپنیاں ہوتی تھیں، ایک ہندو اور ایک سکھ کمپنی۔

ہندو کمپنی کی پچیس نفری کی پٹرول پارٹی رات کو نکلی اور ڈیڑھ دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ ہمیں کمپنی سے تقریباً" تین میل دُور فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے یاد ہے رات اچھی طرح یاد ہے۔ ساری بٹالین جاگ اٹھی تھی۔ تین میل خاصا فاصلہ ہوتا ہے جہاں سے فائر کی آواز کم ہی آنی چاہئے تھی لیکن وہ کوئی شہر نہیں تھا، جنگل بیابان تھا

رات خاموش تھی اور اس خاموشی میں تین میل دور کے دھماکے ہمیں سنائی دے رہے تھے۔ ہم فوجی تھے اس لئے ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ اچھی خاصی جھڑپ ہو رہی ہے۔ مشین گنیں بھی فائر کر رہی تھیں۔ یہ مشین گنیں بھی تھیں، سٹین گنیں اور ٹامی گنیں بھی جنہیں سب مشین گن کہا جاتا تھا۔

بٹالین کیمپ میں رہتی تھی۔ افسروں کے خیمے بھی کیمپ میں تھے۔ ہمارا کمانڈنگ آفیسر جاگا اور وہ کیمپ میں یعنی جوانوں کے خیموں کے علاقے میں آ گیا۔ اُس کے ساتھ صوبیدار میجر بھی تھا اور دو تین انگریز افسر بھی۔ پوری پلٹن کو تیاری کا حکم مل گیا۔

میں تو یہ نہیں بتا سکتا کہ کمانڈنگ آفیسر نے کیا کارروائی کرنی تھی، یہ پتہ چلتا تھا کہ بٹالین کو اس طرف ایڈوانس کرنا پڑے گا جدھر سے گولیوں کی آواز آ رہی تھی۔ انگریز افسر تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، ہم نہیں جانتے تھے۔ اگر ہم کچھ جانتے بھی تھے تو اتنا ہی تھا کہ چھپے ہوئے جاپانی ہوں گے اور ان کی تعداد زیادہ ہو گی اور انہوں نے ہماری پٹرول پر فائر کھول دیا ہے۔

چونکہ بٹالین کو تیاری کا حکم ملا تھا اس لئے کیمپ میں ہڑبونگ سی مچ گئی۔ اب اس کیمپ کے شور شرابے میں دُور کی فائرنگ کی آواز کم سنائی دینے لگی۔ کچھ دیر بعد ہماری ایک مسلمان کمپنی کو حکم ملا کہ وہ ایڈوانس کرے اور اُس جگہ پہنچے جہاں فائر ہو رہا ہے۔

یہ میری کمپنی تھی.... اے کمپنی.... میں اس کمپنی کے ساتھ نہیں گیا تھا کیونکہ میں حوالدار کلرک تھا۔ صوبیدار محمد اشرف اور حوالدار امیر خان اسی کمپنی میں تھے۔ جب یہ کمپنی روانہ ہوئی تو ہمارے کان ابھی تک فائرنگ کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کیمپ کے شور کی وجہ سے آوازیں تو دب گئی تھیں لیکن ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ فائر کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا جا رہا تھا کہ فائرنگ کچھ قریب آ گئی ہے یا آتی جا رہی ہے۔

ہماری مسلمان کمپنی چلتے ہوئے نہیں بلکہ دوڑتے ہوئے روانہ ہوئی تھی۔ تقریباً" ایک گھنٹے بعد ایک بار پھر بے ہنگم فائر ہونے لگا اور اب یہ فائر خاصا قریب تھا۔ ہم نے روشنی راؤنڈ فائر ہوتے بھی دیکھے۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہے، کیمپ سے کوئی زیادہ دُور نہیں۔ روشنی راؤنڈوں کی روشنی ہمیں صاف دکھائی دیتی تھی۔

رات کے غالباً" تین بج رہے ہوں گے کہ فائر بالکل ہی خاموش ہو گیا اور ہماری

اگلی صبح پوری بٹالین کو ایڈوانس کا حکم ملا۔ اُس روز میں بھی بٹالین کے ساتھ گیا۔ قریب ہی سے بڑا گھنا جنگل اور پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ پہاڑیاں اونچی نہیں تھیں بلکہ انہیں ٹیکریاں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔

جنگل میں جا کر بٹالین کو جنگی ترتیب میں پھیلا دیا گیا تھا۔ ہراول کمپنی آگے نکل گئی تھی اور ریئر گارد پیچھے تھی۔ مختصر یہ کہ کمپنی جنگی ترتیب میں جا رہی تھی۔ جنگل میں جا کر ہر طرف دیکھا گیا یعنی تلاشی لی گئی' وہاں کچھ بھی نظر نہ آیا سوائے چند ایک انسانی ہڈیوں کے ڈھانچوں کے۔ یہ پہلی لڑائیوں میں مارے ہوئے جاپانی یا ہندوستانی سپاہیوں کے ڈھانچے تھے۔ کمپنی شام کے وقت واپس آئی۔

○

دو روز بعد پوری بٹالین کو فال اِن کیا گیا اور ہمارے انگریز کرنل نے تقریر کی۔ یہ لوگ اردو بڑی اچھی طرح بول سکتے تھے۔ ہمارے کرنل نے پوری بٹالین کو بتایا کہ یہ کیا قصہ ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ قصہ کیا تھا۔ سرکاری طور پر ہمیں کیمپ میں یہ بتایا گیا کہ یہ انڈونیشیا کے لوگ ہیں۔ اور وہ ہمارے خلاف لڑ رہے ہیں۔

کرنل نے یہ تو نہ کہا کہ وہ آزاد رہنا چاہتے ہیں' اُس نے کچھ اس قسم کے الفاظ کہے جیسے یہ لوگ ڈاکو اور لٹیرے ہیں اور کسی کی حکومت پسند نہیں کرتے' اور اگر انہیں کھلی چھٹی دی گئی تو یہ فوج کے گوداموں میں سے راشن اور ایمونیشن اور ہتھیار بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔

یہ یاد آیا کہ قبائلی پٹھانوں کے متعلق بھی انگریز اسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے کہ یہ لوگ لٹیرے ہیں جو حملے کر کے رائفلیں اور ایمونیشن اٹھا کر لے جاتے اور اِدھر اُدھر فروخت کرتے ہیں۔ یہ تو ہم مسلمان جانتے تھے کہ قبائلی پٹھان فرنگی کی حکومت کو قبول نہیں کرتے تھے۔ ہم انگریز کرنل کی بات سمجھ گئے اور پتہ چل گیا کہ انڈونیشیا کے مسلمان اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ فوج کا ڈسپلن بڑا ہی سخت ہوتا ہے جس میں ایک تھم یہ ہوتا ہے کہ فوجی اب شہروں' قصبوں یا دوسری آبادیوں میں گھوم پھر نہیں سکتے لیکن ان علاقوں میں جا کر انگریزوں نے فوجیوں کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ شہروں میں جا کر لوگوں سے ملیں ملائیں اور ان میں گھومیں پھریں۔ میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بعد میں پتہ

چلا کہ فوجیوں کو کھلی چھٹی کیوں دی گئی تھی۔ وہ اس لئے کہ فوجی ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں کا اخلاق تباہ و برباد کر دیں اور ان کی عزت اور آبرو کو کچل اور مسل کر رکھ دیں۔ میں دوبارہ تفصیلات سنانا نہیں چاہتا' صرف یہ یاد دلاؤں گا کہ ولندیزی عورتوں نے اپنی عزت اور آبرو صرف راشن پانی' سگریٹ اور شراب کی خاطر فوجیوں کے حوالے کر دی تھی لیکن مسلمان لڑکیوں کا کردار الگ تھلگ تھا اور وہ پوری طرح اپنے وقار میں رہتی تھیں۔

میں نے یہ بات اس لئے دہرائی ہے کہ ایک طرف ہماری پٹرول پارٹی پر مقامی لوگوں نے حملہ کیا اور دوسری طرف ہمیں اجازت دے دی گئی کہ ہم قریبی قصبے میں جایا کریں اور ان لوگوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں۔ انگریز دراصل بڑی ہی خونریز جنگ لڑ چکے تھے اور اب وہ یہ طریقہ آزمانا چاہتے تھے کہ فوج وہاں کے شہریوں کو دوست بنائے اور دشمنی ختم ہو جائے اور وہاں کے مسلمان آزادی سے دستبردار ہو جائیں۔

کچھ ہی دنوں بعد عید الفطر آ گئی۔ ہمیں توقع تھی کہ ہمیں نماز کیمپ میں ہی پڑھنی پڑے گی اور ہم قصبے میں نہیں جا سکیں گے لیکن انگریز کرنل نے بڑی ہی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ مسلمان قصبے میں جا کر نماز پڑھیں اور عید منائیں۔

ہم تمام مسلمان عید کی صبح نہا دھو کر قصبے میں چلے گئے۔ ہمارے پاس کوئی سویلین کپڑا نہیں تھا' وردیاں دھو لی تھیں اور وہی پہن کر چلے گئے تھے۔ قصبے میں وہاں کے لوگ ہمیں مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے اور آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے تھے۔ وہ اپنی زبان میں ہمیں عید مبارک کہتے تھے لیکن ہم نے دیکھا کہ ان میں سے کچھ لوگ جھجکتے تھے اور ہمارے قریب نہیں آتے تھے۔ غالباً" وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمان نہیں اور سیر سپاٹے کے لئے قصبے میں آئے ہیں لیکن انہوں نے جب دیکھا کہ ہم سب مسجد میں داخل ہو گئے ہیں تو انہیں معلوم ہُوا کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

ان میں چند ایک انڈونیشی ایسے تھے جو ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتے تھے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں۔

اسلام کا رشتہ بھی کتنا پیارا اور کتنا مضبوط ہے۔ نماز بالکل اسی طرح پڑھی گئی جس طرح ہم اپنے گاؤں میں پڑھا کرتے تھے۔ یوں لگا جیسے میرے گاؤں اور اس قصبے کے درمیان ایک انچ کا فاصلہ نہیں۔

امام نے خطبہ پڑھا اور پھر اُس نے اپنی زبان میں وعظ شروع کر دیا جس کا ایک لفظ بھی ہم نہ سمجھ سکے۔ صرف ایک لفظ سمجھ میں آتا تھا اور یہ تھا مردیکا۔ ہم یہ خطبہ تبرّک سمجھ کر سنتے رہے۔

امام منبر سے ہٹ گیا اور اس نے اگلی صف میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے کچھ کہا اور اشارہ کیا۔ وہ آدمی ادھیڑ عمر تھا اور انڈونیشی تھا۔ وہ منبر پر چڑھنے کی بجائے منبر کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور اُس نے اُردو میں تقریر شروع کر دی۔ وہ اپنے لب و لہجے میں بولتا تھا اور کہیں کہیں وہ بولنے میں دشواری سی محسوس کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر ہم سے یعنی فوجیوں سے مخاطب تھا۔

اس نے وہی باتیں کہیں جو میں پہلے آپ کو تمہید کے طور پر سنا چکا ہوں۔ اُس نے لوگوں کو اپنی تاریخ سنائی اور کہا کہ ولندیزیوں نے انہیں کس طرح غلام بنا کر رکھا تھا اور جاپانیوں نے ان پر یہ کرم کیا کہ انہیں ہتھیار بھی دیئے اور جنگی ٹریننگ بھی اور اب جب کہ جاپانیوں کو شکست ہو گئی ہے تو یہ کفّار یعنی امریکہ' برطانیہ اور ولندیزی ان کی زمین پر قبضہ کر کے انہیں غلام بنانا چاہتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کسی کا غلام نہیں ہو سکتا اور مسلمان کسی کو غلام بنایا بھی نہیں کرتا۔

اُس نے اعلانیہ کہا کہ کچھ دن پہلے ہمارے مجاہدین نے اس پلٹن کی ایک پارٹی پر شب خون مارا ہے جو ہمارے قصبے کے ساتھ کیمپ لگائے ہوئے ہے۔ اُس نے اس شب خون کے شہیدوں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور کہا کہ تمام انڈونیشی روایت کو زندہ رکھیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔

پھر اس نے کہا کہ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ اس پلٹن میں مسلمان بھی ہیں اور آج وہ مسلمان اس مسجد میں اللہ کے حضور سجدہ کرنے آئے ہیں۔ اُس نے بڑے ہی پُراثر اور خوبصورت الفاظ کہے۔ اُس نے کہا کہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ ہمارا اللہ ایک ہے اور ہم سب اُسی کے آگے سجدہ کرتے ہیں اور ہمارا قرآن بھی ایک ہے جس پر ہم سب مل کر عمل کرتے ہیں اور پھر اللہ نے جو رسولؐ ہماری رہنمائی کے لئے اتارا تھا وہ بھی ہم سب کے لئے ایک ہے۔ اسی طرح ہمارا جذبہ اور مقصد بھی ایک ہونا چاہئے۔

یہ آدمی جو تقریر کر رہا تھا' بعد میں پتہ چلا کہ امام کے خطبے کی ترجمانی کر رہا تھا اور وہ امام کا خطبہ ہمیں یعنی فوجیوں کو سنا رہا تھا۔ پھر کہا' آپ لوگ یعنی ہم ہندوستانی' انگریزوں

کے غلام ہیں اور انگریز ہمیں یہاں مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑنے کے لئے لایا ہے۔

اُس نے کہا کہ مسلمان قرآن کی رُو سے بھائی بھائی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھاتے اور جو مسلمان اپنے بھائی کے خلاف ہتھیار اٹھاتا ہے وہ جہنّمی ہوتا ہے۔ اس موقع پر تقریر کرنے والے نے قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی اور پھر تین احادیث بھی سنائیں۔

اُس نے کہا کہ انہیں پہلی دفعہ پتہ چلا ہے کہ اس پلٹن میں مسلمان بھی ہیں۔ اُس نے کہا' ہم آپ سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ ہمارے دوش بدوش آ کر لڑیں لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر یہ توقع رکھیں گے کہ جہاں کہیں آپ لوگ ہمارے مجاہدین کے آگے آ جائیں تو ایک دوسرے پر گولی نہ چلائیں۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے آدمی آپ پر گولی نہیں چلائیں گے' آگے آپ کا اپنا دین ایمان ہے کہ ہمارے مجاہدین کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

ہمارے ایک سپاہی نے اچانک بڑی زور سے بلکہ چیمپئن کا پورا زور لگا کر نعرہ لگایا' نعرۂ تکبیر۔ ہم تمام فوجیوں نے توپوں کے دھماکوں کی طرح اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ جس نے یہ نعرہ لگایا تھا وہ سفید اَن پڑھ تھا۔ وہ جذبہ تو مسلمانوں والا رکھتا تھا' یہی وہ بات تھی جو اس کے پلّے پڑ گئی تو وہ بم کی طرح پھٹا۔ اس نعرے سے وہاں جتنے انڈونیشی مسلمان تھے' چمک اٹھے۔

امام اپنی زبان میں جب خطبہ دے رہا تھا تو وہ بار بار مردیکا کہتا تھا۔ اُس کے خطبے کی ترجمانی کرنے والے اس ادھیڑ عمر انڈونیشی نے بتایا کہ ان کا نعرہ ہے مردیکا جس کا مطلب ہے آزادی اور پھر ان کا دوسرا نعرہ ہے ـــــ "مسلم سمہ سمہ" ـــــ جس کا مطلب ہے کہ مسلمان ایک ہیں۔

اس انڈونیشی حریّت پسند کی تقریر خاصی لمبی تھی۔ میں نے اس کا لبِ لباب سنایا ہے۔ اس نے جب اپنی تقریر ختم کی تو ہم جو فوجی تھے ان میں کھُسر پھُسر شروع ہو گئی۔ صوبیدار محمد اشرف نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ ہمارا فرض ہے کہ ان لوگوں کو یقین دلائیں کہ ہم ان پر گولی نہیں چلائیں گے لیکن اپنی ڈیوٹی پوری کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم گولی تو چلائیں گے لیکن نشانے نہیں باندھیں گے اور ہماری گولیاں درختوں سے گزریں گی۔ صوبیدار اشرف نے میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی چونکہ تم تعلیم یافتہ ہوں

اس لئے منبر کے پاس جا کر ان لوگوں کو یقین دلاؤ کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم فوج سے بھاگ کر ان کے پاس نہیں آسکتے۔

میں نے کبھی تقریر نہیں کی تھی لیکن اس وقت جذبات میں ایسا تاثر پیدا ہو گیا تھا میں اٹھا اور منبر کے پاس جا کھڑا ہُوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اتنے بڑے مجمعے سے خطاب کرنے لگا تھا۔ میری تو زبان ہکلانے لگی تھی لیکن جذبہ ایسا بیدار ہُوا کہ میں نے بولنا شروع کر دی۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ اپنی ساری تقریر بیان کروں، صرف یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے انڈونیشی مسلمانوں سے کہا کہ ہم اسلام کے رشتے کی پوری طرح لاج رکھیں گے اور ان کی جس قدر مدد کر سکتے ہیں کریں گے، جانیں بھی قربان کر دیں گے۔ اس طرح کچھ باتیں کر کے میں ایک نہایت ضروری بات پر آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ ہم انگریزوں کے ملازم ہیں اور ان کے بنائے ہوئے قانون کے پابند ہیں۔ میں یہ جو باتیں کر رہا ہوں یہ اپنے ان تمام بھائیوں کی طرف سے کر رہا ہوں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے کہ ہم نے آپ کے ساتھ باتیں کی ہیں۔ اگر ہندوؤں اور سکھوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ افسروں کو بتا دیں گے پھر ہمیں سزا ملے یا نہ ملے یہ ضرور ہو گا کہ ہم پر پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔ آپ کے ساتھ ہمارے وعدے اللہ اور اللہ کے اس گھر کے نام پر ہیں۔

میں مختصر سی تقریر کر کے بیٹھ گیا تو وہی ادھیڑ عمر انڈونیشی پھر اٹھا جس نے اُردو میں امام کا خطبہ ہمیں سنایا تھا۔ اُس نے انڈونیشی زبان میں لوگوں سے کچھ بات کی۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ انڈونیشی مسلمانوں کو میری باتیں سنا رہا ہے۔ اُس نے بات ختم کی تو مسجد میں انڈونیشی جیسے ہم پر ٹوٹ پڑے ہوں۔ بڑے ہی جذباتی انداز سے وہ ہمیں گلے لگاتے اور خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ ہم جب مسجد سے نکلے تو ایک ایک آدمی کو تین تین چار انڈونیشی اپنے گھروں کو لے جانے کے لئے گھسیٹ رہے تھے لیکن ہم میں سے کوئی بھی کسی کے ساتھ نہیں جا رہا تھا۔ ہم ڈرتے تھے کہ ان لوگوں کے ساتھ ہمارے بھائی چارے کی خبر انگریز افسروں تک پہنچ گئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ہمیں انگریز افسروں نے ہی اجازت دی تھی لیکن ہمیں ضرورت سے زیادہ محتاط ہونا چاہئے تھا۔

میں نے بعد میں سنا تھا کہ ایک اور شہر میں بھی مسلمانوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ عید کی نماز جامعہ مسجد میں پڑھ سکتے ہیں۔ وہ شہر غالباً" سوکابومی تھا۔ وہاں بھی انڈین آرمی

پلٹنیں تھیں۔ میں نے سنا تھا کہ اُس علاقے کے انڈونیشی گورنر
افسری بڑے افسر نے مسجد میں تقریر کی تھی اور اُس نے آزادی کے جذبے اور
کسی بڑے کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اُس نے ایسی بات نہیں کی تھی
بھائی چارے کے مسلمان ان کی مدد کریں لیکن اُس کی تقریر سے انڈین آرمی کے
آرمی میں گئے تھے اتنے زیادہ متاثر ہوئے تھے کہ اُنہوں نے طے کر لیا تھا
جو اس مسجد میں گئے ہیں ہر طرح سے مدد کریں گے۔
انڈونیشی حریت پسندوں کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔
نے کہا ہے کہ جامعہ مسجد میں تقریر کرنے والا گورنر تھا یا کوئی بڑا افسر، اس سے
سمجھیں کہ انڈونیشیا کے عوام صرف جنگِ آزادی ہی نہیں لڑ رہے تھے بلکہ انہوں
باقاعدہ حکومت قائم کر رکھی تھی جس میں گورنر بھی تھے اور ان سے چھوٹے افسر
یعنی وہ ایک منظم اور باقاعدہ حکومت تھی جو ہر ترقی یافتہ ملک کی طرح چلائی جا رہی
یہ امریکہ اور برطانیہ کی دھاندلی تھی کہ وہ ان لوگوں کی آزادی سلب کرنا چاہتے

ہم مسجد سے کچھ دُور نکل آئے تو ہمارے جمعداروں اور صوبیداروں نے ہم سب
کہا کہ ہم مسجد میں بیٹھے تھے اور یہ لوگ اللہ اور رسول" کا نام لے رہے تھے۔ ہم بھی
مسلمان ہیں اس لئے ہمیں یہی کہنا اور کرنا چاہئے تھے جو ہم نے مسجد میں کیا لیکن
لوگ احتیاط کرنا کہ بیرکوں میں بیٹھ کر پھینگیں نہ مارنا کہ ہم پکے مسلمان ہیں اور
نیشی مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ ہمارے ایک صوبیدار نے چلتے چلتے اس
وع پر تقریر کر ڈالی۔
فوج میں ایک خرابی تھی جو آج کل بھی موجود ہے۔ یہ ہے خوشامد اور غیبت۔
اوں کو خوش کرنے کے لئے بعض عہدیدار اور جے سی او صاحبان ان کی خوشامد کرتے
اور دوسروں کے خلاف غیبت کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے میں
یہ خامی بعض فوجیوں میں موجود تھی۔ زیادہ تر خوشامدی جمعدار، صوبیدار اور
بیدار میجر ہُوا کرتے تھے۔ حوالدار وغیرہ ان جمعداروں صوبیداروں کی چاپلوسی میں
رہتے تھے۔ یہ خوشامد ترقی کی خاطر ہُوا کرتی تھی۔ پھر جیسا کہ آپ جانتے ہیں،
ملکوں میں غداری کے جراثیم موجود ہیں۔ ہمارے جوانوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑے
ایسے ضرور تھے جو مخبری کر کے اوپر والوں کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔

"میری ایک بات کان کھول کر سب سن لو" ـــــ صوبیدار محمد اشرف
"میں جانتا ہوں ہم میں غدار بھی موجود ہیں جو مخبری کریں گے۔ میں ان لوگوں کو
دیتا ہوں کہ کسی کے متعلق پتہ چل گیا کہ اس نے مخبری کی ہے تو اسے عبرت
گایا جب کبھی ہم گوریلوں کے خلاف باہر نکلے تو اسے گولی مار دی جائے گی"۔
"ایسے نہیں!" ـــــ ڈی کمپنی کے صوبیدار نذر شاہ نے رک کر کہا۔
یہیں رک جاؤ اور اللہ کو حاضر ناظر جان کر حلف اٹھاؤ کہ ایک دوسرے کے خلاف
نہیں کریں گے اور اوپر والوں تک یہ بات نہیں پہنچنے دیں گے"۔

سب سے پہلے صوبیدار نذر شاہ نے بلند آواز سے حلف اٹھایا اور پھر سب
وہ آنکھیں بند کر کے دھیان میں اللہ تعالیٰ کو رکھ کر یہ حلف اٹھائیں۔ سب نے
کہنے پر عمل کیا۔ اس کے بعد صوبیدار نذر شاہ نے کہا کہ تم لوگ غداری کر
کے قانون سے تو بچ جاؤ گے لیکن اللہ کی بے آواز لاٹھی سے نہیں بچ سکو گے۔

آج کل کے فوجی میری ان باتوں پر حیران ہو رہے ہوں گے اور ہو سکتا ہے
باتوں کو سچ ہی نہ مانیں کیونکہ اس طرح کی باتیں کرنا اور دشمن کے ساتھ درپردہ
کر لینا ایک سنگین جرم ہے جس کی کم از کم سزا دس سال ہے اور عمر قید بھی ہو سکتی
انگریزوں کے زمانے میں یہی سزا تھی۔ انڈونیشی مسلمان ہمارے بھائی تھے۔ یہ
جذبات کی آواز تھی لیکن انگریز انہیں دشمن کہتے تھے اور ہمارے لئے انڈونیشی
سرکاری طور پر دشمن تھے۔ ہم نے اپنے دشمن کے ساتھ جس طرح سمجھوتہ کیا
اسے جس مدد کا یقین دلایا تھا' یہ سنگین جرم نہیں تو اور کیا تھا۔ یہ غداری تھی۔
جانے کی صورت میں کورٹ مارشل تو ہونا ہی تھا۔

میں بتا رہا تھا کہ ہم ابتدا میں سمجھے کہ ہمیں جنگلوں کی تلاشی لینے کے لئے بھیجا
گیا ہے تاکہ چھپے ہوئے جاپانیوں کو پکڑا جائے لیکن اب بالکل واضح ہو گیا کہ
انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے یہاں لایا گیا ہے۔ میں آج بھی حیران
کہ انگریز افسروں نے ہمیں انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ملنے ملانے کی اجازت
دے دی تھی۔ انگریز تو مسلمانوں کے معاملے میں خاصا حساس تھا۔ میرا خیال ہے
انڈونیشیا میں جا کر انگریز افسروں نے یہی غلطی کی جس کا انہیں خمیازہ بھگتنا پڑا۔

○

ب میں آپ کو کچھ واقعات سناتا ہوں۔ اس عید کے آٹھ دس روز بعد ہم نے
فبر ملی کہ جس جنگل میں انڈونیشی حریت پسندوں نے ہماری بٹالین کی پٹرول پارٹی پر
یہ تھا وہیں کہیں انہوں نے ایک گورا رجمنٹ کی کمپنی یا پلاٹون پر ایسا ہی حملہ کیا اور
پلا نقصان کر دیا تھا۔ وہ جگہ ہمارے کیمپ سے دس بارہ میل دُور تھی۔ یہ تو ایک خبر
جو ہم تک پہنچی۔ ایک دو روز بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ وہ اس طرح کہ ہماری
کو حکم ملا کہ کل اس جنگل میں ایڈوانس ہو گا اور دوسری طرف سے گورا رجمنٹ
ہے گی۔

ہم سمجھ گئے کہ اس جنگل کو گھیرے میں لے کر فوج آگے بڑھے گی اور جنگل کی
لے گی۔ خیال تھا کہ انڈونیشی گوریلوں نے یہاں اپنا کوئی ٹھکانہ یا اڈہ بنا رکھا تھا۔
چونکہ دفتر میں کام کرتا تھا اس لئے میں نے بریگیڈ یا غالباً" ڈویژن ہیڈ کوارٹر کا آپریشن
رڈر دیکھ لیا۔ ایسے آرڈر خفیہ ہُوا کرتے تھے۔ میں نے ہی نہیں بلکہ دوسرے حوالدار
ں نے بھی یہ آرڈر دیکھا۔

میں نے صوبیدار محمد اشرف کو بتایا کہ ہماری بٹالین جس آپریشن پر جا رہی ہے یہ تو
بڑا آپریشن ہے اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ رائل ایئر فورس کے لڑاکا ہوائی جہاز
اس جنگل پر بمباری کریں گے۔ اس آپریشن کے لئے ہمیں تین چار روز جنگل میں
رہنا تھا۔

صوبیدار محمد اشرف نے کہا کہ یہ اطلاع شام سے پہلے پہلے اس قصبے میں پہنچ جانی
چاہئے تاکہ گوریلوں کا اگر وہاں کوئی اڈہ ہے تو وہ وہاں سے غائب ہو جائیں۔ اب سوال یہ
تھا کہ یہ اطلاع پہنچانے کے لئے کون جائے۔ میں نے کہا کہ میں جاؤں گا۔ قصبے میں
جانے پر کوئی پابندی تھی ہی نہیں۔

میں دن کے پچھلے پہر قصبے میں چلا گیا اور مسجد میں جا عصر کی نماز پڑھی۔ مجھے مسجد
امام سے ملنا تھا یا اُس شخص سے جس نے عید کے روز امام کا خطبہ اُردو میں سنایا تھا۔
امام تھوڑی ہی دیر پہلے عصر کی نماز پڑھا کر جا چکا تھا۔ پانچ چھ انڈونیشی مسجد میں
تھے جنہوں نے بازو پھیلا کر میرا استقبال کیا تھا۔ ان میں کوئی ایک بھی میری زبان
سمجھتا تھا۔ میں نے اشاروں میں انہیں بتایا کہ میں امام سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک
نے میرے اشارے سمجھ گیا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔

امام گھر پر مل گیا۔ میں اُس سے پہلی بار ذرا آزادی سے مل رہا تھا۔ مجھ
روز اُس کے ساتھ جو ملاقات ہوئی تھی وہ عید ملنے تک ہی تھی۔ مجھے پتہ چلا
تھوڑی اردو جانتا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے سمجھایا کہ میں اس فخص
چاہتا ہوں جو اُس روز مسجد میں اس کا ترجمان بنا تھا۔

امام نے اپنے چھوٹے بیٹے سے کہا تو وہ بچہ دوڑ پڑا اور پندرہ بیس منٹ
مطلوبہ شخص آ گیا۔ ان لوگوں نے میری بڑی ہی خاطر تواضع کی۔ میں نے اُن
بتایا کہ کل سے اس جنگل میں یہ آپریشن ہو رہا ہے اور رات ہی رات اپنے
اطلاع بھیج دیں کہ وہاں سے نکل جائیں۔

میں بس اتنا سا پیغام دے کر وہاں سے آ گیا۔

اصل آپریشن تو گورا رجمنٹ نے کرنا تھا کیونکہ گوریلوں کے متعلق جو انفا
وہ اسی رجمنٹ کو ملی تھی۔ لڑاکا بمبار طیاروں کو گورا رجمنٹ نے ہی راہنمائی دینا
بمباری کرانی تھی۔ ہماری بٹالین کا کام یہ تھا کہ اپنی طرف سے اس جنگل کو گھ
لے کر بھاگنے والے گوریلوں کا راستہ روکیں گے اور جس طرح گورا رجمنٹ کے
کے مطابق کوئی بھی کارروائی ضروری سمجھی گئی تو ہماری بٹالین کرے گی۔

چونکہ پوری بٹالین جا رہی تھی اس لئے میں بھی اپنی کمپنی کے ساتھ گیا۔
کمپنی کمانڈر کے ساتھ رہنا تھا۔

میں یہ سارا فوجی آپریشن بیان نہیں کروں گا۔ اس میں آپ کی دلچسپی کی
بات نہیں۔ سارا فوجی معاملہ تھا۔ میں نے ایسے آپریشن فرنٹیئر کے قبائلی علا
دیکھے تھے اور شامل بھی ہُوا تھا۔ وہاں تین چار بریگیڈ چھاؤنیوں سے نکلنے لو
عریض پہاڑی علاقے میں پھیل جاتے اور دُور تک نکل جاتے تھے۔ راستے میں
نظر آتا' اسے پکڑ لیتے یا گولی مار دیتے تھے لیکن قبائلی پٹھان کم ہی نظر آیا کر
وہاں انگریز یہ ظلم بھی کرتے تھے کہ جہاں کہیں قبائلیوں کی کھڑی فصل نظر آتی
کر دیتے تھے اور ان کے چھوٹے چھوٹے گاؤں تباہ بھی کر دیا کرتے تھے۔

انڈونیشیا میں فرنٹیئر والی بے آب و گیاہ پہاڑیاں تو نہیں تھیں' گھنا جنگ
آپریشن بھی اسی نوعیت کا تھا اور مجھے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ یہ لوگ انڈونیشی
بستیاں اجاڑ دیں گے۔ میں سوچتا تھا کہ انہوں نے یہاں بھی فرنٹیئر والی سکیم چلائی

مسلمان ہیں' ان کا ردِ عمل کیا ہو گا۔

اگلے روز ہماری بٹالین جنگل میں پہنچ گئی اور جنگی ترتیب میں گئی۔ معلوم ہُوا کہ
دوسری طرف سے گورا رجمنٹ اور شاید کوئی اور بٹالین بھی گورا رجمنٹ کے ساتھ تھی۔
ساڑھے نو دس بجے تو چھ سات لڑاکا بمبار ہوائی جہاز آ گئے۔ انہیں گورا رجمنٹ نے
وائرلیس پر ٹارگیٹ بتایا ہو گا۔ ان ہوائی جہازوں نے فضا میں ایک چکر کاٹا اور ایک
دوسرے کے پیچھے غوطے میں آئے اور بم گرا کر آگے نکل گئے۔ جب سارے جہاز بم
گرا چکے تو وہ پھر غوطے میں آ کر مشین گنیں فائر کرتے آگے نکل گئے۔ اس طرح انہوں
نے اس جنگل میں اتنی آگ برسائی کہ وہاں کسی انسان کا زندہ رہنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہماری بٹالین اور گورا رجمنٹ آمنے سامنے آ
گئیں۔ ان پلٹنوں نے پورا جنگل چھان مارا تھا اور یہ پورے جنگل میں پھیلی ہوئی تھیں۔
انہیں کوئی انڈونیشی گوریلا وہاں سے بھاگتا یا کہیں پوزیشن میں بیٹھا نظر نہ آیا۔

میں نے خود اپنی آنکھوں دیکھا کہ جہاں بم گرے تھے وہاں گہرے گڑھے پڑ گئے تھے
اور درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے تھے۔ ایک بھیڑیا مرا ہُوا دیکھا اور ایک جگہ ایک جانور مرا
پڑا تھا جو میں نے دُور سے دیکھا وہ بکری جیسا لگتا تھا۔ بات مختصر یہ ہے کہ اس جنگل میں
سے اتنی بڑی فوج کو کچھ بھی نہ ملا۔ میں افسر تو نہیں تھا کہ مجھے راز کی باتیں بھی معلوم ہو
جاتیں۔ یہ چار پانچ دنوں بعد معلوم ہوئیں۔ بات یہ تھی کہ اس جنگل میں واقعی انڈونیشی
گوریلوں نے اپنا اڈہ بنا رکھا تھا اور یہاں سے گوریلے گروہوں میں نکل کر مختلف
کارروائیاں کرنے جاتے تھے لیکن اُس روز وہاں ایک بھی گوریلا نہیں تھا۔ یہ بھی معلوم
ہوا کہ کچھ ایسے آثار اور نشانات ملے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں ان کا اڈہ تھا۔

سات آٹھ دن بعد میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ساتھ والے قصبے میں گیا اور پھر
مسجد کے امام اور اُس آدمی سے ملا۔ انہوں نے میرا شکریہ اس طرح ادا کیا جیسے میں کوئی
پیر و مُرشد تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں انہیں پہلے اطلاع نہ دے دیتا تو ان کے کم و
بیش دو سو تربیت یافتہ گوریلے مارے جاتے اور اُس رات چار پانچ کمانڈر بھی وہاں موجود
تھے جنہیں گوریلا جنگ لڑنے کا اور لڑانے کا بھی بھرپور تجربہ تھا۔ میری مخبری پر ان
گوریلوں کو بروقت اطلاع پہنچا دی گئی تھی کہ رات کو ہی وہاں سے نکل جائیں۔ چنانچہ وہ
صبح سے پہلے پہلے وہاں سے نکل گئے تھے۔ انگریزوں کا اتنا بڑا آپریشن ناکام رہا۔

○

سات دن گزر گئے تو ایک رات ہمارے کیمپ پر گوریلوں نے حملہ کر دیا۔ ہم مسلمان تھے بہت پریشان ہوئے کہ ان گوریلوں نے ہمیں پہلے نہ بتایا اور اچانک حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے لئے اپنے دفاع میں لڑنا ضروری ہو گیا تھا لیکن لڑنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے مسجد میں ان کے امام سے جو وعدہ کیا تھا' اس کی خلاف ورزی ہوتی تھی اور پھر ہم نے حلف بھی اٹھایا تھا۔

حملہ ایسا نہیں تھا کہ گوریلے فائرنگ کر رہے تھے بلکہ وہ کیمپ میں گھس آئے تھے اور انہوں نے کیمپ کے اندر آ کر فائرنگ شروع کی تھی۔ ہم یہ دیکھ کر کچھ حیران ہوئے کہ گوریلے صرف ہندو اور سکھ کمپنی پر شب خون مار کر چلے گئے۔ مسلمان کمپنیوں کو بھی حکم ملا تھا کہ وہ گوریلوں کو گھیرا ڈال کر پکڑنے کی کوشش کریں۔ مسلمان کمپنیاں فوراً اٹھی تھیں اور انہوں نے گھیرا ڈالنے کی کوشش کی بھی تھی لیکن گوریلے آدھا گھنٹہ بھی نہ ٹھہرے اور غائب ہو گئے۔ جتنی دیر وہ کیمپ میں رہے ان کا نعرہ "مردیکا" سنائی دیتا رہا۔

صبح معلوم ہوا کہ ہماری بی کمپنی کے اکیس جوان مارے گئے ہیں اور تیس یا بتیس رائفلیں غائب ہو گئی ہیں۔ رات کو ہم لوگ رائفلیں اور سٹین گنیں اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ سکھوں کی کمپنی کے صرف سات جوان اور ایک نائیک مارا گیا تھا۔ ان دونوں کمپنیوں کے زخمیوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ تھی۔ سکھوں کی کمپنی سے بھی دس بارہ رائفلیں غائب ہو گئی تھیں اور کچھ اور سامان بھی چلا گیا تھا۔

اس سے ہم نے اندازہ کیا کہ انڈونیشی گوریلے کس قدر دلیر اور بہادر ہیں اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ میں کہا کرتا تھا کہ انڈونیشی حریت پسندوں نے یہ شب خون ہمارے کیمپ پر مار کر ہمارے سر فخر سے اونچے کر دیئے ہیں۔ دونوں مسلمان کمپنیوں کے خیموں کی طرف انہوں نے دیکھا بھی نہیں۔

اس شب خون نے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس پر آپ بھی غور کریں۔ ہمارے کیمپ کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے یعنی ایک طرف بی کمپنی کے خیمے تھے۔ یہ ہندوؤں کی کمپنی تھی۔ اس کے آگے ہماری یعنی اے کمپنی تھی۔ یہ مسلمان کمپنی کے خیمے تھے۔ اس سے آگے سی کمپنی کے خیمے تھے اور یہ کمپنی سکھوں کی تھی۔ اس سے آگے مسلمانوں کی ڈی کمپنی کے خیمے اور اس سے آگے بٹالین ہیڈ کوارٹر کے خیمے تھے۔ افسروں

کے خیمے اس کیمپ سے ذرا ہٹ کر تھے۔

انڈونیشی گوریلوں نے شب خون اس طرح مارا کہ بی کمپنی کے خیموں پر حملہ کیا اور پھر آگے مسلمانوں کی اے کمپنی کے خیموں کو چھوڑ دیا اور اس سے آگے سکھوں کی کمپنی کے خیموں پر ہلہ بولا اور اس سے آگے مسلمانوں کی کمپنی کے خیموں کی طرف جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ گوریلوں نے مسلمانوں کو دانستہ چھوڑ دیا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی سامنے آیا کہ مسلمانوں کی دونوں کمپنیاں شور شرابہ سنتے ہی بیدار ہو گئی تھیں لیکن یوں لگتا جیسے انہوں نے دانستہ گوریلوں کے خلاف کارروائی نہیں کی۔ یہ دونوں کمپنیاں تیزی سے اٹھ کر کیمپ کو گھیرے میں لے سکتی تھیں تاکہ کوئی گوریلا نکل کر نہ جا سکے۔ روشنی راؤنڈ بے شمار فائر ہوئے تھے جن کی روشنی نے رات کو دن بنا دیا تھا۔ گوریلے صاف نظر آتے تھے لیکن ان پر فائر اس لئے نہیں کیا تھا کہ اپنے جوان اپنے ہی جوانوں کی گولیوں سے مارے جائیں گے۔

شب خون بڑی خطرناک کارروائی ہوتی ہے۔ کھلبلی مچ جاتی ہے اور جن پر شب خون مارا جاتا ہے' وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ کیا کریں۔ اگر ایک گوریلا سامنے نظر آتا ہے تو اس پر سٹین گن فائر کی جائے تو اسے چھلنی کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے پیچھے اور دائیں بائیں اپنے جوان ہوتے ہیں جو اس فائر کی زد میں آ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ ہماری بٹالین پر پہلی بار اس قسم کا حملہ ہوا تھا اور بٹالین کو ایسا حملہ روکنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ بات افسروں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ گوریلوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کیا اور مسلمانوں نے وہ جوابی کارروائی نہ کی جو انہیں کرنی چاہئے تھی۔

ہم سمجھ گئے کہ گوریلوں کو کسی مسلمان نے پہلے بتا رکھا تھا کہ کیمپ میں ہم لوگ کس ترتیب میں رہتے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ انہیں یہ ترتیب کس نے بتائی تھی۔ اس کا پتہ چلانا ضروری بھی نہیں تھا اور پتہ چلانا چاہئے بھی نہیں تھا کیونکہ بات جو منہ سے نکل جاتی ہے وہ غیروں تک بھی پہنچ جایا کرتی ہے.... میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ یہ کارنامہ کس کا تھا۔ بٹالین ہیڈ کوارٹر میں تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کا رہنے والا ایک حوالدار غلام نبی ہوا کرتا تھا۔ وہ چونکہ پڑھا لکھا تھا اس لئے اسے انٹیلی جنس سیکشن میں

رکھا گیا تھا۔ وہ ایک بار ساتھ والے قصبے میں گیا اور اس نے گوریلوں کو کیمپ کی ترتیب بتائی تھی اور انہیں کچھ اور باتیں بھی بتائی تھیں۔ یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ حوالدار غلام نبی نے ہی انہیں کہا تھا کہ وہ اس طرح شب خون ماریں۔ افسروں کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کام حوالدار غلام نبی کا ہے۔

اگلے روز پوری بٹالین کو فال اِن کیا گیا اور ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے ایک لیکچر دیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ بٹالین کے عہدیدار اور جوان اسلام کے رشتے کو استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ ایک جرم ہے جس کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے کرنل نے صاف الفاظ میں تو نہ کہا کہ مسلمان انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ خفیہ رابطہ رکھے ہیں' اس کا مقصد اور مطلب یہی تھا۔ اُس نے مسلمانوں کا نام لئے بغیر دھمکی آمیز لیکچر دیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ ایسا واقعہ پھر کبھی ہُوا تو بٹالین پر یہ پابندی عائد کر دی جائے گی کہ کوئی جوان کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا۔ مسلمان قصبے کی مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھ سکیں گے۔

اس شب خون کا دوسرا اثر یہ ہُوا کہ بٹالین کے ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف ہو گئے اور وہ انڈونیشی مسلمانوں کو گالیاں دیتے تھے۔ خصوصاً" سکھ دھمکیاں دیتے تھے کہ وہ ان مسلمانوں سے اپنے جوانوں کے خون کا انتقام لیں گے۔ ہندو کمپنی میں بھی ایسا ہی غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ بعض سکھ جوان مسلمان جوانوں سے کہتے تھے کہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کو سمجھا دو ورنہ ہم ان کے قصبے پر حملہ کر دیں گے اور ان کی لڑکیوں کو اٹھا لائیں گے۔ مسلمان عام طور پر سکھوں کی یہ دھمکی سن کر ہنس پڑتے تھے۔

ظاہری طور پر تو ہم ہنس پڑتے تھے لیکن اندر سے ہم جل اٹھتے اور ہمارا خون کھولنے لگتا تھا۔ ہم اپنے غصے کا اظہار اس لئے نہیں کرتے تھے کہ ہم پر یہ شک نہ کیا جائے کہ ہمارے دلوں میں انڈونیشی مسلمانوں کی ذرا سی بھی ہمدردی ہے۔ ہم ہی جانتے ہیں کہ سکھوں کی یہ گالیاں جو وہ انڈونیشی مسلمانوں کو دیتے تھے' ہم کس طرح برداشت کرتے تھے۔ آخر ایک واقعہ ہو ہی گیا۔ وہ اس طرح کہ اس سکھ نائیک نے ایک روز انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف ایسی ہی بات کہہ ڈالی۔ ہم چار پانچ آدمی وہاں کھڑے تھے۔ ایک میں تھا' دو اور جوان کھڑے تھے اور ایک یہی حوالدار غلام نبی تھا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ اس سکھ نائیک نے انڈونیشیا کی مسلمان عورتوں کے متعلق

ویسی ہی گندی بات کہی جو ولندیزی عورتوں کے متعلق مشہور تھی۔ یہ تو میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ولندیزی عورتوں کا کردار کیا تھا اور وہ کس طرح اپنی عزت اور آبرو راشن' سگریٹ اور شراب کے چند گھونٹوں کے لئے پیش کر دیا کرتی تھی۔ اس سکھ نائیک نے کہا کہ یہاں کی مسلمان عورتیں بھی ایسی ہی ہیں۔ سکھ عربات بڑے ہی گندے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ اس سکھ نے مسلمان عورتوں کے متعلق بھی ایسے ہی ننگے الفاظ استعمال کئے۔ ہم حسبِ معمول ہنس پڑے لیکن میں نے دیکھا کہ حوالدار غلام نبی کے ہونٹوں پر جو ذرا سی مسکراہٹ تھی' وہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

اگلی صبح پتہ چلا کہ یہ سکھ نائیک لاپتہ ہے۔ رات کو وہ اپنے خیمے میں موجود تھا۔ آدھی رات کے وقت بھی اُسے دیکھا گیا تھا۔ فوج میں سورج نکلنے سے بہت پہلے پوری بٹالین جاگ اٹھتی تھی۔ اس وقت یہ سکھ خیمے میں نہیں تھا۔ اسے ہر طرف دیکھا گیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔

دن کے دو بج رہے تھے جب بٹالین کے دفتر میں یہ اطلاع پہنچی کہ سکھ نائیک کی لاش کیمپ سے تقریباً" ایک میل دور ایک کھڈ میں پڑی ہے۔ سکھوں کی کمپنی کا صوبیدار اور دو تین اور سکھ دوڑے گئے اور واپس آئے تو انہوں نے اس سکھ نائیک کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ میں نے یہ لاش دیکھی تھی۔ اس کا پیٹ دائیں سے بائیں تک چاک کیا ہُوا تھا اور اس کی انتڑیاں وغیرہ باہر نکل آئی تھیں جنہیں ہاتھوں سے اٹھا کر پیٹ میں رکھا گیا تھا۔ پیٹ پر اُسی کی پگڑی باندھ دی گئی تھی تاکہ پیٹ کے اندرونی اعضاء پیٹ میں ہی رہیں۔

یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اسے کہاں مارا گیا اور اس کی لاش اتنی دور کیوں پھینکی گئی۔ اگر اسے کسی انڈونیشی حریت پسند نے مارا ہوتا تو اس کی لاش کیمپ کے قریب ہی پڑی ہونی چاہئے تھی۔ اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ یہ سکھ اتنی دور کیا کرنے گیا تھا کہ کسی انڈونیشی مسلمان کا شکار ہو گیا۔ باقاعدہ انکوائری ہو رہی تھی۔

اگلے روز کسی سپاہی کے منہ سے یہ بات نکل گئی کہ اُس نے اس نائیک کو حوالدار غلام نبی کے ساتھ رات کو فلاں جگہ کھڑے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ غلام نبی سے پوچھا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا لیکن شک اُسی کے خلاف پکا ہو تا گیا۔ مجھے اب اچھی طرح یاد نہیں کہ اور کیسی شہادت اور سراغ ملے تھے جن سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس سکھ نائیک کو

حوالدار غلام نبی نے قتل کیا ہے۔

حوالدار غلام نبی کو باقاعدہ حراست میں لے لیا گیا۔ اب اُس کا کورٹ مارشل ہونا تھا اور ظاہر ہے کہ اُسے سزائے موت ملنی تھی۔ سزائے موت نہیں تو عمر قید تو کہیں نہیں گئی تھی۔ فوج میں کوئی سپاہی جرم کرے تو اسے کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن کوئی حوالدار ایسا جرم کرے کہ اسے گرفتار کرنا پڑے تو اسے بند نہیں کیا جاتا بلکہ ایک حوالدار اس کے ساتھ اسکارٹ کے طور پر مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اُس وقت اسے پیٹی قید کہا کرتے تھے' شاید آج کل بھی یہی کہتے ہوں۔ پیٹی قید کا مطلب یہ تھا کہ حراست کے دوران یہ حوالدار بیلٹ نہیں باندھ سکتا تھا۔

غلام نبی پر بھی اسکارٹ مقرر کر دیا گیا۔ وہ ہر وقت خیمے میں رہتا تھا اور ایک حوالدار پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ اگلے روز ایک اور حوالدار کو مقرر کر دیا جاتا تھا۔ کورٹ مارشل کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابھی ابتدائی کارروائی کرنی تھی اور یہ کاغذات بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جانے تھے جہاں سے کورٹ مارشل کے احکام ملنے تھے۔

پہلے دو دن جن حوالداروں نے غلام نبی پر اسکارٹ ڈیوٹی دی' وہ مسلمان تھے۔ تیسرے روز ایک ہندو حوالدار کی ڈیوٹی لگی۔ اس حوالدار نے رات کو بھی غلام نبی کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہُوا کرتی تھی۔

صبح دیکھا کہ اس ہندو حوالدار کی لاش خیمے میں پڑی ہے اور غلام نبی لاپتہ ہے۔ غلام نبی دو سٹین گنیں اور جتنا ایمونیشن اس کے ہاتھ لگا' اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اب تو صاف پتہ چل گیا کہ سکھ نائیک کو بھی اُسی نے قتل کیا تھا اور اپنے اسکارٹ حوالدار کو بھی قتل کر کے وہ بھاگ گیا ہے۔ سب جانتے تھے کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ قتل کر کے یا کوئی اور سنگین جرم کر کے کوئی اس طرح فرار ہو جائے تو اس کے کہیں بھی پاؤں نہیں لگتے۔ ہر وقت اور ہر جگہ مخبری کا اور گرفتاری کا خطرہ لگا رہتا ہے اور آدمی بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ میں جس ملک کی بات کر رہا ہوں اور جو حالات پہلے سنائے ہیں' اس ملک اور ان حالات میں بھاگنے والے مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انڈونیشی مسلمان ایسے مسلمان فوجیوں کو جو اُن کے پاس پہنچ جاتے تھے' سر آنکھوں پر بٹھاتے اور دلی طور پر عزت اور احترام کرتے تھے۔

انگریز ایسا جرم بخشنے والی قوم نہیں تھی۔ غلام نبی ایک سکھ اور ایک ہندو کو قتل کر

کے بھاگا تھا۔ انگریز افسر جانتے تھے وہ کہاں گیا ہے۔ علی الصبح ہندو کی لاش خیمے میں دیکھ لی گئی تھی اور یہ بھی کہ غلام نبی لاپتہ ہے۔ اُسی وقت ہندو اور سکھ دونوں کمپنیوں کو فوری تیاری کا حکم ملا اور ان کمپنیوں کو قریبی قصبے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ قصبے کو دونوں کمپنیوں نے محاصرے میں لے لیا۔ وہ کوئی اتنا بڑا قصبہ نہیں تھا' یوں سمجھ لیں کہ ایک ذرا بڑا گاؤں تھا۔ چونکہ وہاں ساری آبادی مسلمانوں کی تھی اس لئے وہ صاف ستھرے رہنے والے لوگ تھے اور اپنی ہر حرکت سے تہذیب یافتہ لگتے تھے۔ تہذیب یافتہ نہ لگتے تو بھی وہ اپنا وقار قائم رکھنے والے اور وقار پر مرمٹنے والے لوگ تھے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھان جب انگریزوں کے خلاف کبھی نہ ختم ہونے والی لڑائی لڑ رہے تھے تو ان کے ساتھ انگریزوں کا رابطہ رہتا تھا۔ وہاں پولیٹیکل ایجنٹ ہوتا تھا۔ اُس کے آدمی انگریزوں اور قبائلیوں کا رابطہ کرا دیتے تھے۔ اس رابطے کی ضرورت اس وقت پڑتی تھی جب کوئی انگریز افسر مارا جاتا اور اُس کی لاش پٹھان اٹھا لے جاتے تھے۔ انگریز قبائلیوں کے ساتھ رابطہ کرتے اور لاش اس طرح واپس لیتے تھے کہ پٹھان اس لاش کی نقد قیمت وصول کرتے تھے۔

بالکل ایسے ہی انڈونیشیا میں گوریلوں کے ساتھ انگریزوں اور امریکیوں کا رابطہ ہو جاتا تھا۔ ہماری دو کمپنیوں نے قصبے کو محاصرے میں لیا تو فوراً" حملہ نہیں کر دیا گیا یا یوں نہیں کہ قصبے میں داخل ہو کر ہر گھر کی تلاشی لی جاتی۔ خیال یہی تھا کہ حوالدار غلام نبی اسی قصبے میں ہے اور ابھی ابھی صبح ہوئی ہے اور وہ یہیں ہو گا۔ انگریز افسر خاصے محتاط تھے۔ انہوں نے قصبے کے بزرگوں کو باہر بلایا اور وہ آ گئے۔

بعد میں یہ باتیں ہمیں معلوم ہوئیں۔ انگریز افسروں نے اپنے آدمیوں کی معرفت بزرگوں کو بتایا کہ ایک حوالدار اس طرح دو آدمیوں کو قتل کر کے اس قصبے میں رُوپوش ہو گیا ہے۔ انہیں ہمارے افسروں نے کہا کہ اس حوالدار کو وہ خود ہی باہر نکال دیں ورنہ ہر گھر کی تلاشی لی جائے گی۔

انڈونیشی بزرگوں نے انگریز افسروں سے کہا کہ ہم اگر اتنے بزدل ہوتے تو آپ کے آگے آ کر غلاموں کی طرح سر جھکاتے اور آپ کو اپنا حاکم سمجھ کر خود ہی اپنے گھروں میں لے جاتے اور کہتے ہمارے گھروں کی تلاشی لے لو لیکن ہم ایک آزاد قوم ہیں اور

مسلمان بھی ہیں۔ اگر ہمارے پاس کوئی مسلمان پناہ لینے کے لئے آتا ہے تو ہم اسے اپنے اللہ کی امانت اور اپنا مہمان سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی جانیں دے دیں گے لیکن وہ آدمی نہیں دیں گے جس نے یہاں پناہ لی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہیں معلوم نہیں کہ ان کا حوالدار اس قصبے میں آیا ہے لیکن وہ یہ بات صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ قصبے کی تلاشی کا خطرہ مول نہ لیں۔

انگریز بھی تو کوئی بزدل قوم نہیں تھی۔ انہوں نے پانچ سال جنگِ آزادی لڑی تھی اور جرمنی اور جاپان کو شکست دی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ امریکہ ان کے ساتھ نہ آملتا تو وہ فاتح نہ کہلا سکتے لیکن اب وہ فاتح تھے اور اس کے علاوہ وہ آدھی دنیا کے بادشاہ تھے۔ ہندوستان' برما' ملایا اور انڈونیشیا جیسے ملکوں کے لوگوں کو تو وہ پیدائشی غلام سمجھا کرتے تھے۔ وہ بھلا کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ اس قصبے کے لوگ انہیں اس طرح کا چیلنج دے رہے تھے کہ ان کا حوالدار یہاں ہے یا نہیں' وہ گھروں کی تلاشی نہیں لینے دیں گے۔

ایک تو انگریزوں کی یہ شاہانہ ذہنیت اور پھر جلتی پر تیل ڈالنے والا ایک انگریز میجر بھی تھا۔ وہ بی کمپنی یعنی ہندوؤں کی کمپنی کا کمپنی کمانڈر تھا۔ وہ طبعاً" بڑا ہی غصیلا آدمی تھا۔ اتفاق سے اس کا نام دیکھئے کیا تھا۔ نام تھا پگ.... آر ڈبلیو پگ.... یہ تو آپ جانتے ہیں کہ پگ کا مطلب ہوتا ہے خنزیر۔ وہ غصے کا خنزیر ہی تھا۔ وہ جب غصے میں بات کیا کرتا تھا تو اس کے منہ سے تھوک اڑا کرتا تھا۔ اس نے جب انڈونیشی مسلمانوں کے بزرگوں کی یہ چیلنج نما بات سنی تو اُس کے غصے میں دھماکہ پیدا ہُوا اور وہ ان بزرگوں کو بڑی بے عزتی کے انداز میں ڈانٹنے لگا اور اُس نے یہاں تک حرکت کی کہ ایک بزرگ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے پیچھے دھکیلا اور وہ بزرگ پیچھے کو گر پڑا۔ یوں لگا جیسے بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھادی ہو۔

ایک تو پانچ سات انڈونیشی جواں سال آدمی ساتھ تھے جن کے پاس جاپانی ساخت کی سٹین گنیں بھی تھیں اور رائفلیں بھی۔ ان میں سے کچھ نے اس انگریز میجر پر ہتھیار تان لئے اور دو تین نے اپنے نیفوں سے خنجر نکال لئے۔ ادھر قریبی مکانوں کی منڈیروں پر اچانک اس طرح آدمی اور عورتیں کھڑی نظر آئیں جیسے وہ سب جنات تھے جو اچانک ظاہر ہو گئے تھے۔ ان سب نے منڈیروں کے پیچھے پوزیشنیں لی ہوئی تھیں۔ کسی نے انہیں للکار کر بتایا کہ ایک انگریز افسر نے ہمارے بزرگ کی بے عزتی کی ہے۔ وہ سب

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان میں کم سن لڑکیوں سے لے کر بڑی عمر کی عورتیں تک بھی تھیں اور باقی سب مرد تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی بغیر ہتھیار کے نہیں تھا۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ ان لوگوں نے انگریزوں پر فائر نہیں کھولا تھا۔ انڈونیشی ان انگریزوں اور امریکیوں کو تو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں اور ہماری ان دو کمپنیوں کی خوش قسمتی تھی کہ جن لوگوں نے انگریز افسروں اور انڈونیشی بزرگوں کا رابطہ کرایا تھا' وہ درمیان میں آگئے اور خون خرابہ نہ ہُوا۔

اس قصبے کے بزرگوں نے ہمارے انگریز افسروں سے کہا کہ آبادی کو توپوں سے اُڑا دو اور یہاں کے بچے بچے کو مار ڈالو' کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فوج سے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکایا جائے گا۔ یہاں نہیں تو کہیں اور.... ہمارا کمانڈنگ آفیسر بھی ساتھ تھا۔ اُس نے اپنے کمپنی کمانڈر میجر پگ کو ڈانٹ پلائی اور پیچھے ہٹادیا۔ یہ اس انگریز کی ڈپلومیسی تھی۔ اگر وہ بھی غصے میں آجاتا تو وہاں صورت حال کچھ اور ہو جاتی۔ ہماری کمپنیاں ناکام واپس آگئیں۔

ہمیں اب یہ توقع تھی کہ قصبے میں جانے کی جو کھلی اجازت تھی وہ منسوخ کر دی جائے گی لیکن ایسا نہ ہُوا۔ یہ انگریز افسروں کی دانشمندی تھی اور یہ ان کی ڈپلومیسی تھی۔ غالباً" انہوں نے سوچا ہو گا کہ مسلمان جوانوں کو قصبے میں جانے سے روکا گیا تو ان کے دلوں میں تلخی پیدا ہو گی اور انڈونیشی مسلمانوں کی ہمدردی میں اضافہ ہو جائے گا۔ دراصل انگریز کسی اور ذہنیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یہ اس شیطان اور مُسلم کُش کی ایک بڑی گہری چال تھی۔ اس کا علم ہمیں یوں ہُوا کہ ہم لوگ اس قصبے میں جب بھی جاتے تو نماز کا وقت ہوتا تو نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہاں نماز پڑھنے سے ہمیں دو فائدے ہوتے تھے۔ ایک تو وہ باقاعدہ مسجد تھی اور ہم سمجھتے تھے کہ مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ملتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ وہاں انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ملاقات ہوتی تھی تو ہمیں بخدا روحانی خوشی میسّر آتی تھی۔ ان میں جو اردو نہیں بولتے اور سمجھتے تھے وہ اشاروں میں اپنے جذبات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ دین کا رشتہ زبان کا پابند نہیں ہوتا۔ یہ ایسا رشتہ ہے جو الفاظ میں اور زبان سے بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دل سے دل مل جاتے ہیں اور پھر مسکراہٹیں اور آنکھیں اپنا مدعا بیان کرتی ہیں۔ مجھ پر یہی کیفیت وہاں جا کر طاری ہو جایا کرتی تھی۔

ایک روز عصر کے وقت میں اور حوالدار امیر خان اور ایک انڈونیشی ہمارے ساتھ تھا' قصبے کی مسجد میں گئے اور عصر کی نماز وہاں پڑھی۔ اتفاق سے وہاں وہ آدمی مل گیا جس نے عید کے روز امام کا خطبہ ہمیں اردو میں سنایا تھا۔ وہ ہم تینوں کو مسجد کے اندر لے گیا۔ اندر کا مطلب ہے اندرونی کمرے میں۔ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی راز کی بات کرے گا۔

بات واقعی راز کی تھی اور بڑی ہی خطرناک بات تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ مجھے وہ اس لئے قابلِ اعتماد اور معزز سمجھتا تھا کہ میں نے عید کے روز مسجد میں تقریر کی تھی۔ یہ بات تو وہ کسی اور کو بھی بتا سکتا تھا لیکن احتیاط کو لازم سمجھتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہاں دو تین آدمی ایسے ہیں جو ہیں تو اس قصبے کے مسلمان ہی لیکن ان کے متعلق شک کیا جا رہا ہے کہ وہ درپردہ انگریزوں کے جاسوس اور مخبر ہیں۔ ان لوگوں نے بڑی استادی سے قصبے میں یہ افواہ پھیلا دی ہے کہ ہماری بٹالین کے جو مسلمان ہیں وہ اس قصبے کے مسلمانوں کے خلاف ہو گئے ہیں اور کسی بھی روز یہ بٹالین مسلمان کمپنیوں سے قصبے پر حملہ کروائے گی۔ پروپیگنڈے میں یہ بھی کہا گیا کہ امریکیوں اور ولندیزیوں نے مسلمانوں کی ان کمپنیوں کو بہت پیسہ دیا ہے اور اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ یہاں کے لوگوں نے اس بات کو سچ مان لیا ہے؟.... اُس نے بتایا کہ زیادہ تر لوگوں نے اسے سچ نہیں مانا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسے سچ سمجھتے ہیں۔ اُس نے خطرے کا اظہار کیا کہ یہ لوگ جو اسے سچ سمجھتے ہیں دوسروں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسجد میں کوئی مسلمان جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر بولے گا تو اسے دنیا میں ہی سزا ملے گی۔ میں نے اور پھر حوالدار امیر خان نے اسے کہا کہ وہ تمام آبادی سے کہہ دے کہ تم لوگ انگریزوں کو نہیں جانتے۔ یہ بڑی چالباز قوم ہے اور اس قوم نے آدھی دنیا پر اپنی بادشاہی جو قائم کر رکھی ہے' یہ سب اس کی چالبازی کا نتیجہ ہے۔ اس انڈونیشی معزز آدمی نے کہا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور انگریزوں کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ تب میں نے اسے کہا کہ پھر اسے یقین کر لینا چاہئے کہ انگریز یہ ایک چال چل رہے ہیں جس سے وہ یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ اس بٹالین کے مسلمانوں اور اس قصبے کی آبادی کے درمیان عداوت پیدا ہو جائے۔ ایسا بھی

نہیں ہو گا۔ تب میں نے اُسے کہا کہ وہ ان آدمیوں کو جانتا ہے جن پر شک ہے کہ وہ انگریز کے ایجنٹ ہیں تو انہیں آبادی سے نکال کیوں نہیں دیتے۔ ایسے لوگ تو غدار ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ کام بھی کر دیا جائے گا لیکن تھوڑی سی دشواری یہ ہے کہ وہ ذرا اونچی حیثیت کے لوگ ہیں اس لئے ان کے خلاف سوچ سمجھ کر کارروائی کریں گے۔ میں نے اسے کہا کہ کارروائی کریں یا نہ کریں' لوگوں کو یہ بتا دیں کہ ہماری بٹالین کا کوئی ایک بھی مسلمان ایسا نہیں جس کے دل میں انڈونیشی مسلمانوں کے خلاف کوئی وہم یا شک ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ یہ غلط فہمی پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی۔

○

کیمپ میں واپس آ کر ہم نے یہ بات اپنے دو تین صوبیداروں کو بتائی اور پھر یہ بات حوالدار میجروں اور حوالداروں تک پہنچی اور طے کیا گیا کہ زبانی کلامی اپنے تمام مسلمان جوانوں کو بتا دیا جائے کہ انگریز اس ساتھ والی آبادی میں یہ پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔ کچھ دن اور گزر گئے تو میں اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ ایک روز پھر قصبے میں گیا اور مسجد میں جا کر نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو ایک جوان سال انڈونیشی میرے ساتھ لگ کر آ بیٹھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے مسکرا کر سر سے اشارہ کیا کہ میں اُس کے ساتھ چلوں۔ میں نے پوچھا' کیا بات ہے؟ اُس کی مسکراہٹ اور زیادہ پھیل گئی اور اُس نے سر ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اردو نہیں سمجھتا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ میرے زانو پر رکھ کر ذرا دبایا اور پھر سر سے اشارہ کیا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ انڈونیشی مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ ساتھیوں نے کہا کہ جانے میں کوئی حرج نہیں' ذرا محتاط رہنا' ہم تمہارا یہیں انتظار کریں گے۔

میں کسی انڈونیشی مسلمان سے دھوکے اور فریب کی توقع رکھتا ہی نہیں تھا۔ میں اٹھا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے چھوٹی چھوٹی تین چار گلیوں میں گھماتا ایک گھر میں لے گیا۔ وہ بڑا اچھا اور صاف ستھرا گھر تھا۔ ایک صحن میں سے گذار کر ایک کمرے میں لے گیا۔ میں دیکھ کر حیران رہ گیا.... میرے سامنے حوالدار غلام نبی چارپائی پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھا اور بازو پھیلا کر میری طرف آیا۔ دوسرے لمحے ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

اس نے مجھے اپنا ہم راز بنانے کے قابل سمجھا تھا کہ ہم دونوں ہم خیال تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ میں برما فرنٹ پر بھگوڑا ہُوا تھا اور میں نے آئی این اے میں جانا تھا۔ میں جب بٹالین میں واپس آیا تھا تو حوالدار غلام نبی بڑے پیار سے ملا تھا۔ میں نے اسے صاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ میں نے آئی این اے میں جانا تھا اور میں اس لئے آئی این اے سے متنفر ہُوا کہ میں نے ہندوؤں کی ذہنیت دیکھ لی تھی۔ پھر میں نے اسے برما کے جنگل کی ساری داستان سنائی تھی۔ غلام نبی تو میٹرک بھی پاس نہیں تھا لیکن اُس کی تعلیم اتنی ہی ضرور تھی کہ فوج میں آکر اس نے تعلیمی ٹیسٹ بھی پاس کئے تھے جس سے وہ میٹرک سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو گیا تھا۔ یہ وجہ تھی کہ اسے انٹیلی جنس سیکشن میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

میں بہت خوش ہُوا کہ اُس نے مجھے بلایا تھا اور اپنا ہم راز بنایا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ مجھے یہی بتانا چاہتا تھا کہ وہ یہاں ہے اور اُس کی باقی زندگی انڈونیشیا میں ہی گزرے گی اور وہ ان لوگوں کی جنگِ آزادی لڑے گا۔ پھر اُس نے مجھے اکسانا شروع کر دیا کہ میں بھی بھگوڑا ہو کر اس کے پاس آجاؤں۔ میں نے اسے بتایا کہ ارادہ یہی ہے اور میں کسی بھی وقت اِدھر سے اُدھر آجاؤں گا۔

اس نے مجھ سے وہ ساری باتیں پوچھیں جو اُس کے فرار کے بعد بٹالین میں ہوئی تھیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس نے اس سکھ نائیک کو کس طرح قتل کیا تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ رات اس نے جاگتے گذاری تھی۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس نائیک کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس سکھ نے انڈونیشی عورتوں کی جس طرح زبانی توہین کی تھی' اسے وہ برداشت نہیں کر سکا تھا۔ اس سے آپ اندازہ کریں کہ اس کے دل میں انڈونیشی مسلمانوں کی کتنی زیادہ محبت تھی۔ وہ رات کو کئی بار اپنے خیمے میں سے اس توقع پر نکلا کہ یہ نائیک کسی وقت تو پیشاب وغیرہ کے لئے باہر آئے گا۔ غلام نبی جب مجھے یہ واقعہ سنا رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیا کم عقل آدمی ہے۔ یہ ضروری تو نہیں تھا کہ نائیک نے رات ضرور اٹھنا تھا لیکن اس سکھ کی موت اسی طرح لکھی ہوئی تھی اس لئے وہ آدھی رات کے وقت خیمے سے نکلا۔

ادھر سے غلام نبی عین اُسی وقت اس کے خیمے کی طرف گیا۔ یہ کوئی فوجی ہی جانتا ہے کہ غلام نبی کو کیسی دشواری پیش آئی ہو گی۔ دشواری یہ تھی کہ رات کو ہر کمپنی کا

اب سنتری تین گھنٹے کے لئے چل پھر کر پہرہ دیتا تھا۔ غلام نبی ان سنتریوں سے بچتا بچاتا باہر نکلا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا کہ اُس کا شکار آخر باہر آگیا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور سکھ کے قریب جا کر یقین کر لیا کہ یہ اس کا شکار ہی ہے۔

سکھ نے اُسے پہچان کر آنے کا پوچھا۔ غلام نبی نے یہ قتل بڑی اچھی طرح پلان کیا ہوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا۔ اُس نے بڑی پھُرتی سے یہ کپڑا سکھ کے منہ میں ٹھونس کر پیچھے گانٹھ دے دی۔ غلام نبی بڑا گٹھا ہُوا طاقتور جوان تھا۔ اس کے مقابلے میں سکھ نائیک کچھ دبلا پتلا تھا۔ غلام نبی نے فوراً" اسے ایک کندھے پر ڈال لیا۔ سکھ کی ٹانگیں غلام نبی کے آگے تھیں اور اوپر والا دھڑ پیٹھ کی طرف تھا۔ یہ واردات بڑی ہی دلیری اور جرأت والی واردات تھی۔ غلام نبی ایک طرف چل پڑا۔

وہاں سہولت یہ حاصل تھی کہ وہ کھُلا میدان نہیں تھا۔ وہاں درخت بہت زیادہ تھے۔ بڑی خوبصورت سرسبز جگہ تھی۔ غلام نبی بڑی تیز تیز چلتا گیا اور اس جگہ جا پہنچا جہاں اس سکھ کی لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔

غلام نبی نے وہاں جا کر سکھ کو کندھے سے نیچے گرایا۔ سکھ پیٹھ کے بل گرا۔ غلام نبی نے بڑی پھُرتی سے چاقو نکالا' کھولا اور پیشتر اس کے کہ سکھ نائیک اٹھتا' غلام نبی نے چاقو اس کے پیٹ میں اتار کر ایک طرف زور سے کھینچا اور سکھ کا پیٹ چاک کر دیا۔

پیٹ چاک ہوتے ہی آدمی مرنہیں جاتا وہ ہوش میں رہتا ہے اور یکدم اٹھتا ہے اور بچنے کی یا بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سکھ بھی اٹھا اور وہ جونہی اٹھا اس کی انتڑیاں باہر آ گئیں۔ غلام نبی اسے دیکھتا رہا اور سکھ اس کے ساتھ آ لگا اس طرح خون غلام نبی کی وردی کے ساتھ بھی لگ گیا۔ آخر سکھ گر پڑا۔ غلام نبی نے اس کے منہ سے کپڑا اتار کر اپنے پاس رکھ لیا اور واپس آگیا۔ اپنے خیمے میں آ کر اُس نے کپڑے تبدیل کئے اور اس طرح آرام اور سکون سے سو گیا جیسے بڑا ہی ضروری کام ختم کر لیا ہو۔

حوالدار غلام نبی کے ساتھ ایسی اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں۔ اُس نے مجھے اس لئے بلایا تھا کہ مجھے یہ پتہ چل جائے کہ وہ یہاں ہے اور مجھے اپنے جذبات اور ارادوں سے مکمل کرنا چاہتا تھا اور پھر وہ بٹالین کے مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ ایک ایک کر کے سب اُسی کی طرح اُدھر سے بھاگ کر اِدھر اپنے انڈونیشی بھائیوں کے پاس آجائیں۔ اُس نے بتایا کہ انڈونیشی اسے بہت اونچی حیثیت دے رہے ہیں جو اسے پسند نہیں۔ وہ ان

کے ساتھ مل کر ان کی جنگِ آزادی لڑنا چاہتا تھا اور اتنے دنوں میں وہ ایک گوریلا کارروائی میں شامل ہو بھی چکا تھا۔ وہ تو تربیت یافتہ فوجی تھا اور حوالدار تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منجھا ہُوا تجربہ کار حوالدار ہے۔ اُس نے برما فرنٹ پر لڑائی بھی لڑی تھی۔

میں نے ایک خاص بات نوٹ کی۔ وہ یہ کہ انڈونیشی لوگوں کے قد ذرا چھوٹے تھے اور ان کے درمیان غلام نبی کا قد چھ فٹ تھا اور جسم پہلوانوں جیسا۔ اس کے ساتھ انڈونیشی چھوٹے چھوٹے لگتے تھے۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ وہ دو انڈونیشی مسلمانوں کو اٹھا کر بڑے آرام سے چل پھر سکتا ہے۔

اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ایک خاص کام کرنا چاہتا ہے جو اسے کرنے نہیں دیا جارہا۔ وہ چاہتا یہ تھا کہ رات کو کہیں ہمارے کیمپ کے اِردگرد کسی درخت پر بیٹھ جایا کرے یا کہیں پوزیشن لے لیا کرے اور ہر روز ایک دو فوجیوں کو گولی کا نشانہ بنا لیا کرے۔ وہ ہندو اور سکھ صوبیداروں وغیرہ کو مارنا چاہتا تھا اور پھر وہ انگریز افسروں کو نشانہ بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس کام کو فوجی زبان میں Sniping کہتے ہیں لیکن انڈونیشی مسلمان ایک منظم گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اور وہ وہی کارروائیاں کرتے تھے جن کا انہیں اپنے اپنے ہیڈ کوارٹر سے آپریشن آرڈر ملتا تھا۔ کوئی حریت پسند اپنے طور پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ غلام نبی کو بھی انہوں نے اپنا پابند کر لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ایسی کارروائی کا تصوّر نہ کرے جس کا اوپر سے حکم نہ آیا ہو۔

میں غلام نبی کی کمزوری سمجھتا تھا۔ وہ جذبات میں آیا ہوا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایسی لڑائیاں عقل سے لڑی جاتی ہیں جذبات سے نہیں.... ہماری بہت باتیں ہوئیں اور پھر میں وہاں سے آگیا۔

○

اللہ نے کرم کیا کہ مجھے ترقی مل گئی۔ میں اب فرسٹ گریڈ کا کلرک بن گیا تھا۔ ہر کلرک کا عہدہ حوالدار ہی ہوتا تھا لیکن تین گریڈ تھے۔ تھرڈ، سیکنڈ اور آخری گریڈ تھا فرسٹ۔ یہ ترقی ملتے ہی مجھے ایکوٹنٹ آفس میں لگا دیا گیا۔ اس سے مجھے یہ سہولت حاصل ہو گئی کہ میں انتہائی گہرے راز کے خطوط بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ آپریشن آرڈرز تو ہوتے ہی سیکرٹ تھے۔ ان تک میری رسائی اور زیادہ آسان ہو گئی۔

ملاقات کے آٹھ دس روز بعد بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ایک اور آپریشن آرڈر آ

گیا۔ اس میں صرف ہماری بٹالین کا کام تھا۔ ایک خاص ایریا دیا گیا تھا۔ ہماری بٹالین کو اس ایریا میں پہنچنا اور وہاں سے کمپنیوں کو مختلف اطراف میں روانہ کرنا تھا۔ اس علاقے میں انڈونیشی گوریلوں نے کوئی خاص کارروائی کرنی تھی اور وہاں اکٹھے ہو کر انہوں نے مختلف اطراف کو جانا تھا۔ انگریزوں اور امریکیوں کا جاسوسی کا نظام بڑا اچھا تھا۔ یہ تو ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ ولندیزی لڑکیاں خاص طور پر جاسوسی کا کام کرتی تھیں اور کچھ ولندیزی جن کے خدوخال انڈونیشی مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے، وہ مسلمانوں کے روپ میں انڈونیشی گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔

ولندیزی تو یورپ کی قوم تھی جن کے خدوخال اور رنگ بالکل الگ تھے لیکن ان میں کچھ ایسے تھے جو انڈونیشیا کے ہی علاقوں میں آباد ہو گئے اور یہیں پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کی مائیں انڈونیشی تھیں۔ اس طرح ان کے خدوخال انڈونیشیا کے لوگوں جیسے ہو گئے تھے۔ ان میں سے انگریزوں اور امریکیوں کو جاسوسی یعنی انٹیلی جنس کا کام کرنے والے آدمی مل گئے تھے۔ ولندیزی لڑکیاں تو خاص طور پر بہت ہی خوبصورت تھیں۔ وہ جاسوسی کے میدان میں بڑی کامیاب تھیں۔ جاسوسی کا یہ نظام ایسا تھا کہ انڈونیشی گوریلوں کی بعض کارروائیوں کی اطلاع قبل از وقت فوج کو مل جاتی تھی۔

جس آپریشن میں ہماری بٹالین جارہی تھی، یہ بھی جاسوسوں کی بدولت جارہی تھی جاسوسوں نے ہی اطلاع دی ہو گی کہ انڈونیشی گوریلے فلاں جگہ اکٹھے ہو رہے ہیں اور ان کا پلان یہ ہے۔

آپریشن آرڈر آیا تو وہ میں نے بھی پڑھا۔ میں اب اس موقع کی انتظار میں تھا کہ یہ آرڈر میرے ہاتھ چڑھ جائے اور میں اس کی نقل کر کے حوالدار غلام نبی کو پہنچا دوں۔ بڑی کوشش کے باوجود میں اس کی نقل نہ کر سکا البتہ اس کے نہایت ضروری حصے، آپریشن کا دن اور وقت وغیرہ زبانی یاد کر لئے اور الگ بیٹھ کر ایک کاغذ پر لکھ لئے۔ آپریشن تین دنوں بعد شروع ہونا تھا یعنی ہماری بٹالین کو تین دنوں بعد اس ایریے کی طرف روانہ ہونا تھا۔

میں اُسی روز قصبے میں گیا اور سیدھا اُس گھر میں گیا جہاں غلام نبی سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ معلوم کر کے مجھے مایوسی ہوئی کہ غلام نبی دو تین روز پہلے کسی گوریلا آپریشن میں شریک ہونے کے لئے چلا گیا تھا۔ گھر میں اس گھر کا سربراہ موجود تھا اور وہ کوئی ایسا ویسا

آدمی نہیں تھا بلکہ اس کی ایک خاص حیثیت تھی۔ میں نے اُسے آپریشن آرڈر کے اہم نکات جو لکھے ہوئے تھے' دے دیئے اور کہا کہ یہ بہت جلدی جس تک پہنچانے ہیں پہنچا دے۔

اس انڈونیشی نے مجھے بتایا کہ غلام نبی اسی گوریلا آپریشن میں شریک ہونے کے لئے گیا ہے۔ اُسے ایک پارٹی دی جائے گی اور اس پارٹی کا ایک خاص مشن ہے جو اس نے غلام نبی کی کمانڈ میں پورا کرنا ہے۔ اس شخص نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ میں اسے اپنی بٹالین کا جو آپریشن آرڈر دے چلا ہوں یہ گذشتہ شام اُس کے پاس پہنچ چکا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ اُس کے پاس کس طرح پہنچا ہے' اُس نے بتایا کہ تمہارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اس کی نقل ہمارے گوریلا ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئی تھی۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ انڈین آرمی کے مسلمان بہت بڑا کام کر رہے ہیں اور یہ کام اللہ کی راہ میں کیا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس آپریشن آرڈر کے پیشِ نظر اپنا پلان ملتوی کر دیں گے؟

"نہیں!" — اُس نے جواب دیا — "ہمارا پلان ملتوی نہیں ہو گا بلکہ اس کی صورت بدل دی گئی ہے۔ چونکہ پہلے اطلاع مل گئی ہے کہ ایک بٹالین آ رہی ہے تو اب پلان یہ بن گیا ہے کہ پیشتر اس کے کہ یہ بٹالین ہمارے گوریلوں کو گھیرے میں لے گوریلے بٹالین کو گھات میں لے لیں گے"۔

ہو سکتا ہے میرے فوجی بھائی جو میری یہ بات پڑھیں گے' کہیں گے کہ یہ شخص بڑا ہی غیر ذمہ دار تھا جس نے گوریلوں کا پلان بتا دیا لیکن مجھ پر ان لوگوں کو مکمل اعتماد تھا۔ میں انہیں اتنی گہری راز کی بات بتا رہا تھا تو وہ مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپا رہے تھے۔

تین دن گزر گئے اور ہماری پوری بٹالین اس آپریشن آرڈر کے مطابق بتائے ہوئے ایریے کی طرف چل پڑی۔ میں بھی ساتھ تھا۔ بٹالین کو ایک خاص جگہ پہنچنا تھا اور وہاں سے کمپنیوں کو آپریشن آرڈر کے مطابق مختلف اطراف روانہ کرنا تھا۔ جگہ دُور تھی اور کوئی پکی سڑک نہیں تھی اس لئے بٹالین پیدل جا رہی تھی۔ اُس مقام تک پہنچتے شام ہو گئی۔

رات وہیں گذارنی تھی۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے تمام کمپنی کمانڈروں کو بلا کر بریفنگ دی اور انہیں اچھی طرح سمجھا دیا کہ ان کے ذمے کیا کیا کام ہے۔ اس کے بعد

وہیں بغیر خیموں کے کیمپ کر لیا گیا۔ ہم دن بھر پیدل چلتے رہے تھے۔ راستے میں چار جگہوں پر پندرہ پندرہ منٹ کے لئے رُکے تھے۔ تھکن اتنی زیادہ کہ ٹانگیں ٹوٹ رہی تھیں۔ ہم نے زمین پر کمبل ڈالے اور لیٹتے ہی سو گئے۔

رات کے دس بجنے والے ہوں گے کہ اچانک بٹالین پر ہر طرف سے فائر کھل گیا۔ بٹالین میں ہڑبونگ بپا ہو گئی اور سب آڑ اور پوزیشنیں ڈھونڈنے لگے۔ "مردیکا" کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔

انڈونیشی مسلمان "مردیکا" کا نعرہ لگایا کرتے تھے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ انڈونیشی ہیں۔ ان کا لہجہ اپنا اور آواز مختلف ہوتی لیکن اُس دن ہماری بٹالین پر فائر آیا تو "مردیکا" میں ایک آواز بڑی ہی بلند' دبنگ اور گرجدار تھی۔ یہ کسی انڈونیشی کی آواز نہیں تھی۔

یہ آواز غلام نبی کی تھی لیکن غلام نبی اس آپریشن میں شدید زخمی ہو گیا۔

(جاری ہے)

بات

آگے چلانے سے پہلے ایک وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں پہلے یہ لکھتا آیا ہوں کہ اُس وقت انڈونیشیا کا وجود نہیں تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انڈونیشیا کے لوگ اس ملک کے لئے جس کے لئے وہ جنگِ آزادی لڑ رہے تھے' انڈونیشیا ہی کہتے تھے اور انہوں نے اس ملک میں باقاعدہ حکومت بھی قائم کر رکھی تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ حکومت باقاعدہ طور پر چل رہی تھی اور گوریلا جنگ بھی ایک باقاعدہ ہیڈ کوارٹر کے تحت پلان اور سکیموں کے مطابق لڑی جا رہی تھی۔ یہ جو میں کہتا آیا ہوں کہ انڈونیشیا اُس وقت کوئی ملک نہ تھا' اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ انڈونیشیا کو بحیثیت ایک آزاد ملک اقوامِ متحدہ نے تسلیم کیا تھا نہ انگریزوں نے نہ امریکیوں نے اور نہ ہی ولندیزیوں نے۔

اب میں آپ کو اُس میدانِ جنگ میں لئے چلتا ہوں جہاں انڈونیشی گوریلوں نے ہماری بٹالین پر اُس وقت شب خون مارا تھا جب بٹالین دن بھر پیدل چلتے چلتے تھک کر گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اگلے روز بٹالین نے اُس مقام تک پہنچنا تھا جو آپریشن آرڈر میں بتایا گیا تھا۔ یہ تو ایک پڑاؤ پہلے ہی ہم پر حملہ ہو گیا تھا۔

خیمے نہیں تھے۔ خیموں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ دو دنوں کے آپریشن کے بعد واپس اپنے کیمپ میں آجانا تھا۔ رات چاندنی تھی لیکن درخت اتنے زیادہ تھے کہ چاندنی ہمارے کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ اردگرد ٹیکریاں تھیں اور یہ سب ٹیکریاں سرسبز تھیں اور ان پر بھی درخت تھے۔ ساری بٹالین کے سو جانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سبھی بے خبر سو گئے تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لئے اردگرد ذرا دور دور کئی ٹیکریوں پر پوسٹیں بنا دی گئی تھیں۔ پوسٹوں کا مطلب یہ تھا کہ وہاں ایک ایک سیکشن یعنی آٹھ نو نوجوان اس

سے دو چار زیادہ جوان مورچہ بند ہو گئے تھے۔

ہر پوسٹ میں ایک سنتری بیدار تھا۔ کیمپ کے اندر ہر کمپنی کا ایک سنتری تین تین گھنٹے گھوم پھر کر ڈیوٹی دیتا تھا۔ رائفلیں' سٹین گنیں' مشین گنیں ہمیں اپنے پاس رکھنے کا حکم ملا تھا۔

حملہ اس طرح ہوا کہ ہر طرف سے بٹالین پر سٹین گنوں' ٹامی گنوں اور رائفلوں کا بے تحاشا فائر آنے لگا۔ پوری بٹالین جاگ اٹھی۔ کیمپ کی اردگرد کی تمام پوسٹوں میں سے روشنی راؤنڈ فائر ہونے لگے جنہوں نے رات کو دن بنا ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی ہر پوسٹ میں سے مشین گنیں اور رائفلیں اندھا دھند جوابی فائر کرنے لگیں۔ فوجی ٹریننگ کے مطابق تمام پلٹن اٹھ کر کیمپ کے اردگرد مورچہ بند ہو گئی۔ کمانڈنگ آفیسر اور کمپنی کمانڈر وغیرہ فوراً" آگئے اور چلا چلا کر حکم اور ہدایات دینے لگے۔

بٹالین کے پاس اس قدر زیادہ ایمونیشن تھا جس کے ختم ہونے کا امکان نہیں تھا اس لئے فوجی یوں فائر کر رہے تھے جیسے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ دشمن کہاں ہے۔ ویسے بھی رات کے وقت اسی طرح فائر کیا جاتا ہے۔ مشین گنیں دائیں بائیں پھیر پھیر کر مسلسل فائر کی جاتی ہیں۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمن جہاں کہیں بھی ہو' اس کی زد میں آجاتا ہے۔

یہ تو ہم جانتے تھے کہ گوریلوں نے پہلا حملہ پوسٹوں پر کیا ہو گا۔ پھر کوئی بعید نہیں تھا کہ گوریلے بٹالین کی حدود کے اندر بھی آگئے ہوں۔ انڈونیشی مسلمانوں کی جرأت اور شجاعت کو ہم اچھی طرح جانتے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ بٹالین کے مسلمان سپاہی فائر نہیں کر رہے ہوں گے بلکہ ہتھیاروں کی نالیاں ذرا اوپر کر کے ایمونیشن پھونک رہے ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کسی باقاعدہ فوج کا حملہ نہیں بلکہ یہ گوریلے ہیں جو زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ ٹھہریں گے اور واپس چلے جائیں گے۔

ہُوا بھی ایسے ہی' گوریلے بگولے کی طرح آئے اور گئے۔ ہم لوگ یہی کچھ کر سکتے تھے کہ اندھا دھند گولیاں چلائیں اور اپنی جانیں بچانے کے لئے آڑ میں رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری بٹالین جو بھی جوابی کارروائی کر رہی تھی' وہ بوکھلاہٹ کا مظاہرہ تھا اور پلٹن کے اندر نفسانفسی کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ جو قیامت کا شور ہو رہا ہے' اس میں گوریلوں کا فائر کتنا ہے اور کیا ان کا فائر بند ہو چکا ہے یا نہیں۔ کمپنی

کمانڈروں اور کمپنی صوبیداروں وغیرہ نے اپنی اپنی کمپنیوں کو اپنی کمانڈ میں لے لیا تھا۔

پھر جس طرح اچانک فائر شروع ہُوا تھا اسی طرح اچانک بند ہو گیا۔ غالباً" دو یا تین کمپنیوں کو کیمپ سے دُور بھیجا گیا کہ وہ گوریلوں کا تعاقب کریں اور ان میں سے جو زخمی ہیں انہیں اٹھا کر کیمپ میں لے آئیں۔ میں صرف آپ کو اے کمپنی کی بات سناؤں گا۔ اے کمپنی مسلمانوں کی کمپنی تھی۔ میں اس کمپنی کی کارگذاری صرف اس لئے سنانا چاہتا ہوں کہ پہلے میں بتا چکا ہوں کہ حوالدار غلام نبی جو گوریلوں میں جا ملا تھا' زخمی ہو گیا تھا۔ میں نے آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہمیں کس طرح پتہ چلا کہ غلام نبی زخمی ہو گیا تھا اور پھر اس پر کیا بیتی۔ یہ تو میں پچھلے باب میں سنا چکا ہوں کہ غلام نبی انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا گیا تھا اور وہاں اُس نے بڑی اچھی پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ وہ تجربہ کار حوالدار تھا اور میں نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہماری بٹالین جس آپریشن پر جا رہی تھی وہ گوریلوں کے اجتماع کے خلاف تھا اور گوریلوں نے کوئی بڑی زبردست کارروائی کرنی تھی اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ اُن کی اس کارروائی میں غلام نبی کی حیثیت ایک کمانڈر جیسی ہے۔

باقی رات جاگتے گزر گئی۔ ہمارے سٹریچر بیئرر زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ایک جگہ لاتے رہے۔ بٹالین کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کا عہدہ کیپٹن تھا اور اس کے ساتھ اس کا عملہ بھی تھا۔ ابتدائی مرہم پٹی وغیرہ کا پورا انتظام تھا۔

یہ تو صرف میں جانتا تھا کہ گوریلوں نے ہماری بٹالین پر راستے میں ہی کیوں حملہ کر دیا ہے۔ ہماری بٹالین جس آپریشن آرڈر کے مطابق جا رہی تھی وہ آپریشن آرڈر انڈونیشی گوریلوں تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ گوریلوں کے ایک خاص مقام پر ہم نے حملہ کرنا تھا لیکن اس کی بجائے گوریلوں نے راستے میں ہی ہم پر حملہ کر دیا۔ مجھے توقع یہ تھی کہ ہم ہدف کے مقام پر پہنچ جائیں گے تو وہاں ہمیں کچھ بھی نہیں ملے گا اور رات کو ہم پر گوریلوں کا حملہ ہو گا یعنی شکاری نے خود شکار ہونا تھا لیکن انڈونیشی گوریلوں نے ہماری بٹالین کو ہدف کے مقام تک پہنچنے ہی نہ دیا۔

صبح ہوئی تو پتہ چلا کہ ہماری بٹالین کے بیالیس جوان مارے گئے ہیں اور ایک سو اکیس شدید زخمی ہوئے ہیں اور معمولی زخموں والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ یہ بھی پتہ چلا کہ انڈونیشی گوریلوں کی صرف چار لاشیں ملی ہیں اور زخمی ایک بھی نہیں ملا۔ وہ لوگ زخمی کو کسی حالت میں پیچھے چھوڑ کر نہیں جایا کرتے تھے۔ ایک زخمی کو اٹھانے پر دو

دو تین تین آدمی قربان کر دیا کرتے تھے۔

○

اے کمپنی کے جو چار پانچ جوان مارے گئے تھے ان میں ایک لاش نائیک نُور عالم کی تھی۔ سپاہی محمد شفیع بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ بچ گیا تھا۔ سپاہی شفیع نے یہ عجیب بات سنائی کہ لانس نائیک نُور عالم بی کمپنی کے ایک نائیک کی گولیوں سے مرا ہے۔ بی کمپنی ہندوؤں کی کمپنی تھی۔ ان کی ایک سیکشن بٹالین کیمپ سے ذرا دُور ایک ٹیکری پر اپنی پوسٹ قائم کئے ہوئے تھی۔ اس میں آٹھ جوان تھے جن کا کمانڈر ایک نائیک تھا۔ سپاہی شفیع نے یہ تو سب کو بتایا کہ لانس نائیک نور عالم اس ہندو نائیک کی مشین گن کی گولیوں سے مرا ہے لیکن اصل جو بات تھی وہ ہر کسی کو بتانے والی نہیں تھی۔ میں آپ کو وہ بات سناتا ہوں۔ دراصل یہی بات سننے والی ہے۔

شفیع نے یہ بات مجھے اور حوالدار امیر خان کو الگ بٹھا کر سنائی تھی۔ اُسے کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ ہمارا رابطہ انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ شفیع کی جذباتی حالت یہ تھی کہ وہ نُور عالم کی موت پر روتا تھا اور آہیں بھرتا تھا۔ میں کہتا ہوں اتنا دکھ اپنے بھائی کی موت پر ہی ہو سکتا ہے۔ شفیع نے ہمیں رازداری کے لہجے میں یہ بات یوں سنائی کہ ان کی کمپنی کو حکم ملا کہ وہ فلاں طرف نکل جائے اور گوریلوں کو تلاش کرے۔

کمپنی جنگی ترتیب کے مطابق پھیلتی جا رہی تھی۔ علاقہ ٹیکریوں اور چٹانوں والا تھا اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے جاتے تھے' جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ یوں ہُوا کہ لانس نائیک نُور عالم اور سپاہی شفیع اپنی کمپنی سے کچھ الگ ہو گئے۔ یہ کوئی غلطی نہیں تھی نہ یہ کوئی غیر فوجی کارروائی تھی۔ البتہ اتنا ضرور ہُوا کہ ان دونوں کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ وہ کمپنی سے کچھ زیادہ ہی دُور ہو گئے ہیں۔ دونوں کو معلوم تھا کہ انہیں ایک فوجی رسم پوری کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی گوریلا ان کے ہاتھ چڑھ جاتا۔

دونوں جا رہے تھے تو ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے سے کسی کے کراہنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دونوں رک گئے۔ چاندنی اور زیادہ صاف ہو گئی تھی۔ چونکہ وہ جنگلاتی علاقہ تھا اس لئے چاندنی میدانی علاقوں کی نسبت زیادہ شفاف اور چمکدار ہوتی تھی۔ نُور عالم کے پاس سٹین گن تھی اور شفیع کے پاس رائفل تھی۔ دونوں اپنے ہتھیاروں کی نالیاں جھاڑی کی طرف کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور پوچھا کون ہے؟

کراہنے کی آوازوں کے ساتھ یہ آواز آئی — "آگے آجاؤ" — آواز بڑی حد تک کمزور تھی اور لہجہ کراہنے والا ہی تھا۔ یہ الفاظ اُردو میں بولے گئے تھے اس لئے کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ یہ کوئی اپنا ہی آدمی ہے۔ دونوں اکٹھے ذرا تیز قدم اٹھاتے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی جس کی وردی انڈین آرمی والی نہیں تھی، پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ٹامی گن تھی جو اُس نے ان دونوں پر تان کر رکھی ہوئی تھی یعنی اس کی نالی ان دونوں کی طرف تھی۔

"دونوں اپنے ہتھیار نیچے رکھ دو" — اس آدمی نے کہا — "میری انگلی ٹریگر میں ہے...."

"تم حوالدار غلام نبی تو نہیں؟" — لانس نائیک نُور عالم نے اُس کے قریب گھٹنوں کے بل ہو کر کہا۔

"نور عالم ہو؟" — اس آدمی نے پوچھا اور بولا — "میں غلام نبی ہی ہوں۔ میں اتنا زیادہ زخمی ہوں کہ بیٹھ بھی نہیں سکتا.... میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟ یہ مت بھولنا کہ تم بھی مسلمان ہو"۔

شفیع نے ہمیں سنایا کہ حوالدار غلام نبی سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا تھا۔ نُور عالم اور شفیع کو معلوم تھا کہ غلام نبی انڈونیشی گوریلوں کے پاس چلا گیا ہے۔

"یہ تم بتاؤ ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں" — نُور عالم نے کہا — "جہاں کہو گے اٹھا کر وہاں تک لے جائیں گے"۔

غلام نبی نے پانی مانگا۔ ہر فوجی کے پاس پانی کی بوتل ہُوا کرتی تھی۔ نُور عالم اور شفیع نے بیک وقت اپنی اپنی بوتل کھولی اور غلام نبی نے ہاتھ بڑھا کر نُور عالم سے بوتل لے لی اور پانی پی لیا۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ اُسے یہاں سے اُٹھا کر کچھ دُور تک پہنچا دیں اور خود واپس آ جائیں۔ وہ کہتا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ اس کا مطلب تھا انڈونیشی گوریلے۔ اس نے کہا کہ اب تو وہ چلے گئے ہیں لیکن اُس کی تلاش میں ضرور آئیں گے اور اُسے اٹھا کر لے جائیں گے۔

"اگر انگریزوں سے ترقی لینے کے لالچ میں مجھے اٹھا کر بٹالین میں لے جانا چاہتے ہو تو یہیں پڑا رہنے دو" — غلام نبی نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

"لعنت ہے ہم پر اگر تمہیں ایسا دھوکہ دیں" — نُور عالم نے کہا — "زخم کہاں

ہیں؟"

غلام نبی نے انہیں بتایا کہ اُس کی بائیں ٹانگ پر مشین گن کی چار پانچ گولیاں لگی ہیں اور شاید ہڈی بچ گئی ہے۔ بائیں بازو پر بھی دو یا تین گولیاں لگی تھیں اور وہ کہتا تھا کہ بازو کی ہڈی بھی شاید بچ گئی ہے اور گولیوں نے پٹھے کاٹ دیئے ہیں۔ اُس کا خون بڑی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ نُور عالم اور شفیع نے کہا کہ ان کے پاس فیلڈ پٹیاں ہیں، وہ ٹانگ اور بازو پر باندھ دیں گے لیکن غلام نبی نے کہا کہ یہ پٹیاں کافی نہیں ہوں گی اور وہ ان دونوں کو زیادہ دیر تک وہاں روکنا بھی نہیں چاہتا۔

نُور عالم اور شفیع نے بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ خطرہ یہ کہ وہ اپنی کمپنی سے الگ ہو گئے تھے اور انہیں فکر ہی نہیں تھا کہ کمپنی کہاں جا نکلی ہو گی۔ انہوں نے غلام نبی کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کا ارادہ کر لیا۔

○

سپاہی محمد شفیع نے ہمیں سنایا کہ یہ غلام نبی کی ہی ہمت اور برداشت تھی کہ وہ بے ہوش نہیں ہُوا تھا، ویسے اس کی حالت بہت ہی بری تھی۔ ان دونوں نے اُسے مل کر اُٹھا لیا۔ غلام نبی چھ فٹ قد کا گٹھے ہوئے جسم والا جوان تھا اور اللہ نے اُسے بڑی جسمانی طاقت دی تھی۔ اصل طاقت تو اُس کا ایمان تھا۔ نُور عالم اور شفیع بھی کوئی کمزور آدمی نہیں تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ غلام نبی کی زخمی ٹانگ اور زخمی بازو کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی اور ذرا کمزور آدمی ہوتا تو وہ ان زخموں سے مر ہی چکا ہوتا۔

غلام نبی بار بار پانی مانگتا تھا اور یہ دونوں اُسے پانی پلاتے رہے۔ غلام نبی نے کراہتے ہوئے انہیں بتایا کہ اس گوریلا حملے کا کمانڈر وہ خود تھا۔ وہ کیمپ کے اندر چلا گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ اُس نے دس بارہ فوجی تو مار لئے تھے اور کئی ایک کو زخمی کیا تھا اور نکل بھی آیا تھا۔ گوریلے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا کرتے۔ غلام نبی جب کیمپ سے دُور نکل آیا تو پیچھے سے اس پر مشین گن فائر ہوئی تھی۔

تقریباً ایک میل دُور گئے ہوں گے کہ غلام نبی نے انہیں روک دیا اور کہا کہ اُسے نشیب پر لٹا دیں۔ میرا خیال ہے فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ کم تھا۔ ٹیکریاں اور چٹانیں اتنی زیادہ تھیں کہ چند قدموں پر مڑنا پڑتا تھا۔ بہرحال غلام نبی محفوظ جگہ پہنچ گیا تھا۔

"اب ایک کام کرو" — غلام نبی نے نُور عالم اور شفیع سے کہا — "گیدڑ کی

آوازیں نکالو پھر چپ ہو جانا"۔

شہروں کے لوگ شاید گیدڑ کی اس آواز سے واقف نہ ہوں جو رات کو گیدڑ اکٹھے ہو کر نکالا کرتے ہیں۔ دیہات کے لوگ ان آوازوں سے بڑی اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے ایک گیدڑ بولتا ہے اور پھر جتنے گیدڑ وہاں موجود ہوتے ہیں یا جن گیدڑوں تک یہ آواز پہنچتی ہے وہ مل کر بولتے ہیں اور پھر سب اکٹھے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں اس آواز کو الفاظ میں لکھ نہیں سکتا' اس آواز سے میں واقف ہوں کیونکہ میں دیہات کا رہنے والا ہوں۔

نُور عالم اور شفیع نے گیدڑوں جیسی آوازیں نکالیں اور چُپ ہو گئے.... ایک دو منٹ گزرے ہوں گے کہ غلام نبی کے کہنے پر انہوں نے پھر ایسی ہی آوازیں نکالیں۔ ان کی آوازیں بالکل گیدڑوں جیسی تھیں۔ انہیں یہ آوازیں تین بار نکالنی پڑیں اور کچھ دُور سے ایسی ہی آوازیں سنائی دیں جیسے ایک گیدڑ بول رہا ہو۔ اب غلام نبی نے انہیں کہا کہ بس' تم اب نہ بولنا۔

"اب اگر چلے جاؤ تو اچھا ہے" ـــ غلام نبی نے کہا ـــ "تمہیں اتنی دیر کمپنی سے الگ نہیں رہنا چاہئے' کہیں پکڑے ہی نہ جاؤ"۔

"ہم تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جائیں گے" ـــ شفیع نے کہا ـــ "پکڑے گئے تو بھاگ کر ہم بھی انڈونیشیوں کے پاس چلے جائیں گے"۔

لانس نائیک نور عالم نے بھی یہی بات پرجوش لہجے میں کہی۔ غلام نبی نے انہیں کہا کہ ایک بار پھر گیدڑوں کی طرح بولو۔ دونوں پھر گیدڑوں کے انداز سے چیخے تو قریب سے ہی گیدڑ کی آواز آئی۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ تین آدمی آتے نظر آئے۔ غلام نبی نے نُور عالم اور شفیع سے کہا کہ وہ بیٹھ جائیں تاکہ آنے والوں کو کوئی شک نہ ہو اور اگر انہیں شک ہو گیا تو وہ فوراً گولی چلا کر دونوں کو ختم کر دیں گے۔

اتنے میں تین انڈونیشی آئے اور غلام نبی نے اُن کی زبان میں کچھ کہا اور وہ دوڑ کر غلام نبی تک پہنچے اور جب انہوں نے نُور عالم اور شفیع کو دیکھا تو کچھ حیران ہوئے۔ غلام نبی کچھ اشاروں میں اور کچھ انڈونیشی الفاظ میں ان کے ساتھ بات کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی انڈونیشی زبان میں اپنا مطلب بیان نہیں کر سکتا۔ تین انڈونیشیوں نے ان

دونوں کی طرف دیکھا لیکن صرف دو نے ان دونوں کو باری باری گلے لگایا اور کہا ـــ "سلم سلم" ـــ لیکن تیسرا انڈونیشی پیچھے ہی کھڑا مسکراتا رہا۔ غلام نبی نے انہیں بتایا کہ یہ جوان لڑکی ہے اس لئے یہ انہیں ان دونوں کی طرح نہیں ملی۔

"اچھا دوستو!" ـــ غلام نبی نے لیٹے لیٹے ہاتھ اوپر کیا اور کہا ـــ "تم دونوں چلے جاؤ' میرے ساتھی پہنچ گئے ہیں' تم نے یہ جو نیکی کی ہے اس کا اجر تمہیں اللہ سے ملے گا"۔

دونوں نے غلام نبی کے ساتھ ہاتھ ملائے پھر انڈونیشیوں کے ساتھ ہاتھ ملائے اور وہاں سے چل پڑے۔ ان دونوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ انہیں گیدڑوں کی طرح کیوں بلوایا گیا تھا۔ یہ اشارہ تھا جس سے گوریلے ایک دوسرے کو بتاتے تھے کہ وہ کہاں ہیں یا وہ ایک دوسرے کو مدد کے لئے بلاتے تھے۔ میں آپ کو یہی بتا دیتا ہوں کہ ایسی آوازیں ہر روز یا ہر ایکشن میں نہیں نکالی جاتی تھیں بلکہ ہر بار کوئی اور ہی آواز مقرر کی جاتی تھی۔

○

سپاہی محمد شفیع نے ہمیں سنایا کہ وہ وہاں سے چل پڑے اور پھر دوڑنے لگے۔ شفیع کہتا تھا کہ غلام نبی نے ان کا ایمان تازہ کر دیا تھا۔ وہ بادلِ نخواستہ وہاں سے آئے۔ یہ غلام نبی کی عقلمندی تھی کہ اُس نے دونوں کو چلے جانے کو کہا تھا۔ اگر یہ دونوں اپنے جذبات کی پیروی کرتے تو ان انڈونیشیوں کے ساتھ ہی چلے جاتے لیکن غلام نبی جذبات میں آنے والا بندہ نہیں تھا۔

یہ دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور کچھ دُور آ کر ذرا آہستہ چلنے لگے اور آپس میں یہ صلح مشورہ کرنے لگے کہ کمپنی سے الگ ہونے کی کیا وجہ بتائیں گے۔ شفیع نے ایک بات سوچی' ایک بات نُور عالم نے سوچی لیکن دونوں کے بہانے کوئی اتنے قابلِ قبول نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک مسئلہ یہ بھی پیدا کر لیا تھا کہ غلام نبی کا خون اُن دونوں کی وردیوں پر لگ گیا تھا اور یہ خون کوئی تھوڑا سا نہیں تھا جسے یہ چھپا لیتے۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ اپنی بٹالین کا کوئی زخمی یا کوئی لاش تو ضرور ملے گی۔ اسے اٹھالیں گے اور کیمپ میں لے جا کر پھینک دیں گے اور کہیں گے کہ یہ تو زخمی تھا اس لئے اسے اٹھالیا تھا اور راستے میں مر گیا ہے۔

وہ کیمپ سے ابھی کچھ دور تھے کہ نور عالم کو ٹھوکر لگی اور وہ آگے کو گر پڑا۔ اُٹھ کر دیکھا اور شفیع نے تو پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ لاش تھی۔ چاندنی میں ٹھیک نظر آ رہا تھا کہ وہ مرا ہُوا انڈونیشی گوریلا تھا۔ اس کی ٹامی گن اُس کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔

"لو نُور بھائی!" — شفیع نے کہا — "ہمارا تو کام ہی بن گیا ہے۔ اللہ سبب بنانے والا ہے۔ اس کے ہتھیار سنبھالو اور بیان یہ دیں گے کہ اسے ہم نے مارا ہے اور یہ بھاگ رہا تھا اور ہم اسے اٹھا کر لا رہے تھے تو یہ یہاں آ کر مر گیا اور اسے ہم نے وہیں پھینک دیا"۔

نُور عالم کو یہ بات بہت اچھی لگی۔ اس نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس کی ذات باری نے ان کے بچنے کی صورت پیدا کر دی تھی.... انہوں نے اس انڈونیشی کی ٹامی گن اٹھالی، میگزینیں بھی لے لیں اور اُس کی بیلٹ میں سے اُس کا خنجر بھی نکال لیا۔

شفیع نے ہمیں سنایا کہ نُور عالم نے کہا کہ فائرنگ بہت دیر سے بند ہو چکی ہے اس لئے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم نے اس انڈونیشی گوریلے پر فائر کیا تھا، رائفلوں سے کچھ راؤنڈ فائر کر دیتے ہیں۔ یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ دونوں نے ہوا میں تین تین راؤنڈ فائر کر دیئے اور وہاں سے چل پڑے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ تھوڑی ہی دُور ایک ٹیکری پر اپنی ایک پوسٹ ہے۔

دونوں اس پوسٹ سے تھوڑی ہی دور رہ گئے تو پوسٹ سے ایک لائٹ مشین گن فائر ہوئی جس کے تین چار راؤنڈ نُور عالم کے سینے میں لگے اور پار ہو گئے۔ اُس وقت شفیع اس سے تھوڑی ہی دُور تھا۔ وہ تجربہ کار سپاہی تھا۔ اس نے جنگِ عظیم لڑی تھی۔ اس نے قریبی درخت کی طرف ڈائیو لگائی اور درخت کے تنے کے پیچھے پیٹ کے بل گرا۔ مشین گن دائیں سے بائیں فائر کرتی آ رہی تھی۔ گولیاں شفیع کے اوپر سے گزر گئیں۔ اُس نے نہایت گندی گالیاں دے کر بڑی ہی بلند آواز سے کہا کہ ہم اے کمپنی کے جوان ہیں، فائر مت کرو لیکن یہ فائر اپنا کام کر گیا تھا۔ شفیع اُٹھ کر نُور عالم کے پاس گیا تو وہ مر چکا تھا۔

شفیع نے انڈونیشی کی ٹامی گن اور خنجر اور میگزینیں اٹھائیں اور نُور عالم کی لاش کو دوسرے کندھے پر ڈال لیا۔ وہ روتا اور گالیاں دیتا ہُوا وہاں سے چل پڑا۔ وہ مدد کے لئے بھی پکار رہا تھا لیکن جس پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی تھی، وہاں سے کوئی بھی اُس کی

مدد کو نہ آیا۔ وہ نُور عالم کی لاش بھی اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی سٹین گن بھی اور اُس کے پاس اپنی رائفل بھی تھی، انڈونیشی کی ٹامی گن اور میگزینیں بھی تھیں، اس کا چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے نور عالم کی لاش وہیں زمین پر رکھ دی۔

وہ رو پڑا اور بڑی بلند آواز سے کہتا گیا کہ وہ دیکھو بی کمپنی کے کسی گنر نے لانس نائیک نُور عالم کو مار ڈالا ہے۔

اُس کی یہ پکار سن کر بٹالین کے کئی جوان اور صوبیدار وغیرہ اس کے پاس آ گئے اور پوچھا کہ اُس نے یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ اُس نے بڑے غصے اور غم کی حالت میں انہیں بتایا کہ کیا وہاں ہے۔

انگریز افسروں تک یہ بات پہنچی اور شفیع کو بلا کر پوچھا۔ شفیع نے روتے ہوئے بتایا کہ وہ دونوں اپنی کمپنی سے الگ ہو گئے تھے اور انہیں ایسا شک ہُوا کہ ایک گوریلا چھپ چھپ کر بھاگ رہا ہے۔ انہوں نے اس کا تعاقب کیا اور وہ کہیں غائب ہو گیا۔ اس کی تلاش میں وہ دونوں کمپنی سے الگ ہو گئے، آخر وہ انہیں نظر آ گیا اور اس پر اتنے راؤنڈ فائر کئے گئے کہ اس کا جسم چھلنی ہو گیا۔

شفیع نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ انڈونیشی ابھی زندہ تھا۔ نور عالم نے اسے اٹھالیا اور ہم دونوں کیمپ کی طرف آ رہے تھے کہ بی کمپنی کی ایک پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی اور اس سے نُور عالم وہیں مر گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ نُور عالم کی لاش اٹھا کر لا رہا تھا لیکن ان ہتھیاروں کی وجہ سے وہ لاش کو راستے میں ہی رکھ آیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ یہ ہتھیار انڈونیشی گوریلے کے ہیں اور اُس کی لاش فلاں جگہ پڑی ہے۔

اتنے میں شفیع کی کمپنی واپس آ گئی۔ اس کمپنی کے کمپنی کمانڈر کو بھی اطلاع مل گئی کہ اس کی کمپنی کا ایک لانس نائیک بی کمپنی کے ایک گنر نے مار ڈالا ہے۔ اے اور بی کمپنی کے کمانڈر جو دونوں انگریز اور میجر تھے، شفیع کو ساتھ لے کر اُس طرف چل پڑے جہاں ایک جگہ نُور عالم کی لاش پڑی تھی اور کچھ آگے انڈونیشی کی لاش تھی۔ ان انگریز افسروں نے اس پوسٹ پر چڑھ کر دیکھا جہاں سے مشین گن فائر ہوئی تھی۔ معلوم ہُوا کہ اس گنر نے اس سیکشن کمانڈر ہندو نائیک کے حکم پر گن فائر کی تھی۔

انگریز افسروں نے نائیک سے پوچھا کہ گوریلے کبھی کے چلے گئے ہیں اور فائر بند ہو چکا ہے تو پھر اس نے مشین گن فائر کیوں کروائی؟ اُس کے پاس یہی ایک جواب تھا کہ

اُسے شک ہوا تھا کہ یہ گوریلے ہیں۔ انگریز افسر اس کی یہ بات نہ مانے۔ انہوں نے جوانوں سے کہا کہ وہ اس جگہ چلے جائیں جہاں پوسٹ سے نورُ عالم اور شفیع پر مشین گن فائر کی گئی تھی.... دونوں جوان وہاں گئے تو اس کے کمپنی کمانڈر نے اسے کہا کہ یہ دیکھو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جوان اپنے آدمی ہیں۔

"کیا انڈونیشی گوریلوں کی وَردی ایسی ہی ہوتی ہے؟" —— بی کمپنی کمانڈر نے پوچھا۔

نائیک کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ہندو تھا اور یہ پوری کمپنی ہندوؤں کی تھی میں واضح کر دوں کہ یہ ہندو رہتک حصار اور کرنال وغیرہ کے علاقوں کے رہنے والے تھے۔ دوسرے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا کیونکہ انگریزوں کا خیال تھا کہ ہندو تجارتی اور کاروباری لوگ ہوتے ہیں۔ رہتک حصار کے ہندو جنگجو تسلیم کئے جاتے تھے اس لئے ان علاقوں سے فوج میں بھرتی ہوتی تھی۔

یہ ہندو جنگجو تھے یا نہیں' ان کی خصلتیں اپنی ہی قسم کی ہوتی تھیں۔ لڑائی میں اگر جم گئے تو سب جم گئے ورنہ ان میں سے کوئی ایک بھاگ اٹھتا تو پوری کمپنی بھاگ اٹھتی تھی۔ مسلمانوں اور سکھوں کے مقابلے میں یہ ہندو خاص لڑاکے نہیں تھے۔ بات دراصل یہ تھی کہ انڈونیشی گوریلوں نے شب خون مارا تو ان کا پہلا حملہ اس پوسٹ پر آیا۔ اس نائیک کی سیکشن کے چار جوان مارے گئے اور دو بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ یہ نائیک تو یوں سمجھیں چھاچھ کو پھونک پھونک کر پی رہا تھا۔ اُس پر گوریلوں کی ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ اُسے اپنے دو جوان آتے نظر آئے تو ان پر مشین گن کا فائر کروا دیا۔

○

یہ تھی لانس نائیک نور عالم کی موت کی اصل کہانی جس کے پس منظر سے صرف میں اور حوالدار امیر خان واقف تھے۔

سپاہی محمد شفیع نے ایسی عقلمندی سے یہ بیان دیا کہ کسی آفیسر کو شک بھی نہ ہُوا کہ یہ انڈونیشی گوریلوں سے بھی مل آیا ہے اور بٹالین کے ایک بھگوڑے حوالدار غلام نبی کو اٹھا کر انڈونیشی گوریلوں کے حوالے کر آیا ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا اور میں وہ آپ کو سناتا ہوں۔ میں بھی وہیں تھا جب سپاہی شفیع چیختا چلّاتا کیمپ میں آیا تھا۔ اُس نے جب یہ کہا تو کہ

اُس نے اور نُور عالم نے ایک انڈونیشی گوریلے کو مارا ہے اور اس کے ہتھیار لے آئے ہیں تو میرے بس میں ہوتا تو میں آگے بڑھ کر شفیع کے منہ پر تھوک دیتا۔ انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ہم نے مسجد میں بیٹھ کر بھائی چارے کا جو وعدہ کیا تھا' شفیع نے وہ توڑ دیا تھا۔ یہ ایک گناہ تھا۔ ہمیں تو اُس نے تیسرے روز اصل بات بتائی تھی۔ میں آپ کو اُس رات کی بات سناتا ہوں نُور عالم مارا گیا تھا۔ رات کو انگریز افسروں نے اس معاملے کو اتنا سنجیدہ یا سنگین نہ سمجھا۔ جنگ میں ایسے ہو ہی جاتا ہے کہ اپنے آدمی اپنے ہی کسی آدمی کی فائر کی زد میں آجاتے ہیں لیکن اگلی صبح بٹالین میں کوئی اور ہی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔

صورتِ حال یہ پیدا ہوئی کہ بٹالین کے مسلمانوں نے کھسر پھسر شروع کر دی تھی کہ اس ہندو نائیک نے مسلمان لانس نائیک کو دانستہ مارا ہے اور اس لئے مارا ہے کہ فوج کے مسلمان انڈونیشی مسلمانوں کے دوست بنے ہوئے ہیں اور مسلمان فوج سے نکل کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس جا رہے ہیں۔

جس طرح مجھے شفیع پر غصّہ تھا کہ اُس نے ایک انڈونیشی کو مارا ہے اسی طرح اے اور ڈی کمپنی کے جوانوں اور عہدیداروں میں غصے کی لہر پیدا ہو گئی کہ ہندو نائیک نے نُور عالم کو دانستہ مارا ہے۔ یہ کھسر پھسر ان دونوں مسلمان کمپنیوں کے صوبیداروں تک پہنچی۔ ان میں ایک صوبیدار محمد اشرف تھا اور دوسرا صوبیدار نذر شاہ تھا۔ یہ دونوں بھی انڈونیشی مسلمانوں کو اپنا بھائی اور ان پر فائر کرنے کو گناہ سمجھتے تھے۔ ان دونوں صوبیداروں نے کمپنی کمانڈر کو بتایا کہ بٹالین کے مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف احتجاج پیدا ہو گیا ہے جو خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ یہ تو ہم دیکھ رہے تھے کہ ہندو اور سکھ انڈونیشی مسلمانوں کو گالیاں دیا کرتے تھے اور انہیں انگریزوں اور امریکیوں کا نہیں بلکہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ بہرحال غم و غصے کی لہر بٹالین کے مسلمانوں میں پھیل گئی اور ان صوبیداروں نے انگریز افسروں کو خبردار کر دیا۔

فوج میں اس قسم کی فرقہ وارانہ باتیں کرنا سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔ فوج میں تو یہ اصول بلکہ حکم تھا کہ کسی کا کوئی مذہب نہیں۔ سب فوجی ہیں' آپس میں بھی بھائی ہیں اور ان بھائیوں کو آپس میں نہیں لڑنا چاہئے۔ فرقہ وارانہ باتیں کرنے کو جرم سمجھا جاتا تھا لیکن وہاں مسئلہ کچھ اور تھا۔ انگریز افسر اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے کہ آرمی کے

مسلمان انڈونیشی مسلمانوں کے حمایتی ہیں اور ہندو اور سکھ انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ہمارا انگریز کمانڈنگ آفیسر اس مسئلے کو صرف ایک حکم سے دبا سکتا تھا کہ کوئی جوان یا کوئی افسر اس طرح کی فرقہ وارانہ بات کرے گا تو اُس کا کورٹ مارشل کیا جائے گا لیکن یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ آرمی کے مسلمان انڈونیشی مسلمانوں کے پاس بھگوڑے ہو کر جا رہے تھے۔ اس سلسلے کو روکنے کے لئے آرمی کے مسلمانوں کو مطمئن رکھنا بہت ہی ضروری تھا۔

ایک دن اور گزرا تو بٹالین کے مسلمان ذرا اونچی آواز سے احتجاج کرنے لگے۔ انگریز افسروں کو لحہ بہ لحہ رپورٹیں مل رہی تھیں۔ صوبیدار محمد اشرف اور صوبیدار نذر شاہ تو زیادہ ہی بھڑک اُٹھے تھے۔ اس زمانے کی فوج میں جمعدار اور صوبیدار وغیرہ انگریز افسروں کی خوشامد ایسے گھٹیا طریقے سے کیا کرتے تھے جیسے ان کے زر خرید غلام ہوں لیکن صوبیدار اشرف اور صوبیدار نذر شاہ خوشامد اور چاپلوسی کو بھول گئے اور انہوں نے انگریز افسروں کو خبردار کرنا شروع کر دیا اور یہ مشورہ دیا کہ اس نائیک کے خلاف کچھ نہ کچھ کارروائی ضرور ہونی چاہئے ورنہ مسلمان باغی ہو جائیں گے۔

انگریز بڑی ہی دانشمند اور دُور اندیش قوم تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ جنگِ عظیم جیسی جنگ نہیں جہاں ذرا سی بات پر کورٹ مارشل کر کے سزا دی جا سکتی تھی۔ انہیں پورا پورا اندازہ تھا کہ یہ کچھ اور ہی قسم کی لڑائی ہے اور ان کے دشمن مسلمان ہیں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمان مسلمان کے خلاف ہتھیار اٹھانا گناہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر کو یقیناً" معلوم ہو گا کہ پہلی جنگِ عظیم میں عراق کے محاذ پر ایک مسلمان رسالے کے تمام سواروں نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بھی ہمارا کمانڈنگ آفیسر جانتا ہو گا کہ اُدھر محاذ پر ایک رسالے نے لڑنے سے انکار کیا اور اِدھر ہندوستان میں جھانسی کی چھاؤنی میں ایک اور مسلمان رسالے نے ترکوں کے خلاف جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جھانسی کے رسالے کو محاذ پر جانے کا حکم ملا تھا۔ اس رسالے کو پتا چل گیا تھا کہ محاذ پر ایک مسلمان رسالے نے بغاوت کر دی ہے اور اس رسالے کو ان کی جگہ بھیجا جا رہا ہے تو ان تمام سواروں نے یہیں انکار کر دیا۔

جھانسی کے رسالے نے تو باقاعدہ مسلح بغاوت کر دی تھی۔ رسالے کے گھڑ سواروں نے دو انگریز افسروں کو جان ہی سے مار ڈالا تھا اور باقی انگریز افسروں کے بنگلوں پر جا حملہ کیا تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ رسالہ گھڑ سوار فوج کو کہتے ہیں۔ اب بھی اسے رسالہ

بنی کیولری کہتے ہیں لیکن گھوڑوں کی جگہ ٹینک آ گئے ہیں۔

میں جب اُدھر سے ایک مدت بعد واپس اپنے گھر آیا تھا اور میں نے جنگی لٹریچر پڑھنا شروع کیا تھا تو ان دونوں رسالوں کی بغاوت کی پوری تفصیل "حکایت" میں پڑھی تھی جو مدیر "حکایت" نے لکھی تھی۔

انگریز افسروں کو یہ بھی معلوم تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلی پٹھان جب انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے تو مسلمان نشانہ لے کر فائر نہیں کرتے تھے بلکہ ہتھیار کی نالیاں ذرا اوپر کر کے گولیاں چلاتے تھے۔ وہاں بھی ایسے واقعات ہوئے تھے کہ آرمی کے کچھ لوگ بھاگ کر پٹھانوں کے پاس چلے گئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت آٹھ پنجاب کی پانچوں بٹالین کے غلام سرور سگنیلر نے حاصل کی تھی جو تمام تر قبائلی علاقے میں سرور پنجابی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ آخر پکڑا گیا اور بنوں جیل میں اُسے پھانسی چڑھایا گیا تھا۔ یہ تفصیلی کہانی بھی مدیر "حکایت" نے لکھی تھی۔

اب انڈونیشیا میں ایک ہندو نائیک کے حکم سے مشین گن فائر ہوئی اور ایک مسلمان لانس نائیک مارا گیا تو بٹالین میں ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گئی۔ انگریز افسروں نے اس کشیدگی کو فوجی قانون کی روشنی میں نہ دیکھا بلکہ یہ دیکھا کہ ان کے دشمن انڈونیشی مسلمان ہیں اور اس صورت میں آرمی کے مسلمانوں کی دل آزاری نہیں ہونی چاہئے ورنہ اس سے دشمن کو تقویت پہنچے گی۔

یہ سب کچھ سوچ کر ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے اس ہندو نائیک کے خلاف چارج شیٹ بنوائی اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بھیج دی۔ میرا خیال ہے کمانڈنگ آفیسر بریگیڈ کمانڈر سے ملا تھا اور اس کے ساتھ زبانی بات کی تھی۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے حکم آیا کہ اس نائیک کا کورٹ مارشل کیا جائے۔ کورٹ مارشل ہُوا اور اس نائیک کو سپاہی بنا دیا گیا۔ اس سے مسلمان خوش ہو گئے۔ سپاہی محمد شفیع کی جذباتی حالت یہ تھی کہ اُس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ اس نائیک سے لانس نائیک نُور عالم کے خون کا بدلہ ضرور لے گا لیکن ایسے نہیں کہ وہ پکڑا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ کسی آپریشن میں وہ موقع نکال کر اس نائیک کو گولی مار دے گا۔

میں کوئی ایسا عالم فاضل یا مفکر اور سیاستدان تو نہیں کہ اپنی عالمانہ رائے کا اظہار

کروں لیکن میں نے جو دیکھا اور جو محسوس کیا اور جو آج دیکھ رہا ہوں' اس کا تھوڑا سا ذکر ضرور کروں گا۔ اپنے قبائلی جب انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے تو ہمارا ان کے ساتھ یہ خاموش معاہدہ تھا کہ ہم ان پر فائر نہیں کریں گے اور وہ ہم پر گولی نہیں چلائیں گے۔

انڈونیشیا کی جنگ آزادی میں انڈین آرمی کے مسلمانوں نے جس طرح ان کی مدد کی اور خطرے مول لے کر بھگوڑے ہوئے اور ان کے شانہ بشانہ لڑے' یہ ساری تفصیلات میں نے پیش کر دی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستانی فوجیوں کا ترکوں کے خلاف نہ لڑنا اور ایسے ہی کئی اور واقعات یہی بتاتے ہیں کہ اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک اُمت ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔

میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کسی عالم دین نے ایسا وعظ نہیں سنایا تھا کہ ہمیں مسلمانوں کے خلاف نہیں لڑنا چاہئے۔ اگر میں کچھ تھوڑا بہت پڑھا لکھا تھا تو ان سپاہیوں کے متعلق سوچیں جو چٹے اَن پڑھ تھے لیکن وہ انڈونیشی مسلمانوں سے جا ملے تھے۔ آخر یہ کیا جذبہ تھا جو انہیں اُس طرف لے گیا تھا؟.... یہ وہی جذبہ تھا جو چودہ سو سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔ وہی جذبہ آج بھی ہمارے خون میں چلا آ رہا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جسے آج کفار مسلمانوں کے دلوں سے نکال پھینکنا چاہتے ہیں۔ ساری دنیا پر نگاہ ڈالیں۔ مسلمانوں کے لئے کہیں بھی امن و امان نہیں' ان کے اپنے ملکوں میں بھی امن و امان نہیں اور مسلمان آپس میں خون خرابے میں لگے ہوئے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں' اس آپس کی خونریزی میں یہودی اور صلیبی کا ہاتھ نظر آئے گا۔

برطانوی کرنل لارنس کے متعلق تو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ وہ عرب میں جاسوس بن کر گیا تھا اور اکثر لوگ اسے جاسوس ہی سمجھتے چلے آ رہے ہیں لیکن وہ صرف جاسوس نہیں تھا۔ وہ بہت بڑی نظریاتی تخریب کاری کے لئے وہاں بھیجا گیا تھا۔ اُس وقت عراق اور چند اور علاقوں پر ترکوں کی حکومت تھی۔ کرنل لارنس نے عربوں کا ہمدرد بن کر ان کی اس طرح برین واشنگ کی کہ تم عرب ہو اور وہ یعنی ترک غیر ملکی ہیں اور تم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اُس نے مسلمانوں پر ترک اور عرب کا لیبل لگا کر انہیں دو حصوں میں کاٹ دیا اور اسلام کا رشتہ توڑ دیا۔

ہندوستان میں آزادی سے پہلے ہندوؤں کے روحانی پیشوا مہاتما گاندھی نے ایک فتنہ پیدا کیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والے لوگ پہلے ہندوستانی ہیں اور اس کے بعد وہ مسلمان' ہندو' سکھ اور عیسائی وغیرہ ہیں۔ اُس کا مطلب یہ تھا کہ مذہب ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور مذہب کی بنیاد پر کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل رشتہ وطن کے ساتھ ہوتا ہے۔ بظاہر اُس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھیں اور مذہب کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ مہاتما گاندھی اپنے ہندو مذہب کو اہمیت نہ دیتا' اس کا در پردہ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے دلوں سے اسلامی رشتہ اور جذبہ نکال دیا جائے۔ اُس نے ہندوانہ عیاری اور مکاری سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے علماء دین کو بھی اپنے جال میں لے لیا تھا اور ان پر نیشنلسٹ علماء کا لیبل لگا دیا تھا۔ افسوسناک بلکہ انتہائی شرمناک حقیقت یہ ہے کہ علماء مہاتما گاندھی کے ہمنوا بن گئے اور اس طرح ہندوستان کے مسلمان نظریاتی طور پر دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ تو وہ تھا جس نے اپنے الگ اسلامی وطن کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے جنگِ آزادی لڑی اور دوسرا حصہ وہ تھا جو اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھتا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو کے ساتھ ہندو ہو گیا تھا' لیکن اسلامی جذبہ مرا نہیں کرتا۔ انہی وطن پرستوں سے مسلمان الگ ہونے لگے اور تحریک پاکستان میں شامل ہو گئے۔

ہندوؤں' یہودیوں اور اہلِ صلیب کی یہ کوششیں جاری رہیں اور انہوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈے اور پُرکشش طریقے استعمال کر کر کے مسلمانوں کو مصری' عراقی' ایرانی' شامی' عربی اور ترک وغیرہ میں تقسیم کر دیا اور اب ساری دنیا میں مسلمان بٹ کر اس قدر کمزور ہو گئے ہیں کہ وہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے اور اہلِ صلیب کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔

میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا۔ آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کو یاد کریں جب مسلمانوں کی سلطنت دُور دُور تک پھیل گئی تھی لیکن وہ سب مسلمان کہلاتے تھے۔ ان کے ملک الگ الگ نہیں تھے۔ وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت تھے۔ تفرقہ بازی یعنی فرقہ بندی ایک الگ موضوع ہے' میں ملکوں کی بات کر رہا ہوں۔ اُس

وقت مسلمانوں کے درمیان سفارتی تعلقات نہیں تھے بلکہ سب اسلامی رشتے میں منسلک تھے۔ تسبیح کے دانوں کی طرح ایک ہی ڈوری میں پروے ہوئے تھے۔ یہود و نصاریٰ نے بڑی کامیابی سے تسبیح کے ان دانوں کو بکھیرا اور دنیا کی اس عظیم طاقت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اپنے ملک میں دیکھ لیں۔ ایک ملک کے باشندے ہو کر اور ایک دین کے پیروکار ہو کر ہم ایک نہیں رہے۔ ہم ایک طرف مذہبی فرقوں میں اور دوسری طرف سیاسی جماعتوں میں بٹ گئے ہیں اور ایک دوسرے کے منہ نوچ رہے ہیں۔ پھر بھی میں کہتا ہوں کہ اخوت و اتحاد کا جذبہ مسلمانوں کے خون میں چلا آ رہا ہے۔ اسے وقتی طور پر دبایا جا سکتا ہے ہمیشہ کے لئے نہیں۔ قباحت یہ پیدا ہو گئی ہے یا ہمارے لیڈروں نے ہم میں پیدا کر دی ہے کہ ہم لوگ دنیاوی مفادات کو عزیز سمجھنے لگے ہیں اور اسلام کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔

میں یہ بات بعد میں لکھنا چاہتا تھا لیکن ذکر اسلامی رشتے کا آ گیا ہے تو میں اس کا مختصر سا ذکر یہیں کر دیتا ہوں۔ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں انڈین آرمی کے مسلمان فوجی اونڈنیشی مسلمانوں کے ساتھ جا ملے تھے' ان کی تعداد کوئی معمولی سی نہیں تھی۔ اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز ہم آزاد ہوں گے اور ہندوستانی کی بجائے پاکستانی کہلائیں گے۔ یہ تو ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں نے الگ وطن کے لئے آزادی کا جہاد شروع کر دیا ہے جو بعد میں تحریک پاکستان کے نام سے مشہور ہوا۔ ہم نے انڈونیشی مسلمانوں کا ساتھ دیا تو وہ اسلامی جذبے کے تحت اور اللہ کے حکم سے دیا تھا لیکن انڈونیشیا والوں نے اس وقت ہمارا ساتھ دیا جب ہم پر ایک وقت آن پڑا تھا۔

یہ تھی ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ جذبے کے زور پر لڑے تھے ویسے ہندوستان کی جنگی طاقت کے سامنے ہماری کوئی جنگی طاقت نہیں تھی۔ ہندوستان نے اکیس ڈویژنوں سے حملہ کیا تھا جسے ہمارے پانچ ڈویژنوں نے روکا تھا۔ ہمارے ڈویژن پورے پانچ نہیں تھے۔ ایک ڈویژن ادھورا تھا۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ چونڈہ میں ٹینکوں کی جنگ ہوئی تھی۔ اس میں چھ سو سے ایک ہزار ٹینک ہندوستان کے تھے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس صرف ڈیڑھ سو ٹینک تھے۔ انسانی نفری کا حساب یہ تھا کہ انڈین آرمی کی نفری پچاس ہزار تھی اور ادھر ہماری کل نو ہزار

نفری تھی۔ تمام محاذوں پر دونوں طرف جنگی طاقت کی اور نفری کی نسبت تناسب ایسے ہی تھی۔

مسلمان ممالک نے کچھ نہ کچھ ہماری مدد کی تھی لیکن جو مدد انڈونیشیا نے کی تھی' وہ بڑی کن ہے اور ایک بڑا ہی اہم اور تاریخی واقعہ ہے۔ اُس وقت انڈونیشیا کا صدر احمد سوئیکارنو مرحوم تھا۔ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کا لیڈر بھی وہی تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ انڈین آرمی کے جو مسلمان اس کی جنگ آزادی میں اس کے ساتھ جا ملے تھے وہ سب پاکستان میں آنے والے علاقوں کے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ دوستی کا حق ادا کر دے۔

ہمارے ایئرفورس کے سابق کمانڈر انچیف ریٹائرڈ ایئرمارشل اصغر خان جو ستمبر 65ء میں ریٹائر ہو چکے تھے' مدد کے لئے انڈونیشیا گئے اور سوئیکارنو مرحوم سے ملے۔

سوئیکارنو مرحوم نے حکم دے دیا کہ پاکستان جو کچھ بھی مانگتا ہے اُسے دے دیا جائے۔ اصغر خان کا بیان ہے کہ ان کے لئے وہاں اسلحہ خانے اور بارود خانے کے سٹور کھول دیئے گئے اور کہا جو چاہئے اور جتنا چاہئے لے جاؤ۔

سوئیکارنو مرحوم نے ایک اور ہی بات کہہ دی جس کی توقع نہیں تھی۔ خلیج بنگال میں انڈیمان کے نام سے جزیروں کا ایک جھرمٹ ہے جو کسی وقت کالا پانی کہلاتا تھا۔ ان جزائر پر ہندوستان کا قبضہ ہے اور یہ جزائر ہندوستان کو انگریز دے گئے تھے۔ سوئیکارنو مرحوم نے ایئرمارشل اصغر خان سے کہا کہ وہ اپنی افواج کو حکم دے دے گا کہ جا کر جزائر انڈیمان پر قبضہ کر لو کیونکہ یہ جزائر ہمارے ہیں' ہندوستان کے نہیں۔ سوئیکارنو کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ ہندوستان کی توجہ انڈیمان کی طرف کر لیں گے اور پاکستان کی سرحدوں پر ہندوستان کی فوجی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔

ایئرمارشل اصغر خان نے یہ تجویز قبول نہ کی اور کہا کہ وہ اپنے مفاد کی خاطر انڈونیشیا کو اتنا زیادہ نہیں الجھانا چاہتے۔ سوئیکارنو مرحوم نے اپنی ایئرفورس کو حکم دے دیا کہ دو سو مگ لڑاکا بمبار طیارے ہوابازوں سمیت تیار رہیں اور اشارہ ملنے پر مشرقی پاکستان پہنچ جائیں۔

یہ کوئی معمولی سی مدد نہیں تھی۔ اُس وقت مگ طیارے کو فضا کی دہشت کہا کرتے تھے۔ سوئیکارنو مرحوم کو روس نے مگ طیارے دیئے تھے۔ سوئیکارنو وہ طیارے اپنے

ہوابازوں سمیت مشرقی پاکستان بھیج رہے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ تیار تھے کہ ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو انڈونیشیا کے یہ لڑاکا ہوباز مگ طیارے لے کر پہنچ جائیں گے۔ اس اتنی بڑی مدد میں ایک آبدوز بھی شامل تھی جو انڈونیشیا سے کراچی پہنچ گئی تھی اور پھر وہ خلیج بنگال میں زیر آب گشت کرتی رہی۔ میں پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ سوئیکارنو مرحوم نے اپنی نیوی کو خلیج بنگال کی طرف بھیج دی تھی اور کہا تھا کہ مشرقی پاکستان سے ذرا دور دور رہیں اور جوں ہی کال ملے مشرقی پاکستان کے ساحل پر پہنچ جائیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ہندوستان نے ستمبر 1965ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو پتہ چل گیا تھا کہ انڈونیشیا کی نیوی اور ایئرفورس مشرقی پاکستان کے دفاع کے لئے تیار ہے۔ مختصر یہ کہ انڈونیشیا نے پاکستان کی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ لیا تھا۔

یہ تو انڈونیشیا کی سرکاری مدد تھی۔ انڈونیشیا کے شہریوں کا جذبہ دیکھیں۔ انہیں خبر ملی کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے تو انہوں نے جکارتا میں جو انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے' ہندوستانی سفارت خانے پر حملہ کر دیا۔ انڈونیشیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہندوستانی تاجر اور دکاندار اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے ان کی دکانوں اور ان کے تجارتی اداروں پر حملے شروع کر دیئے اور لوگوں سے کہا کہ ان سے یعنی ہندو دکانداروں سے کوئی چیز نہ خریدیں۔ اس وقت کے اخبار گواہ ہیں کہ انڈونیشیا سے بے شمار ہندو تاجر اور دکاندار بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے۔

یہ کیا تھا؟.... یہ اسلامی رشتے کی کرامات تھی۔ ایک ہی سال بعد امریکہ اور ہندوستان نے جس طرح سوئیکارنو مرحوم کو اس کی سزا دی تھی' وہ میں آگے چل کر سناؤں گا۔

○

اب وہیں واپس آ جائیں جہاں ہماری بٹالین پر انڈونیشی گوریلوں نے شب خون مارا تھا۔ اُسی روز بٹالین اپنے زخمیوں کو اٹھا کر واپس آ گئی۔ ہندو اور سکھ جو وہاں مارے گئے تھے' اُن کی لاشیں ہندوؤں اور سکھوں نے جلا دی تھیں اور مسلمانوں کو الگ الگ قبروں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ ہم نے سب کا مشترکہ جنازہ پڑھا تھا۔ یہ ہماری بٹالین کی بڑی

شرمناک شکست تھی۔ انڈونیشی گوریلوں نے بٹالین کو آپریشن آرڈر میں بتائے ہوئے مقام تک پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔

اس کے ایک مہینہ بعد یا اسی عرصے کے لگ بھگ اس ہندو نائیک کا کورٹ مارشل ہُوا اور اُسے سپاہی بنا دیا گیا تھا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ سپاہی محمد شفیع اس سزا سے مطمئن نہیں تھا جو اس ہندو نائیک کو دی گئی تھی۔ ایک نائیک کا عہدہ چھن جانا کوئی معمولی سزا نہیں تھی۔ وہ تو سیکشن کمانڈر تھا لیکن سپاہی بنا دیا گیا۔ شفیع کہتا تھا کہ وہ اس سے نُور عالم کے خون کا بدلہ لے گا تو ہم سمجھتے تھے کہ یہ محض جذباتی باتیں کر رہا ہے۔ میرا اس کے ساتھ کبھی کبھی آمنا سامنا ہوتا تھا۔ وہ نُور عالم کو بہت ہی یاد کرتا تھا اور یہ تو ضرور ہی کہتا تھا کہ وہ اس کے خون کا بدلہ لے گا۔ میں نے اسے ہر بار کہا کہ وہ یہ ارادہ دل سے نکال دے ورنہ باقی عمر اُسے جیل میں گذارنی پڑے گی۔ میں اُسے یہ بات زور دے کر نہیں کہا کرتا تھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ اس بات میں کوئی ایسا سنجیدہ نہیں اور دیہاتیوں اور سپاہیوں والی بات کر رہا ہے۔

کمانڈنگ آفیسر نے ایک نئی چال چلی۔ راتوں کو پٹرول پارٹیاں کیمپ سے دُور جنگل میں جایا کرتی تھیں۔ ان میں عام طور پر نفری آٹھ دس جوانوں کی ہوتی تھی اور ان کا کمانڈر نائیک یا حوالدار ہوتا تھا۔ کبھی کبھی پٹرول پارٹی یعنی گشتی پارٹی زیادہ نفری کی بھیجی جاتی تھی۔ ایسی پارٹی کی نفری بیس اور اس سے کچھ اوپر بھی ہُوا کرتی تھی۔ تمام کمپنیاں باری باری پٹرول پارٹیاں بھیجتی تھیں۔ ہوتا یہ تھا کہ مسلمان کمپنی کی پٹرول پارٹی جاتی تو اس میں سارے ہی مسلمان ہوتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں کی کمپنی تھی اور سکھوں کی بھی۔

نیا حکم یہ دیا کہ آئندہ زیادہ نفری کی پٹرول پارٹی جائے تو اس میں صرف ایک مذہب کے لوگ نہ ہوں بلکہ تینوں مذہبوں کے جوان شامل ہوں۔ مثلاً" بیس یا پچیس جوانوں کی پارٹی بھیجنی ہوتی تو اس میں کچھ مسلمان' کچھ ہندو اور کچھ سکھ شامل کئے جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان الگ تھلگ نہ جایا کریں کیونکہ ان کا رابطہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہو جاتا ہے اور پھر یہ مسلمان جوان اپنی ڈیوٹی کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ تو عام طور پر دیکھا گیا کہ کسی ہندو یا سکھ پٹرول پارٹی پر گوریلوں نے فائرنگ کی اور دو تین آدمی مار ڈالے۔

کبھی کبھار ایسی فائرنگ ہو ہی جاتی تھی لیکن یہ دیکھا گیا کہ جب مسلمان پٹرول پارٹی جاتی تھی تو اس پر کبھی فائرنگ نہیں ہوئی تھی نہ کبھی ان کا کوئی جوان زخمی ہوا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور پھر ہندو مسلم کشیدگی دیکھ کر کمانڈنگ آفیسر نے یہ نیا طریقہ رائج کر دیا کہ زیادہ نفری کی پٹرول پارٹی کی نفری تینوں قوموں کی ملی جلی ہو۔

اس ہندو نائیک کا کورٹ مارشل ہو چکا تھا جس کی پوسٹ سے مشین گن فائر ہوئی اور لانس نائیک نُور عالم مارا گیا تھا۔ وہ اب نائیک سے سپاہی بن گیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے' اس کے آٹھ دس روز بعد سولہ جوانوں کی ایک پٹرول پارٹی بھیجنے کا حکم ملا۔ جمعدار ایجوٹنٹ نے جو پارٹی بنائی اس میں چاروں کمپنیوں کے چار چار جوان شامل کئے گئے۔ اس طرح اس پارٹی میں چار ہندو' چار سکھ اور آٹھ مسلمان ہو گئے۔ آٹھ مسلمان اس لئے کہ دو کمپنیاں مسلمانوں کی تھیں۔ ان کا کمانڈر ایک سکھ حوالدار تھا۔ اس پارٹی نے رات دس بجے روانہ ہونا اور چار بجے واپس آنا تھا۔

یہ پارٹی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے ایک حکم کے تحت بھیجی جا رہی تھی۔ میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا یہ آرڈر پڑھا تھا۔ ہماری بٹالین کے کیمپ سے تقریباً" دو میل دُور سے ایک پگڈنڈی گزرتی تھی۔ ایک خاص ایریا بتایا گیا تھا جس میں اس پگڈنڈی کے دونوں طرف چھُپ کر گشت کرنی تھی۔ انٹیلی جنس نے کچھ اس قسم کی اطلاع دی تھی کہ انڈونیشی گوریلوں کی ایک پارٹی' پیدل یا گاڑی میں اس علاقے میں سے رات کو کسی بھی وقت گزرے گی۔ اس گوریلا پارٹی کو وہیں ختم کرنا تھا اور ایک دو گوریلوں کو زندہ پکڑ کر لانا تھا۔

میں یہ نہیں بتا سکتا کہ اس گوریلا پارٹی میں کیا خاص بات تھی کہ اسے گھات میں لینا اور اس میں سے ایک دو آدمیوں کو زندہ لانا تھا۔ یہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا پلان تھا اور مجھے اس پلان کی بیک گراؤنڈ کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ میں اتنا ہی جانتا تھا کہ ہماری بٹالین سے سولہ جوانوں کی پارٹی جانی ہے اور کہیں گھات لگانی ہے اور اس ایریے کی دیکھ بھال کرنی ہے۔

رات کو مقررہ وقت پر یہ پارٹی چلی گئی۔ یہ تو آئے دن کا معمول تھا کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ میں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ میں اپنی توجہ کی بات اس لئے کر رہا ہوں کہ جب بھی بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کوئی آپریشن آرڈر یا کوئی خاص آرڈر آتا تھا تو میں یہ ضرور دیکھتا تھا۔ دیکھنے سے میرا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کوئی ایسا آرڈر ہو جو پہلے انڈونیشیوں

تک پہنچانے والا ہو تو میں اس کا بندوبست کر دوں۔ اب میں نے اور میرے چند ایک ساتھیوں نے ایک پکا بندوبست کر لیا تھا جس کے تحت کوئی ضروری اطلاع دینی ہوتی تو وہ ساتھ والی آبادی میں پہنچا دی جاتی تھی۔ اس پٹرول پارٹی کی اطلاع پہنچانا ضروری نہیں تھا۔

صبح اٹھے تو میں اپنے دفتر چلا گیا۔ دفتر ایک بڑے سائز کے چوکور خیمے میں بنایا گیا تھا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہُوا تھا۔ صبح صبح ہی بڑی دلچسپ رپورٹ آئی۔ انگریز افسروں کو میں نے بھاگتے دوڑتے دیکھا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ کوئی خاص گڑبڑ ہو گئی ہے۔

گڑبڑ جو ہوئی تھی وہ خاصی دلچسپ تھی۔ ہُوا یہ تھا کہ یہ پٹرول پارٹی اُس ایریے میں پہنچ گئی جو اُسے دکھایا گیا تھا۔ سکھ حوالدار نے اس پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ آٹھ جوان پگڈنڈی سے ذرا ہی دُور ایک طرف اور آٹھ دوسری طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ حوالدار نے جوانوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا ہے اور کسی قسم کی آواز پیدا نہیں کرنی۔ چھپانا بھی اس طرح ہے کہ پگڈنڈی نظر آتی رہے۔

حوالدار نے جوانوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ گوریلوں کی ایک پارٹی پیدل یا گاڑی میں گزرے گی اور گاڑی فوجی ہو گی۔ اس گاڑی پر فائر کرنا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھاگ کر نہ جائے اور ان میں سے ایک دو کو زندہ پکڑنا ہے۔

○

یہ سکھ حوالدار اور تمام جوان پٹرول پارٹیوں کے عادی ہو چکے تھے۔ گھات لگانا' دشمن کی کسی پارٹی کو گھیرے میں لینا اور اس پر اس طرح حملہ کرنا کہ وہ نکل نہ سکے اور جوابی کارروائی بھی نہ کر سکے' ان کے تجربے میں تھا اور ان سب کو بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ انہیں اتنا زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

تقریباً" دو گھنٹوں کی گشت کے بعد دُور سے ایک گاڑی کی آواز آنے لگی۔ وہ جنگل تھا' کوئی شہر تو نہیں تھا جہاں رات کو بھی گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ وہ سارا علاقہ یوں سمجھیں کہ فوجی علاقہ تھا اور وہاں جنگ لڑی جا رہی تھی لیکن یہ عام جنگ نہیں' گوریلا جنگ تھی جس میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کس وقت کیا ہو جائے۔

گاڑی آ رہی تھی۔ پگڈنڈی خاصی چوڑی تھی اور کچھ اونچی نیچی بھی تھی۔ اس ایریے میں بھی ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور جنگل گھنا تھا۔ پگڈنڈی سیدھی نہیں تھی

بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مُڑتی تھی۔

حوالدار نے بڑی تیزی سے پگڈنڈی کے دونوں طرف اپنی پارٹی کو پوزیشن میں کر دیا اور کہا کہ پہلا فائر وہ خود کرے گا اور اُس کا ٹارگیٹ گاڑی کا ڈرائیور ہو گا۔ جوان تیار ہو گئے۔ حوالدار کے خیال کے مطابق گھات بڑی صحیح اور مکمل تھی۔

گاڑی جب پچیس تیس گز دور رہ گئی تو اس کے انجن کی آواز بند ہو گئی اور وہ ویسے ہی چلتی آئی۔ حوالدار کے بیان کے مطابق گاڑی کا انجن رک گیا تھا اور ایسی آوازیں آنے لگی تھیں جیسے ڈرائیور گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں ایسی آواز کو پہچاننا کوئی مشکل نہیں تھا۔ کچھ اور قریب آ کر گاڑی رک گئی۔ سکھ حوالدار نے رائفل سے پہلا فائر کیا اور اس کے ساتھ ہی دونوں طرف سے پارٹی نے فائر کھول دیا۔ اب ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس گاڑی میں سے گورلیے کود کود کر اُترتے اور اس فائرنگ کی زد میں آتے اور جو اس زد سے ٹھیک نکل جاتے وہ بھاگ جاتے یا کہیں پوزیشن لے کر جوابی فائر کرتے لیکن کوئی ایسی حرکت نظر نہ آئی۔ گاڑی ایسی جگہ رکی تھی جہاں ایک جُھنڈ چار پانچ بڑے اونچے اور گھنے درختوں کا تھا۔ چاندنی تو ٹھیک ٹھاک تھی لیکن چاند گہرے بادلوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا۔

یہ گاڑی بڑا فوجی ٹرک تھا جسے ہم تین ٹن ٹرک کہا کرتے تھے۔ اس پر ترپال چڑھا ہُوا تھا۔ اس گاڑی کی طرف سے ایک گولی بھی فائر نہ ہوئی۔ سکھ حوالدار نے فائر بند کرا دیا اور جوانوں کو اشارہ کیا کہ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھیں اور ٹرک کو ہر طرف سے گھیر کر قریب جائیں۔

جوان آہستہ آہستہ اپنی پوزیشنوں سے سرکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جب وہ کچھ قریب پہنچ گئے تو سکھ حوالدار نے کسی جوان کو بلند آواز میں کوئی بات کہی۔ گھات میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ ذرا سی بھی اونچی آواز نہ نکلے لیکن کوئی ایسی بات ہو گئی کہ سکھ حوالدار کے منہ سے بڑی بلند آواز نکل گئی۔ ظاہر ہے اُس نے اپنی ٹھیٹھ پنجابی میں کچھ کہا ہو گا۔

"کون ہو تم لوگ!" — ٹرک کے قریب سے آواز آئی — "اپنی گاڑی پر فائر کرتے ہو؟.... آگے آؤ اور ہم کو پہچانو"۔

سکھ حوالدار دوڑ کر آگے گیا۔ وہ جب آگے جا رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ ٹرک کے

دائیں طرف سے ایک آدمی اٹھا اور ایک آدمی ٹرک کے نیچے سے نکل رہا تھا۔ سکھ حوالدار نے قریب جا کر دیکھا تو وہ اپنے ہی فوجی تھے۔ ان میں ایک نائیک تھا اور ایک سپاہی۔ بات ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ فرنٹیئر فورس کے جوان ہیں۔ فرنٹیئر فورس ہم سے کوئی چھ سات میل دُور مقیم تھی اور اُس کی ذمہ داری کا ایریا دوسری طرف تھا۔

اس ٹرک میں کچھ سامان تھا جو رات ہی رات کہیں پہنچانا تھا۔ گاڑی کو سامنے سے دیکھا۔ سامنے والی سکرین میں سے سکھ حوالدار کی فائر کی ہوئی گولی گزری تھی اور سکرین میں سوراخ ہو گیا تھا اور اس میں لمبی لمبی لکیریں پڑ گئی تھیں یعنی سکرین ٹوٹ گئی تھی۔ سکھ حیران تھا کہ اُس کی گولی بالکل ڈرائیور کی سیدھ میں لگی تھی پھر ڈرائیور بچ کس طرح گیا تھا۔ ہُوا یہ تھا کہ گولی سکرین میں لگنے سے چند سیکنڈ پہلے ڈرائیور گاڑی میں سے نکل گیا تھا۔ جب پارٹی نے فائر کھولا تو دونوں ٹرک کے نیچے چھُپ گئے تھے۔ وہ بھی فوجی تھے اور اس قسم کے اچانک فائر سے بچنے کا تجربہ رکھتے تھے۔

وہ دونوں پٹھان تھے اور ان کے ٹرک پر فائر ہُوا تھا' وہ تو سخت غصے میں آ گئے اور واہی تباہی بکنے لگے۔ ہمارا سکھ حوالدار سخت پریشان ہو گیا کہ انہیں کس طرح راضی کرے لیکن ٹرک کی سکرین ٹوٹ گئی تھی اور ٹرک پر اتنی گولیاں لگی تھیں کہ ترپال چھلنی ہو گیا تھا۔ ٹرک پر جو سامان لدا ہُوا تھا وہ کوئی خاص اہم اور قیمتی نہیں تھا۔ سکھ حوالدار نے اُن سے معافی مانگی اور بتایا کہ اسے کیا مشن دیا گیا تھا اور اس کے مطابق وہ اس ٹرک کو گورلیوں کا ٹرک سمجھا تھا۔

اتنے میں ایک اور گاڑی کی آواز آنے لگی۔ سکھ حوالدار نے کہا کہ یہ ہو سکتی ہے وہ گاڑی جسے گھات میں لینا تھا' اس میں انڈونیشی گورلیے ہوں گے۔

"تم سکھ ہے!" — پٹھان نائیک نے کہا — "وہ بھی ہمارا گاڑی ہے۔ اس میں چودہ پندرہ جوان آ رہے ہیں۔ وہ ہمارا ایسکارٹ ہے۔ شاید ان کا گاڑی بھی خراب ہو گیا تھا"۔

اتنے میں وہ گاڑی بھی قریب آ کر رکی اور اس میں سے فرنٹیئر فورس کا ایک حوالدار اُترا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے؟ اُسے بات سنائی گئی اور جب اُس نے سامان والا ٹرک دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ یہ پٹھان تو اس سکھ کو معاف کر سکتے تھے لیکن گاڑی کو جو نقصان پہنچا تھا اسے چھپانا ممکن نہیں تھا۔ اس واقعہ کی رپورٹ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جانی ہی تھی۔

اس علاقے میں رات کے وقت کوئی فوجی ٹرک خصوصاً" وہ ٹرک جس میں سامان ہوتا' اکیلا نہیں جا سکتا تھا۔ اس ٹرک کے ساتھ ایک ٹرک میں اس کے لئے حفاظتی دستہ آ رہا تھا لیکن جس طرح سامان والی گاڑی کا انجن رک گیا تھا' اسی طرح اس پچھلی گاڑی میں بھی کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ یہ گاڑی پیچھے رک گئی اور سامان والی گاڑی والوں کو پتہ ہی نہ چلا۔ اتفاق سے سامان والی گاڑی یہاں آ کر فیل ہو گئی۔ پوری جنگِ عظیم میں یہ گاڑیاں استعمال ہوئی تھیں اور استعمال بھی سڑکوں پر نہ ہوئیں بلکہ جنگلوں پہاڑوں اور اسی قسم کے دشوار گذار راستوں میں استعمال ہوتی رہیں۔ ان گاڑیوں کا تو بُرا ہی حال ہو گیا تھا۔ اکثر گاڑیاں اسی طرح راستے میں رک جاتی تھیں۔

یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ پچھلی گاڑی دور ہی رُک گئی تھی۔ اگر دونوں گاڑیاں اکٹھی آ رہی ہوتیں تو یوں ہوتا کہ سامان والی گاڑی رکتی تو پچھلی گاڑی بھی رک جاتی جس میں حفاظتی دستہ تھا۔ ان پر فائرنگ ہوتی تو جانی نقصان ہوتا اور وہ بھی آخر فوجی تھے' جوابی فائر کر کے پٹرول پارٹی کو اچھا خاصا نقصان پہنچا سکتے تھے۔ ایک بڑا ہی خوفناک حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

اگر اگلی گاڑی کو نقصان نہ پہنچا ہوتا تو سکھ حوالدار اور پٹھان حوالدار آپس میں تصفیہ کر سکتے تھے لیکن اب یہ معاملہ دونوں کے بس کا نہیں رہا تھا۔ سکھ حوالدار نے پٹھان حوالدار سے کہا کہ وہ اُس کا نام' نمبر اور یونٹ لکھ لے اور وہ بالکل ایسا ہی بیان دے گا جیسے یہ واقعہ ہُوا ہے۔ پٹھان حوالدار نے سکھ کا نام نمبر اور یونٹ وغیرہ لکھ لی اور پٹھان اگلی گاڑی کو دیکھنے لگے کہ اسے کیا ہو گیا ہے اور سکھ حوالدار اپنی پٹرول پارٹی سے کہنے لگا کہ اب واپس چلو۔

سکھ حوالدار نے اپنی پارٹی سے یہ کہہ تو دیا لیکن اُس نے وقت دیکھا تو ابھی دو بجے تھے۔ اسے چار بجے واپس ہونا تھا۔ اسے جو ٹارگیٹ دیا گیا تھا وہ تو اُس کے سامنے آیا ہی نہیں تھا۔ اب تو سکھ کا دماغ حاضر ہی نہیں رہا تھا۔ میں بھی بعد میں اس سے ملا تھا۔ اس پر خوف یہ طاری ہو گیا تھا کہ کچھ ہی دن پہلے ایک ہندو نائیک کا کورٹ مارشل اسی جرم میں ہُوا تھا کہ اس نے بغیر دیکھے فائرنگ کرا کے اپنا ہی لانس نائیک مروا ڈالا تھا۔ سکھ کو یہ ڈر تھا کہ اُس کا بھی کورٹ مارشل ہو گا اور اُسے بھی سپاہی بنا دیا جائے گا۔

اس سکھ حوالدار کی اس غلطی پر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

وائیوں میں ایسی غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ میں نے پچھلے کسی باب میں لکھا ہے کہ بحرالکاہل میں امریکہ اور جاپان کے بحری جہازوں کے مابین تاریخ کی سب سے بڑی بحری جنگ ہوئی تھی۔ بحری جہاز ایک دوسرے کے اتنا قریب کم ہی آتے ہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ اور پہچان سکیں۔ وہ بہت ہی دُور دُور رہتے ہیں اور اُن کی توپیں دور مار ہوتی ہیں۔ بحرالکاہل کی بحری جنگ میں امریکہ کی نیوی کے کئی بحری جہاز ایک دوسرے کو جاپانی جہاز سمجھ کر گولہ باری کرنے لگے اور ایک دوسرے کو بے تحاشہ نقصان پہنچایا۔ اس قسم کی غلطیوں کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔

میں ویسے ہی آپ کی دلچسپی کی خاطر صوبہ سرحد کے علاقے کی لڑائیوں کی ایک بات سنا رہا ہوں۔ وہاں جب فوج پھیل کر ایڈوانس کرتی تھی تو اس کی حفاظت کے لئے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پوسٹیں بنائی جاتی تھیں جنہیں پکٹ کہتے تھے۔ سپاہی بڑی تیزی سے پتھر اٹھا کر لاتے اور گولائی میں دیوار کھڑی کر لیتے تھے اور اُس میں مورچہ بند ہو جاتے تھے۔

میری بٹالین میں ایک بار یوں ہُوا تھا کہ رات کے پچھلے پہر بنوں سے پہاڑی علاقے کی طرف ایڈوانس کیا گیا۔ یہ بریگیڈ تھا۔ جس کمپنی نے کسی چوٹی پر پکٹ بنانی ہوتی تھی اس کے کمپنی کمانڈر کو وہ چوٹی دکھا دی جاتی تھی۔ چوٹی دکھانے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ وہ کمپنی ایک عہدیدار اور چند ایک جوان مقرر کر کے بھیج دیتی اور وہ اس چوٹی پر جا کر مورچہ بند ہو جاتے تھے۔ اُس رات ایڈوانس ہُوا تو سحری کے وقت پہاڑیوں کے اوپر بے تحاشہ فائر شروع ہو گیا۔ بے تحاشہ فائر تو ہم کیا کرتے تھے' پٹھان ایک گولی چلاتے اور ہمارا سب آدمی لے لیتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ بے ہنگم فائر نہیں کرتے تھے لیکن یہ تو بے ہنگم فائر تھا جو اچانک شروع ہُوا اور پندرہ بیس منٹ بعد اچانک ہی بند ہو گیا۔

رپورٹ ملی کہ جب ایک پکٹ پر ایک کمپنی کے جوان جا رہے تھے تو اوپر سے ان پر "رہا ہے" انہوں نے فوراً" اِدھر اُدھر پوزیشنیں لے لیں اور جوابی فائر کر دیا۔ وہ یہ سمجھے مانتے بجانب تھے کہ چوٹی پر پٹھان پہنچے ہوئے ہیں اور یہ فائر انہوں نے کیا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ ایک اور کمپنی کو کسی چوٹی پر پکٹ بنانی تھی اور اس کے کمپنی کمانڈر کو غلط چوٹی دکھا دی گئی تھی یا اس نے چوٹی سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ بہرحال ہُوا یہ کہ اس کمپنی کے جوان پہلے پہنچ گئے اور غلط چوٹی پر پکٹ قائم کر لی۔ کچھ دیر بعد اس کمپنی کے

جوان اوپر جانے لگے جنہیں وہاں پکٹ بنانی تھی۔ اوپر والے یہ سمجھے کہ نیچے سے پٹھان آ رہے ہیں اور نیچے والے یہ سمجھے کہ اوپر پٹھان پہلے سے موجود ہیں۔ فائر اس طرح بند ہوا کہ ایک پکٹ کے حوالدار نے بلند آواز سے اپنے جوانوں کو حوصلہ افزائی کے لئے للکارا۔ تب نیچے سے اوپر جانے والوں کو پتہ چلا کہ یہ تو اپنے آدمی ہیں۔ پھر فائر بند ہوا اور بڑا اچھا اتفاق یہ ہوا کہ دونوں طرف کوئی جوان زخمی بھی نہ ہوا۔ دونوں حوالداروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

انڈونیشیا میں اس ہندو نائیک کا کورٹ مارشل صرف اس لئے کیا گیا تھا کہ بٹالین میں ہندو مسلم وشنی پیدا ہو گئی تھی اور پھر نائیک کی غلطی یہ تھی کہ اُس نے اُس وقت مشین گن فائر کروائی جب گوریلے بہت پہلے کے غائب ہو چکے تھے۔ اُسے اُس کی بزدلی کہا گیا تھا۔

○

یہ سکھ حوالدار اسی علاقے میں اپنی پٹرول پارٹی کو لئے گھومتا پھرتا رہا لیکن بڑی ہی سخت پریشانی کے عالم میں۔ اس کی پٹرول پارٹی اب اس طرح چل رہی تھی کہ ایک قطار پگڈنڈی کے دائیں اور دوسری قطار بائیں تھی۔ اس ترتیب کو فوج میں سنگل فائل کہا جاتا ہے۔ جوان ایک دوسرے کے پیچھے کچھ فاصلہ رکھ کر چلے جا رہے تھے۔ وہ ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں گہرے کھڈ بھی تھے اور ٹیکریاں بھی۔ اس زمین پر جوانوں کا درمیانی فاصلہ کچھ زیادہ ہو گیا۔

آخر واپسی کا وقت ہو گیا۔ گوریلوں کی کوئی پارٹی پیدل یا گاڑی میں آتی نظر نہ آئی۔ ہو سکتا ہے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے کسی مسلمان نے انہیں پہلے ہی خبردار کر دیا ہو کہ آج رات نہ جائیں، راستہ صاف نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اُس رات اپنا پروگرام ملتوی کر دیا ہو۔ بہرحال سکھ کو اپنا ٹارگیٹ نہ ملا۔ بہت آگے جا کر اُس نے اپنی پارٹی کو اکٹھا ہونے کے لئے پکارا۔

پارٹی اکٹھی ہو گئی اور فوجی دستور کے مطابق حوالدار نے گنتی کی تو دو جوان کم تھے۔ اُس نے معلوم کر لیا کہ کون کون سے جوان ابھی نہیں پہنچے اور پیچھے رہ گئے ہیں۔ اُس نے وہیں سے انہیں بلند آواز سے پکارنا شروع کیا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

ان غیر حاضر جوانوں میں ایک تو سپاہی محمد شفیع تھا اور دوسرا وہ ہندو نائیک تھا جس

نے نُور عالم پر فائر کیا تھا اور اب وہ سپاہی تھا۔ سکھ حوالدار کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ محمد شفیع نے عہد اور عزم کر رکھا تھا کہ وہ اس ہندو سے نُور عالم کے خون کا بدلہ لے گا۔ سکھ حوالدار اتنا ہی جانتا تھا کہ پارٹی کے دو جوان غیر حاضر ہیں۔ وہ انہیں چھوڑ کر تو نہیں جا سکتا تھا۔ اُس نے اپنی پارٹی کو حکم دیا کہ واپس چلو اور ان دونوں کو تلاش کرو۔ ایسا کبھی ہُوا نہیں تھا کہ اچھے بھلے جوان اس طرح لاپتہ ہو جائیں۔ وہاں کوئی ایسی گہری کھائی بھی نہیں تھی جس میں دونوں پاؤں پھسلنے سے گر پڑے ہوں۔

صبح کے چار بج رہے تھے اور یہ پارٹی پیچھے کو جا رہی تھی۔ جوان باری باری ان دونوں کے نام لے لے کر پکار رہے تھے لیکن کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ جوان اونچی اور گھنی جھاڑیوں کے پیچھے اور ٹیکریوں کے اردگرد اپنے ان دو ساتھیوں کو ڈھونڈتے جا رہے تھے۔

تقریباً ایک میل پیچھے گئے ہوں گے کہ ایک جوان کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی — اِدھر آؤ اوئے.... دوڑ کر آؤ" — سب دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ دیکھا، وہاں وہی ہندو مرا پڑا تھا جسے شفیع مار کر انتقام لینا چاہتا تھا۔ شفیع وہاں نہیں تھا۔ لاش کے ایک پہلو سے بھی خون نکل رہا تھا اور شہ رگ سے بھی۔ اب اس پارٹی نے شفیع کو پکارنا اور ڈھونڈنا شروع کر دیا لیکن شفیع کہیں بھی نہ ملا۔ اس ہندو کی رائفل بھی غائب تھی۔

تھک ہار کر سکھ حوالدار نے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ ہندو کی لاش کو جوانوں نے باری باری اٹھایا اور کیمپ میں لے آئے۔ چونکہ لاش دفتر والے خیمے کے سامنے رکھی گئی تھی اس لئے میں نے بھی اسے دیکھا۔

سکھ حوالدار نے کمانڈنگ آفیسر کو یہ بیان دیا کہ پہلے اُس نے غلط سمجھ کر فرنٹیئر رائفلز کی گاڑی پر فائر کھول دیا تھا۔ وہ واقعہ تفصیل سے بیان کرنے کے بعد بتایا کہ اُسے کیسے پتہ چلا کہ دو جوان غیر حاضر ہیں اور ہندو اُسے کہاں اور کس حالت میں پڑا ملا۔ یہ رپورٹ بھی دی گئی کہ سپاہی محمد شفیع لاپتہ ہے۔

یہ تو میں جانتا تھا کہ اب اس بٹالین کو سپاہی محمد شفیع نہیں ملے گا۔ یقینی بات تھی کہ ہندو کو شفیع نے قتل کیا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔ اُس وقت وہ انڈونیشی مسلمانوں تک پہنچ چکا ہو گا۔ انگریز افسر کہتے تھے کہ اس سپاہی کو انڈونیشی گوریلوں نے مارا ہے اور شفیع بھی انہوں نے مار ڈالا ہے اور کسی کھڈ نالے میں پھینک گئے ہوں گے۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہماری بٹالین میں ایک کیپٹن ڈاکٹر تھا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بھی ایک ڈاکٹر تھا اور مرہم پٹی کا نہایت اچھا انتظام تھا۔ اس ہندو سپاہی کی لاش بریگیڈ ہیڈ کوارٹر بھیج دی گئی اور ہماری بٹالین کا ڈاکٹر ساتھ گیا۔ شام کو پتہ چلا کہ اس ہندو سپاہی کے ایک پہلو میں گہرا زخم تھا جو خنجر کا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا زخم شہ رگ میں تھا۔ شہ رگ دائیں بائیں کو نہیں کاٹی گئی تھی بلکہ اوپر نیچے کی طرف کاٹی گئی تھی اور جس ہتھیار سے کاٹی گئی تھی وہ اس کی گردن کے پیچھے سے باہر نکل گیا تھا۔

میں نے اپنے ہمراز دوستوں کو بتایا جن میں نمایاں حوالدار امیر خان، صوبیدار محمد اشرف اور صوبیدار نذر شاہ تھے۔ انہوں نے ہندو کی لاش نہیں دیکھی تھی۔ میں نے انہیں بتایا کہ زخم کہاں تھے اور کیسے تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ صوبیدار نذر شاہ نے بڑی صحیح قیاس آرائی کی تھی۔ اس میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ اس ہندو کو شفیع نے قتل کیا ہے۔ صوبیدار نذر شاہ نے کہا کہ شفیع نے اس کے پہلو میں سنگین ماری ہوگی اور یہ پیٹھ کے بل گر پڑا ہوگا۔ پھر شفیع نے پہلو سے سنگین نکال کر اس کی شہ رگ میں ماری ہوگی اور شہ رگ چیر دی ہوگی۔ یہ سنگین ہی تھی جو اُس کی گردن کے پچھلی طرف نکلی گئی تھی۔

ہم دعائیں کرنے لگے کہ شفیع خیریت سے انڈونیشی گوریلوں تک پہنچ جائے۔

اس سکھ حوالدار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی اس غلطی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ اُس نے فرنٹیئر فورس کی گاڑی پر فائر کر دیا تھا۔ وہ لڑائی اس نوعیت کی تھی کہ ایسی غلطیوں کا امکان موجود تھا۔

○

یہ تو میری بٹالین کے کچھ واقعات ہیں اور کچھ آگے چل کر سناؤں گا، وہاں صرف میری بٹالین ہی نہیں تھی، انڈین آرمی کی بے شمار یونٹیں تمام تر انڈونیشیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے کئی ایک عجیب و غریب اور بعض بڑے ہی جذباتی واقعات دوسری یونٹوں کے سنے تھے۔ وہ بھی سناؤں گا۔ بیشتر واقعات ایسے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ ایسا انڈونیشی مسلمانوں کو اپنی آزادی کے لئے لڑتے دیکھ کر ہی تازہ ہو جاتا تھا۔

میں آپ کو دوسرا پہلو بھی دکھا دیتا ہوں.... یہ نہ سمجھیں کہ وہاں انڈین آرمی کا ہر مسلمان ویسا ہی دیندار اور حریت پسند تھا جیسوں کی میں کہانیاں سنا رہا ہوں۔ کچھ ایسے

دل میں خواہش رکھتے تھے کہ انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ جا ملیں لیکن کچھ سوچ کر چپ ہو رہتے تھے اور ان کے لئے صرف دعا کرتے تھے۔ ایسے بھی تھے جو نام کے مسلمان تھے اور ان کے دلوں میں عیش موج تھی یعنی شیطانیت۔ اس کا میں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں اور دیکھیں اللہ تعالیٰ کس طرح ایسے لوگوں کو دنیا میں ہی سزا دیتا ہے۔

میں نے پہلے تفصیل سے بتایا ہے کہ وہاں ولندیزیوں کی لڑکیاں اور جوان عورتیں موجود تھیں۔ یہ عورتیں اتنی تندرست اور صحت مند تھیں کہ ان میں جو ادھیڑ عمر تھیں وہ بھی جوان لگتی تھیں۔ اگر شکل و صورت سے نہیں تو اپنی ابلیسی حرکتوں سے جوان لگتی تھیں۔ ان کی اتنی ہی خوبصورتی کافی تھی کہ ان کے رنگ گورے تھے، بال کھلے رکھتی تھیں اور لباس ایسا پہنتی تھیں جو گھروں سے دُور فوجیوں کو مشتعل کرتا تھا۔ ملبوس ہو کر بھی لگتا تھا وہ برہنہ ہیں۔ ہم میں سے جو ان کے چکر میں آ گئے تھے، وہ تو اپنا دین دھرم بھی بھول گئے تھے۔

ہمارا ایک حوالدار میجر تھا۔ وہ سب کے سامنے شراب پیتا تھا۔ ایسے اور بھی تھے لیکن میں اس کا ذکر کروں گا۔ وہ میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا اور اس کا نام عبدالعزیز تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ وہ خاندانی خوشامدی اور چاپلوس تھا۔ ہم تو اُسے افسروں کی جوتیاں چاٹنے والا کہا کرتے تھے۔ بظاہر خوش طبع اور ملنسار تھا۔ باتیں ایسی کرتا کہ سُننے والا اُسے اپنا بے تکلف دوست سمجھ لیتا تھا۔ پیار اور محبت سے وہ راز لے لیتا اور کمپنی صوبیدار اور کمپنی کمانڈر کو مرچ مسالہ لگا کر یہ باتیں سناتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ بڑا خوبصورت سانپ تھا جو آستین میں بیٹھ کر ڈستا تھا۔

ساتھ والی بستی میں ولندیزی بھی آباد تھے اور انہوں نے اپنی عورتوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ عبدالعزیز کی زندگی ان عورتوں کے ساتھ گناہوں میں گزر رہی تھی۔ کچھ دن وہ ایک عورت کے ساتھ یارانہ لگا کر رکھتا اور اُسے راشن اور دیگر اشیاء دیتا رہتا تھا۔ ان عورتوں پر کوئی ایسی پابندی نہیں تھی کہ وہ کیمپ میں نہیں آ سکتیں۔ افسروں کے ساتھ بھی ان عورتوں کے یارانے تھے۔ اونچے خاندانوں کی ولندیزی لڑکیاں افسروں کے MESS میں آتیں اور کھاتی پیتی اور راتیں وہیں گذارتی تھیں۔ انہیں ایسا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا کہ یہ افسر ہے اور وہ صرف افسر کے ساتھ ہی یارانہ رکھیں۔ کسی جمعدار صوبیدار یا اس سے بھی نیچے عہدے کے فوجی کے ساتھ بات چیت ہو جاتی تو وہ اُسی کی ہو

جاتی تھیں۔ سکھوں کو شراب ملتی تھی۔ شراب کی خاطر یہ عورتیں سکھوں کے پاس آ جاتی تھیں۔

حوالدار میجر عبدالعزیز ان ہی عورتوں میں گم ہو گیا تھا۔ ایک بار ایسے ہُوا کہ وہ کیمپ سے نکلا اور غالباً" اُس بستی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں تک راستہ سیدھا نہیں جاتا تھا۔ سارے علاقے کی طرح وہاں بھی اونچی نیچی ٹیکریاں اور چٹانیں تھیں اور یہ سارا علاقہ جنگل تھا۔

ہمارے تین چار سپاہی جن میں ایک نائیک بھی تھا' بستی کی طرف سے واپس کیمپ میں آ رہے تھے۔ وہ فوجیوں کی طرح ہنستے کھیلتے' ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کرتے چلے آ رہے تھے کہ ایک سپاہی نے رک کر کہا کہ اِدھر دیکھو' کیا ہو رہا ہے۔ سب نے اُدھر دیکھا تو عجیب سا منظر نظر آیا۔

حوالدار میجر عبدالعزیز ایک لڑکی کے ساتھ الجھا ہُوا تھا اور لڑکی جو خاصی جوان تھی اس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہاں ولندیزی لڑکی اور مسلمان لڑکی فوراً" پہچانی جاتی تھی۔ ایک تو ان کے چہرے مختلف تھے اور دوسرا فرق یہ تھا کہ مسلمان لڑکیاں اگر بال کھُلے رکھتی یا کٹواتی بھی تھیں تو سر پر رومال ضرور باندھتی تھیں جسے سکارف کہتے ہیں۔ یہ بڑا رومال تھا جو وہ سر پر رکھ کر ٹھوڑی کے نیچے گانٹھ دے لیتی تھیں یا ویسے ہی کھلا چھوڑ کر گردن ڈھانپ لیتی تھیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنا سر ننگا نہیں رکھتی تھیں۔

یہ جو لڑکی عبدالعزیز سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی' یقیناً مسلمان لڑکی تھی۔ اگر ولندیزی ہوتی تو وہ یوں مزاحمت نہ کرتی بلکہ اپنا آپ عبدالعزیز کے پیش کرتی اور عبدالعزیز اس سے جان چھڑا رہا ہوتا۔

وہ انڈونیشی مسلمان لڑکی تھی جسے عبدالعزیز پکڑنے کی اور پکڑ کر گرانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ایک بار لڑکی نے ایسا داؤ کھیلا کہ عبدالعزیز کو پیٹھ کے بل گرا دیا لیکن وہ بھاگی نہیں' وہیں کھڑی رہی۔ عبدالعزیز نے چھوٹے سے ایک درخت کی شاخ توڑ لی جس سے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اس سے وہ لڑکی کو مارنا پیٹنا چاہتا تھا۔

ایک سپاہی نے کہا' چلو یار' کرنے دو اسے جو کرتا ہے' آخر حوالدار میجر ہے لیکن جو نائیک تھا وہ بڑی دلیر اور بڑی ہی ظالم چیز تھی۔ اختر حسین اس کا نام تھا اور وہ پٹھان کبڈی ٹیم کا بڑا ہی زبردست کھلاڑی تھا۔ اُس میں مسلمانی بھڑک اُٹھی۔ وہ کچھ بھی نہ بولا

اور تیز دوڑ کر عبدالعزیز اور لڑکی تک پہنچا۔

عبدالعزیز نے اُس شاخ کے پتے توڑ ڈالے تھے اور لڑکی کو مارنے لگا تھا۔ لڑکی بھاگی نہیں تھی کہ اختر پہنچ گیا۔ اس نے جاتے ہی حوالدار میجر کی گردن پر ایسا گھونسہ مارا کہ حوالدار میجر عبدالعزیز لڑکھڑتا ہوا ایک درخت کے ساتھ ٹکرایا اور اس کا سر تنے کے ساتھ لگا۔

اختر نے مجھے یہ بات سناتے ہوئے کہا کہ عبدالعزیز کا سر تنے کے ساتھ لگا تو ڈول گیا۔ اختر نے اسے ننگی گالیاں دیں اور دوسرا گھونسہ اس کے پیٹ میں مارا اور کہا کہ تم مسلمان ہو اور مسلمان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس گھونسے سے عبدالعزیز دہرا ہو گیا تو اختر نے اُسے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ انڈونیشی لڑکی وہیں کھڑی رہی۔

عبدالعزیز نے شراب پی پی کر اور ولندیزی عورتوں کے ساتھ جھک مار مار کر اپنے جسم میں طاقت رہنے ہی نہیں دی تھی۔ اُس سے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا البتہ گالیاں بک رہا تھا اور دھمکیاں دیتا تھا کہ میں تمہارا کورٹ مارشل کروا دوں گا۔ سپاہیوں نے درمیان میں آ کر عبدالعزیز کو پرے گھسیٹ لیا اور عبدالعزیز بڑی تیزی سے اور غصے سے وہاں سے چل پڑا۔ اختر نے انڈونیشی لڑکی سے پوچھا کہ وہ مسلمان ہے؟ اختر نے صرف اتنا کہا تھا — "مسلم؟" — لڑکی نے سر ہلا کر جواب دیا کہ وہ مسلمان ہے۔ غصے سے اُس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا تھا اور وہ قہر بھری نظروں سے عبدالعزیز کو دیکھ رہی تھی جو وہاں سے کھسک گیا تھا۔

اختر نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اشارہ کیا کہ وہ چلی جائے۔ لڑکی نے جھک کر سلام کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور بولی — "السلام علیکم" — اور وہاں سے چل پڑی۔ اختر اور سپاہیوں نے مل کر وعلیکم السلام کہی۔

میں آپ کو فوج کی بات سناتا ہوں۔ حوالدار میجر کے سامنے ایک نائیک کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ نائیک حوالدار میجر کے ماتحت اور اُس کے حکم کا پابند ہوتا ہے۔ عبدالعزیز اور اختر میں ایک فرق یہ بھی تھا کہ عبدالعزیز خوشامدی اور چاپلوس تھا اور اختر ایسا مسلمان تھا جو ایک تو عہدے کی وجہ سے اور دوسرے چاپلوسی کے زور پر عبدالعزیز اختر کو سزا نہ دلوا سکتا تھا۔

○

یہ واقعہ مجھے اسی شام معلوم ہو گیا تھا۔ اگلے روز عبدالعزیز نے ڈنک مار دیا۔ اُس نے اپنے کمپنی صوبیدار کی معرفت کمپنی کمانڈر کو یہ شکایت پیش کی کہ فلاں کمپنی کا نائیک اختر حسین انڈونیشیوں کی بستی میں جاتا ہے اور وہاں راز کی فوجی باتیں انہیں بتاتا ہے اور اسے ثبوت ملا ہے کہ اس کا رابطہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہے۔ یہ تو مختصر سی چارج شیٹ تھی جو اُس نے اپنے انگریز کمپنی کمانڈر تک پہنچائی اور کہا کہ اس کے پاس ثبوت بھی موجود ہیں۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُسی روز اُس نے ایک ولندیزی عورت پیش کر دی جس نے کمپنی کمانڈر کو یہ بیان دیا کہ نائیک اختر حسین بستی کے مشکوک انڈونیشی مسلمانوں کے گھروں میں جاتا ہے اور اُن تک خبریں پہنچاتا ہے۔

میں آپ کو یہ بات بڑی مختصر کر کے سنا رہا ہوں۔ اصل بات یہ تھی کہ عبدالعزیز نے خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعے اور چرب زبانی سے اختر حسین کے خلاف بڑا سنگین کیس بنا دیا تھا اور گواہوں کے طور پر اِس ولندیزی عورت کے علاوہ اپنی کمپنی کے تین جوان بھی پیش کر دیئے تھے۔ اختر حسین دوسری کمپنی میں تھا۔ اُس کمپنی کمانڈر تک یہ چارج شیٹ پہنچی اور اختر حسین کو ملزم کی حیثیت سے کمپنی کمانڈر کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اختر حسین نے اپنا صحیح بیان دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ تین چار جوانوں کو پیش کر سکتا ہے اور انڈونیشی بستی میں وہ اس لڑکی کو بھی ڈھونڈ سکتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی کا گھر کون سا تھا۔

انگریز انصاف کرنے والی قوم تھی۔ انہوں نے اُن تین چار جوانوں کو بلایا جو نائیک اختر حسین کے ساتھ تھے۔ انہوں نے بالکل صحیح گواہی دی اور پھر اختر حسین نے یہ کہا کہ صاحب بہادر، اُس موقعہ پر چلو اور وہاں کی زمین دیکھو جس پر ہماری لڑائی کے نشان موجود ہوں گے۔

کمپنی کمانڈر نے اُسے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی اور اُسے جھوٹا ثابت کرنے کی بھی کوشش کی تاکہ سچی بات سامنے آجائے۔ اختر حسین نے بڑی دلیری سے کہا کہ صاحب بہادر، میں نے سچ بول دیا ہے اور اگر مجھے سزا دی گئی تو پھر میں انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہوں اور اپنی اس بٹالین پر لعنت بھیجوں گا۔

یہ حقیقت ہے کہ انگریز سچ کو بہت پسند کرتے تھے۔ انہیں ایک بار پتہ چل جائے

کسی نے ان کے آگے جھوٹ بولا ہے اور اپنا مطلب نکالا ہے تو پھر وہ اُسے انتہائی سزا دیتے تھے۔ بہرحال عبدالعزیز تو بڑا ہی چالاک اور کایاں آدمی تھا۔ اُس نے یہ کیس کمانڈنگ آفیسر تک پہنچا دیا۔ اُس کی اپنی اتنی اتھارٹی نہیں تھی کہ خود انگریز کمانڈنگ آفیسر تک پہنچ جاتا، کمپنی کمانڈروں کے ذریعے یہ کیس کرنل تک پہنچ گیا اور کرنل نے باقاعدہ انکوائری کا حکم دے دیا۔ آخر فیصلہ اختر حسین کے حق میں ہو گیا لیکن اسے یہ بھی کہا گیا کہ آئندہ اُس نے کسی سینئر عہدے کے آدمی پر ہاتھ اٹھایا تو اس کا کورٹ مارشل کیا جائے گا۔ ہمیں تو یہ توقع تھی کہ اختر حسین کا کورٹ مارشل ہو جائے گا اور اگر نہ ہوا تو کمانڈنگ آفیسر تو اُسے کچھ نہ کچھ سزا دے گا لیکن بچ بچاؤ ہو گیا۔

عبدالعزیز کی یہ بہت بڑی شکست تھی۔ اُس نے اختر کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ اب وہ اُس کو نہیں چھوڑے گا۔ اس کی ایک دھمکی یہ تھی کہ وہ اُسے گولی مارے گا یا مروا دے گا۔ وہاں کسی کو گولی مارنا یا مروانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں آپ کو ایسے واقعات سنا چکا ہوں۔ عبدالعزیز نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ نائیک اختر حسین پر ایسا کیس بنوائے گا کہ اسے سروس سے ڈسچارج نہ کیا گیا تو اس کی نائیکی بھی نہیں رہنے دوں گا۔

عبدالعزیز کو اپنے عہدے پر ناز تھا اور اُس کی اصل طاقت تو یہ تھی کہ پکا بے غیرت تھا اور افسروں کی جُوتیاں چاٹتا تھا۔ اگر آپ فوجی سروس کے ماحول کو نہیں جانتے تو آپ سمجھ نہیں سکتے کہ ایک درجہ اوپر عہدے والا آدمی نیچے درجے کے عہدے والے کو کتنا اور کس طرح نقصان پہنچا سکتا ہے۔ انگریز افسر سچے آدمی کو پسند کرتے تھے یا نہیں، اوپر اللہ کی ذات تھی جو جھوٹے اور بدکار کو ایک نہ ایک دن ضرور پکڑتا ہے۔

میں نے پچھلے ایک باب میں بتایا ہے کہ ولندیزی عورتوں میں پیشہ ور طوائفیں بھی شامل ہو گئی تھیں جن کے اندر بڑی خطرناک بیماریاں بھی تھیں۔ میں نے ایسی دو بیماریوں کے نام بھی لکھے تھے۔ ایک ہے آتشک اور دوسری ہے سوزاک۔ یہ بیماریاں کچھ فوجیوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ اُن ہی فوجیوں کو لگی تھیں جو عبدالعزیز کی طرح بدکاری کے عادی ہو گئے تھے۔ جس فوجی کو یہ بیماری لگتی تھی یہ اُس کا جرم تصوّر کیا جاتا تھا جس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ وہ غلیظ عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ اُس کا علاج تو ہوتا تھا لیکن اس کی کچھ سزا بھی مقرر تھی۔ اسے Self-Inflicted Injury (خود پیدا کردہ زخم یا بیماری) کہتے تھے۔

لگتا یہ بیماری عبدالعزیز کو لگ گئی یہ تھی سوزاک۔ پہلے تو وہ اس بیماری کو چھپاتا رہا۔ جو

فوجی اس بیماری میں مبتلا ہوتے تھے وہ اسی طرح کرتے تھے۔ بیماری کو چھپا لیتے تھے اور چوری چھپے علاج کرانے کی کوشش کرتے تھے جو نہیں ہوتا تھا۔ عبدالعزیز تو حوالدار میجر تھا اس لئے اُسے اپنی عزت کا اور عہدے کا زیادہ خیال تھا لیکن بیماری کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس شخص کا عہدہ کیا ہے۔ چھپانے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ بیماری اندر ہی اندر پھیل گئی اور جڑ پکڑ گئی۔ عبدالعزیز شراب کا عادی بھی تھا۔ یہ بیماری اندر ہی اندر رہتی ہے۔ شراب نے اور اس بیماری نے عبدالعزیز کو گرا دیا پھر بھی اُس نے بیماری کو چھپانے کی کوشش کی۔

عبدالعزیز روز بروز کمزور ہی ہوتا چلا گیا اور چند دنوں میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک روز چلتے چلتے گر پڑا تب سب کو پتہ چلا کہ اس کا اندر سے کیا حشر ہو رہا ہے۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور ڈاکٹر نے جب اُس کی حالت دیکھی تو عبدالعزیز سے کہا کہ تم اب کسی قابل نہیں رہے اور یہ بیماری لاعلاج حد تک پہنچ چکی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے یہ کہا کہ اگر تم اپنے وطن اور اپنے گھر پہنچ گئے تو اپنی بیوی اور بچوں سے دور رہنا ورنہ وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہو جائیں گے۔

پھر دیکھئے اللہ نے اُسے کیا سزا دی۔ میں تو کہتا ہوں کہ بدکار عورتوں کے پاس جانا اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنا تو گناہ تھا ہی لیکن عبدالعزیز کا اصل گناہ یہ تھا کہ اُس نے ایک مسلمان لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور لڑکی بھی وہ جو اللہ کے نام پر کافروں کے خلاف لڑنے والی تھی۔ ایک روز پتہ چلا کہ عبدالعزیز کے سارے جسم پر پھنسیاں سی پھوٹ آئی ہیں اور اُس کے قریب جاؤ تو بدبُو آتی ہے۔

میں نے ایک روز اُسے ہسپتال کے خیمے میں جا کر دیکھا تو وہ لاش بنا ہُوا تھا اور اُس کے چہرے پر بھی موٹی موٹی پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ ہلے اور آواز نہ نکلی۔ میں واپس آیا تو تین گھنٹوں بعد اطلاع ملی کہ عبدالعزیز تڑپ تڑپ کر مر گیا ہے۔

اُسے وہیں کیمپ سے ذرا دُور دفن کیا گیا تھا۔ نماز جنازہ کا اعلان ہُوا تھا لیکن بٹالین کے کئی مسلمان اُس کا جنازہ پڑھنے نہیں گئے تھے۔ کوئی سپاہی مرجاتا تھا تو بٹالین کے تمام مسلمان نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے اور ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تو ضرور ہی ہوتے تھے۔ وطن سے دُور پردیس کی موت سب کے لئے بڑی دردناک ہوتی تھی لیکن عبدالعزیز کا جنازہ بٹالین کے بمشکل آدھے مسلمانوں نے پڑھا ہو گا۔ (جاری ہے)

انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ انڈین آرمی کے علاوہ امریکہ اور برطانیہ کی افواج وہاں پہلے ہی موجود تھیں اور اس اسلامی جنگِ آزادی کو دبانے کی انتہا درجہ تک کوشش کر رہی تھی لیکن انڈونیشی مجاہدین نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ امریکہ نے اپنی ایک خاص فوج جسے بحری فوج کہا جائے تو ٹھیک ہو گا' انڈونیشیا میں بھیج دی۔ یہ تھی اس کی مَیرِین فورس جسے امریکہ والے کریک فورس کہتے ہیں۔

فضائی حملوں کا تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ ہمیں فضا میں لڑاکا بمبار طیارے جاتے اور آتے نظر آتے رہتے تھے اور دُور دُور سے بموں کے دھماکوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کا پس منظر کیا تھا لیکن یہاں مزید معلومات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں.... پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ صلیبی طاقتیں کسی قیمت پر اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں کہ ایک اور اسلامی ملک معرضِ وجود میں آ جائے۔ اینگلو امریکی بلاک کو ولندیزیوں کے ساتھ اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک تو وہ مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو کچلنا چاہتے تھے اور اسی بہانے وہ مسلمانوں کی نسل کُشی بھی کر رہے تھے کہ یہ خطّہ مسلمانوں کا خطّہ نہ رہ سکے۔

کون نہیں جانتا کہ عرب ممالک کے تیل پر پہلے انگریز قابض تھے اور پھر امریکی کمپنیوں نے تیل کے اس سمندر پر جا قبضہ کیا اور اب یہ حالت ہے کہ عرب ممالک امریکہ کے غلام بن چکے ہیں۔ ان دونوں صلیبی ملکوں کی شروع سے ہی یہی کوشش رہی ہے کہ جہاں کہیں زمین خزانے اگلتی ہے وہاں جا کر اس زمین پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ

دونوں ملک ان کوششوں میں کامیاب چلے آ رہے ہیں۔

نقشے پر انڈونیشیا کی جغرافیائی اور زمینی کیفیت دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے ملک پر حکومت کس طرح کی جاتی ہے اور شہری انتظامات کس طرح رواں دواں رکھے جا سکتے ہیں۔ یہ ملک 17 ہزار چھوٹے بڑے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان میں جاوا' سماٹرا' بورنیو جیسے بڑے جزیرے بھی ہیں اور اتنے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی جو نقشے پر نظر نہیں آتے لیکن یہ خطہ جو 17 ہزار جزیروں میں منقسم اور کٹا ہُوا ہے' معدنی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں سے تیل' پٹرول اور قدرتی گیس بے انداز نکلتی ہے اور یہ اشیاء غیر ممالک کو برآمد بھی کی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ پلائی وُڈ انڈونیشیا میں ہوتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ انڈونیشیا کا یہ سارا ملک دو تہائی جنگلات ہے اور ایک تہائی کسی حد تک میدانی۔ بہت سے علاقے پہاڑی بھی ہیں۔ ان جنگلات سے جو لکڑی حاصل ہوتی ہے اس میں پلائی وُڈ کے علاوہ صندل' دیودار اور دیگر عمارتی لکڑی کی بہتات ہے۔ یہ تمام لکڑی برآمد ہوتی ہے۔ انڈونیشیا میں سونے کے ذخائر بھی ہیں اور پیتل' جست' ربڑ اور ٹین کا تو کوئی شمار اور حساب ہی نہیں۔ یہ تمام معدنیات برآمد کی جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ زمین کی دولت جسے امریکہ اور برطانیہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کا مسئلہ یہ تھا کہ اسلامی ملک بن گیا تو یہ ساری دولت مسلمانوں کے کام آئے گی اور انڈونیشیا عرب ممالک کی طرح ایک اور انتہائی امیر مسلمان ملک ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت کے لحاظ سے انڈونیشیا عرب ممالک سے زیادہ امیر ملک ہے۔ انڈونیشیا کی جنگ آزادی کے لیڈر احمد سوئیکارنو وغیرہ اس دولت سے واقف تھے اور ان میں اسلامی جذبہ تو تھا ہی۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ جیتے جی اپنی زمین کی یہ دولت مغربیوں کے حوالے نہیں کریں گے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے قارئین پُراسرار' چسکے دار اور سنسنی خیز واقعات اور کہانیاں سننا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو یہ کہانیاں سنا بھی چکا ہوں اور آگے چل کے سناؤں گا بھی لیکن انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کی داستان کوئی چسکے دار کہانی نہیں کہ اس سے الف لیلیٰ کی کہانیوں جیسا لطف اٹھایا جائے۔ یہ اُسی جہاد کی اور اُسی جذبے کی روئیداد ہے جو اسلام نے ہمیں عطا کیا ہے اور مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس جذبۂ جہاد کو زندہ رکھے۔ ایک بات جو آگے چل کر کہنی چاہئے تھی' میں یہیں کہہ دیتا ہوں۔ میں نے پچھلے باب

تفصیل سے بتایا ہے کہ جنگِ ستمبر 1965ء میں انڈونیشیا نے ہماری مدد کس طرح کی تھی۔ اب یہ سنیں کہ امریکہ نے اسے جرم قرار دے کر احمد سوئیکارنو مرحوم کو اور انڈونیشی مسلمانوں کو کیا سزا دی تھی۔

انڈونیشیا کے پہلے صدر احمد سوئیکارنو مرحوم بنے تھے۔ بڑے ہی جابر اور مردِ مومن انسان تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا رجحان روس کی طرف تھا اور روس نے انہیں بہت ہی جنگی ساز و سامان دیا تھا جس میں مگ لڑاکا بمبار جدید طیارے بھی تھے۔ جنگِ ستمبر 1965ء میں احمد سوئیکارنو مرحوم نے حکم دے دیا تھا کہ یہ لڑاکا بمبار طیارے بالکل تیار رہیں اور جوں ہی مشرقی پاکستان سے کال آئے' وہاں پہنچ جائیں۔

انڈونیشیا والوں کا دوسرا جرم یہ تھا کہ یہ واحد ملک تھا جس نے یو این او سے علیٰحدگی اختیار کر لی تھی اور یو این او کی سیکیورٹی کونسل میں انڈونیشی نمائندے نے جو آخری تقریر کی تھی وہ ایک لعن طعن تھی جو امریکہ اور دیگر بڑی طاقتوں کے منہ پر ماری گئی تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ یہ بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو اپنا غلام بنا رہی ہیں اور ان کی دلچسپیوں اور ان کے مفادات کا کوئی خیال نہیں۔ اس طرح انڈونیشیا نے یو این او یعنی اقوامِ متحدہ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ پھر یہ ملک بالکل آزاد ملک بن گیا تھا۔

1966ء میں اچانک انڈونیشیا کے بڑے شہروں خصوصاً" جکارتہ میں کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے لوگوں کے گھروں پر حملے شروع کر دیئے اور قتلِ عام شروع کر دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان لوگوں کو معلوم تھا کہ کون کون سے خاندان اسلام پسند ہیں اور انہیں ختم کرنا ہے۔ اس قدر خونریزی ہوئی کہ شہروں کی گلیوں میں خون بہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں مسلمان اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ کٹ گئے۔ ان فسادیوں نے لوگوں کے گھروں میں گرینیڈ پھینکے۔ لاکھوں مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

حکومت تو جیسے سمجھ نہ سکی ہو کہ یہ اچانک ہُوا کیا ہے۔ اس خونریزی کا لیڈر سوہارتو تھا جو آج تک انڈونیشیا کا صدر چلا آ رہا ہے۔ احمد سوئیکارنو کو گرفتار کر کے گمنامی میں پھینک دیا گیا اور یہ فسادی لیڈر حکومت پر قابض ہو گیا۔ انکشاف ہُوا کہ یہ خونریزی امریکہ نے بدنامِ زمانہ تنظیم سی آئی اے سے کرائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ احمد سوئیکارنو کی حکومت ختم کر کے وہاں امریکہ اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کرے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس خونریزی کے دوران آل انڈیا ریڈیو سے میں نے

خبرنامے میں یہ الفاظ سنے کہ احمد سوئیکارنو کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ ستمبر 1965ء میں اس نے پاکستان کی بہت ہی مدد کی تھی جو امریکہ کو پسند نہیں تھا۔

امریکہ نے انڈونیشیا کے دارالحکومت اور بڑے بڑے شہروں کو مسلمانوں کے خون میں ڈبو کر اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی اور سوہارتو کو صدر بنا دیا۔ غور فرمائیں' سوہارتو مارچ 1967ء میں صدر بنا تھا اور آج تک وہ صدر بنا چلا آ رہا ہے۔ گزرے ہوئے تیس برسوں میں الیکشن ہوتے چلے آئے ہیں لیکن سوہارتو ہی صدر منتخب ہوتا رہا۔ کوئی جرأت نہیں کر سکتا کہ اس کے خلاف ووٹ دے۔ گذشتہ سال سوہارتو نے اپنے ملک کے تین صفحۂ اوّل کے اخبار رسالے اس جرم میں بند کر دیئے تھے کہ انہوں نے لکھا تھا کہ ملک میں کرپشن اور سیاسی مفاد پرستی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ انڈونیشیا جیسے امیر ملک کے عوام روٹی کو ترس رہے ہیں۔

یہ ہے سوہارتو کی ڈکٹیٹرشپ جسے امریکہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہیں پر اکتفا نہ کی گئی کہ احمد سوئیکارنو کو نظر بند کر دیا گیا بلکہ انتہائی گھٹیا طریقوں سے اس کی اور اس کے خاندان کی کردار کشی کی گئی۔ اسے شرابی' زانی کہا گیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اُس وقت انڈونیشیا ایک جنگی طاقت بن گیا تھا اور معدنیات کی بدولت امیر سے امیر تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس ملک کے عوام خوش حال تھے مگر اب وہاں یہ عالم ہے' یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری!

پاکستان میں بھی ایسے ہی ہوا ہے۔ جنگِ آزادی بے مایہ اور مفلس مسلمانوں نے ایک مخلص قیادت میں لڑی' جان و مال کی قربانیاں دیں اور پھر اپنے گھر بار اور جائدادیں لٹوا کر پاکستان آ گئے لیکن پاکستان وجود میں آیا تو اس پر انگریزوں کے پروُردہ جاگیردار اور وڈیرے قابض ہو گئے جنہوں نے آہستہ آہستہ امریکہ نوازی شروع کر دی اور امریکہ کی دولت کی چکاچوند نے ان کی عقل پر ایسا پردہ ڈالا کہ ملک اور اپنے لوگ امریکہ کے غلام بنا ڈالے۔ بالکل یہی حال امریکہ نے انڈونیشیا میں کیا اور آج وہ انڈونیشیا جس کی زمین سے شہیدوں کے لہو کی خوشبو اٹھتی ہے' امریکہ کا غلام ہے۔

○

آیئے اب میں آپ کو جنگِ آزادی کے ہنگامے میں لے چلتا ہوں.... ہماری بٹالین کو دُور کے ایک چھوٹے سے قصبے موجوکرتو میں بھیج دیا گیا۔ وہاں گئے تو بٹالین کو دو

حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اے اور سی کمپنی کو موجوکرتو میں رہنے دیا گیا اور بی اور ڈی کمپنی کو دس گیارہ میل دُور ایک اور مقام جو مبنگ بھیج دیا گیا۔ ہیڈ کوارٹر موجوکرتو میں رہا۔ میں چونکہ ہیڈ کوارٹر کے دفتر میں سینئر کلرک تھا اس لئے میں موجوکرتو میں رہا۔ صورت یوں بنی کہ اے کمپنی میں مسلمان تھے اور سی کمپنی سکھوں کی تھی۔ مسلمان اور سکھ موجوکرتو میں رہے اور بی کمپنی ہندوؤں کی تھی اور ڈی کمپنی مسلمانوں کی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان جو مبنگ چلے گئے۔

موجوکرتو میں ہماری ان کمپنیوں کے علاوہ ایک لیبر فورس تھی جس میں زیادہ تر انڈونیشی عیسائی اور جنگلی سے لوگ تھے جن کا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ کچھ امریکی فوجی بھی تھے اور کچھ انگریز فوجی بھی تھے لیکن ان کی کوئی باقاعدہ یونٹ وہاں نہیں تھی۔ یہاں ان کے دفاتر تھے۔ چھوٹی سی ایک سیکیورٹی فورس بھی تھی جس میں مسلمانوں کی نفری بہت ہی تھوڑی تھی باقی سب عیسائی تھے۔

یہ دونوں قصبے موجوکرتو اور جو مبنگ ایک بڑے شہر سورابایا سے تقریباً" بیس میل دُور تھے۔ ہمیں ایک پرانے سکول میں جگہ دی گئی تھی۔ قصبے کے اردگرد ہماری کمپنیوں کی پوسٹیں بنا دی گئی تھیں۔ یہ اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ریت سے بھری ہوئی بوریاں گول دیوار کی صورت میں رکھی جاتی تھیں اور ان میں سے مشین گنوں اور رائفلوں کے لئے سوراخ رکھ دیئے جاتے تھے۔ ان پر چھت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ہر پوسٹ میں آٹھ دس اور کسی میں زیادہ جوان رہتے تھے۔ ہم قصبے کے بازار میں گھوم پھر سکتے تھے لیکن شام کے بعد باہر جانے کی پابندی تھی۔ ہمیں خاص طور پر کہا گیا تھا کہ ان شہریوں سے ہوشیار رہنا۔ یہ حکم بٹالین آرڈر میں بھی شامل کیا گیا تھا۔ بٹالین آرڈر بھی میرے ہاتھوں سے نکلتے تھے۔ اس آرڈر میں پوری بٹالین کو خبردار کیا گیا تھا کہ انڈونیشی گوریلے ہتھیاروں اور ایمونیشن میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے اپنی جان سے زیادہ اپنے ہتھیار یعنی اسلحہ اور ایمونیشن کی حفاظت کرو۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہمارا رابطہ کس طرح ہُوا کرتا تھا' اب رابطے کا ایک طریقہ پیش کرتا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں دیکھا.... ایک روز چار بجے کے لگ بھگ میرے آفیسر دفتر سے اٹھ گئے تو میں ٹہلتا ٹہلتا ایک پوسٹ تک پہنچ گیا جس میں مسلمان کمپنی کے دس بارہ جوان ڈیوٹی پر تھے۔ ان کا کمانڈر ضلع اور

تحصیل جہلم کے ایک گاؤں کا رہنے والا نائیک عبدالمجید تھا جو میرا دوست تھا اور میں اس کے جذبے سے بھی واقف تھا۔ میں اس پوسٹ میں جا بیٹھا۔

نائیک مجید باتیں کرتے کرتے اُٹھ کھڑا ہُوا اور سینڈ بیگوں کی دیوار کے ساتھ جا رکا۔ اوپر سے باہر سب کچھ نظر آتا تھا۔ مطلب یہ کہ یہ دیوار ایک اچھے جوان کے کندھوں تک اونچی تھی۔ میں نے ویسے ہی دیکھا کہ نائیک مجید اپنے ایک ہاتھ میں ایک کاغذ کو مروڑ مروڑ کر گولی بنا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پاس جا کھڑا ہُوا اور باہر دیکھنے لگا۔

ویسے ہی میری نظر باہر کے مناظر دیکھتے دیکھتے ایک انڈونیشی لڑکے پر رُک گئی۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال ہو گی۔ اُس نے پتلون کی شکل کا ذرا تنگ سا پاجامہ پہنا ہُوا تھا اور اوپر قمیض نہیں بلکہ صرف بنیان تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ اُس کا رنگ زردی مائل گورا تھا اور لڑکا بڑا ہی بھولا بھالا اور بڑی اچھی شکل والا تھا۔ وہ اس طرح چلا آ رہا تھا کہ کنکریوں کو ٹھوکریں مارتا اور کچھ اچھلتا کودتا بھی تھا جیسے اس عمر کے لڑکے کیا کرتے ہیں۔

وہ جب کچھ قریب آ گیا تو اُس نے ہماری طرف دیکھا۔ وہ پوسٹ سے کچھ دُور تھا لیکن اسی طرح ٹھوکریں مارتا ہمارے قریب آ گیا اور ہماری طرف اس کی جیسے توجہ نہیں تھی۔ نائیک مجید نے کاغذ کی گولی جو بنائی تھی' وہ اپنے ہونٹوں میں لے لی اور پیچھے سے بڑی زور سے پھونک ماری تو گولی دُور جا گری۔

وہ لڑکا گولی تک پہنچا اور اسے بھی اسی طرح ٹھوکریں مارتا آگے لے گیا جس طرح وہ ہر چیز کو ٹھوکریں مارتا اور کھیلتا چلا آ رہا تھا۔ مجید اسے دیکھتا رہا اور میری نظریں بھی اسی پر لگی رہیں۔ ذرا آگے جا کر اُس نے معلوم نہیں کس طرح گولی کو پاؤں سے یا غالباً" پاؤں کے انگوٹھے سے اوپر کو اچھالا کہ گولی اس کے سر تک چلی گئی۔ اُس نے منہ اُوپر کر کے منہ کھول دیا اور گولی منہ میں پکڑ لی اور پھر وہ دوڑ پڑا۔

نائیک مجید نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا۔ پھر اُس نے کہا' اللہ کا شکر ہے' پیغام پہنچ جائے گا۔

نائیک مجید نے بتایا کہ وہ اسی طرح ضروری پیغام انڈونیشی گوریلوں کے کمانڈر تک پہنچاتے ہیں۔ میں نے پہلے سنا تھا کہ اس طریقے سے مسلمان فوجی گوریلوں کو پہلے ہی خبردار کر دیتے ہیں کہ فلاں دن فلاں وقت فوج فلاں آپریشن کے لئے نکل رہی ہے اور وہ اپنا بندوبست کر لیں.... یہ میں آپ کو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں لیکن ہم جس جگہ

ے آئے تھے وہاں یہ سہولت تھی کہ ہم خود قصبے میں جا سکتے تھے اور ضروری باتیں نہیں زبانی بتا دیتے تھے یا میں آپریشن آرڈر کی نقل ان کے حوالے کر آتا تھا۔ یہ ولت ہر آبادی میں نہیں تھی۔

میں نے اُس روز وہ طریقہ اپنی آنکھوں دیکھا جو پہلے صرف سنا تھا۔ اسی طرح بظاہر ئی غریب اور کھلنڈرا سا لڑکا کسی پوسٹ کے سامنے سے اُچھلتا کودتا گزرتا تھا اور پوسٹ سلمان کمانڈر پیغام لکھ کر اس کی گولی بناتا اور اس کی طرف منہ سے اُچھال دیتا تھا۔ لڑکا ی طرح اس گولی کے ساتھ کھیلتا آگے چلا جاتا اور پیغام اٹھا لیتا یا اچھال کر منہ میں لے لیتا

ایک طریقہ اور بھی تھا۔ کوئی لڑکا یا لڑکی یا کوئی بوڑھا سا آدمی چھابڑی اٹھائے ستوں کے قریب سے گزرتا تھا۔ چھابڑی میں اُس علاقے کا پھل فروٹ یا کوئی ایسی ہی ہوتی تھی۔ پوسٹ کا مسلمان کمانڈر پیغام لکھ کر اس کی گولی بنا لیتا یا تہہ کر کے تعویذ سا لیتا اور چھابڑی کے قریب جا کر ایسی حرکتیں اور باتیں کرتا کہ دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ ہ خرید رہا ہے لیکن وہ چیز لے کر کاغذ چھابڑی میں رکھ کر آ جاتا تھا۔ یہ پیغام گوریلوں کمانڈر تک پہنچ جاتا تھا۔

عموماً" کمپنی کمانڈر' کمپنی صوبیدار اور حوالدار میجر کو پورے ہفتے کا پروگرام دے دیا تے تھے کہ فلاں فلاں دن اور فلاں وقت اتنی نفری کی ایک پٹرول' (گشت پارٹی) فلاں یے میں جائے گی اور وہ وہاں کیا کرے گی اور کس وقت واپس آنا ہے.... نائیک مجید ایک روز بعد کا پروگرام مختصراً" اردو میں لکھ کر لڑکے کے ذریعے بھیج دیا تھا۔ ونیشی مسلمانوں کے پاس اُردو پڑھنے والے لوگ موجود تھے۔ اس وقت تک تو انڈین ی کے بہت سے مسلمان فوجی اُن کے پاس پہنچ گئے تھے۔

○

دو روز بعد دن کے دو بجے دونوں کمپنیاں پٹرول کے لئے نکلیں۔ ان کا مقصد اور گرام نہ جانے کیا تھا لیکن میں اسے پٹرول یا گشت کہوں گا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ کیمپ ے دونوں کمپنیوں کو اکٹھے نکلنا تھا اور قصبے سے دور جا کر سکھ کمپنی کو ایک طرف اور سلمان کمپنی کو دوسری طرف چلے جانا تھا' یعنی دونوں کمپنیوں کو الگ الگ ایریا دیا گیا تھا۔ انہیں اس سارے علاقے کی تلاشی لینی تھی اور کوئی چھوٹا موٹا گاؤں دیکھ کر اس کو بھی

اچھی طرح دیکھنا تھا اور ضرورت کے مطابق تلاشی تک نوبت آئے تو وہ بھی لیتی تھی۔ وہاں اسی قسم کے ٹاسک ہُوا کرتے تھے۔

شام کو جب کمپنیاں اپنے اپنے ٹاسک سے فارغ ہو کر ایک جگہ اکٹھی ہوئیں اور کیمپ میں آئیں تو ہمیں پتہ چلا کہ تین سکھ مارے گئے ہیں اور چند ایک زخمی ہوئے ہیں۔ یہ کمپنی گوریلوں کی زد میں آگئی تھی اور گوریلے فائرنگ کر کے بھاگ گئے تھے۔ اُدھر مسلمان کمپنی پر ایک بھی راؤنڈ فائر نہیں ہُوا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اُس روز نائیک عبدالمجید نے اس لڑکے کے آگے کیا پیغام پھینکا تھا۔ گوریلوں کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ مسلمان کمپنی فلاں ایریے میں جائے گی اور فلاں ایریے میں سکھوں کی کمپنی جائے گی۔ گوریلے سکھوں کے علاقے میں چلے گئے اور تین سکھوں کو ہلاک اور چند ایک کو زخمی کر کے غائب ہو گئے۔

انگریز آفیسران باتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اب یہ راز نہیں رہ گیا تھا کہ انڈین آرمی کے مسلمان فوجی گوریلوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تعاون بھی کرتے ہیں۔ اب ہمارے افسروں نے دیکھا کہ سکھ مارے گئے ہیں اور مسلمانوں کی طرف گوریلوں نے دیکھا ہی نہیں تو افسروں نے یہ آرڈر جاری کر دیا کہ آئندہ گشتی پارٹی ایک کمپنی کی نہیں ہُوا کرے گی بلکہ آدھے مسلمان اور آدھے سکھ اکٹھے جایا کریں گے.... انگریزوں نے یہ حکم تو دے دیا لیکن یہ نہ سوچا کہ سکھ پھر بھی دُور سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس حکم کے بعد دو مرتبہ ایسے ہُوا کہ دس گیارہ مسلمان اور دس گیارہ سکھ اکٹھے کسی ٹاسک پر بھیجے گئے لیکن مارے گئے تو صرف سکھ مارے گئے۔ اس علاقے کے گوریلوں کو معلوم تھا کہ سکھوں کے ساتھ جو دوسرے فوجی ہیں وہ مسلمان ہیں۔

○

دیگر واقعات سنانے سے پہلے ایک بڑی دلچسپ بات سناتا ہوں۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کا تعلق امریکہ کی مَیرین فورس کے ساتھ ہے۔ پہلے یہ خبر میں نے زبانی سنی تھی پھر پندرہ سولہ دنوں بعد میں نے اپنے انگریز اکیونٹ کی میز پر ایک انگریزی اخبار پڑا دیکھا اور اس میں یہ خبر پوری تفصیل کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ امریکہ کا اخبار "نیویارک ٹائمز" تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ انڈونیشیا 17 ہزار چھوٹے بڑے جزائر کا مجموعہ ہے۔ ان

جزیروں میں عجیب و غریب جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی بتا چکا ہوں کہ انڈونیشیا کا ۷۰ فیصد رقبہ جنگلات ہے باقی ایک حصہ ذرا میدانی ہے۔ ان جنگلات میں شیر بھی پائے جاتے ہیں، ہاتھی بھی، درختوں پر رہنے والے اژدہا بھی بہت ہیں جنہیں GREEN TREE PYTHON کہتے ہیں۔ ان کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے اور ایک عجیب جانور ہے جو ہے تو کنگرو لیکن یہ درختوں پر رہتا ہے۔ بندر اور بن مانس کی نسل کے ایسے جانور ملتے ہیں جو دنیا کے کسی اور خطّے میں نہیں ہوتے۔

وہاں ایک جزیرہ ہے جس کا نام KOMODO ہے۔ یہ جزیرہ ہمارے موجو کرتو سے جنوب میں پانچ سو میل کے لگ بھگ دُور تھا۔ یہ جزیرہ ہمیشہ غیر آباد چلا آ رہا تھا۔

یہ علاقے یعنی یہ کچھ جزیرے جنگِ عظیم سے محفوظ رہے تھے۔ دوسرے علاقوں میں جنگ کے دھماکے ہوتے رہے۔ وہاں کے درندے اور جنگلی جانور بھاگ کر ان جزیروں میں چلے گئے جو جنگ سے محفوظ تھے۔ خبر یہ ملی کہ جنگِ آزادی کو کچلنے کے لئے امریکہ نے اپنی نیوی کا بھی استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ امریکن نیوی کی ایک گن بوٹ میں کم و بیش پندرہ فوجی یا نیوی کے آدمی تھے، جزیرہ KOMODO میں جا اترے۔ شاید تفریح کے لئے وہاں گئے تھے یعنی یہ دیکھنے کے لئے کہ اس جزیرے میں کیا ہے۔ ان کا مقصد بہرحال فوجی تھا۔ ان کے ساتھ ایک لیفٹیننٹ تھا۔

انہیں بڑی عجیب اور خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ آوازیں شیر کی دہاڑ اور ہاتھی کی چنگھاڑ جیسی ملی جلی آوازیں تھیں۔ یہ تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ آوازیں کسی جانور یا درندے کی ہیں لیکن ان امریکیوں نے ایسا درندہ کبھی دیکھا نہ تھا۔ وہ آگے بڑھتے گئے اور ایسا منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آگیا جس پر وہ دیکھنے کے باوجود یقین نہ کر سکے۔ چھپکلی یا سانڈے کی شکل کے دو عفریت آپس میں لڑ رہے تھے۔ ان امریکیوں کے وہ تقریباً 60 یا 70 گز دُور تھے۔ اس عفریت کی لمبائی آٹھ گز سے دس گز تک تھی۔ ان کے پنجوں کے ناخن خنجروں جیسے تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو لہولہان کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ رائفلیں تیار کر لو، ہم انہیں قریب سے دیکھیں گے اور اگر انہوں نے ہم پر حملہ کیا تو سب مل کر فائر کریں گے۔

وہ آگے بڑھتے چلے گئے اور ایسی جگہ آگئی جہاں جنگل گھنا نہیں تھا، درخت ایک

دوسرے سے دُور دُور ہو گئے تھے اور زمین سے چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ جب وہ ٹولہ آگے چلے گئے تو وہ دو عفریت لڑتے لڑتے ایک چٹان کے پیچھے ہو گئے۔ اچانک ان امریکیوں کو اپنے عقب میں ایسی ہی آواز سنائی دی جو ان عفریتوں جیسی تھی۔ انہوں نے پیچھے دیکھا تو مارے خوف کے ان کا بُرا حال ہو گیا۔ ایسے ہی تین عفریت ان کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔

انہوں نے دوڑ کر اِدھر اُدھر پوزیشنیں لے لیں اور ان پر فائر کرنے لگے لیکن یہ عفریت ڈرنے کی بجائے اور تیز دوڑے اور اس کے ساتھ ہی پانچ چھ ایسے ہی عفریت مختلف سمتوں سے آ گئے اور یہ سب بلائیں ان امریکیوں پر ٹوٹ پڑیں۔

ان آدمیوں میں سے صرف دو بھاگ کر زندہ اور سلامت گن بوٹ میں پہنچ گئے لیکن وہ ہکلاتے تھے اور منہ سے کوئی لفظ صحیح نہیں نکلتا تھا۔ آخر انہیں شراب پلائی گئی تو انہوں نے بتایا کہ اس جزیرے میں انہوں نے کیا دیکھا ہے اور وہاں کیا حادثہ ہُوا ہے۔ ان کے وہ ساتھی جو گن بوٹ میں ہی رہے تھے اور جزیرے میں داخل نہیں ہوئے تھے' وہ مانتے ہی نہیں تھے کہ آج کے دَور میں لاکھوں سال پہلے والے عفریت موجود ہوں گے۔ بچ کر نکل آنے والے دونوں آدمیوں نے انہیں کہا کہ ہمیں جھوٹا کہہ لو لیکن اس جزیرے میں داخل نہ ہونا۔

اس جزیرے میں پھر کوئی داخل نہ ہُوا اور اوپر رپورٹ بھیجی گئی۔ ابھی ہیلی کاپٹر نہیں بنے تھے۔ چھوٹے ہوائی جہاز کے ذریعے اس جنگل میں دیکھا گیا۔ یہ ہوائی جہاز درختوں کی بلندی پر اُڑا کر ویسے بھی اور دُوربینوں سے بھی دیکھا تو یہ عفریت نظر آئے۔ ان کی تعداد صحیح طور پر معلوم نہیں' اچھی خاصی تھی۔ امریکہ والوں نے اپنے تمام اگلے فوجی ہیڈ کوارٹروں کو خبردار کر دیا کہ KOMODO جزیرے کے قریب نہ جائیں۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جب انڈونیشیا آزاد ہو گیا اور اس کی باقاعدہ حکومت کام کرنے لگی تو اس حکومت نے KOMODO جزیرے کو ایک محفوظ پارک کی حیثیت دے دی اور اسے صرف سیاحوں کے لئے ریزرو کر دیا۔ آج بھی یہ عفریت وہاں موجود ہیں اور سیاح وہاں جاتے ہیں اور دُور دُور سے ان عفریتوں کو دیکھتے ہیں۔ کسی شخص کو رائفل یا ریوالور یا کوئی ہتھیار جزیرے میں لے جانے کی اجازت نہیں۔ ان پندرہ امریکیوں نے غالباً" دو یا تین عفریت رائفلوں سے مار ڈالے تھے' اس کے بعد وہ طبعی

موت مرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی اگلی نسلیں پیدا ہوتی رہیں۔ اس عفریت کو KOMODO DRAGON کا نام دیا گیا ہے اور یہ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔

ایک اور امریکی گن بوٹ ایسے ہی ایک اور ویران جزیرے کے ساحل پر جا لگی اور اس میں سے دس بارہ فوجی اترے اور جزیرے کے اندر آگے چلے گئے۔ وہ جب اور زیادہ چلے گئے تو اچانک دو تین دھاری دار شیروں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان فوجیوں کو ان پر فائر کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ یہ دھاری دار شیر تھے جنہیں ٹائیگر کہتے ہیں۔ چار فوجی شیروں کا شکار ہو گئے اور باقی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور گن بوٹ تک پہنچ گئے۔۔

۔۔خبر میں لکھا تھا کہ ان دونوں گن بوٹوں کو کوئی اور جزیرے بتائے گئے تھے جن میں انسان آباد تھے اور اس قسم کے درندوں وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ گن بوٹیں غلط جزیروں پر جا رکی تھیں۔

○

میں نے جب یہ خبر سنی اور پھر اخبار میں پڑھی تو میرے دل سے ایک آواز اٹھی کہ انڈونیشی مجاہدین کے سروں پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور اس جنگل کے درندے بھی انہی کا ساتھ دے رہے ہیں۔

میں تیرہ چودہ سال کے اُس بھولے بھالے لڑکے کی بات کر رہا تھا جو نائیک عبدالمجید کا پھینکا ہُوا پیغام لے گیا تھا۔ یہ لڑکا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہنے لگا۔ یوں کہہ لیں کہ وہ میرے ذہن میں کبھی نہ مٹنے والا ایک نقش بن گیا۔ یہ تو اُس کے ہنسنے کھیلنے کی عمر تھی لیکن وہ کس طرح خطرہ مول لے کر اپنی قوم اور اپنے ملک کی جنگِ آزادی میں اپنا رول ادا کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی نہیں تھا بلکہ اُس جیسے بے شمار لڑکے اور لڑکیاں یہ رول ادا کر رہی تھیں۔۔۔۔ ایک رات یہ لڑکا اس طرح میرے ذہن اور دل پر حاوی ہو گیا کہ میں نو گی رات تک سو بھی نہ سکا۔

"تم بزدل ہو" ۔۔۔ یوں آواز سنائی دی جیسے اُس لڑکے نے مجھے طعنہ دیا ہو۔

"تم اس لئے مسلمان نہیں کہلا سکتے کہ تمہارا نام مسلمانوں جیسا ہے"۔

"تم ہندوؤں کی کھڑی کی ہوئی انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے بوڑے ہو گئے تھے لیکن اپنی قوم کے لئے تمہارا خون سرد ہو گیا ہے"۔

"انگریزوں سے تمہیں راشن وَردی اور چند روپوں سے زیادہ کچھ نہیں مل سکتا۔

اجر لینا ہے تو اللہ سے لو"۔

"اٹھو.... یہ صلیبی جنگ ہے.... آگے بڑھو اور اپنا فرض ادا کرو"۔

مجھے یقین کی حد تک محسوس ہونے لگا کہ میرے تاریک کمرے میں وہ لڑکا موجود ہے اور وہ میرا خون گرم کر کے مجھے بھڑکا رہا ہے۔ میں اپنے آپ میں شرمساری سی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پچھلے کیمپ میں انڈونیشی مجاہدین کی بہت مدد کی تھی۔ بڑے ہی خفیہ آپریشن آرڈر بھی ان تک پہنچائے تھے لیکن یہ شاید میرے ضمیر کی' میری روح کی یا میرے ایمان کی آوازیں تھیں کہ مجھے اس سے زیادہ جہاد کرنا چاہئے۔ کرنا یہی تھا کہ مجھے انڈونیشی مجاہدین کے پاس چلے جانا چاہئے اور ان کے دوش بدوش لڑنا چاہئے۔

مجھے حوالدار غلام نبی یاد آنے لگا اور پھر مجھے لانس نائیک نور عالم اور سپاہی شفیع یاد آئے۔ میں تو تھوڑا بہت تعلیم یافتہ تھا اور کچھ کتابیں بھی پڑھی تھیں لیکن نور عالم اور شفیع بالکل ہی اَن پڑھ تھے۔ انہوں نے اللہ کی نگاہ میں بہت اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ نور عالم تو شہید تھا۔ میں صاف طور پر محسوس کرنے لگا کہ نور عالم مرا نہیں' وہ میرے دل میں زندہ ہے۔

مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں بالکل تنہا آدمی ہوں' بیوی نہیں' بچے بھی نہیں' انسان کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ میں اس ذمہ داری سے آزاد تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک بار پھر بھگوڑا ہو کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی مجھے ایسا سکون اور اطمینان ہونے لگا جس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہا تھا۔

○

اُدھر جو مبنگ میں ہماری بی اور ڈی کمپنیاں تھیں۔ بی ہندوؤں کی اور ڈی مسلمانوں کی کمپنی تھی۔ ایک روز ہمارا کمانڈنگ آفیسر' ایجوٹنٹ اور صوبیدار میجر جو سکھ تھا' بڑی عجلت میں جو مبنگ روانہ ہو گئے۔ میں اتنا ہی محسوس کر سکا کہ وہاں کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ ایک فون آیا تھا جو کمانڈنگ آفیسر نے سنا اور سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایجوٹنٹ اور صوبیدار میجر کو بلا کر فوراً جیپ میں بیٹھا اور یہ لوگ روانہ ہو گئے۔

وہ شام کو واپس آئے۔ میں نے صوبیدار میجر سے پوچھا اور اُس نے بتایا کہ جو مبنگ میں دو گورا رجمنٹ کی کمپنیاں بھی ہیں۔ وہاں ایسا آپریشن شروع کر دیا گیا ہے کہ ہر گاؤں اور چھوٹی سے چھوٹی بستی کے گھروں کی بھی تلاشی ہوتی ہے اور گرفتاریاں بڑی عام ہو

رہی ہیں لیکن زیادہ تر نوجوان لڑکیوں اور جوان عورتوں کو پکڑا جاتا ہے۔ صوبیدار میجر نے بتایا کہ گورا رجمنٹ نے کھلے میدان میں تھوڑی سی جگہ چاروں طرف خاردار تار لگا دی ہے اور اس میں قیدیوں کو رکھتے ہیں۔ قیدیوں میں زیادہ تر مستورات ہیں۔

صوبیدار میجر نے بتایا کہ ڈی کمپنی کے کمپنی صوبیدار نے اپنے کمپنی کمانڈر سے جو ریٹائرڈ تھا' کہا کہ ان عورتوں کو رہا کرائیں یا انہیں گورا رجمنٹ کی قید میں نہ رکھا جائے۔ صوبیدار نے وجہ یہ بتائی کہ گورے ان عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور بدتمیزی کریں گے اور اگر ہمیں اس کی اطلاع مل گئی تو پھر ہم برداشت نہیں کریں گے اور ان گوروں پر حملہ کر دیں گے۔

کمپنی کمانڈر انگریز میجر تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو بادشاہ سمجھ کر صوبیدار کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ وہ فوجی معاملات میں اس طرح دخل اندازی نہ کرے۔ صوبیدار نے اسے کہا کہ اس مطالبے اور احتجاج میں وہ اکیلا نہیں بلکہ پوری کمپنی ہے اور کمپنی کے جوانوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ تک یہ مطالبہ پہنچا دوں ورنہ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

اس انگریز کمپنی کمانڈر نے پوری کمپنی کو فال اِن کیا اور کمپنی پر رعب اور غصہ جھاڑا کہ یہ عورتیں گورا رجمنٹ نے پکڑی ہیں اور ہم انہیں آزاد نہیں کروا سکتے۔

جوان بول پڑے۔ انہوں نے کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم کسی مسلمان عورت کی بےحرمتی برداشت نہیں کر سکیں گے۔ بہتر ہے ان عورتوں کو جیل میں بھیج دیا جائے اور رہا نہ رکھا جائے ورنہ ہم خود ان عورتوں کو رہا کروا لیں گے۔

جو حضرات فوج کے ڈسپلن اور دیگر امور سے واقف ہیں' وہ تو کبھی تسلیم نہیں کریں گے کہ جوانوں نے اپنے انگریز کمپنی کمانڈر سے یہ مطالبہ کیا ہو گا اور یہ دھمکی بھی دی ہو گی۔ یہ سوچنے والے حضرات اپنی جگہ حق بجانب ہیں لیکن وہاں کی صورتِ حال کچھ اور تھی۔ میں بار بار ایک بات کہہ رہا ہوں کہ اُس وقت تک انڈین آرمی کی مختلف رجمنٹوں سے کئی مسلمان انڈونیشی مجاہدین کے پاس چلے گئے تھے۔ کمپنی صوبیدار اور کمپنی کے حوالدار اور جوان انگریزوں کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ وہاں مسلمانوں میں کچھ ایسا بیدار ہو گیا تھا کہ وہ نتائج سے بےپرواہ ہو گئے تھے۔

کمپنی کمانڈر نے کمپنی کا یہ عزم اور یہ مطالبہ اور یہ دھمکی دیکھ کر موجو کر تو کمانڈنگ

آفیسر کو بذریعہ فون اطلاع دی۔ یہ تو بتانا ممکن نہیں کہ اُس نے کمانڈنگ آفیسر سے کیا کہا تھا اور کیا رائے دی تھی، میں نے یہ دیکھا کہ کمانڈنگ آفیسر اسی وقت اُٹھ دوڑا تھا۔

صوبیدار میجر نے یہ بھی بتایا کہ کمانڈنگ آفیسر نے کمپنی کو بڑے اچھے الفاظ میں یقین دلایا تھا کہ ان عورتوں کے ساتھ گورے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے اور وہ کوشش کرے گا کہ ان عورتوں کو یہاں سے جیل میں منتقل کر دیا جائے.... کمانڈنگ آفیسر، ایجوٹنٹ اور کمپنی کمانڈر گورا رجمنٹ کے افسروں کے پاس گئے اور نہ جانے وہاں کیا گفت و شنید ہوئی۔ ہمارے آفیسر واپس آئے تو انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ کل صبح عورتوں کو یہاں سے نکال دیا جائے گا۔

چار پانچ روز بعد وہاں سے اطلاع آئی تھی کہ اگلے ہی روز عورتوں کو فوجی حراست سے نکال کر لے گئے تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ انہیں کہاں لے گئے۔ بہرحال یہ ڈی کمپنی کے مسلمانوں کی بہت بڑی فتح تھی لیکن انگریز افسروں نے ڈی کمپنی کو یوں سزا دی کہ کمپنی پر پابندیاں عائد کر دیں کہ کوئی جوان کیمپ سے باہر نہیں جا سکتا اور کسی انڈونیشی سویلین کے ساتھ بات نہیں کر سکتا۔

ایک روز اچانک یوں ہُوا جیسے انڈونیشیا کے جنگلات اور بستیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ یہ ایسا وسیع پیمانے پر آپریشن شروع کیا گیا تھا جس طرح جھاڑو دیا جاتا ہے۔ امریکہ سے تازہ دم کریک فورس آ گئی تھی اور برٹش آرمی کی بھی بہت سی یونٹیں تھیں اور بھی یونٹیں انڈین آرمی کی تھیں۔ اس تمام فوج کو کئی میلوں میں پھیلا کر اس طرح ایڈوانس کیا گیا کہ اوپر سے لڑاکا بمبار طیارے آتے تھے جو کم بلندی پر جا کر بم پھینکتے تھے۔ اس کے ساتھ توپ خانے بے انداز گولہ باری کرتے تھے۔ انفنٹری کی امریکی، انگریز اور ہندوستانی یونٹیں پیش قدمی کرتی تھیں اور راستے میں کوئی چھوٹی موٹی بستی نظر آ جاتی تو اس کے بچّے سے بوڑھے تک کو باہر نکال کر ذلیل و خوار کیا جاتا اور گھروں کی تلاش لی جاتی تھی۔ جس گھر پر شک ہوتا کہ اس گھر کا خواہ ایک ہی جوان گوریلوں میں ہے تو اس گھر کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ ان بیلیسوں کو توقع تھی کہ یہ غریب اور مفلس لوگ ڈر جائیں گے اور اپنی گوریلا فورس کی مدد نہیں کریں گے لیکن انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ ادھر آپریشن ہوتا اور شام کو یونٹیں واپس اپنے اپنے کیمپ میں پہنچ جاتیں تو گوریلے کسی نہ کسی کیمپ پر گرینیڈ پھینکتے اور مشین گنوں اور ٹامی گنوں کا فائر چھڑکاؤ کی طرح کر کے

بھاگ جاتے تھے۔

اس دوران انڈونیشی مجاہدین نے دس بارہ گاڑیوں کی ایک کنوائے کو لُوٹا۔ اس میں زیادہ تر راشن تھا اور تھوڑا اسلحہ بارود بھی تھا۔

بعض چھوٹی چھوٹی بستیاں تو بالکل ہی خالی ملتی تھیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ ان کے رہنے والے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے گوریلا شبخونوں اور کارروائیوں سے انگریزوں اور امریکیوں کو احساس دلاتے رہتے تھے کہ ہم یہیں ہیں، کہیں بھاگ نہیں گئے۔ حیرت اس پر ہوتی تھی کہ انڈونیشی مجاہدین کی گوریلا کارروائیاں اس ظالمانہ آپریشن میں پہلے سے زیادہ ہو گئی تھیں اور اتحادی فوج کا نقصان بھی پہلے سے زیادہ ہوتا تھا۔

○

میں امریکیوں اور انگریزوں کے یہ آپریشن اور ان کے جواب میں انڈونیشی مجاہدین کی جوابی گوریلا کارروائیاں پوری تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کروں گا۔ اگر میں ان تفصیلات میں اُلجھ گیا تو پھر کوئی دوسری بات نہیں کر سکوں گا۔ عرصے بعد میں جب گھر واپس آیا تھا تو ایک امریکی نامہ نگار کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی اور پھر امریکہ کے ایک مشہور ماہنامہ "ریڈرز ڈائجسٹ" میں ایک مضمون انڈونیشی مجاہدین کی جنگ آزادی کے بارے میں پڑھا تھا۔ میں اس کتاب اور "ریڈرز ڈائجسٹ" کے حوالے ہی کافی سمجھوں گا۔

امریکی نامہ نگار نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ اتحادیوں یعنی امریکیوں اور انگریزوں کے بمبار ہوائی جہاز اور توپ خانے جنگلوں پر اس قدر بم اور گولے برساتے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ کوئی درخت اور کوئی ذی روح سلامت نہیں رہا ہو گا لیکن جب ہوائی جہاز، توپ خانے اور انفنٹریاں واپس چلی جاتی تھیں تو اُسی رات گوریلے کہیں نہ کہیں شب خون مار کر اتحادیوں کو احساس دلا دیتے تھے کہ وہ پہلے سے زیادہ زندہ و بیدار ہیں۔

"ریڈرز ڈائجسٹ" میں مضمون نگار نے امریکی ہوتے ہوئے بھی تعصّب کا ذرّہ بھر حق ہو نہیں کیا تھا اور انڈونیشی مجاہدین کو کشادہ ظرفی سے خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ اس نے لکھا کہ انڈونیشی گوریلے جب ایک آپریشن کے بعد کہیں حملہ کرتے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے انہیں زمین نے نگل لیا تھا اور اب اگل دیا ہے اور زمین پھر انہیں نگل کر اپنی

آغوش میں چھپالے گی۔

میں آپ کو اپنے ایک ساتھی کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ تھا ہمارا اے کمپنی کا کلرک عاشق علی۔ میں نے شاید پہلے بتایا ہے کہ جنگِ عظیم کے دوران فوج میں جو کلرک بھرتی کئے جاتے تھے انہیں ڈائریکٹ حوالدار بھرتی کیا جاتا تھا۔ جنگ سے پہلے سپاہی کلرک ہُوا کرتے تھے۔ عاشق علی جنگ کے دوران بھرتی ہُوا تھا اور ٹریننگ کے بعد ہماری بٹالین میں آگیا۔ اسے اے کمپنی کا کلرک بنایا گیا۔

اُس کی عمر کوئی بائیس تیئیس سال ہو گی۔ اُس کا رنگ گورا تھا اور وہ صحیح معنوں میں خوبصورت نوجوان تھا اُس میں زندہ دلی بھی تھی اور خاندانی شرافت بھی۔ وہ تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے مجھے کئی بار کہا تھا کہ جب کبھی موقع ملا وہ بھگوڑا ہو کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا اور کافروں کے خلاف لڑے گا۔ میں نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ میرا ان گوریلوں کے ایک دو کمانڈروں کے ساتھ خفیہ رابطہ رہا ہے اور اب بھی ہے۔ میں نے یہ سوچ کر اپنا یہ راز نہیں دیا کہ ابھی بچّہ ہے' کہیں ہندوؤں سکھوں میں بیٹھا یہ بات کہہ نہ ڈالے۔

میں جس ظالمانہ آپریشن کی بات کر رہا ہوں' اس میں ہماری چاروں کمپنیاں شامل ہوا کرتی تھیں۔ کمپنی کلرک بھی کمپنی کمانڈر کے ساتھ جایا کرتے تھے۔ ایسے ایک آپریشن کے دوران اے کمپنی دُور جنگل میں جا کر کسی اور سمت چلی گئی۔ اسے وہ علاقہ دیا گیا تھا۔

عاشق علی اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ تھا۔ کمپنی کمانڈر کے ساتھ اردلی بھی تھا اور آپریٹر بھی۔ اُس وقت ریڈیو ٹیلی فون فوج کو مل گئے تھے اور اس کے لئے ایک آپریٹر ہر آفیسر کے ساتھ ہوتا تھا۔ کمپنی کمانڈر ایک پلاٹون کی طرف چلا گیا اور یہ پلاٹون چٹانی علاقے میں گئی تو وہاں گوریلوں کی اچھی خاصی فائرنگ آنے لگی جو چاروں طرف سے آ رہی تھی۔

اسے گھات کہہ لیں یا گوریلے جنگل میں کہیں دیکھ رہے تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ ایک پلاٹون کمپنی سے الگ ہو کر چٹانی علاقے میں آگئی ہے تو انہوں نے چٹانوں کی اونچائیوں سے اس پلاٹون پر گولیاں برسانی شروع کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ سات جوان مارے گئے۔ گوریلوں کو پہلے اطلاع نہیں دی جا سکی تھی کہ یہ مسلمانوں کی پلاٹون

ہے اور یہ فلاں علاقے میں جائے گی۔ پہلے کسی کو پتہ ہی نہیں تھا ورنہ انڈونیشی گوریلے مسلمانوں پر گولی نہ چلاتے۔

فائر ایسا آیا کہ کوئی گولی ضائع نہیں ہوتی تھی۔ انڈونیشی گوریلے اُس وقت رائفل سے گولی نکالتے تھے جب انہیں یقین ہوتا تھا کہ یہ گولی ایک فوجی کو ضرور لگے گی۔

ایسے کارگر فائر سے پلاٹون بوکھلا گئی اور اِدھر اُدھر بکھر گئی۔ جوانوں نے پوزیشنیں لے لیں اور اندھا دھند فائر شروع کر دیا' گرینیڈ بھی پھینکے اور مشین گنیں تو بے رحمی سے فائر کیں۔ گوریلے اپنا وار کر کے جنگل اور چٹانوں میں لاپتہ ہو گئے۔

جب فائر ختم ہُوا تو کمپنی کمانڈر' کمپنی صوبیدار اور حوالدار وغیرہ پلاٹون کے جوانوں کو دیکھنے نکلے۔ انہوں نے پلاٹون کو پکارا اور کہا کہ ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں لیکن پلاٹون کی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سارے جوان بکھر گئے تھے اور ان کا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ نہیں رہا تھا۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ وہ آپریشن ختم کر دیا گیا۔ یہ آپریشن پورے ایک بریگیڈ کا تھا۔ واپسی کا حکم ملا۔ اے کمپنی کی اس پلاٹون کی لاشیں اٹھالی گئیں اور جو زخمی چل سکتے تھے وہ چل پڑے اور جو چلنے کے قابل نہیں تھے انہیں سٹریچروں پر ڈال لیا گیا۔

واپس آ کر جب کمپنی کی گنتی کی گئی تو پتہ چلا کہ حوالدار کلرک عاشق لاپتہ ہے۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ واپس جا کر اسے ڈھونڈا جاتا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور رات جلدی ہی گہری ہو گئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ کمپنی کمانڈر نے واپس آتے ہوئے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کا کمپنی کلرک جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا اب اس کے ساتھ نہیں۔

اگلے دن کوئی ایسا آپریشن یا کوئی اور جنگی پروگرام نہیں تھا۔ ساری فورس کو جو دراصل پوری بریگیڈ کی نفری تھی' اُس روز آرام دیا گیا تھا۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر نے پوری کی پوری اے کمپنی کو آگے جانے کا حکم دیا تاکہ عاشق علی کی لاش لائی جا سکے یا ہو سکتا ہے وہ شدید زخمی حالت میں کہیں پڑا ہُوا ہو۔ کمانڈنگ آفیسر کا یہ جو حکم تھا کہ لاش لائی جائے' اس میں جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ لاش لانے کا مطلب یہ تھا کہ عاشق علی کی موت کی تصدیق ہو جانی تھی۔

کمپنی گئی اور علاقے میں گھوم پھر کر' کھڈ نالے دیکھ کر مایوس واپس آگئی۔ کمپنی کو عاشق علی زندہ یا مُردہ نہ ملا۔

یہ میں جانتا تھا کہ عاشق علی انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا گیا ہے۔ اسے کمپنی کمانڈر کے ساتھ رہنا چاہئے تھا لیکن وہ دانستہ اس سے الگ ہو گیا ہو گا اور ٹیکریوں اور چٹانوں اور اونچی گھاس میں چھپتا چھپاتا گوریلوں کے پاس پہنچ گیا ہو گا۔ میں نے کمپنی کمانڈر کے اردلی سے پوچھا تھا۔ یہ اردلی بھی مسلمان تھا۔ اُس نے بتایا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا محمد عاشق علی کس وقت اور کس جگہ ان سے الگ ہو گیا تھا۔

عاشق علی کے گھر یہ سرکاری اطلاع بھیجی گئی تھی کہ آپ کا بیٹا حوالدار کلرک عاشق علی لڑائی میں لاپتہ ہو گیا ہے.... اسے انگریزی میں کہا جاتا تھا Missing in action۔

○

میرے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا کہ میں وثوق سے کہہ سکتا کہ عاشق علی انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا گیا ہے لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ وہ مرا نہیں نہ وہ زخمی ہُوا ہے بلکہ وہ اُدھر چلا گیا ہے۔ میں جب سوچتا تھا کہ ایک ماں کا اتنا خوبصورت اور نوجوان بیٹا اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کو چلا گیا ہے تو مجھے اپنے آپ میں شرم محسوس ہوتی تھی اور وہ بھولا بھالا انڈونیشی لڑکا میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا جو نائیک مجید کا پیغام لے گیا تھا۔ میں نے اب پکا ارادہ کر لیا کہ اب انگریزوں کی آرمی میں نہیں ٹھہروں گا۔

پانچ چھ دن گزر گئے تو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ایک سیکرٹ لیٹر آیا جس میں ہماری دونوں کمپنیوں کو ایک خاص ٹاسک دیا گیا تھا۔ اس میں ایک گاؤں کا نام لکھا ہُوا تھا۔ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع یہ ملی تھی کہ اس گاؤں میں اسلحہ بارود کا ذخیرہ کیا جا رہا ہے اور وہاں چھاپہ مار کر وہ پکڑنا ہے اور وہاں جتنے بھی آدمی اور عورتیں ملیں انہیں گرفتار کرنا ہے۔ کمپنیوں نے ایک روز بعد روانہ ہونا تھا۔

موجوکرتو میں بھی میں نے ایک انڈونیشی کے ساتھ رابطہ رکھا ہُوا تھا۔ اس کے ساتھ کسی وقت مسجد میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ جنگِ آزادی کا ایک اہم کل پُرزہ تھا۔ اس کا کام مخبری اور جاسوسی تھا اور اس کا رابطہ اس علاقے کے گوریلا ہیڈ کوارٹر کے ساتھ تھا۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے یہ خفیہ چٹھی آئی تو میں نے بڑی تیزی سے یہ نقل کی اور اسی دن کے پچھلے پہر اس شخص کے گھر چلا گیا۔ اُس کا نام حمزہ تھا۔ اُسے یہ نقل دی اور میں فوراً" وہاں سے نکل آیا۔

میں وہاں سے نکل ہی رہا تھا کہ تو ہماری بٹالین کا پولیس حوالدار سامنے آگیا۔ ہر بٹالین میں رجمنٹل پولیس ہُوا کرتی تھی۔ اس میں ایک حوالدار اور چند ایک جوان ہُوا کرتے تھے۔ وہ ہم میں سے ہی ہوتے تھے۔ ہمارا پولیس حوالدار سرگودھا کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام صداقت شاہ تھا۔ مجھے اس گھر سے نکلتا دیکھ کر رک گیا اور بڑے تپاک سے ملا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کس کا گھر ہے۔ میں نے اُسے یہ نہ بتایا کہ یہ شخص کس حیثیت کا مالک ہے' میں نے یوں کہا کہ اس سے ایک بار مسجد میں ملاقات ہوئی تھی اور وہاں سے ایسے تعلقات شروع ہوئے کہ یہ اصرار کیا کرتا ہے کہ میں کبھی کبھار اس کے گھر آیا کروں۔ مطلب یہ کہ میں نے یہ تاثر دیا کہ یہ ایک دوستانہ بات ہے کہ میں اس شخص سے ملنے آیا تھا۔

مجھے پوری امید تھی کہ حوالدار صداقت شاہ چونکہ مسلمان ہے اس لئے اس کی ہمدردیاں انڈونیشی مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ اس نے میرے ساتھ ایسی ہی باتیں شروع کر دیں جیسے وہ بھی کسی نہ کسی دن بٹالین سے بھاگ کر انڈونیشی مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا۔ مجھے آج تک اس کی جوشیلی اور جذباتی باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔

میں وہاں سے اپنے کمرے میں آیا۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد کسی نے مجھے بتایا کہ سی کمپنی کے دس بارہ جوانوں کو تیار کر کے قصبے میں لے گئے ہیں۔ لے جانے والا سی کمپنی کا کمانڈر تھا جو انگریز میجر تھا۔ میں نے سوچا کہ جاسوسوں نے کسی گھر کے بارے میں اطلاع دی ہو گی اور اس گھر پر چھاپہ مارنے کے لئے یہ جوان لے جائے گئے ہیں۔ میں نے کوئی زیادہ توجہ نہ دی۔

میں شام کا کھانا کھا کر فارغ ہُوا ہی تھا کہ میرے کمرے میں سی کمپنی کا کمانڈر داخل ہُوا اور بڑے رعب سے مجھے کہا کہ اُٹھو' ہمارے ساتھ چلو۔ میں فوراً" اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اپنے دفتر میں لے جا کر کمپنی کمانڈر نے وہ کاغذ جس پر میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا آپریشن آرڈر نقل کیا تھا' میرے آگے رکھ دیا اور پوچھا یہ تم اس گھر میں دے آئے تھے؟.... میں نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔ وہ اور زیادہ غصے میں آگیا اور مجھے حراست میں لینے کا حکم دے دیا۔

فوج میں کسی سپاہی کو جب حراست میں لیا جاتا ہے تو اسے کوارٹر گارڈ کی حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے لیکن حوالدار کو حراست میں لیا جائے تو اسے حوالات میں بند نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ایک حوالدار بطور گارڈ لگا دیا جاتا ہے۔ یہ حوالدار ہر روز تبدیل ہوتا ہے اور نیا حوالدار آ جاتا ہے۔ ہمارے وقتوں میں ایسی حراست کو "ہیڈ قید" کہا جاتا تھا۔

میرے ساتھ بھی ایک سکھ حوالدار گارڈ لگا دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اگلے روز کمانڈنگ آفیسر کے دفتر پیش کیا جائے گا۔ میں سمجھ گیا یہ کیا ہُوا ہے۔ پولیس حوالدار صداقت شاہ اپنا آدمی تھا لیکن یہ یقیناً" اُلمی نے مخبری کی تھی۔ رجمنٹل پولیس کی یہی ڈیوٹی ہوتی تھی کہ مخبری اور چغلی کی جاتی رہے۔ آخر ان لوگوں نے بھی ترقی لینی ہوتی تھی۔

اگلے روز جب مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پیش کیا گیا تو چارج شیٹ پڑھ کر مجھے سنائی گئی۔ وہ یہ تھی کہ میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا ایک آپریشن آرڈر نقل کر کے دشمن کے حوالے کیا۔ اس کا گواہ پولیس حوالدار صداقت شاہ تھا اور قصبے کے دو انڈونیشی عیسائیوں کو بھی میرے خلاف گواہ بنا لیا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں کچھ دن پہلے یہاں سے نکل نہ گیا۔ میں ارادے ہی باندھتا رہا اور پکڑا گیا۔ پکڑے جانے کا مجھے ذرا برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ میں اسے بھی جہاد کا ایک حصہ سمجھتا تھا لیکن بار بار دل پر چوٹ پڑتی تھی کہ مجھے تو میدان جنگ میں جانا تھا اور زیادہ سے زیادہ بیلیسیوں' ہندوؤں اور سکھوں کو رائفل کا نشانہ بنانا تھا۔

یہ چارج شیٹ کسی معمولی سے جرم کی نہیں تھی بلکہ بڑا ہی سنگین جرم تھا کہ کوئی اتنی خفیہ اطلاع قبل از وقت دشمن کو پہنچا دے.... مجھے کمانڈنگ آفیسر سزا دے سکتا تھا لیکن اس نے میری چارج شیٹ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو بھیج دی.... پانچ چھ دنوں بعد بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اطلاع آئی کہ میری چارج شیٹ ڈویژن ہیڈ کوارٹر بھیج دی گئی ہے اور ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس حوالدار کلرک کا فیلڈ کورٹ مارشل ہونا چاہئے کیونکہ جرم سنگین ہے اور یہ کورٹ مارشل کا جرم ہے۔

فیلڈ کورٹ مارشل بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میدانِ جنگ میں جرم سرزد ہُوا ہے اور وہیں کورٹ بنا کر سزا سنا دی جاتی ہے۔ کوئی رُو رعایت نہیں ہوتی۔ میرا جرم واقعی سنگین تھا اور مجھے تو یہ توقع تھی کہ سزائے موت دی جائے گی

اور اگر ان انگریزوں نے مجھ پر رحم کیا تو عمر قید دیں گے۔ میرے پاس تو صفائی کا گواہ تھا ہی نہیں۔ میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں کہ یہ کارستانی صداقت شاہ کی تھی۔ حوالدار' جمعدار اور صوبیدار وغیرہ جس طرح انگریز افسروں کی خوشامد کرتے تھے' وہ سویلین حضرات خواب میں نہیں لا سکتے۔ خوشامد اور چاپلوسی تو اب بھی ہوتی ہے لیکن آپ نے ہندوستانیوں کو خوشامد کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مثلاً" ہماری بٹالین میں تین صوبیدار ایسے تھے جو پہلے تو فوجی انداز سے اٹینشن ہو کر اور اکڑ کر سیلوٹ کرتے تھے اور اس کے بعد صاحب کے آگے رکوع میں چلے جاتے تھے جو غیر فوجی حرکت تھی۔ انگریز انہیں اس غیر فوجی حرکت سے روکتے نہیں تھے کیونکہ وہ ہندوستانیوں کو ذہنی طور پر غلام بنا رہے تھے اور بنا لیا تھا۔

حوالدار صداقت شاہ رجمنٹل پولیس کا حوالدار تھا۔ اُس کی کوئی اور ڈیوٹی نہیں تھی۔ بٹالین میں کون سے ڈاکے پڑتے تھے کہ یہ حوالدار تفتیش کرتا ہو گا' اُس کا کام غیبت چغلی اور مخبری کرنا تھا۔ وہ تو انگریز افسروں کے آگے بچھ بچھ جاتا تھا لیکن میری بدقسمتی کہ میں اُسے مسلمان سمجھتا تھا اور اُس سے یہی امید رکھتا تھا کہ وہ کم از کم میری چغلی نہیں کرے گا لیکن اس نے کر دی۔ یہ تو اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں نے اس انڈونیشی کے گھر میں جا کر اسے کیا دیا ہے۔ ہمارے ایجوٹنٹ نے اس انڈونیشی کے گھر جا چھاپہ مارا اور ایسی تلاشی لی کہ آپریشن آرڈر کی نقل جو میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی برآمد کر ہو گی۔ حوالدار صداقت شاہ نے یقیناً" ایجوٹنٹ کو بتایا تھا کہ میرا رابطہ ان انڈونیشی گوریلوں کے ساتھ ہے۔

یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ ایک مسلمان نے اپنے مسلمان بھائی کے خلاف کفار کو جا بھکایا اور اسے ثبوت مہیا کیا۔ یہ واقعہ اس لئے عجیب نہیں کہ ہماری قوم میں شجاعت اور جذبۂ ایثار بے مثال ہے جس کے حوالے دوسری قومیں بھی دیتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ قوم نے جو غدار پیدا کئے ہیں وہ کوئی اور قوم پیدا نہیں کر سکی۔ تاریخ اسلام پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ شجاعت اور غداری پہلو بہ پہلو چلی آ رہی ہیں۔ اس حوالدار نے اللہ کی خوشنودی کی بجائے ایک انگریز افسر کی خوشنودی حاصل کرنا زیادہ بہتر سمجھا کیونکہ اسے امید تھی کہ یہ افسر خوش ہو کر ترقی دے دے گا۔

میرے لئے اذیت یہ تھی کہ مجھ پر ایک سکھ حوالدار ڈیوٹی دیتا تھا۔ ہر روز نیا حوالدار

آتا تھا اور جو بھی آتا وہ بظاہر ہمدردی سے لیکن در پردہ طنزیہ انداز میں مجھ سے بات کرتا اور کہتا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کی مدد کرنے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ پھر یہ حوالدار مجھ سے بھید لیتے تھے کہ میں نے واقعی انہیں آپریشن آرڈر کی کاپی دی ہے یا نہیں۔ میں انہیں ٹالتا رہتا تھا۔ میں نے فرار کی ترکیبیں بھی سوچیں لیکن یہ بدبخت سکھ حوالدار ایک منٹ کے لئے بھی مجھ سے پرے نہیں ہٹتے تھے۔

میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو سزائے موت یا عمر قید کے لئے تیار کر لیا۔ میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ میں نے انگریزوں کے دشمن کی مدد کی تھی۔ انڈونیشی مسلمان ایسے دشمن تھے جو شکست کا نام بھی نہیں سنتے تھے اور روز بروز طاقتور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جاپان کی فوج بڑی ہی طاقتور فوج تھی اور اس کے پاس جدید اسلحہ تھا اور اسے اپنی نیوی کی اور اپنی ایئر فورس کی مدد بھی حاصل تھی پھر بھی امریکیوں اور انگریزوں نے اس سے ہتھیار ڈلوا لئے تھے لیکن انڈونیشی مسلمان دبنے میں آتے ہی نہیں تھے۔ ان کا تو یہ حال تھا جیسے چنگاریوں کو بارود کے ڈھیر میں دبانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ ایسے دشمن کو مدد دینا بہت ہی بڑا جرم تھا اور میرا سب سے بڑا جرم تو یہ تھا کہ میں مسلمان تھا اور میں نے مسلمانوں کی مدد کی تھی۔

○

پانچ چھ دنوں بعد ڈویژن ہیڈ کوارٹر سے حکم نامہ آ گیا کہ اس حوالدار کا فیلڈ کورٹ مارشل کیا جائے۔ فوری طور پر کورٹ مارشل کے ممبر چنے گئے جو سب کے سب انگریز افسر تھے۔ کورٹ مارشل میں یوں ہوتا ہے کہ ایک آفیسر سرکاری وکیل یعنی پراسیکیوٹر بن جاتا ہے اور ایک کو ملزم کا صفائی کا وکیل بنا دیتے ہیں۔ میرے فیلڈ کورٹ مارشل کے لئے چار ممبر اور ایک پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ دو افسر دوسری یونٹوں کے بلائے گئے۔

مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو سب سے پہلے میری فردِ جرم سنائی گئی جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ سب سے پہلا گواہ جو میرے خلاف کورٹ مارشل کے سامنے آیا وہ حوالدار صداقت شاہ تھا۔ بات اتنی سی ہوئی تھی کہ میں اس انڈونیشی مسلمان کے گھر سے نکل رہا تھا تو صداقت شاہ سامنے آ گیا تو اس نے رک کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا لیکن صداقت شاہ نے گواہی میں کہا کہ وہ کیمپ سے اس انڈونیشی کے گھر تک گیا تھا اور میرے پاس آپریشن آرڈر کی نقل تھی جو میں نے ہاتھ سے تیار کی تھی اور یہ بھی کہ میں

نے یہ نقل صداقت شاہ کو پڑھ کر سنائی تھی اور پھر میں جب اس انڈونیشی کے گھر تک پہنچا تو میں نے صداقت شاہ سے کہا کہ وہ ٹھہرے اور میں یہ کاغذ اندر دے کر آتا ہوں۔

میرے صفائی کے وکیل نے جو انگریز میجر تھا اور وہ جو ہنگ سے اپنی یونٹ سے آیا تھا' حوالدار صداقت شاہ پر جرح کی لیکن یہ جرح بالکل بے معنی اور کھوکھلی تھی۔ وہ آخر انگریز افسر تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ میں بری ہو جاؤں۔ وہ تو کورٹ مارشل کی ایک خانہ پری کی گئی تھی کہ ملزم کا وکیل بھی قانوناً" لازمی ہوتا ہے۔ اس کی جرح کے جواب میں صداقت شاہ مزید جھوٹ بولتا رہا۔

جب جرح ختم ہوئی تو میں نے سوچا کہ مجھے سزا تو ضرور ہی ملے گی پھر میں اپنے دل کا غبار کیوں نہ نکال لوں۔ میں نے صداقت شاہ سے مخاطب ہو کر کہا — "لعنت ہے تم پر صداقت شاہ! ابھی تم پر اللہ کی لعنت پڑے گی اور تم کُتّے کی موت مرو گے"۔

کورٹ مارشل کا پریذیڈنٹ ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ اُس نے مجھے غصے سے شٹ اَپ کہہ کر چپ کرا دیا۔ اس نے کہا کہ ملزم کو بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر ملزم یوں بولے گا تو اسے توہینِ عدالت کی سزا الگ ملے گی۔

اس کے بعد دو انڈونیشی جو اسی قصبے کے رہنے والے تھے' عدالت میں میرے خلاف پیش کئے گئے اور دونوں نے اس قسم کی گواہیاں دیں کہ میں اس انڈونیشی سے ملتا ملاتا رہتا ہوں اور وہ انڈونیشی گوریلا ہیڈ کوارٹر کا آدمی ہے اور وہ جاسوسی کر کے اطلاعات و معلومات اپنے دفتر میں پہنچاتا ہے اور میں اُسے جاسوسی میں مدد دیتا ہوں۔ ان عیسائی گواہوں کو عینی شاہد بنایا گیا تھا۔

ہمارے اکاؤنٹ آفس میں میرے ماتحت چار حوالدار کلرک تھے جن میں ایک سکھ تھا۔ اسے کورٹ مارشل میں لایا گیا اور اس نے گواہی دی کہ میں جب آپریشن آرڈر کی نقل کر رہا تھا تو اس نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ اس طرح دو اور جھوٹے گواہ پیش کئے گئے اور پانچ چھ دنوں کی سماعت کے بعد کورٹ مارشل ختم ہو گیا اور اس کے کاغذات اوپر بھیج دیئے گئے۔ میں ابھی حراست میں تھا۔

میرا صفائی کا وکیل ہر گواہ پر جرح کرتا تھا اور میں صاف طور پر نوٹ کر رہا تھا کہ اس کے بعض سوال ایسے ہوتے تھے جیسے وہ صفائی کا وکیل نہیں بلکہ استغاثہ کا وکیل ہے اور میرے خلاف جرم ثابت کر رہا ہے۔ میرے خلاف تو جرم ثابت ہو ہی گیا تھا اور مجھے

یہاں سے انصاف کی توقع نہیں تھی۔ اگر یہ سول کی کورٹ ہوتی تو مجھے دو تین ہیئرنگز کے بعد ہی بری کر دیا جاتا کیونکہ کوئی ثبوت اور کوئی شہادت نہیں تھی لیکن کورٹ مارشل کا مطلب ہوتا ہے کہ جو ملزم اس کے سامنے لایا گیا ہے اس نے جرم کیا ہے اور اسے سزا دینی ہی ہے۔

○

پندرہ سولہ دنوں بعد فیصلہ آگیا جو مجھے اس طرح سنایا گیا کہ موجو کرتو میں ہماری جتنی بھی نفری تھی اسے پریڈ گراؤنڈ میں فال اِن کیا گیا اور مجھے ان کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ کمانڈنگ آفیسر نے اردو میں میرا جرم سنایا اور پھر سزا سنائی.... آٹھ سال سزائے قید بامشقت نوکری سے ہمیشہ کے لئے برطرف.... یہ سب کچھ سنا کر کمانڈنگ آفیسر میرے سامنے آن کھڑا ہُوا اور اس نے میرے بازو سے حوالداری کا نشان پکڑ کر اتنی زور سے کھینچا کہ میری قمیض بھی پھٹ گئی اور پھر اس نے میرے کندھوں سے رجمنٹ کے نشان اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اس کے بعد مجھے ایک سکھ حوالدار اور چار سکھ جوانوں کے حوالے کر دیا گیا اور حکم دیا کہ اسے سورابایا جیل میں لے جاؤ۔

میں چونکہ حوالدار تھا اس لئے مجھے ہتھکڑی نہ لگائی گئی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہاں ہتھکڑی تھی ہی نہیں۔ سزا کے بعد میں حوالدار تو رہا ہی نہیں تھا اور اب میں سزا یافتہ مجرم تھا۔ ہتھکڑی نہ لگانے کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے لیکن میں اسے اللہ کا ایک خاص کرم کہا کرتا ہوں کہ میرے ہاتھ پاؤں کھلے رہے۔

سکھ حوالدار اور جوان مجھے وہاں سے لے کر اُس طرف چل پڑے جدھر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ اس ٹرک سے مجھے سورابایا جیل جانا تھا۔ انڈونیشیا کا یہ بڑا شہر وہاں سے بیس میل دُور تھا۔ مجھے جب کمانڈنگ آفیسر کے حکم سے ٹرک کی طرف لے چلے تو کمانڈنگ آفیسر نے بٹالین کی اس نفری کو جو وہاں کھڑی تھی لیکچر دینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے کہ اب کوئی بھی اس طرح دشمن کی مدد کرتے ہوئے پکڑا گیا تو اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس انگریز کرنل نے یہ بھی کہا کہ میں مسلمانوں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ انڈونیشی باغیوں کی اس لئے مدد نہ کریں کہ وہ مسلمان ہیں۔ فوج میں کوئی مذہب نہیں ہوتا' فوج میں حکم اور فوجی قانون چلتا ہے۔

اس انگریز کرنل کے الفاظ دھیمے ہوتے گئے کیونکہ میں اس سے دُور ہٹتا جا رہا تھا اور

مجھے ٹرک میں بٹھا لیا گیا۔ میرا گارڈ سکھ حوالدار بختاور سنگھ تھا۔ میری سزا کے کاغذات ہر مجھے ٹرک میں بٹھا لیا گیا۔ میرا گارڈ سکھ حوالدار بختاور سنگھ تھا۔ میری سزا کے کاغذات اُن کے پاس تھے۔ چار سکھ سپاہی میری گارد تھی۔ دو الگ ہٹ کر ایک طرف اور دو دوسری طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ سکھ حوالدار نے میرے ساتھ اظہار افسوس و ہمدردی کیا اور کہا تم تو خواہ مخواہ سزا لے بیٹھے ہو۔

"کوئی افسوس نہیں حوالدار!" — میں نے ہنستے ہوئے کہا — "تم دیکھ لینا' ایک سال کے اندر اندر انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا اور میں جیل سے باہر ہوں گا۔ اگر ایسا نہ ہُوا تو بھی کوئی افسوس نہیں۔ باہر حرام کی موت مرنے سے یہ بہتر نہیں کہ جیل میں جا بیٹھو اور مفت کی روٹیاں کھاؤ؟"

حوالدار بختاور سنگھ احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔ وہ ذرا سا بھی محسوس نہ کر سکا کہ میں نے اپنی ہنسی میں اور ان الفاظ میں کیسا دکھ اور کیسا عزم چھپا لیا ہے۔ ٹرک چلا جا رہا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ ٹرک سے کود کر فرار ہو سکتا ہوں یا نہیں۔ حوالدار بختاور سنگھ کے پاس سٹین گن تھی اور چاروں سکھ جوانوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان کی میگزینوں میں راؤنڈ بھرے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ٹرک سے کود گیا تو یہ مجھ پر گولی چلا دیں گے اور میں بے کار مارا جاؤں گا۔ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی جان انڈونیشی مجاہدین پر کس طرح قربان کروں۔ کبھی تو مایوسی سے دل ڈوب جاتا تھا کہ میں اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ اس ذہنی کیفیت میں مَیں اپنے آپ کو کوستا تھا کہ پہلے ہی میں کیوں بھاگ نہ گیا۔ مین ٹرک میں دل ہی دل میں اللہ تبارک تعالیٰ کو یاد کرتا گیا اور یہ کہتا گیا کہ یا اللہ' میں تو تیری راہ پر قربان ہونا چاہتا تھا' یہ تُو نے کیا کیا' مجھے تھوڑی سی تو مہلت دے دے کہ میں اسلام کے نام پر کچھ کر سکوں۔

میرے دل میں یہ دعا تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور میں سکھ حوالدار کے ساتھ اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کرتا جا رہا تھا جیسے مجھے اس سزا کا کوئی غم نہیں بلکہ میں خوش ہوں کہ فوجی ڈیوٹی سے جان چھوٹی۔

سورابایا ساحلی شہر ہے۔ یہ شہر قریب آتا چلا گیا اور مجھ پر یہ مایوسی غالب آگئی کہ میں فرار نہیں ہو سکوں گا۔ میں اندازہ کرتا جا رہا تھا کہ کتنا سفر طے ہو گیا ہے اور کتنا باقی ہے۔

آگے ایک دریا آگیا۔ میں اس سارے علاقے سے ناواقف تھا۔ ٹرک اس دریا کے پُل پر چڑھا تو میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں دریا کا پاٹ کچھ تنگ تھا اس لئے پانی کا

جوش و خروش زیادہ تھا۔ ٹرک کے اوپر ترپال نہیں تھا اس لئے دُور دُور تک باہر کے منظر نظر آ رہے تھے۔ میں نے اُس طرف دیکھا جس طرف دریا کا بہاؤ تھا۔ تھوڑا ہی آگے جا کر دریا بائیں کو مڑتا تھا۔ وہاں کنارے کچھ اُونچے اور چٹانی تھے اور درخت اتنے زیادہ کہ کچھ دُور تک نظر نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے غور کیا کہ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ اس دور میں کود جاؤں؟.... میں تیرنا تو ٹھیک ٹھاک جانتا تھا لیکن ایسے سیلابی دریا میں کبھی نہیں اترا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہُوا۔ حوالدار بختاور سنگھ نے بیٹھ جانے کو کہا تو میں نے اسے بتایا کہ ذرا ٹانگیں سیدھی کر رہا ہوں۔ اسے میں نے یہ تاثر دیا تھا کہ اس سزا کا مجھے کوئی غم نہیں۔ میں آہستہ آہستہ ٹرک کے ٹیل بورڈ تک گیا اور بختاور سنگھ کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ میں یہ بھی سوچتا رہا کہ دریا میں کود جاؤں یا یہ خطرہ مول نہ لوں۔ اچانک ایک غیبی سی آواز آئی کہ اٹھو اور کود جاؤ۔ ٹرک کی رفتار تیز تھی اور یہ پُل کے درمیان چلا جا رہا تھا۔ وہاں سے میں دریا میں نہیں کود سکتا تھا۔ ایک ہی طریقہ تھا کہ پہلے میں ٹرک سے کودوں اور پھر پُل کے جنگلے پر چڑھوں اور دریا میں کود جاؤں۔ جنگلا اتنا ہی اونچا تھا جتنا ٹرک کا ٹیل بورڈ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اس طرح دریا میں نہیں کود سکوں گا۔ میں اتنی تیز ٹرک سے کودتا تو گرتا اور پھر اٹھتا۔ اتنی دیر میں میرے سکھ گارڈ پہنچ جاتے اور مجھے پکڑ لیتے اور اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو پیچھے سے گولی چلا دیتے۔

مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی.... اللہ نے کرم کیا کہ ٹرک یک لخت آہستہ ہو گیا اور اس کی رفتار کم ہوتے ہوتے ایسی رہ گئی جیسے کوئی آدمی پیدل چل رہا ہو۔ سامنے سے ایک فوجی کنوائے آ رہا تھا اور ہمارے ٹرک کے آگے دو گھوڑا گاڑیاں جا رہی تھیں جن کی کوئی رفتار ہی نہیں تھی۔ اب ٹرک کی پوزیشن یہ تھی کہ سڑک کے درمیان سے جنگلے کے ساتھ ہو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ٹرک رک گیا۔ اُس وقت ٹرک پُل کے وسط تک پہنچ گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے ایک غیبی طاقت نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔ میں نے ایک پاؤں ٹیل بورڈ پر رکھا۔ اُس وقت پُل کا جنگلہ بالکل ساتھ تھا۔ میں نے دوسرا پاؤں جنگلے پر رکھا اور پیشتر اس کے کہ میرے گارڈ مجھے پکڑتے یا رائفلیں اٹھا کر مجھے نشانہ بناتے میں نے دونوں پاؤں جنگلے پر رکھ دیئے اور سیلابی دریا میں ڈائیو لگا دی۔

دل میں اللہ کا نام تھا۔ مجھے یہ روحانی تسکین بھی تھی کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا

تھا، ڈاکہ نہیں ڈالا تھا، کسی کو قتل نہیں کیا تھا اور مجھے یہ سزا چوری کی واردات کی نہیں ملی تھی، میں اللہ کی راہ میں پکڑا گیا تھا اور کفار نے مجھے سزا دی تھی۔ روح کہتی تھی کہ اللہ میری مدد کرے گا.... میں دریا میں گرا تو نیچے ہی نیچے جاتا رہا۔ پُل خاصا بلند تھا۔ اتنی بلندی سے ڈائیو لگانے سے یہی ہونا تھا کہ مجھے دریا کی تہہ تک چلے جانا تھا لیکن وہاں تو دریا کی تہہ تھی ہی نہیں۔ پاٹ تنگ تھا، دریا سیلابی تھا اور گہرائی کا کوئی حساب نہ تھا۔

○

مجھے اب یہ ڈر تھا کہ سکھ اوپر سے فائر کریں گے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس ٹھکانے رکھے اور سانس روک کر پوری کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ دیر پانی کے اندر رہوں۔ دریا کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ آخر میں پانی سے اوپر اٹھنے لگا لیکن میری کوشش ابھی پانی کے اندر ہی رہنے کی تھی۔ میں پانی کے بہاؤ کی رفتار محسوس کر رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ میں جب پانی سے ابھروں گا تو خاصی دُور پہنچ چکا ہوں گا۔ اس کے ساتھ یہ خیال بھی آیا کہ رائفل بہت دُور تک مار کر سکتی ہے، سکھ گارڈ مجھے نشانہ بنا لیں گے۔

سانس روکے رکھنے کی حد ختم ہو گئی اور میں پانی سے ابھرا۔ وہاں موجیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں اور انہوں نے مجھے بھی اسی طرح ہلارے دینے شروع کر دیئے۔ میں نے پیچھے نہ دیکھا، دیکھ سکتا بھی نہیں تھا کہ پُل کتنی دور رہ گیا ہے۔ موجیں مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔ کچھ اور آگے جا کر میں نے محسوس کر لیا کہ پانی کے ساتھ بائیں کو مُڑ رہا ہوں۔ میں نے کنارے کی طرف تیرنے کی کوشش شروع کر دی لیکن پانی کا زور اتنا شدید تھا کہ کنارے تک پہنچنا محال نظر آ رہا تھا۔

ایک تو پانی کا جوش اور زور زیادہ تھا اور دوسرا خطرہ یہ نظر آنے لگا کہ سکھ پُل سے پار جا کر ٹرک دریا کے کنارے کنارے لے آئیں گے اور مجھے پکڑ لیں گے یا دریا ہی میں گولی مار دیں گے۔ میں نے سوچا کہ ٹرک وہاں تک آ جائے گا یا نہیں۔ مجھے یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ کنارے پر گھنا جنگل اور ٹیکریاں تھیں۔ ٹرک کے لئے وہ علاقہ دشوار گذار تھا۔

آگے جا کر دریا کا پاٹ چوڑا ہو گیا اور دریا دائیں طرف کو مُڑ گیا۔ پاٹ کی چوڑائی نے سیلاب کا جوش اور زور کم کر دیا تھا جس سے میرے لئے تیرنا آسان ہو گیا۔ میں نے اپنے دماغ کو حاضر اور عقل کو ٹھکانے رکھا۔ دل پر ذرا سی بھی گھبراہٹ نہ آنے دی۔ میں نے

کسی بھی جگہ بلاوجہ ہاتھ پاؤں نہیں مارے تھے' میں نے سوچ لیا تھا کہ بازوؤں اور ٹانگوں کو تھکانا نہیں۔ پانی بہت ہی ٹھنڈا تھا جو میرے جسم کو اکڑا رہا تھا۔ میں اتنے ہی ہاتھ پاؤں مارتا تھا کہ پانی کی سطح پر رہوں۔

میرے اندازے کے مطابق ابھی دن کا ایک ہی بجا ہو گا۔ سورج سر پر آگیا تھا اور بادل گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مینہ برسے گا۔ میں خود چاہتا تھا کہ موسلا دھار بارش شروع ہو جائے تاکہ میں اس میں چھپا رہوں اور کچھ دُور سے بھی کوئی دیکھ نہ سکے۔

میں بار بار ایک بات دہرائے جا رہا ہوں۔ کہ میں بالکل پُرسکون تھا اور میرے دل پر خوف تو دور کی بات ہے' ذرا سی گھبراہٹ بھی نہیں تھی اور اسے میں اس امر کی نشانی سمجھتا تھا کہ میرے سر پر اللہ کا ہاتھ ہے اور میں ہر مشکل میں سے گزر جاؤں گا اور کوئی خطرہ میرے راستے میں حائل نہیں ہو سکے گا.... یہ تو میرا تجربہ ہے کہ انسان صحیح راستے پر جا رہا ہو اور اُس کی زبان پر صداقت ہو اور دل پاک ہو تو انسان بڑے سے بڑے خطرے میں سے بھی زندہ و سلامت گزر جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مشکلیں آسان ہوتی جا رہی ہیں۔ اسے اللہ کی مدد کہتے ہیں۔

میں اب کنارے پر پہنچنے کے لئے جسم کی ساری طاقت صرف کر کے تیر رہا تھا۔ دریا کا اتنا تیز بہاؤ اور سیلاب مجھے اپنے ساتھ ہی ساتھ لے جا رہا تھا۔ آخر کار اللہ کی مدد سے میں سیلاب کی تندی و تیزی سے نکل آیا اور دریا کے اُس حصے میں پہنچ گیا جہاں پانی پُرسکون تھا اور میں کنارے کی طرف ذرا کم زور صرف کر کے تیر رہا تھا۔ مجھے زیادہ تیرنا نہ پڑا کیونکہ جسم کو ڈھیلا چھوڑا تو میرے پاؤں دریا کی تہہ سے لگ گئے۔ پانی کی گہرائی میری کمر تک تھی۔ میں پانی میں چلتا ہُوا دریا سے نکل گیا۔

وہ بالکل ہی ویران علاقہ تھا جو گھنا جنگل تھا لیکن درخت دوسرے جنگلات سے مختلف تھے۔ زیادہ تر تاڑ اور ناریل کے درخت تھے جو سمندر کے قریب ساحلی علاقوں میں ہوتے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ میں سمندر کے قریب ہوں۔ وہاں ٹیکریاں بھی تھیں اور جنگل بہت گھنا تھا۔ کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔

گھڑی میرے پاس نہیں تھی۔ گھڑی کمرے میں اتار کر رکھی تھی اور جب مجھے حراست میں لینے کے لئے آئے تو اتنی جلدی مجھے لے گئے کہ تو میں گھڑی بھی اور کچھ اور

چیزیں بھی کمرے میں ہی چھوڑ آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ دن کے ابھی تین بجے ہیں۔ مجھے بہت جلدی کسی آبادی میں پہنچنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آبادی کوئی بھی ہوئی' اس میں مسلمان ہی ہوں گے یا زیادہ تر گھر مسلمانوں کے ہوں گے۔

میں سورابایا جانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک بڑا شہر ہے اور اس شہر کی چھاؤنی بھی خاصی بڑی ہے اور یہاں امریکی اور برطانوی فوج کے ہیڈ کوارٹر بھی ہیں اور انڈین آرمی کا ہیڈ کوارٹر بھی غالباً" وہاں تھا۔ اس کے باوجود میں سورابایا اس امید پر جا رہا تھا کہ کسی مسلمان گھر میں جا پہنچوں گا اور جب انہیں بتاؤں گا کہ میں انڈین آرمی سے بھاگ کر مجاہدین کے پاس آیا ہوں تو وہ مجھے گلے لگا لیں گے۔ ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ انڈونیشیا کا کوئی مسلمان مجھے دھوکہ دے گا اور پکڑوا دے گا۔

میرے راستے میں ایک اونچی چٹان آگئی۔ میں اس خیال سے اس چٹان پر چڑھ گیا کہ اوپر جا کر ہر طرف دیکھوں گا' شاید کوئی آبادی نظر آجائے.... اوپر گیا تو بہت دُور ایسے آثار نظر آئے جیسے وہ بکھرے ہوئے جھونپڑے ہیں۔ میں نیچے اترا اور اس طرف چل پڑا۔ زمین سے وہ جھونپڑے نظر نہیں آتے تھے۔

ذرا ہی دور مجھے دو جنگلی قسم کے آدمی جاتے نظر آئے۔ وہ دریا کی طرف جا رہے تھے۔ سوائے چھوٹے سے ایک کپڑے کے جس سے انہوں نے اپنے اپنے ستر ڈھانپے ہوئے تھے' ان کے جسموں پر کوئی اور کپڑا نہیں تھا۔ ان کے رنگ سیاہ تھے۔ میں نے انہیں پکارا تو انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میں ان کی طرف چل پڑا اور وہ آپس میں کوئی بات کر کے آہستہ آہستہ میری طرف آنے لگے.... وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں مسکرایا تو ان کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ میرے سر کی اور میرے کپڑوں کی حالت دیکھ کر وہ جان گئے تھے کہ میں دریا میں سے نکل کر آ رہا ہوں۔

میں نے دریا کی طرف اشارہ کیا اور پھر بازو گھما گھما کر انہیں سمجھایا کہ میں تیر کر نکلا ہوں اور پھر کہا — "سورابایا.... سورابایا" — اور پھر ہاتھ اور سر سے اشارہ کیا کہ یہ شہر کس طرف ہے۔ ان میں سے ایک میرے پیچھے آن کھڑا ہُوا اور اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ کر مجھے ذرا بائیں طرف گھمایا اور پھر میرے پہلو میں آ کر اس طرف اشارہ کیا اور کہا — "سورابایا.... ہو ہو.... سورابایا" — اس کا مطلب یہ تھا کہ سیدھے چلتے جاؤ اور آگے سورابایا آجائے گا۔ میں نے مسکرا کر اور ذرا جھک کر ان کا شکریہ ادا کیا

اور وہ بھی مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

○

میں اُس سمت کو چل پڑا۔ وہ علاقہ دشوار گذار تو نہیں تھا لیکن تیز اور سیدھا چلنا آسان بھی نہیں تھا کیونکہ اس علاقے میں ڈھیریوں جیسی ٹیکریاں بھی تھیں اور کھڈ بھی تھے۔ زمین کٹی پھٹی تھی اور بچ بچ کر چلنا پڑتا تھا۔ بہرحال میں نے سمت کا خیال رکھا اور راستہ بناتا ہوا چلتا چلا گیا۔

اب تھکن میرے جسم کو توڑنے لگی تھی۔ میں یخ دریا میں تیرا بھی تھا اور پیدل بھی چلتا رہا تھا اور پیٹ بھی خالی تھا اس لئے تھکن خاصی زیادہ ہو گئی تھی لیکن میں نے بھوک اور تھکن کو اپنے ذہن اور اعصاب پر سوار نہ ہونے دیا' قوتِ ارادی کو بھی مضبوط رکھا۔ پیاس تو محسوس ہی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ جسم پانی میں سے نکل کر آیا تھا اور فضا میں نمی زیادہ تھی۔

ایک چھوٹے سے کھڈ سے بچنے کے لئے میں اس کے کنارے کنارے گزرنے لگا تو اس کے بالکل ساتھ ایک بڑا درخت تھا۔ مجھے اس درخت کے تنے کا سہارا لینا پڑا۔ میں نے ہاتھ تنے سے لگایا اور اُدھر دیکھا نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ درخت کا تنا کھُردرا نہیں جیسے ہر درخت کا ہوتا ہے بلکہ یوں لگا جیسے میں نے کسی انسان کے جسم پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ انسان کا جسم بھی تو اتنا نرم نہیں ہوتا۔ میں نے ادھر دیکھا تو کوئی چیز متحرک نظر آئی جس کا رنگ درخت جیسا ہی تھا۔ میں تو جمپ لگا کر تین چار قدم آگے جا پڑا اور پھر پیچھے دیکھا۔ میرا دل بڑی زور سے دھک دھک کرنے لگا.... وہ ایک اژدہا تھا جو تنے کے ساتھ لپٹا ہُوا اوپر جا رہا تھا۔ اُس کی موٹائی بلا مبالغہ آٹھ نو انچ تھی۔ دس انچ بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا منہ ایک ٹہن تک پہنچ گیا تھا اور دم ابھی زمین سے ذرا سی اٹھی تھی۔ اس سے اندازہ کریں کہ اس کی لمبائی کتنی تھی۔ میرا ہاتھ لگنے سے وہ رک گیا تھا اور اس نے مُنہ نیچے لٹکا لیا تھا۔ میں نے وہاں سے بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ انڈونیشیا کے جنگلوں میں درختوں پر رہنے والے اژدہا اکثر پائے جاتے ہیں لیکن یہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے کہ انسان کو ہی نگل جائیں' جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کو اور درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں اور ان کے بچوں اور ان کے انڈوں کو اپنی روزمرّہ کی خوراک بنائے رکھتے ہیں۔

میں وہاں سے تیز چل پڑا جیسے میرے جسم میں نئی طاقت آگئی ہو۔ مجھے وہ مکان نظر آنے لگے جو میں نے چٹان پر چڑھ کر دیکھے تھے۔ وہاں سے وہ یوں نظر آئے تھے جیسے کسی قسم کے جھونپڑے ہوں لیکن یہ جھونپڑے نہیں بلکہ اچھی قسم کے مکان تھے۔ ان میں کچھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور کچھ الگ الگ تھے۔ گھنا جنگل پیچھے رہ گیا تھا اور دریا تو چھ سات میل دور چلا گیا تھا۔ میں نے بڑا لمبا اور مشکل سفر طے کیا تھا۔ اب آگے درخت تو تھے لیکن دُور دُور تھے اور مجھے پکا راستہ بھی نظر آگیا جو اس بستی کی طرف جاتا تھا۔

اس چھوٹی سی بستی کے پس منظر میں مجھے ایک شہر نظر آنے لگا تھا لیکن ابھی مکانوں کی منڈیریں ہی نظر آتی تھیں۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ یہ گھر مسلمانوں کے ہی ہو سکتے تھے۔ سوچا کہ میں کسی گھر کے دروازے پر جا دستک دوں گا اور جب اپنا تعارف کراؤں گا تو وہ لوگ میرا پُرتپاک استقبال کریں گے۔

ایک مکان دوسروں سے الگ اور میرے قریب تھا۔ میں اسی طرف چل پڑا۔ سورج مغرب کی طرف نیچے چلا گیا تھا۔ میں ابھی اس مکان سے کچھ دور ہی تھا کہ مکان کے پچھواڑے سے ایک جوان لڑکی سامنے آئی اور اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے ہلایا اور وہ تیزی سے میری طرف آگئی۔ میں رک گیا۔ وہ اور تیز چلتی میرے سامنے آرکی اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اُس نے پاجامہ سا پہن رکھا تھا۔ اوپر فراق نما لمبی قمیض تھی اور اس نے سر پر سکارف باندھا ہُوا تھا۔ لڑکی جوان تھی اور گورے رنگ کی تھی اور بڑی خوبصورت تھی۔

"مسلم!" — میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "انڈین آرمی.... مسلم.... مسلم سمہ سمہ!"

"مردیکا!" — لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "مسلم.... مسلم سمہ سمہ!" — اُس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا اور کچھ کہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ آؤ میرے گھر چلو۔

میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔

"انڈین آرمی؟" — لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے بڑی خوشی سے اوپر نیچے سر ہلایا کہ ہاں میں انڈین آرمی سے آیا ہوں۔

اب اُس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر پھر کہا ــــ "مسلم.... مردیکا!" ــــ اس نے کچھ اور بھی کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔

مکان چبوترے پر بنا ہُوا تھا۔ چبوترے کی چار پانچ سیڑھیاں تھیں اور باہر برآمدہ بھی تھا۔ میں لڑکی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ گیا اور لڑکی نے دروازہ کھولا۔ میں اس کے ساتھ اندر گیا تو یہ گھر بڑا ہی صاف ستھرا نظر آیا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جس کی عمر پچاس سال سے زیادہ لگتی تھی۔ اس کا لباس خالصتاً انڈونیشی مسلمانوں جیسا تو نہ تھا لیکن غیر مسلموں جیسا بھی نہیں تھا۔ اس آدمی نے اندر آکر مجھے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ پھر اُس نے بڑے پیار سے مجھے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بار بار لفظ مسلم' مردیکا اور مسلم سمہ سمہ کہتا تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ وہ انڈونیشی زبان بول رہا تھا۔

میں نے اشاروں میں اسے بتایا کہ میں دریا تیر کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ اس آدمی کے ساتھ بات کرتے ہوئے مجھے کچھ سہولت مل گئی کہ وہ کوئی کوئی لفظ انگریزی کا استعمال کرتا تھا۔

پھر ایک عورت کمرے میں آئی جس کی عمر پچاس سال سے کچھ کم ہی لگتی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس آدمی کی بیوی اور اس لڑکی کی ماں تھی۔ اُس نے بھی مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر میرا ماتھا پھر میرے گال چومے اور بٹھا دیا۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ میں بہت بھوکا ہوں۔ یہ عورت تو جیسے تڑپ اٹھی ہو۔ اُس نے اشارے سے کہا کہ ٹھہرو ابھی بندوبست کرتی ہوں۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ یہ عورت ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی اور ایک تپائی گھسیٹ کر میرے آگے کر دی اور ٹرے اس پر رکھی۔ یہ چائے تھی اور اس کے ساتھ آملیٹ تھے اور مچھلی تو بے شمار تھی۔ ڈبل روٹی کے سلائس بھی تھے۔ میں تو محفل کے اور کھانے کے آداب بھول ہی گیا اور ان چیزوں پر ہلّہ بول دیا۔ جب میرا پیٹ بھر گیا تو میں شرمندگی سی محسوس کرنے لگا کہ یہ لوگ کہیں گے کہ یہ جنگلی کہاں سے آگیا۔

اس کے بعد لڑکی نے مجھے ایک پاجامہ اور قمیض اور ایک تولیہ دیا اور بازو سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور غسل خانے میں چھوڑ آئی۔ میں بڑے اطمینان سے نہایا' صابن سے اپنا جسم

پاک صاف کیا اور تولیے سے جسم پونچھ کر کپڑے پہنے اور واپس اسی کمرے میں آگیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور کمرے میں ایک لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے تنہائی سی محسوس کی اور کچھ دیر انتظار کیا کہ میرے میزبانوں میں سے کوئی نہ کوئی تو کمرے میں آئے گا لیکن یوں معلوم ہونے لگا جیسے اس گھر میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ میں نے سوچا خود ہی باہر نکل کر دیکھتا ہوں۔ پیٹ بھر چکا تھا اور میں نے غسل کر لیا تھا' اس سے میری طبیعت بحال ہو گئی تھی اور میں عجیب سی تازگی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بند دروازے کو ذرا سا دھکیلا تو دروازہ نہ کھلا۔ ذرا زور سے دھکیلا تو بھی نہ کھلا اور مجھے پتہ چل گیا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ کمرے کی ایک ہی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کے ساتھ دوسرا کمرہ تھا اور ان دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا۔ میں نے وہ دروازہ کھولا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا۔ مجھے ویسے ہی کوئی وہم سا ہونے لگا۔ میں یہ تو محسوس کر ہی رہا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کے گھر اس طرح نہیں ہوتے۔ میں نے لالٹین اٹھائی اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک دیوار کے ساتھ کارنس تھی۔

کارنس پر کچھ چیزیں ڈیکوریشن کے انداز سے بڑے قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک جوان آدمی کا فوٹو بھی فریم میں لگا ہُوا رکھا تھا اور درمیان میں بہت بڑی فریم میں لگی ہوئی حضرت عیسیٰؑ کی پینٹنگ تھی جس میں حضرت عیسیٰؑ کو صلیب کے ساتھ لٹکا ہُوا دکھایا گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی ہوں۔ یہ لوگ مسلمان نہیں تھے اور ظاہر ہے یہ ولندیزی تھے۔ تب مجھے لڑکی کا چہرہ یاد آیا جو بہت ہی خوبصورت تھا اور یہ خوبصورتی ولندیزی عورتوں کی ہی ہو سکتی تھی۔

ایک دیوار کے ساتھ ایک بڑے سائز کی الماری رکھی ہوئی تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ اس میں کپڑے اور ایسی ہی کچھ چیزیں رکھی تھیں اور ایک خانے میں تین چار کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک کتاب اٹھا کر دیکھی تو یہ بائبل (انجیل) تھی۔ اب تو کوئی شک نہ رہا کہ یہ لوگ مسلمان نہیں۔ الماری میں ایک خانہ نیچے سے اوپر تک لمبوترا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے تحاشا خوشی ہوئی کہ اس میں ایک دونالی بندوق رکھی تھی اور الماری کے ساتھ کارتوسوں کی بیلٹ لٹک رہی تھی۔ میں نے بندوق اور بیلٹ وہاں

سے نکال لی اور الماری بند کر دی۔

میں نے دماغ کو حاضر رکھا اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے مدد مانگی۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ اچھے خاصے احمق ہیں۔ یہ تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اس لڑکی نے مجھے دھوکہ دیا تھا اور اب کمرہ اس لئے باہر سے بند کر دیا ہے کہ مجھے بند کر کے وہ آدمی پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا ہے لیکن جاہل آدمی نے یہ نہ سوچا کہ ساتھ والا کمرہ کھلا تھا اور اس میں بندوق اور کارتوس رکھے ہوئے ہیں۔

میں واپس اُسی کمرے میں آیا اور لالٹین رکھ دی۔ اب مجھے تیزی سے سوچنا اور اس سے زیادہ تیزی سے حرکت کرنی تھی۔ ایک خیال یہ آیا کہ بندوق کے بٹ سے دروازہ توڑ دوں اور بھاگ جاؤں اور دوسرا خیال یہ آیا کہ دروازے پر دستک دوں اور گھر کا کوئی فرد آ جائے تو میں اس سے بندوق کی نالی پر پوچھوں کہ اپنی اصلیت بتاؤ کیا ہے.... مجھے یہ صورت زیادہ اچھی لگی۔

○

میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور وہی لڑکی اندر آئی۔ وہ ہنستی ہوئی آئی تھی اور اس نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔ میرے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں نے لڑکی کو ہلکا سا دھکا دے کر اپنے جسم سے الگ کیا اور بندوق کی بیرلیں یعنی نالیاں جھکا کر اس میں دو کارتوس ڈالے اور نالیاں لاک کر دیں۔ نالیاں لڑکی کے سینے کے ساتھ لگا دیں۔

لڑکی ذرا سی بھی نہ ڈری۔ اُس نے بڑے اطمینان سے اپنے ہاتھ سے بندوق ایک طرف کر دی اور پھر میرے ساتھ بغل گیر ہو گئی اور میرا منہ چومنے لگی۔

میں نے اُسے پھر دھکا دیا اور کہا — "ڈچ!.... یو ڈچ!"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بار بار کہتی تھی — "مسلم.... می مسلم.... نو ڈچ.... مردیکا' مردیکا"۔

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ تمہارا باپ اور تمہاری ماں کہاں ہیں لیکن زبان کی مجبوری تھی۔ بہت اشارے کئے لیکن اس لڑکی نے یہ حرکت کی کہ پاجامہ اتار دیا اور مجھے گناہ کی دعوت دینے لگی۔ سر پر سکارف نہیں تھا اور میں اس کے بال دیکھ رہا تھا جو بڑی کشش والے تھے۔ صحیح الفاظ میں تو یہ کہوں گا کہ بال اشتعال انگیز تھے۔ یہ میں پہلے

آپ کو بتا چکا ہوں کہ ولندیزی عورتوں کا کردار اچھا نہیں تھا اور وہ راشن' شراب اور سگریٹ کے عوض اپنی عزت اور اپنا جسم پیش کر دیتی تھیں اور یہ ان کا کلچر بن گیا تھا۔

میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ میرے لئے یہ کتنا سخت امتحان تھا۔ میں کوئی فرشتہ تو نہ تھا' آخر ایک دیہاتی اور فوجی تھا اور گھر سے نکلے ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ میں یہ بھی بیان نہیں کر سکتا کہ یہ لڑکی کس قدر خوبصورت تھی اور اس کے جسم میں کیسا جادو تھا لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اللہ کو دل میں رکھ کر دل ہی دل میں کہا' یا اللہ' اس امتحان سے مجھے نکال دے اور یہ ایک معجزہ ہو گا۔

لڑکی نیم برہنہ ہو چکی تھی اور اُس نے ایسے انداز سے گناہ کی دعوت دی تھی جسے شاید ہی کوئی جوان آدمی ٹھکرا سکتا لیکن اللہ نے میری مدد یہ کی کہ اب وہ میری طرف آئی تو میں نے فوج میں جس طرح بیونٹ فائٹنگ (سنگین بازی) کی ٹریننگ لی تھی اس طرح بندوق کا بٹ اپنی کہنی کے نیچے کر کے پوری طاقت سے اُس کے منہ پر مارا۔ یہ ضرب تو کوئی ہٹا کٹا آدمی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ لڑکی پیچھے گرتے گرتے دیوار کے ساتھ جا لگی اور فرش پر گری پھر اس کے جسم نے کوئی حرکت نہ کی۔ میں کمرے سے نکل گیا۔

اب وہاں رکنا اور مزید تحقیقات کے لئے مکان کو دیکھنا خودکشی کے برابر تھا۔ باہر اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں مکان سے نکل آیا اور ایک طرف چل پڑا۔ یہ تو مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ سورابایا کا شہر کس طرف ہے۔ میں دراصل شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ یہ شہر کا مضافاتی علاقہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے منہ آسمان کی طرف کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جس نے شیطان کا اتنا سخت حملہ ناکام بنانے کی ہمت عطا فرمائی تھی۔ مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت زیادہ طاقت دے رکھی ہے' یہ ہماری بدبختی ہے کہ ہم اس طاقت کو استعمال نہیں کرتے اور ذرا موقع ملتا ہے تو شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

میں ابھی وہاں سے چلا ہی تھا کہ باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ایک ٹارچ جلی اور بجھ گئی اور پھر یہ آوازیں قریب آنے لگیں۔ ٹارچ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد جلتی بجھتی تھی اور پھر میں قدموں کی آہٹ بھی سننے لگا جو بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

میں مکان کی اوٹ میں ہو گیا۔ مکان کے پچھواڑے کی کھڑکی میں سے روشنی باہر جا

رہی تھی۔ اس روشنی میں جب وہ لوگ آئے تو لڑکی کے باپ کو تو میں نے پہچان لیا کیونکہ اسے میں پہلے دیکھ چکا تھا لیکن یہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ اس کے ساتھ دو آدمی کون تھے۔ کسی حد تک مجھے یقین ہُوا کہ یہ ملٹری پولیس کے انگریز سارجنٹ تھے یا ایک آفیسر تھا اور دوسرا سارجنٹ تھا' البتہ یہ یقین تو تھا ہی کہ یہ فوجی تھے اور مجھے گرفتار کرنے آئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ انہیں لڑکی کا باپ لایا تھا۔ مجھے اس سے اندازہ ہُوا کہ چھاؤنی دور نہیں۔ لڑکی کا باپ ان فوجیوں کو ایک گھنٹے کے اندر اندر لے آیا تھا۔

میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ یکے بعد دیگرے دونوں کارتوس فائر کر کے ان تینوں کو مار سکتا تھا۔ کارتوسوں کے چھرّے پھیل کر تینوں کو بڑی آسانی سے گرا لیتے لیکن وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں فائر کرتا۔ ان تینوں کو تو میں ختم کر دیتا لیکن ایسی صورتِ حال پیدا ہو سکتی تھی جو میرے لئے بہت بڑا خطرہ بن جاتی۔ وہ تینوں مکان کے دوسرے پہلو سے آئے اور میں دبے پاؤں اپنی اوٹ سے ہٹا اور ایک طرف چل پڑا۔ میں تیز نہ دوڑا کیونکہ میرے قدموں کی آہٹ میری نشاندہی کر سکتی تھی۔

اس مکان سے کچھ دور آ کر میں تیز چلنے لگا اور پھر دوڑ پڑا۔ ایک جگہ رک کر پیچھے دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی مکان سے باہر گھوم پھر رہی تھی۔ وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں پھر دوڑ پڑا اور اگلی آبادی قریب آنے لگی۔ بندوق اور کارتوسوں کی بیلٹ میرے پاس تھی۔

ذرا غور فرمائیں کہ ان ولندیزیوں کی لڑکیاں انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا رول ادا کر رہی تھیں' اور پھر لڑکی کے باپ کی کارروائی پر غور کریں۔

میں دوڑتے دوڑتے تھک گیا تو چلنے لگا اور زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ اچھی قسم کے جھونپڑوں کی بستی شروع ہو گئی۔ میری پریشانی اب یہ تھی کہ میں اندھا دھند کسی دروازے پر دستک دینے سے گھبرا رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ گھر مسلمان کا ہی ہوتا۔ میں ایک گلی میں جا رہا تھا تو ایک مکان کے اندر سے ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ دروازے کے سامنے سے گزرا تو دروازہ کھلا ہُوا دیکھا۔ آگے صحن تھا اور اس کے آگے برآمدہ تھا اور اس کے آگے کمرہ تھا اور کمرے اور برآمدے میں دیئے جل رہے تھے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ مسجد ہے۔ تب میں نے اوپر دیکھا تو دو لمبوترے مینار نظر آئے

لیکن گنبد نہیں تھا۔

اس گھر میں داخل ہونے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ میں نے پٹاوری چپل پہن رکھے تھے۔ یہ اتارے اور اندر چلا گیا۔ مسجد کے اندرونی کمرے میں داخل ہوا تو ایک آدمی دیا سامنے رکھے تلاوتِ قرآن کر رہا تھا۔ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر جا چکے تھے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا اُس شخص کے قریب گیا تو اُس نے قرآن مجید سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے السلام علیکم کہا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ انڈونیشی تھا۔

اس نے یہ تو دیکھ ہی لیا تھا کہ میں انڈونیشی نہیں ہوں اور میں یقیناً" ہندوستانی ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اردو سمجھ سکتا ہے؟

"تھوڑا تھوڑا!" ـــــ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے کچھ اشاروں میں اور کچھ الفاظ میں اسے بتایا کہ میں انگریزوں کی فوج سے بھاگ آیا ہوں اور مجاہدین کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ اُس نے قرآن بند کر دیا اور ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر اور سر ہلا کر اور مسکرا کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ میں اسے اشاروں میں سمجھانا چاہتا تھا کہ مجھے گوریلوں کے کسی کمانڈر تک پہنچا دے۔ معلوم نہیں وہ میری بات سمجھا تھا یا نہیں' وہ اتنی سی بات تو سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے پاس آیا ہوں اور اب یہ اس کا فرض ہے کہ مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میرا خیال ہے اُسے کوئی حیرت نہیں تھی کہ ہندوستانی فوج کا ایک حوالدار ان کے پاس آ گیا ہے کیونکہ اُس وقت تک انڈین آرمی کے بہت سے مسلمان ان کے پاس پہنچ چکے تھے اور وہ ولیبیوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔

اُس نے قرآن مجید الماری میں رکھا اور پھر اُس نے مجھے اٹھنے کو کہا اور دیا بجھا دیا۔ وہاں سے نکلے تو اس نے برآمدے کا دیا بھی بجھا دیا اور ہم مسجد سے نکل آئے۔ وہ مجھے مسجد کے قریب ہی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے گھماتا پھراتا ایک بڑے مکان کے سامنے جا رکا اور دروازے پر دستک دی۔

دروازہ ایک عورت نے کھولا۔ عورت نے اور اس آدمی نے آپس میں کوئی بات کی اور پھر یہ آدمی مجھے اندر لے گیا اور مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ دو تین منٹ بعد ایک لمبے تڑنگے انڈونیشی کمرے میں آیا۔ مجھے اس گھر میں لانے والا اٹھ کھڑا ہُوا اور میں بھی اٹھا۔ اس نے اپنی زبان میں میرا تعارف کرایا اور اس شخص نے میرے ساتھ ہاتھ

ملایا۔ اس کے ساتھ بات کرتے یہ سہولت مل گئی کہ وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بول سکتا تھا۔ میں نے اسے تفصیل سے سنایا کہ میں کس طرح اپنی یونٹ سے بھاگا ہوں اور کس طرح دریا میں کود کر اس علاقے تک پہنچا ہوں اور ولندیزیوں کے پھندے میں آ گیا تھا لیکن اللہ نے مدد کی اور میں نکل آیا۔

اس ادھیڑ عمر انڈونیشی نے مجھ سے کچھ سوالات پوچھے۔ وہ شاید یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں جاسوس تو نہیں۔ میں نے بندوق اور کارتوسوں کی بیلٹ اسے پیش کی جو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے لوٹا دی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ میں جاسوس نہیں۔ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا اور پانچ سات منٹ بعد واپس آیا۔ اُس کے پیچھے ایک بڑا خوبصورت نوجوان بھی کمرے میں داخل ہُوا۔ میں نے اسے بڑی غور سے دیکھا تو مجھے یوں وہم ہُوا جیسے میں بیداری کے عالم میں نہیں۔ وہ نوجوان مسکرایا اور بازو پھیلا کر میری طرف آیا۔

تب میں اٹھ کر اس کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے.... وہ میرا ساتھی نوجوان حوالدار کلرک عاشق علی تھا جس کے متعلق رپورٹ دی گئی تھی کہ وہ لاپتہ ہو گیا ہے۔

کا نقشہ کھول کر دیکھیں اور انڈونیشیا کا شہر سورابایا سے پنجاب کے شمالی علاقے تک کا فاصلہ ناپیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فاصلہ ساڑھے تین ہزار میل سے کچھ زیادہ ہے۔ انڈونیشیا تو کرۂ ارض کے دوسری طرف واقع ہے لیکن جب میں اُس انڈونیشی کے گھر میں جا بیٹھا تھا جہاں عاشق علی سے ملاقات ہوئی تھی تو یوں لگا جیسے میرے اور اس انڈونیشی کے درمیان بال برابر بھی فاصلہ نہیں۔ فاصلے دلوں کے پیمانے سے ناپے جاتے ہیں۔ میں جب انگریزوں کو' امریکیوں اور ولندیزیوں کو' اپنے ساتھی ہندوؤں اور سکھوں کو دیکھا کرتا تھا تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ میرے اور ان کے درمیان بڑی ہی لمبی اور کٹھن مسافت حائل ہے۔ ہمارے راستے جدا اور منزلیں جدا تھیں لیکن اس انڈونیشی کے گھر بیٹھ کر جس کا نام عثمان تھا' مجھے یوں روحانی سکون محسوس ہُوا جیسے میں اپنے گھر پہنچ گیا ہوں۔

یہ کیسا رشتہ تھا جو از خود ہی میرے سینے سے ایک شدید احساس بن کر اُبھر آیا تھا؟.. .. میری اس داستان یا سفرنامے کا پچھلا باب پڑھیں کہ میں کس طرح اس ادھیڑ عمر انڈونیشی مجاہد عثمان کے گھر پہنچا تھا۔ آپ کو ایک مسجد کا ذکر ملے گا جہاں میں ایک انڈونیشی کے پاس جا بیٹھا تھا اور وہ انڈونیشی تلاوتِ قرآن کر رہا تھا۔ یہ تھا وہ رشتہ جس نے میرے اور عثمان کے درمیان اجنبیت ہی پیدا نہ ہونے دی.... مسجد اور قرآن.... یہ تھا اسلام کا رشتہ جو دو مسلمانوں کے درمیان فاصلہ پیدا ہونے ہی نہیں دیا کرتا۔ پھر ایک رشتہ جہاد کے جذبے نے پیدا کیا تھا جو اور ہی زیادہ مضبوط تھا۔ اسے خون کا رشتہ کہنا چاہئے۔ دو مجاہدین جب کندھے سے کندھا ملا کر کفار کے خلاف میدانِ جنگ میں لڑتے

ہیں' زخمی ہوتے ہیں' گرتے اور اکٹھے شہید ہوتے ہیں تو ان کے جسموں سے بہتا ہُوا خون ایک ہو جاتا ہے۔

یہ ہے اخوت اور اتحادِ مسلمین۔ آج پاکستان میں خصوصاً" اور عام طور پر ساری دنیا میں مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے اہلِ صلیب اور یہودی جو حربے آزما رہے ہیں' ذرا ان پر غور کریں۔ کہیں مسلمانوں کو قتل و غارت گری سے ختم کیا جا رہا ہے اور کہیں مالی امداد اور کہیں قرضوں کے ذریعے مسلمانوں کو مفلوج کر کے ان کا دین و ایمان خریدا جا رہا ہے۔ اہلِ صلیب صرف اس لئے کامیاب ہیں کہ ہم میں اسلام کا بنیادی اصول' اخوت اور اتحاد' ناپید ہو چکا ہے۔

میں بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ میری یہ داستان در اصل اسلامی اخوت اور اتحاد کی اور جہاد کی روائیداد ہے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے اسی اصول کو سینے سے لگایا اور میں بھی اسی اصول کو اپنی روح میں بیدار کر کے وہاں پہنچا تھا۔ یہاں میں ایک بار پھر کہہ دیتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو ایک ہیرو کے طور پر پیش نہیں کر رہا' وہاں تو بے شمار ہیرو گئے تھے۔ یہ سب انڈین آرمی کے مسلمان فوجی تھے۔ میں آپ کو ایسے واقعات سناؤں گا جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد کس طرح مجاہدین کو ملتی تھی۔ بعض واقعات تو معجزوں جیسے ہوئے تھے۔

○

عثمان کے گھر میں میرے ساتھ وہ سلوک نہیں ہُوا جو میزبان اپنے مہمان کے ساتھ کرتے ہیں بلکہ یوں ہوا جیسے میں ان لوگوں کا بچھڑا ہُوا ایک بھائی تھا اور واپس اپنے گھر آ گیا ہوں۔ مجھے نہلایا گیا' کپڑے دیئے گئے' کھانا کھلایا گیا اور ایک الگ کمرے میں عاشق علی کے ساتھ میرا بستر بچھا دیا گیا۔ عاشق علی کے مل جانے سے مجھے یہ سہولت میسر آ گئی کہ جو اُلٹی سیدھی بات دل میں آتی تھی وہ میں اُس کے ساتھ کر لیتا تھا۔ زبان کی دشواری بھی نہیں تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ وہ بھی پنجاب کا رہنے والا تھا اور اس کا گاؤں میرے قصبے سے کوئی زیادہ دُور نہیں تھا۔

میں اور عاشق علی ساری رات جاگتے اور باتیں کرتے رہے۔ اُس نے پہلے مجھ سے پوچھا کہ یہاں تک کس طرح پہنچا ہوں۔ یہ تو میں عثمان کو سنا چکا تھا اور عاشق علی نے بھی سن لیا تھا لیکن وہ اُس سے پہلے کی باتیں پوچھ رہا تھا۔ میں بے تاب تھا کہ وہ اپنی سنائے کہ

اس طرح یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ اس نے پوری تفصیل سے سنایا.... یہ ہے وہ کہانی جو
آپ بیتی بھی پوری تفصیل سے پہنچانا چاہتا ہوں۔ اس میں آپ کو کچھ اللہ کی مدد
بھی مل لیں گے۔

چھلا باب ایک بار پھر دیکھ لیں۔ آپ کو یاد آئے گا کہ عاشق علی کہاں سے لاپتہ ہُوا
تھا.... اب میں عاشق علی کے ساتھ اس کا حوالداری عہدہ نہیں لکھوں گا کیونکہ اب وہ
انڈین آرمی کا فوجی نہیں بلکہ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی کا مجاہد تھا.... مختصراً" بات یوں
تھی کہ وہ پورے بریگیڈ کا آپریشن تھا جس میں ہماری بٹالین بھی شامل ہوئی تھی۔
بٹالین کی کمپنی کا ایریا بڑی دشوار زمین والا تھا۔ وہاں ٹیکریاں بھی تھیں اور پیڑ پودوں کا گھنا
جنگل بھی تھا اور چھوٹے بڑے کھڈ بھی تھے اور اونچی گھاس بھی تھی۔

عاشق علی اپنے کمپنی کمانڈر انگریز میجر کے ساتھ کمپنی کی ایک پلاٹون پوزیشنوں کی
طرف گیا۔ وہ پلاٹون کمپنی سے کچھ زیادہ ہی الگ تھلگ اور تھوڑی دُور پوزیشن میں پہنچ
گئی تھی کہ اچانک تین اطراف سے اُس پر رائفلوں اور ٹامی گنوں کا اور ایک یا دو مشین
گنوں کا فائر اس طرح آنے لگا جیسے اچانک موسلا دھار مینہ برس پڑا ہو۔ اس پلاٹون کو
پیچھے اور آگے جانا تھا۔ اس کی نفری تیس پینتیس کے درمیان تھی۔ در اصل ہُوا یہ تھا کہ
جاوین انڈونیشی گوریلوں کی گھات میں آ گئی تھی۔ میں نے پچھلے باب میں لکھا ہے کہ
انڈونیشی گوریلوں کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ یہ پلاٹون مسلمانوں کی ہے ورنہ اس پر وہ ایک
بار بھی فائر نہ کرتے پلاٹون کا ہر جوان آڑ میں تھا اس لئے گوریلوں کو یہ جوان نظر نہیں
آتے تھے' انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ کچھ نفری انڈین آرمی کی اس علاقے میں آ گئی
ہے اور گوریلوں نے اس پر فائر کھول دیا۔

عاشق علی کو اپنے کمپنی کمانڈر کے ساتھ رہنا تھا۔ کمپنی کمانڈر کے ساتھ وائرلیس
آپریٹر بھی تھا۔ فائر ایسا اچانک اور اتنا زیادہ آیا کہ نفسا نفسی کا ماحول بن گیا اور عاشق علی
سب ہی ایک کھڈ میں کُود گیا۔ اس نے یہ نہ دیکھا کہ کمپنی کمانڈر اور وائرلیس آپریٹر
کدھر نکل گئے ہیں۔

جس کھڈ میں عاشق علی اُترا تھا' اس میں تین چار جوان بیٹھ سکتے تھے۔ یہ اتنا ہی
گہرا تھا کہ بیٹھ کر سر بھی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس کے کناروں پر جھاڑیاں تھیں اور گھاس
اگی تھی۔ ان کی وجہ سے کھڈ میں بیٹھا ہُوا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ عاشق علی کو بڑی اچھی

اور محفوظ پناہ ملی گئی تھی۔ گولیاں اُس کے سر کے اُوپر سے گزر رہی تھیں اور وہ گولیوں کے دھماکے ہی نہیں بلکہ اپنے اوپر گزرتی گولیوں کی سیٹیاں بھی سن رہا تھا۔

زیادہ فائر تو عاشق علی کی کمپنی کی طرف سے ہو رہا تھا۔ انڈونیشی گوریلے تو سوچ سمجھ کر اور اپنا ہدف دیکھ کر فائر کرتے تھے لیکن اس روز انہیں کہیں سے مشین گن مل گئی تھی اور وہ فوجیوں کی طرح برسٹ فائر کر رہے تھے۔ انگریزوں کی فوج کے پاس تو ضائع کرنے کے لئے بھی بے انداز ایمونیشن تھا۔ ہمارے فوجی اپنی حفاظت اس طریقے سے کیا کرتے تھے کہ اندھا دھند مشین گنیں، سٹین گنیں اور رائفلیں فائر کرنی شروع کر دیتے اور اکثریوں ہوتا کہ ٹریگر دبایا تو پھر اسے چھوڑنا بھول جاتے تھے۔

عاشق علی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اُس کی پلاٹون کے آدھے سے زیادہ جوان زخمی یا ہلاک ہو چکے ہوں گے اور باقی بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ اُس کا اندازہ غلط نہیں تھا جس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ جس کھڈ میں وہ چھپا ہوا تھا اس کے بالکل قریب سے ایک انڈونیشی دوڑتا ہُوا گزرا۔ وہ اُس طرف جا رہا تھا جس طرف عاشق علی کی پلاٹون پسپا (ری ٹریٹ) ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور انڈونیشی گوریلا اس کھڈ سے اس طرح گزرا کہ وہ کھڈ میں گرا نہیں بلکہ اس کے اوپر سے کُود گیا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کھڈ میں ایک فوجی چھپا بیٹھا ہے۔

میدانِ جنگ کی صورت یہ تھی کہ عاشق علی کی پلاٹون ہی نہیں بلکہ پوری کمپنی بڑی تیزی سے پیچھے ہٹ رہی تھی اور انڈونیشی گوریلے اس کے تعاقب میں جا رہے تھے۔ میں ایڈوانس اور ری ٹریٹ کو فوجی زبان میں بیان کر کے آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ضرور بتاؤں گا کہ پسپا ہونے کا یعنی پیچھے ہٹنے کا مطلب یہ نہیں کہ عاشق علی کی کمپنی کے افسر اور جوان اُٹھ کر پیچھے کو دوڑ پڑے تھے اور گوریلے ان کے تعاقب میں دوڑے جا رہے تھے۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جوان ایک پوزیشن اور آڑ سے سرک کر پیچھے ہٹتے یا دوڑتے ایک اور آڑ میں جا پوزیشن لیتے اور فائر کرتے ہیں۔ اس طرح کمپنی یا نفری پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور دشمن آگے بڑھنے کی جرات کم ہی کرتا ہے لیکن دشمن بھی پوزیشنیں بدل بدل کر پسپا ہونے والوں کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ چونکہ گوریلے تھے اس لئے وہ بڑی دلیری سے دوڑتے اور کہیں پوزیشن لیتے پسپا ہونے والوں پر فائر کر رہے تھے۔

عاشق نے ابھی اس کھڈ سے نکلنے کی سوچی ہی نہیں تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ وہ اٹھا تو

کسی گوریلے کی نظر میں آ جائے گا۔ یہ تو بعد میں دیکھے گا کہ یہ فوجی مسلمان تھا یا ہندو، گوریلے گولی چلائے گا۔ سب کے سروں پر سٹیل ہیلمٹ ہوتے تھے اس لئے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ اس سٹیل ہیلمٹ کے نیچے جو فوجی ہے وہ مسلمان ہے یا ہندو۔

کچھ دیر بعد پھر دو انڈونیشی گوریلے عاشق علی والے کھڈ کے کنارے سے دوڑتے گزر گئے۔ اب وہ آگے کو نہیں بلکہ پیچھے جا رہے تھے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ گوریلوں کی فوج بھاگ ہی جاتی اور دشمن اس کے تعاقب میں رہتا۔ ہماری بٹالین یا بریگیڈ کی طرف سے پسپائی کے بعد کی کارروائی شروع ہو گئی۔ وہ یہ تھی کہ فیلڈ توپ خانے کی توپیں گولہ باری کرنے لگیں۔ عاشق علی نے بتایا کہ اس گولہ باری میں ہماری بٹالین کی مارٹر پلاٹون کی گولہ باری بھی شامل تھی۔ میں نے آپ کو پہلے بتایا ہے کہ گوریلوں کی فوج کے پاس پھونکنے کے لئے بے انداز ایمونیشن تھا۔ اس بے دریغ گولہ باری کا مطلب اور مقصد یہ تھا کہ جہاں جہاں بھی گوریلے ہیں، وہ زد میں آ جائیں۔ توپ خانے کا گولہ پھٹتا ہے تو اس کے چھوٹے بڑے ٹکڑے گولیوں کی طرح ہر طرف جاتے ہیں اور ایک بھی ٹکڑا کسی کو لگ جائے تو وہ جوان بُری طرح زخمی ہوتا ہے اور اگر ٹکڑے لگے اور ٹکڑے کا سائز ذرا بڑا ہو تو پھر وہ آدمی مر بھی جاتا ہے۔

انڈونیشی گوریلے اپنا کام کر گئے تھے۔ یہ تو انگریز بھی جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ کسی باقاعدہ فوج کے ساتھ نہیں بلکہ گوریلوں سے مقابلہ ہے جو بکھرے ہوئے ہیں۔ بکھرے ہوئے گوریلوں پر گولہ باری ہی کی جاتی تھی۔ گوریلوں نے اب تو پیچھے ہی ہٹنا تھا اور وہاں سے غائب ہو جانا تھا۔ بریگیڈ کے اس بڑے آپریشن کے دوران گوریلوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ انہوں نے کئی اور یونٹوں کی کمپنیوں یا پلاٹونوں کو گھیر کر نقصان کیا تھا۔

○

عاشق علی نے مجھے سنایا کہ اب گولے اُس کے اِرد گرد پھٹنے لگے تھے۔ اُس کا تو دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ توپوں کی گولہ باری سے کوئی اور نقصان چاہے نہ ہی لیکن ہو، جس نفری کے درمیان یا اِرد گرد گولے پھٹتے ہیں اس نفری کے دماغ مسلسل دھماکوں سے ماؤف ہو جاتے ہیں اور وہ لڑنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دشمن کے مورچوں پر حملہ کرنا ہوتا ہے، اس سے پہلے وہاں بے انداز گولہ باری کی جاتی ہے۔

عاشق کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ پہلے گولہ باری خاصی آگے کی جا رہی

تھی اور پھر گولے پیچھے آکر پھٹنے لگے۔ عاشق علی نے یہ تو ارادہ کر ہی رکھا تھا کہ جب کبھی اسے موقع ملا وہ ادھر سے بھاگ کر انڈونیشی گوریلوں کے پاس چلا جائے گا۔ اب اُسے وہ موقع مل گیا تھا لیکن وہ اس ڈر سے کھڈ میں ہی بیٹھا رہا کہ باہر نکلا تو گولہ باری میں مارا جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دور سے کوئی گوریلا اُسے دیکھ لے اور گولی مار دے۔ یہ سوچ کر وہ وہیں دبکا رہا۔ گولے زناٹوں سے اس کے اوپر سے گزرتے جا رہے اور اب وہ دھماکوں کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

عاشق علی کے کھڈ کے بالکل قریب ایک ایسا زبردست دھماکہ ہُوا جیسے زمین پھٹ گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی عاشق علی کو ایک کربناک آواز سنائی دی جو چیخ نما تھی۔ اس کے فوراً بعد ایک انڈونیشی گوریلا کھڈ میں آپڑا۔ دھماکہ اتنا زور دار تھا کہ عاشق علی کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ گوریلا کھڈ میں گرا تو عاشق علی کچھ گھبرا سا گیا۔ گوریلا پیٹ کے بل گرا تھا۔ وہ فوراً ہی سیدھا نہ ہُوا بلکہ آہستہ آہستہ اٹھنے اور سیدھا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ عاشق علی کے پاس سٹین گن تھی جس میں میگزین لگی ہوئی تھی۔ وہ اس گوریلے کو سیدھا ہونے سے پہلے ہی مار سکتا تھا لیکن اس نے ایسا سوچا ہی نہیں۔

گوریلے کے پاؤں عاشق علی کو لگ رہے تھے کیونکہ کھڈ اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس میں صرف بیٹھا جا سکتا تھا۔ کوئی دوسرا آدمی لیٹ نہیں سکتا تھا۔ وہ گوریلا جب سیدھا ہُوا تو عاشق علی نے دیکھا کہ وہ بڑا خوبصورت اور نوعمر لڑکا تھا۔ اُس نے سر پر ایک رومال لپیٹ رکھا تھا اور اس رومال کو سر پر ہی رکھنے کے لئے ایک بیلٹ یا پٹی سی باندھ رکھی تھی۔ جونہی گوریلے نے عاشق علی کو دیکھا' اس نے اپنی ٹامی گن جو اس کے قریب گری تھی اٹھا لی اور اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یہ غصے اور دشمنی کا رنگ تھا۔ اُس نے بڑی تیزی سے ٹامی گن عاشق علی کی طرف سیدھی کی لیکن عاشق علی نے اپنی سٹین گن اس کی طرف نہ کی بلکہ دونوں ہاتھ اُس کی طرف کر دیئے۔

"مسلم.... مسلم!" — عاشق علی نے اپنا ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا — "مریکا — مسلم سمہ سمہ!"

یہ تو اس انڈونیشی نوعمر گوریلے نے دیکھ ہی لیا ہو گا کہ وہ پیٹ کے بل گرا تھا اور اگر یہ ہندوستانی فوجی مسلمان نہ ہوتا تو اسے سیدھا ہونے سے پہلے ہی سٹین گن کے ایک برسٹ سے ختم کر دیتا۔ اُس نے بھی کہا — "مسلم.... ہاہا.... مسلم" — اُس وقت

عاشق علی نے دیکھا کہ اس گوریلے کی پتلون گھٹنے سے پھٹ گئی تھی اور وہاں سے خون ل نکل کر نکل رہا تھا۔ عاشق علی نے پریشان سا ہو کر سٹین گن الگ پھینکی اور اُس کے خم کو دیکھنے لگا۔

گوریلے نے پتلون اوپر کی تو زخم صاف نظر آنے لگا۔ جو گولہ قریب پھٹا تھا اس کا ب بڑا ٹکڑا اس گوریلے کی ٹانگ میں لگا اور خاصا بڑا زخم کر گیا تھا۔ یہ زخم گھٹنے سے ذرا اوپر تھا۔ خون بہت ہی زیادہ نکل رہا تھا۔ عاشق علی نے اپنے جھولے سے فیلڈ پٹی نکالی ر بڑی تیزی سے اسے کھولا۔ فوجیوں کے پاس جو فیلڈ پٹی ہوتی ہے وہ خاصی زیادہ چوڑی ر لمبی ہوتی ہے اور اس میں روئی کا ایک پیڈ بھی بنا ہُوا ہوتا ہے۔ عاشق علی نے وہ پیڈ ونیشی لڑکے کے زخم پر رکھا۔ اس پیڈ پر دوائی بھی لگی ہوئی ہوتی ہے جس کا رنگ پیلا تا ہے۔

عاشق علی نے پیڈ زخم پر رکھا اور پٹی کس کر لپیٹ دی اور پھر اسے گانٹھ دے دی۔ ی کو ضرب ضرور پہنچی ہو گی کیونکہ ٹانگ کے اس مقام پر گوشت کم ہوتا ہے اور ہڈی ب ہوتی ہے۔ زخم بہت ہی بڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی درندے نے منہ ڈال کر وہاں ے بوٹی ہی نکال لی ہو۔ گوریلے کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور وہ بہت ہی درد محسوس کر رہا ۔ گولے کے ٹکڑے بہت ہی گرم ہوتے ہیں۔ ان ٹکڑوں کے ساتھ جلے ہوئے بارُود وھواں یا اثر بھی ہوتا ہے جو زخم کو خراب بھی کرتا ہے اور درد میں اضافہ بھی کرتا ۔

انڈونیشی گوریلے نے دیکھا پٹی تو بندھ گئی ہے لیکن خون شاید بند نہ ہو اور یہ پٹی نی ہو گی۔ اُس نے اپنے سر پر باندھا ہُوا وہ بڑا رومال اتارا اور اُسے تہہ کر کے پٹی کے پلیٹ کر اچھی طرح باندھ دیا.... پہلے تو عاشق علی دیکھتا رہا کہ یہ نوجوان گوریلا کیسی مندی سے زخم اور پٹی پر رومال باندھ رہا تھا لیکن جب رومال بندھ چکا تو اس نے دیکھا اس گوریلے کے سر کے بال خاصے لمبے تھے جو اُس نے لپیٹ کر اوپر کر رکھے تھے اور پر رومال باندھ کر ڈھک دیا تھا۔ اب یہ بال آزاد ہو کر نیچے کو گرے تو اُس کے شانوں بھی نیچے چلے گئے۔ یہ بال کسی مرد کے نہیں بلکہ عورت کے تھے۔ عاشق نے بے ختہ اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اُس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ گوریلا ابھی اپنے م کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر اوپر اٹھا تو عاشق علی کو یقین آیا کہ یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔

اس لڑکی کی عمر سترہ یا زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال تھی۔ عاشق علی کو خیال آیا کہ یہ لڑکی اس غلط فہمی میں نہ آجائے کہ میں اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کروں گا۔

"بہن!" — عاشق علی نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر دوسرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر کہا — "بھائی.... سسٹر.... مائی سسٹر!"

عاشق علی کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کی زبان میں بہن بھائی کو کیا کہتے ہیں۔ لڑکی مسکرائی اور اُس نے اوپر نیچے سر ہلایا جیسے وہ سمجھ گئی ہو کہ عاشق علی کی نیت خراب نہیں اور وہ اسے اپنی بہن سمجھتا ہے۔ عاشق علی نے مجھے سنایا کہ اُس پر کوئی ایسا پاکیزہ تاثر طاری ہو گیا تھا کہ اسے شک ہُوا کہ لڑکی ابھی تک اس کی نیت کو نہیں سمجھی۔ اس نے انگلی آسمان کی طرف کر کے کہا — "اللہ" — پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور پھر کہا — "اللہ.... عاشق علی.... علی.... علی.... علی۔"

"آمنہ!" — لڑکی نے اپنے سینے پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار کر کہا پھر وہی ہاتھ عاشق علی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "علی.... علی!" — لڑکی نے ایک بار پھر مسکرا کر اپنا سر اوپر نیچے ہلایا لیکن فوراً ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور چہرے پر شدید درد کا تاثر آ گیا۔ اُس نے اپنے زخم پر ہاتھ رکھ لیا۔ لڑکی نے ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ وہ جا رہی ہے۔" وہ اپنی ٹامی گن لے کر اٹھنے لگی تو عاشق علی نے اُس کا بازو پکڑ کر بٹھا دیا اور ہاتھ اوپر کر کے ہلایا جس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی گولہ باری ہو رہی ہے اور وہ باہر نہ نکلے۔ لڑکی بیٹھ گئی اور اس نے اپنے بائیں پاؤں پر ہاتھ پھیرا اور عاشق کی طرف دیکھا۔ اُس نے کچھ اشارہ بھی کیا جس کا مطلب عاشق علی نہ سمجھ سکا۔ لڑکی نے فلیٹ شوز پہن رکھے تھے۔

عاشق علی نے اپنے تاثرات سناتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ دیر تو اس لڑکی کی طرف ہی دیکھتا اور حیران ہوتا رہا کہ ایسی نو عمر اور خوبصورت لڑکی کس طرح مردوں کے دوش بدوش انگریزوں اور امریکیوں جیسی جنگی طاقت کے خلاف لڑ رہی ہے۔ لڑکی کا رنگ سفیدی مائل پیلا تھا اور اس میں ہلکی ہلکی سرخی تھی جو اس جنگل اور جنگ میں بھاگنے دوڑنے سے چہرے پر آ گئی تھی۔ عاشق علی نے کہا کہ فوجی کسی برائے نام عورت کو بھی دیکھ لیں تو احمقوں کی طرح اسے دیکھتے ہی رہتے ہیں اور ان کے چہروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور ان کی نیت کیا ہے لیکن عاشق علی جوں جوں اس لڑکی کو دیکھتا تھا

اُس کے دل میں پاکیزگی اور تقدّس کا تاثر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

○

گولہ باری یکلخت بند ہو گئی اور جنگل پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ جنگل نہ جانے کب سے ایسے ہی خاموش چلا آ رہا ہے اور یہاں کبھی کوئی ہنگامہ نہیں ہُوا لیکن آمنہ اور عاشق علی کے لئے بہت کچھ ہو گیا تھا۔ وہ اس طرح کہ آمنہ گولہ باری بند ہوتے ہی اٹھی اور کھڈ سے نکلنے لگی تو اس کے منہ سے کربناک "سی" نکل گئی۔ اُس نے وہیں رک کر اور ذرا جھک کر اپنے بائیں پاؤں کی طرف دیکھا اور پھر عاشق علی کی طرف دیکھا۔ عاشق علی تو یہی سمجھتا تھا کہ اُس کے زخم سے درد کی ٹیس اٹھی ہے لیکن آمنہ نے اپنا بایاں پاؤں ذرا ٹیڑھا کر کے اور کچھ ہاتھوں کے اشارے کئے تو عاشق علی سمجھ گیا کہ اُس کے پاؤں کو موچ آ گئی ہے۔ آمنہ نے مزید اشارے کئے اور کچھ جسم سے ایسی حرکات کیں جن سے پتہ چلا کہ جب اس کے قریب گولہ پھٹا تھا تو وہ گری تھی تو اُس وقت اُس کا بایاں پاؤں مُڑ گیا تھا۔ گرتے وقت جسم کا بوجھ بھی اس پاؤں پر پڑا۔ اب آمنہ کی معذوری یہ تھی کہ دائیں ٹانگ میں اتنا بڑا زخم تھا اور بائیں ٹانگ پاؤں کی موچ کی وجہ سے معذور ہو گئی اس کا وہاں سے نکل جانا بھی بہت ہی ضروری تھا۔ عاشق جانتا تھا کہ اب اُس کی اپنی کمپنی یا دو تین کمپنیاں آگے آئیں گی اور اپنی لاشوں اور زخمیوں کو اٹھا کر پیچھے لے جائیں گی۔ آمنہ کو اس سے پہلے وہاں سے غائب ہو جانا چاہئے تھا لیکن اُس کا بایاں پاؤں جسم کا وزن اٹھا ہی نہ رہا تھا۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ عاشق علی نے مجھے کئی بار کہا تھا کہ وہ انڈونیشی مجاہدین کے پاس چلا جائے گا۔ اب اُسے بڑا اچھا موقع مل گیا تھا لیکن اس میں کچھ جھجک سی تھی جو ڈر کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ عاشق کوئی شہری نوجوان نہیں بلکہ ایک گاؤں کا رہنے والا تھا اس لئے اُس میں اتنی زیادہ خود اعتمادی اور عقلمندی نہیں تھی لیکن اب اُس نے دیکھا کہ ایک انڈونیشی لڑکی جو مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہے، وہاں سے نکل جانے سے معذور ہے اور اگر وہ نہ نکلی تو پکڑی جائے گی تو یہ بہت ہی بُری بات ہو گی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی نو عمر اور خوبصورت لڑکی کو انگریز افسر اپنے پاس رکھ لیں گے اور پھر اس کے ساتھ جو سلوک ہو گا وہ عاشق علی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ یہ سوچ کر عاشق علی کے خون میں جوش آ گیا اور وہ اپنی سٹین گن اور آمنہ کی ٹامی گن اٹھا کر کھڈ

سے نکالا اور دونوں گنیں الگ رکھ کر کھڈ کے کنارے دو زانوں ہو کر آمنہ کی بغلوں میں ہاتھ رکھے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ سٹین گن کے ساتھ سلنگ لگا ہوا تھا۔ عاشق نے سلنگ کندھے میں ڈال لیا اور ٹامی گن جو بغیر سلنگ کے تھی' ہاتھ میں لے لی۔

آمنہ چلنے لگی تو ایک ٹانگ کا زخم اور دوسرے پاؤں کی موچ اُسے چلنے نہیں دے رہی تھی۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں عاشق کی طرف دیکھا۔ عاشق نے اُس کا ایک بازو اپنے کندھوں پر رکھا اور اپنا دایاں بازو اس کی پیٹھ پر رکھ کر اس کا وزن سہار لیا اور دونوں چل پڑے۔ وہ کوئی ہموار زمین نہیں تھی۔ اونچی نیچی جگہیں زیادہ تھیں اور ٹیکریاں سیدھا رستہ نہیں دیتی تھیں۔ ان کی رفتار بہت ہی سست تھی۔ یہ ایک خطرہ تھا۔

وہ تھوڑی ہی دور گئے تو عاشق علی رک گیا۔ وہ آمنہ سے کہنا چاہتا تھا کہ رفتار پر چلے تو تھوڑی دیر بعد پکڑے جائیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ عاشق اسے اٹھا لے۔ اتنی بات وہ آمنہ کو اشاروں میں سمجھا نہیں سکتا تھا' اس نے اشاروں کی بجائے عمل زیادہ بہتر سمجھا جو یہ تھا کہ وہ آمنہ کے سامنے جھکا اور آمنہ کے پیٹ کے ساتھ اپنا دائیں کندھا لگایا اور اُسے اٹھا لیا۔ آمنہ کا پیٹ اس کے کندھے پر تھا' اُس کا سر عاشق کی پیٹھ کی طرف اور ٹانگیں آگے کو تھیں۔ اب عاشق علی تیز چل سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آمنہ نازک اندام سی لڑکی تھی جس کا وزن کوئی ایسا زیادہ نہیں تھا لیکن اس دشوار گزار جگہ سے نکلنا خاصا تھکا دینے والا کام تھا۔ ایک جذبہ تھا جس نے عاشق علی کو کوئی اور ہی طاقت دے دی تھی۔

عاشق علی کو خیال آیا کہ وہ جا کہاں رہا ہے؟ نہ آمنہ نے اُسے بتایا تھا کہ کہاں تک اور کس طرف جانا ہے نہ اس نے خود سوچا تھا۔ وہ کچھ دور تک چلے گئے تھے۔ آمنہ نے اپنا ایک ہاتھ اس کی پیٹھ پر مارا اور کچھ کہا جس کا مطلب غالباً" یہ تھا کہ وہ رک جائے۔ عاشق رک گیا اور آمنہ اس کے کندھے سے اتری۔ اس نے زور زور سے دو تین سانس لئے جس کا مطلب یہ تھا کہ عاشق ذرا ستا لے۔ عاشق بیٹھ گیا اور آمنہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ عاشق کی اس وقت ضرورت یہی تھی کہ ذرا دم لے لے۔ اس نے آمنہ سے اشاروں میں پوچھا کہ جانا کہاں ہے۔ آمنہ نے ایسے اشارے کئے جن سے یہ ظاہر ہُوا کہ وہ ٹھیک سمت کو جا رہے ہیں لیکن وہ عاشق علی کا یہ سوال اشاروں میں نہ سمجھ سکی کہ وہ جگہ کتنی دُور ہے جہاں تک جانا ہے۔

عاشق علی نے اپنی پانی والی بوتل نکالی۔ پہلے آمنہ کو پانی پلایا پھر خود پیا اور ایک بار پھر اُسے کندھے پر ڈال کر چل پڑا۔ اب وہ جس علاقے میں جا رہے تھے وہاں ٹیکریاں کچھ کم ہو گئی تھیں لیکن زمین کھڈوں والی تھی۔ بعض جگہ تو پانی رُکا کھڑا تھا اور کیچڑ بھی تھا۔ ایسی جگہ سے بچنے کے لئے راستہ لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ وہاں کہیں کہیں سیاہ رنگ کی چٹانیں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ وہاں تک پہنچے تو ایک بار پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ فائرنگ ان سے کچھ دُور تھی لیکن تھی بہت ہی زیادہ۔ وہ شاید کسی اور بٹالین کا ایریا تھا اور انڈونیشی گوریلوں نے شاید کسی اور کمپنی یا پلاٹون کو گھات میں لے لیا تھا اور دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ گولے ان کے قریب آ کر پھٹنے لگے لیکن اتنے قریب بھی نہیں کہ وہ اُن کے اڑتے ٹکڑوں کی زد میں آ جاتے' بہرحال گولہ باری ان کے سر پر بھی آ سکتی تھی۔ عاشق علی نے وہاں سے ایک طرف کو ہٹنا شروع کر دیا۔ سورج غروب ہو چکا ہوتا تو پھر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کو فوج کا کوئی آپریشن نہیں ہُوا کرتا تھا لیکن دن کے ابھی دو یا اڑھائی ہی بجے تھے۔

عاشق علی' چلتا گیا اور اچھی خاصی تھکن محسوس کرنے لگا۔ گولہ باری بند ہو گئی اور اب دُور سے اِکے دُکے فائر کی آواز آتی تھی۔ عاشق علی رُک گیا اور آمنہ کو کندھے سے اتارا۔ عاشق تو پسینے سے نہا گیا تھا۔ دونوں بیٹھ گئے۔ آمنہ نے عاشق علی کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر آ گیا جیسے اسے عاشق علی پر رحم آ رہا تھا اور شکریے کا تاثر بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے جو اشارے کئے وہ عاشق علی نے سمجھ لئے۔ آمنہ اسے کہہ رہی تھی کہ مجھے یہیں چھوڑ کر تم واپس چلے جاؤ۔ عاشق علی نے سر ہلایا اور کچھ اشارے کئے جن کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ واپس نہیں جائے گا بلکہ وہ اب انڈونیشی مجاہدین میں شامل ہو گا۔ معلوم نہیں آمنہ نے اُس کے باقی اشارے سمجھے تھے یا نہیں' عاشق علی اُسے اشاروں کی زبان میں کہہ رہا تھا کہ وہ اسے اس معذوری کی حالت میں جنگل میں تو کسی قیمت پر چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

عاشق علی نے اسے پھر کندھے پر اٹھایا اور چل پڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ خُون پوری طرح بند نہیں ہُوا۔ پٹیوں پر ذرا ذرا سا خون آ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر عاشق علی پریشان ہو گیا اور وہ اور تیز چلنے لگا کہ آمنہ کو اس کے ٹھکانے پر جلدی پہنچا دے تاکہ اس کا خون روکنے کا بندوبست کیا جا سکے.... اب پھر گھنا جنگل آ گیا اور پھر پہلے جیسی ٹیکریاں شروع ہو

گئیں۔ وہ گولہ باری اور فائرنگ کی دنیا سے دور نکل گئے تھے۔ آمنہ نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ عاشق علی بہت تھک گیا ہے۔ اس نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر روکا اور اُس کے کندھے سے اُتر آئی۔ عاشق علی نے اُسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو آمنہ نے اپنا ایک بازو عاشق علی کے گلے میں ڈال دیا اور اشارہ کیا کہ وہ اُس کے سہارے چلنا چاہتی ہے۔ عاشق نے اپنا ایک بازو اس کی کمر میں ڈال دیا اور دونوں چلنے لگے۔ چند قدم ہی گئے ہوں گے کہ عاشق رُک گیا۔ ایک تو اُس نے یہ محسوس کیا کہ اس رفتار بہت کم ہے اور دوسرا خطرہ یہ کہ آمنہ چلی تو اس کے زخم سے خون زیادہ نکلنے لگے گا۔ اس نے آمنہ کو اٹھانا چاہا تو آمنہ نے کچھ مزاحمت کی اور اشاروں میں بتایا کہ تمہاری ٹانگیں رہ جائیں گی لیکن عاشق نے اسے کندھے پر اٹھالیا اور چل پڑا۔

یہ روئیداد سناتے ہوئے عاشق علی نے مجھ سے تین بار پوچھا کہ آمنہ جیسی خوبصورت لڑکی کے معاملے میں اُس کے وہ جذبات کہاں چلے گئے تھے جن کے لئے فوجی بدنام ہیں۔ جذبات سے اُس کا مطلب حیوانی جذبات تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہم لوگ دیہات سے آئے ہیں اور فوج میں آکر ہمارے دماغ کسی اور طرف پھر جاتے ہیں لیکن آمنہ کو اپنے رحم و کرم پر پاکر وہ اتنا سرد کیوں ہو گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ آمنہ کے بال بڑے ہی ملائم تھے اور وہ بال کئی بار اس کے منہ کے ساتھ لگے بلکہ دو تین بار جب اُس نے آمنہ کو اٹھایا تو آمنہ کا منہ عاشق کے منہ کے ساتھ لگا اور پھر اس کا جسم عاشق کے جسم پر سوار بھی رہا لیکن وہ یوں محسوس کرتا رہا جیسے یہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی ہے اور زخمی ہے اور اسے منزل پر پہنچانا ہے۔

میں اُس وقت عاشق کو کوئی ٹھیک سا جواب نہیں دے سکا تھا سوائے اس کے کہ یہ اسلامی برادری کا مسئلہ ہے اور یہ جہاد کا معاملہ ہے.... اُس وقت علم تو تھا ہی نہیں اور جو ذرا سا تجربہ تھا وہ خام تھا۔ میں آج عاشق علی کے سوال کا جواب ذرا بہتر طریقے سے دے سکتا ہوں۔ جواب یہ ہے کہ جس قوم کے نوجوانوں کے سامنے کوئی نصب العین نہ ہو اور اس قوم کے حکمران لوٹ مار میں لگے ہوئے ہوں اور وہ اپنا ایمان بیچ کر غیر ملکی کلچر اپنے ہاں درآمد کر کے نوجوانوں میں پھیلا رہے ہوں' اُس قوم میں قومی جذبہ مرجاتا ہے اور حیوانی جذبات ابھر آتے ہیں۔ ہم جب انگریز کے غلام فوجی تھے تو یہی سمجھتے تھے کہ عیش موج کرو اور عورت کو تفریح طبع کا ذریعہ بنائے رکھو۔ یہ تو ایک عام فہم بات ہے کہ

عاشق علی نے اپنا ایمان بیدار کر لیا تھا اور اسے یہ نصب العین نظر آ رہا تھا کہ انڈونیشی مسلمان ہیں اور کفار کے خلاف لڑ رہے ہیں کہ وہ انہیں غلام نہ بنا سکیں۔ جب یہ جذبہ بیدار ہوتا ہے تو حیوانی جذبات دم توڑ جاتے ہیں۔

○

عاشق علی آمنہ کو کندھے پر ڈالے چلا جا رہا تھا کہ اسے فضا میں گھن گرج سی سنائی دینے لگی۔ اس آواز کو عاشق علی بھی پہچانتا تھا اور آمنہ بھی۔ وہ لڑاکا بمبار ہوائی جہاز تھے۔ ان کی گھن گرج بلند سے بلند تر ہوتی گئی اور جب وہ بالکل قریب آ گئی تو فضا سے مشین گنیں چلنے کے مسلسل دھماکے سنائی دیئے۔ ہوائی جہاز جنگل میں مشین گنیں فائر کر رہے تھے۔

یہ تو بہت بڑا آپریشن یا ملٹری ایکشن تھا جس میں ہوائی جہاز بھی استعمال کئے جا رہے تھے۔ یہ سب جانتے تھے کہ ہوائی جہازوں کو اتنے گھنے جنگل میں کوئی گوریلا یا ان کا ڈھکا چھپا ٹھکانہ نظر نہیں آتا لیکن وہ جنگل پر غوطے میں آکر بے طرح مشین گنیں فائر کرتے تھے۔

ایک ایک ہوائی جہاز میں چار چار مشین گنیں ہوتی تھیں۔ ان کی گولیاں خاصی بڑی ہوا کرتی تھیں اور ان گولیوں میں کچھ ایسی بھی تھیں جو زمین پر لگ کر گرینیڈ کی طرح پھٹتی تھیں۔ ہوائی جہاز جب اس طرح جنگل پر گولیاں برساتے تھے تو جنگل میں کچھ لوگ تو ان کی زد میں آ ہی جایا کرتے تھے.... میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیسا آپریشن تھا لیکن یہ بتا سکتا ہوں کہ اس آپریشن کا طریقہ اور مقصد یہ تھا کہ اس جنگل کو اس طرح صاف کر دیا جائے جس طرح جھاڑو پھیرا جاتا ہے۔

عاشق علی اور آمنہ کے لئے یہ ایک اور آفت آسمان سے نازل ہو گئی۔ عاشق علی نے برما فرنٹ پر جاپانی ہوائی جہازوں کی اس طرح کی فائرنگ اور بمباری دیکھی تھی اور آمنہ نے جنگِ آزادی میں ہوائی جہازوں کی یہ تباہ کاری کئی مرتبہ دیکھی تھی۔ اب دونوں کو پناہ کی تلاش تھی۔ ان کے سامنے کم و بیش بیس قدم دور دو بڑے اور پرانے درخت تھے جن کا درمیانی فاصلہ چھ سات قدم ہو گا۔ ان دونوں درختوں کے تنے خاصے موٹے اور چوڑے تھے اور اوپر سے درخت گھنے بھی تھے۔ وہ ہوائی حملے سے بچاؤ کے لئے بہت اچھی پناہ تھی لیکن یہ بیس قدم بڑے ہی خطرناک قدم تھے۔ وہ چلنے ہی لگے تھے

کہ ایک طرف سے ہوائی جہاز گن فائرنگ کرتا ہُوا آیا تو اس کی گولیاں ان دونوں سے چار پانچ گز دُور گرتی ہوئی آگے چلی گئیں۔ عاشق نے گولیوں کو پھٹتے ہوئے بھی دیکھا لیکن اللہ نے اس کی مدد کی۔

عاشق علی آمنہ کو اٹھائے دوڑ پڑا اور جس قدر تیز دوڑ سکتا تھا اتنا تیز دوڑا اور اُن دو بڑے درختوں کے درمیان تک پہنچ گیا۔ اُس نے آمنہ کو کندھے سے اتار دیا اور دونوں ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ دونوں کے جسم ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور پھر انہوں نے اپنے جسم اور زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ لگا لئے تاکہ تنا دونوں کو بچائے رکھے۔

عاشق کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہوائی جہاز کتنے ہیں۔ وہ ہوائی جہازوں کو غوطوں میں آتے دیکھتا تھا لیکن ان کی گنتی نہیں ہو سکتی تھی۔ سر کے اوپر گھنے درخت تھے۔ وہ اور آمنہ اتنا ہی جانتے تھے کہ فضا میں ہوائی جہازوں نے قیامت کا ہنگامہ بپا کر رکھا ہے اور وہ گونجتے گرجتے آتے ہیں اور آگ برساتے ہوئے پھر اوپر چلے جاتے ہیں۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ یہ دونوں درخت بالکل قریب قریب تھے اور خاصے پرانے بھی تھے۔ اُن کے ٹہن دور اوپر نہیں بلکہ زمین سے کچھ ہی اوپر سے شروع ہو جاتے تھے۔ عاشق علی بائیں طرف جھکا ہوا ہوائی جہازوں کو فضا میں چکر لگاتا اور غوطوں میں آتا دیکھ رہا تھا۔ آمنہ نے اُسے زور سے ہلایا تو اُس نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے اپنے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ عاشق علی نے اُدھر دیکھا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی رگوں میں خون یکلخت جم گیا ہو۔ ایک بہت بڑا اژدہا درخت سے اُتر آیا تھا لیکن ابھی اس کا منہ اور تھوڑا سا حصہ زمین پر آیا تھا اور باقی سب کا سب ابھی تنے کے ساتھ لپٹا ہُوا تھا۔ اُس کے منہ اور عاشق اور آمنہ کے درمیان بمشکل ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

دونوں جہاں تھے وہیں سن ہو کے رہ گئے جیسے ان میں اتنی طاقت رہی ہی نہ ہو کہ اُٹھ کر بھاگ جائیں۔ عاشق علی نے ایسے اژدہاؤں کے متعلق ایک بڑی غلط بات سنی تھی جسے وہ سچ مانتا تھا۔ وہ یہ کہ اژدہا منہ کھول کر اتنی زور سے سانس اندر کو کھینچتا ہے کہ اس کا شکار دس بارہ قدم دُور ہو تو بھی کھنچا ہُوا اس کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ چند سیکنڈ کے لئے عاشق علی نے تو یہ یقین کر لیا کہ ابھی اژدہا منہ کھولے گا' سانس اندر کو کھینچے گا اور وہ یا آمنہ اس کے منہ میں چلے جائیں گے۔

آمنہ تیزی سے اُٹھی اور ایک طرف چلنے لگی تو پاؤں کی موچ اور دوسری ٹانگ کے زخم کی وجہ سے گر پڑی۔ تب عاشق علی خوفزدگی کی حالت سے بیدار ہو گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور آمنہ پر جُھکا۔ آمنہ اٹھ رہی تھی اور عاشق نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر تیزی سے اٹھایا اور اسی طرح اٹھا کر چند قدم دُور ہو گیا۔ اس نے ایک اور درخت کے نیچے جا آمنہ کو کھڑا کیا۔ اس کی حالت یہ تھی جیسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک وہ اس خوف میں تھا کہ اژدہا جو آدھے سے زیادہ زمین پر آ گیا تھا بڑی تیزی سے دوڑے گا اور دونوں کو پکڑ لے گا۔ اژدہا کا منہ دوسرے درخت تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے پچھلے باب میں ایک اژدہا کا ذکر کیا ہے۔ یہ ہرے رنگ کا تھا اور اژدہاؤں کی یہ قسم انڈونیشیا کے جنگل میں پائی جاتی تھی۔

شاید ایک منٹ نہیں گزرا ہو گا کہ دونوں درختوں کے درمیان ہوائی جہاز کی گولیوں کی بوچھاڑ پڑی اور گولیاں پھٹیں بھی اور یہ بوچھاڑ خاصی آگے جا کر رکی۔ جس جہاز نے یہ مشین گنیں فائر کی تھیں وہ غوطے سے اُٹھ کر اوپر چلا گیا تھا۔ عاشق نے دونوں درختوں کے درمیان دیکھا تو کوئی اور ہی منظر آیا۔ ہوائی جہاز کی گولیوں نے اژدہا کو چھلنی کر دیا تھا اور اس کا باقی جسم درخت سے نیچے آ پڑا تھا۔ وہاں سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔

گولیوں کی یہ بوچھاڑ بالکل وہیں پڑی تھی جہاں ایک آدھ منٹ پہلے عاشق اور آمنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر اژدہا درخت سے نہ اترتا تو وہ وہیں بیٹھے رہتے اور اُن کے جسم وہیں چھلنی ہو کر مُردہ ہو جاتے۔ تب عاشق علی نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا۔ اللہ نے ان دونوں کو وہاں سے اٹھانے کے لئے اژدہا کو درخت سے اُتارا تھا۔

ایک ایسا ہی اژدہا مجھے بھی ملا تھا: جس پر میں نے اسے دیکھے بغیر ہاتھ رکھ دیا تھا اور ایک اژدہا عاشق علی کو ملا۔ اس سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ انڈونیشیا کے جنگل ایسے ہی اژدہاؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ کہیں کہیں گھنے جنگل میں نظر آتا تھا۔

عاشق علی کا حوصلہ بحال اور دل مضبوط ہو گیا۔ اللہ مردانِ مومن کی اسی طرح مدد کیا کرتا ہے.... یہ آخری گن فائرنگ تھی۔ اس کے بعد ہوائی جہازوں کی گھن گرج دُور دور ہی ہٹتی گئی اور بالکل خاموش ہو گئی۔ عاشق اور آمنہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور عاشق نے آمنہ کو پھر کندھے پر پہلے کی طرح اٹھا

لیا اور چل پڑا۔

وہ زیادہ دُور نہیں گیا ہو گا کہ اُسے کسی کی ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی آدمی نے اسے پکارا ہو۔ وہ رُک گیا اور ادھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ دو انڈونیشی گوریلے بڑی تیز تیز چلے آ رہے تھے۔ عاشق علی آگے کو جھکا اور آمنہ کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ آمنہ نے بھی ان دو آدمیوں کی طرف دیکھا اور بازو اوپر کر کے لہرایا۔ وہ ہنستے ہوئے دوڑ پڑے اور ان دونوں تک پہنچے۔ آمنہ نے بولنا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے وہ انہیں بتا رہی تھی کہ اُس پر کیا بیتی ہے اور وہ کس طرح یہاں تک پہنچی ہے۔ وہ دونوں انڈونیشی اسی کی تلاش میں آئے تھے۔ انہیں ابھی آگے اُس جگہ تک جانا تھا جہاں انہوں نے ہماری پلاٹون کو گھات میں لیا تھا۔ آمنہ کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئے کہ وہ زندہ ہے اور قریب سے ہی مل گئی ہے۔

اب میں آپ کو ایک ایک قدم کی یہ کہانی نہیں سناؤں گا کہ عاشق علی اور آمنہ کس طرح آگے گئے' میں کچھ اہم اور موٹی موٹی باتیں سناؤں گا.... آمنہ کو اب دو انڈونیشیوں نے باری باری کندھے پر اٹھایا اور وہاں سے کم و بیش تین میل دور ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ وہ سب ایک گھر میں داخل ہوئے۔ وہ آمنہ کا گھر تھا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ گھر میں آمنہ کی ماں تھی' باپ تھا اور اس کا ایک بڑا بھائی تھا جو گھر میں اس لئے موجود تھا کہ وہ ایک گوریلا ایکشن میں زخمی ہو گیا تھا ورنہ کوئی جواں سال انڈونیشی گھر میں نہیں ملتا تھا۔ سب کسی نہ کسی رنگ میں جنگِ آزادی میں سرگرم رہتے تھے۔

انہوں نے جب دیکھا کہ آمنہ کو اٹھا کر لا رہے ہیں تو وہ یہ سمجھ کر آمنہ کی طرف لپکے کہ شہید ہو گئی ہے لیکن اسے زندہ دیکھا تو ماں اور باپ نے انڈونیشی کندھے سے اُتار کر چارپائی پر ڈالا اور بے پناہ پیار کیا۔ انہیں جب بتایا گیا کہ آمنہ کو یہ ہندوستانی اٹھا کر لا رہا تھا تو انہوں نے جو پیار عاشق علی سے کیا' وہ عاشق علی ساری عمر نہیں بھول سکے گا۔ اتفاق سے آمنہ کا باپ اُردو بول لیتا تھا۔ اس سے عاشق علی کو سہولت میسّر آ گئی کہ وہ اشاروں میں بات کرنے سے بچ گیا تھا اور اپنے دل کی اور مطلب کی ہر بات کر سکتا تھا۔

آمنہ کے باپ نے عاشق کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ اُس نے انڈونیشیا کی آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔

"نہیں محترم!" — عاشق نے کہا — "قربانی تو آپ لوگ دے رہے ہیں کہ اپنی

لولاد تک آپ نے قربان کر دی ہے"۔

"تم نے بہت بڑی قربانی دی ہے" — باپ نے کہا — "میں ایسے چار پانچ نوجیوں سے مل چکا ہوں جو انگریزوں کی فوج سے بھاگ کر ہمارے ساتھ آن ملے ہیں۔ ہم لوگ تو اپنے وطن میں ہی ہیں' تم لوگوں نے اپنا وطن چھوڑا' فوج کی نوکری چھوڑی اور اپنے عزیز رشتہ دار چھوڑے اور اِدھر آ گئے۔ تم لوگ جانتے ہو کہ اب واپس وطن اور اپنے گھر نہیں جا سکو گے۔ جاؤ گے تو انگریز تمہیں گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دے گا"۔

"میں تو اللہ کے نام پر آیا ہوں" — عاشق نے کہا — "میں آپ لوگوں کو اتنا ہی جانتا ہوں کہ آپ مسلمان ہیں اور آپ کا مقابلہ کفّار کے ساتھ ہے۔ میں اپنی جان قربان کرنے آیا ہوں"۔

عاشق علی کی اس شخص کے ساتھ بہت باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے جو ایک دو مکالمے سنائے ہیں' یہ لبِّ لباب تھا ان کی گفتگو کا اور آخر میں آمنہ کا باپ عاشق علی سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اس نے عاشق سے کہا کہ تمہیں اصل صلہ اور اجر تو اللہ کی طرف سے ملے گا لیکن میں ایک صلہ یہ دیتا ہوں کہ ہماری جنگِ آزادی کامیاب ہو گئی تو میں اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔

عاشق علی نے جب مجھے سنایا کہ اس بزرگ اور دانشمند آدمی نے اسے اپنی بیٹی پیش کر دی تو عاشق کو ذرا سی بھی خوشی نہ ہوئی کہ اتنی خوبصورت اور نوجوان لڑکی اسے مل رہی ہے۔ عاشق علی نے یہ بھی محسوس کیا جیسے اس شخص نے کوئی اچھی بات نہیں کی کہ اس کے جذبۂ جہاد کو ٹھیس پہنچائی ہے جیسے وہ اس لڑکی کی خاطر انڈونیشیا کے مجاہدین کے پاس آیا تھا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عاشق علی انسانی فطرت کے یہ مدوجزر سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ اُس کے اندر جو انقلاب آ گیا تھا' اس کا وہ تجزیہ نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ حیران تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اُس کے حیوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی بلکہ اس میں جو جذبہ پیدا ہو گیا تھا اس جذبے کو مزید تقویت ملی۔ یہاں میں پھر کہوں گا کہ انسان اپنے ذہن میں کوئی بلند و بالا اور مقدّس نصب العین رکھ لے تو وہ اللہ کے بہت ہی قریب پہنچ جاتا ہے۔ ہماری مجبوری ہے کہ ہم لوگ بہت جلد اپنی نفسانی خواہش کے جال میں آ جاتے ہیں اور

جب طبیعت اس لذّت سے خوش ہو جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ بس جی ہم نے تو دنیا کے خزانے پالئے ہیں اور پھر ہوتا یہ ہے کہ اللہ کی ذات کو ہم ایک طرف رکھ دیتے ہیں

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہونے والے ہم جیسے ہندوستانی فوجی اللہ کو دل میں رکھ کر گئے تھے۔ بس یہ تھی اس انقلاب کی وجہ جو حقیقت ہے کہ اُس وقت میں بھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے اس داستان کے آغاز میں کہا ہے کہ میں کوئی شریف آدمی نہ تھا لیکن وہاں جا کر ایسے لمحے بھی آئے کہ میں اپنے آپ کے لئے بھی اجنبی ہو گیا۔

میں اپنی روئیداد پڑھنے والوں سے استدعا کروں گا کہ صرف کہانی کے چسکے میں نہ پڑے رہیں بلکہ اس میں سے کام کی کچھ باتیں نکال لیں اور انہیں اپنی روز مرّہ کی زندگی میں شامل کر لیں۔

○

اگر میں روایتی قسم کا تاریخی ناول لکھ رہا ہوتا تو عاشق اور آمنہ کے عشق و محبت کے کچھ مناظر تخلیق کر کے قلم بند کرتا اور بڑے رومانی مکالمے بھی لکھتا اور دو تین باب اس پر صرف کر دیتا لیکن وہاں ایسا منظر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ آمنہ جیسی بے شمار لڑکیاں اپنے جیسے نوجوان اور خوبرو لڑکوں کے ساتھ گوریلا ایکشن یا شب خون مارنے کے لئے جایا کرتی تھیں۔ لڑکے زخمی لڑکیوں کو اور لڑکیاں زخمی لڑکوں کو اٹھا کر پیچھے لاتی تھیں جس طرح عاشق علی آمنہ کو اٹھا لایا تھا۔ وہاں محبت ضرور ہوتی تھی۔ بعض انڈونیشی لڑکیاں انڈین آرمی کے فوجیوں پر مرمٹی تھیں۔ بڑے جذباتی اور دردناک واقعات ہوئے تھے۔ آمنہ تو عاشق علی کے لئے پاگل ہوئی جاتی تھی لیکن ان کا جو اصل مقصد اور نصب العین تھا' اس میں انہوں نے کوتاہی نہیں کی۔ میں آگے چل کر مناسب موقع پر آمنہ اور عاشق کی محبت کی کچھ باتیں سناؤں گا لیکن میں یہیں بتا دیتا ہوں کہ اس منظر کشی میں فلمی مکالمے نہیں ہوں گے۔

آیئے اب یہاں سے آگے بڑھتے ہیں.... آمنہ کا گاؤں اُس دریا کے پار تھا جس دریا کی سیلابی موجوں نے مجھے یہاں عثمان کے گھر تک پہنچایا تھا۔ عثمان اپنے علاقے کے گوریلوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ اُسے ہیڈ کوارٹر سے باقاعدہ آپریشن آرڈر ملتے تھے جن میں اُسے بتایا جاتا تھا کہ اُس نے اتنے آدمیوں کی ایک پارٹی فلاں جگہ فلاں مقصد کے لئے بھیجنی ہے۔ میں نے آپ کو پہلے تفصیلاً بتایا ہے کہ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی باقاعدہ پلان

ی جا رہی تھی اور ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کسی پارٹی کے دماغ میں کوئی سکیم یا کوئی ں آیا تو وہ پارٹی اپنے آپ ہی اس طرف اُٹھ دوڑتی۔

آپ کی یاد دہانی کے لئے ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ احمد سوئیکارنو کی صدارت میں باقاعدہ حکومت قائم ہو چکی تھی اور جی ایچ کیو جیسا فوجی ہیڈ کوارٹر الگ تھا جو احکام ڈ پلان کا پابند تھا اور تمام انڈونیشیا میں سرگرم عمل گوریلا فورس کو احکام کا پابند رکھنے ذمہ دار تھا۔ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ کسی کمانڈر نے احکام کی خلاف ورزی کی یا پلان کے خلاف کوئی کام کیا تو اُسے باقاعدہ سزا دی گئی۔

عثمان ایریا کمانڈر تھا اور اس کی ذمہ داری میں خاصا وسیع ایریا تھا۔ عاشق علی کو اس ایریے میں شامل کیا گیا تھا اور عاشق علی ایک ہی روز پہلے یہاں پہنچا تھا۔ عثمان نے اسے کسی ایکشن میں بھیجنا تھا۔ وہ عاشق کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکا تھا۔ اُسے ن نے اپنے ہاں ہی رکھ لیا تھا۔ ابھی عاشق کسی ایکشن میں شامل نہیں ہوا تھا۔ اس ح یہ اتفاق ہُوا کہ عاشق علی یہیں تھا اور میں پہنچ گیا۔

ان لوگوں کو تنظیم ملاحظہ ہو۔ عاشق علی آمنہ کے گاؤں پہنچا تو وہاں سے عثمان کو ع دی گئی کہ ہندوستانی فوج کا ایک مسلمان اُدھر سے بھاگ کر یہاں آ گیا ہے۔ عثمان پیغام بھیجا کہ اُسے فوراً" اُس کے پاس بھیج دیا جائے.... عاشق نے مجھے سنایا کہ وہ آمنہ کے گھر سے رخصت ہونے لگا تو اُس کمرے مین گیا جس میں آمنہ لیٹی ہوئی ۔ آمنہ کو پتہ چل چکا تھا کہ عاشق جا رہا ہے۔ عاشق جس وقت آمنہ کے کمرے میں گیا ں وقت وہاں سے سب لوگ باہر آ گئے تھے۔

آمنہ اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے بازو پھیلا دیئے اور رے لمحے وہ دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ محبت کا نہ اظہار تھا۔ وہ ایک دوسرے کی زبان تو بول ہی نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے ی باتیں اشاروں میں کہی اور سنیں۔

○

گزشتہ رات جب میں یہاں پہنچا تھا تو عثمان کے ساتھ رسمی تعارف اور دیگر باتیں ا تھیں۔ صبح اُس نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھالیا۔ اب اُس کا انداز گزشتہ رات سے ا مختلف تھا۔ گزشتہ رات وہ میزبان تھا لیکن اب وہ ایریا کمانڈر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ

میرا انٹرویو لے کر دیکھنا چاہتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں اور میں کس نیت سے آ
ہوں۔

میں نے اُسے سنایا کہ میں ہندوستان کی آزادی کا خیال دل میں لے کر انڈین آرمی
سے بھگوڑا ہُوا اور انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے کے لئے چل پڑا تھا۔ میں نے
اُسے مختصراً بتایا کہ میں برما کے جنگلات میں کس طرح بھٹک گیا تھا اور بعد میں مجھے کس
طرح پتہ چلا کہ یہ انڈین نیشنل آرمی ایک فریب ہے جو وہ ہندوستان کی تمام قوموں
خصوصاً مسلمانوں کو دے رہے ہیں اور وہ جاپانیوں کی مدد سے پورے ہندوستان پر قبض
کرنا چاہتے ہیں۔

عثمان کے ساتھ مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ اردو ذرا رُک رُک کر بول لیتا
لیکن اپنی بات پوری طرح واضح کر سکتا تھا۔ کوئی کوئی لفظ انگریزی کا بھی بول جاتا تھا۔

"میرے پردیسی دوست!" — اُس نے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لا کر کہا — "
نے صرف سنا ہے کہ آئی این اے ہندوؤں کا ایک فراڈ تھا لیکن میں نے اس فراڈ کو ا
سامنے عملی میدان میں دیکھا ہے۔ تم شاید یہ سن کر حیران ہو جاؤ کہ انڈین آرمی سے
مسلمان ہمارے پاس آئے ہیں' ان میں کچھ انڈین نیشنل آرمی کے آدمی ہیں۔ ان
سے کچھ تو قابلِ اعتماد ہیں اور وہ صحیح اسلامی جذبے سے آئے ہیں لیکن کچھ ایسے جو ہما
جنگِ آزادی کو ناکام کرنے کے لئے تخریبی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ایسے تین آد
پکڑے گئے ہیں اور ان تین میں ایک مسلمان تھا اور دو ہندو جو اپنے آپ کو مسلمان ظا
کرتے رہے۔ وہ ایک گوریلا ایکشن میں شامل ہو گئے اور ہمارے دشمن کو بھی یہ اطلا
دے دی کہ فلاں جگہ اتنی نفری کی انڈونیشی پارٹی گوریلا ایکشن کے لئے آ رہی ہے۔ ا
غداری کے نتیجے میں ہماری آدھی پارٹی مارى گئی۔ ایسے جس غدار کو ہم پکڑتے ہیں اُ
فوراً گولی مار دیتے ہیں"۔

"اللہ کا شکر ہے"۔ — میں نے کہا — "کہ میں اس آرمی میں شامل ہی نہ ہو
اور میں اور میرے کچھ اور ساتھی بھی اس آرمی کی اصلیت کو جانتے تھے.... میر
مجبوری یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی وفاداری اور اپنی نیت کا کوئی ثبوت پیش نہیں
سکتا"۔

"مجھے ثبوت کی ضرورت بھی نہیں"۔ — عثمان نے کہا — "ہمیں دھوکہ دے

تو صرف ایک بار دے سکو گے۔ تمہیں دوسرا موقع ملے گا ہی نہیں اور اگر مل گیا تو وہ
تمہاری زندگی کا آخری دن ہو گا.... میں دراصل تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کے
ہندوستانی فوجیوں سے ہوشیار رہنا بلکہ تمہاری عقل کام کرے تو ہر ہندوستانی فوجی کو شک
کی نگاہ سے دیکھنا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ شخص کہاں تک دیانتدار ہے۔
بس اتنی سی بات تمہیں سمجھانی تھی"۔

اُس نے تفصیل سے بتایا کہ امریکہ اور برطانیہ اپنی بے پناہ جنگی طاقت لے آئے
ہیں اور اس میں انہوں نے اور زیادہ اضافہ کر لیا ہے اور امریکہ کے لڑاکا بمبار ہوائی جہاز
تمام تر انڈونیشیا کے جنگلوں میں بارش کی طرح گولیاں اور بم برساتے رہتے ہیں۔ ان کا
مقصد صرف یہ ہے کہ انڈونیشی اتنی بڑی طاقت سے ڈر جائیں اور ہتھیار ڈال دیں۔
انہوں نے کہا کہ ہم اپنی لاشیں ڈال دیں گے ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

یہ بات مجھے عثمان سے معلوم ہوئی کہ ہندوستان میں مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں
اور وہ اپنے الگ ملک کا مطالبہ کر رہے ہیں جسے وہ پاکستان کہتے ہیں اور ان کا لیڈر احمد
سوئیکارنو کی طرح محمد علی جناح ہے جسے تمام ہندوستان کے مسلمان قائدِ اعظمؒ کہتے ہیں۔
انہوں نے قائدِ اعظمؒ کا نام لیا تو مسکرا کر مجھ سے پوچھا کہ محمد علی جناح تو نام ہے لیکن قائدِ
اعظمؒ کے معنی کیا ہیں۔ وہ معنی میں نے اسے بتائے۔ میں حیران تھا کہ عثمان دنیا بھر کی
سیاسی اور دیگر خبروں سے آگاہ تھا۔ اس کے پاس انگریزی اخبار بھی رکھے ہوئے تھے اور
اپنے ملک اور اپنی زبان کا اخبار بھی اس کے پاس تھا اور پھر اس کے پاس ریڈیو سیٹ بھی
تھا۔

"ہندوستان کے مسلمان سیاسی قسم کی جنگ لڑ رہے ہیں" — عثمان نے کہا —
"میرا خیال ہے کہ جنگِ آزادی ہماری طرح مسلح ہی ہونی چاہئے۔ بات یہ ہے میرے
دوست! کوئی حکمران تمہیں آزادی پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کرے گا۔ آزادی لی جاتی
ہے..... زبردستی..... ایمان اور جذبے کی طاقت سے..... پھر بھی تمہارے ملک کے حالات
ڈانواڈول کھا رہے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ تم لوگوں کو ہندوستان میں آزادی مل جائے گی
انشاءاللہ تمہارا الگ وطن بھی بن جائے گا"۔

اُس سے میں نے یہ بات سنی تو میرے تاثرات میں کچھ اور تبدیلی آ گئی اور یہ خیال
آیا کہ میں واپس چلا جاؤں اور اپنے ملک کے مسلمانوں کی جنگ آزادی میں شامل ہو

جاؤں لیکن اس خطرے کے پیشِ نظر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا کہ ابھی تو وہاں انگریزوں کی بادشاہی ہے اور وہ مجھے پکڑ کر عمر قید دے دیں گے۔

"اب ایک اور ضروری بات سن لو" — عثمان نے کہا — "میں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک خامی دیکھی ہے۔ ہمارے پاس ایسے مسلمان آئے ہیں اسلام کے نام پر مرمٹنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور جوش و خروش سے پھٹے جاتے ہیں لیکن انہیں میدانِ عمل میں اُتارتے ہیں تو وہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مذہبی مسئلہ کھڑا کر کے پیچھے ہٹ آتے ہیں۔ عام طور پر سبھی ایسے نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس جو مسلمان آئے ہیں ان کی اکثریت صحیح جذبہ لے کر آئی ہے اور انہیں میں نے ٹھیک ٹھاک لڑتے دیکھا ہے لیکن کچھ تعداد اُن کی بھی ہے جو جذبہ تو رکھتے ہیں لیکن ان کے اندر بے عملی بھی موجود ہے....

"ایسا ایک ہندوستانی مسلمان میرے پاس بھی آیا تھا۔ اُس نے تمہاری طرح چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے ساتھ ایسی باتیں کیں جیسے وہ مجھے اناڑی اور اَن پڑھ سمجھتا تھا۔ وہ مجھے دینِ اسلام کے سبق دینے لگا اور اُس نے ہمارے مجاہدین پر پہلا اعتراض یہ کیا کہ یہ لوگ داڑھی نہیں رکھتے۔ ان پر پابندی عائد کی جائے کہ داڑھیاں رکھیں۔ پھر اُس نے کہا کہ مردوں اور عورتوں کا شانہ بشانہ لڑنا جائز نہیں۔ عورت کو پیچھے رہنا چاہئے۔ عورت کے ذمے صرف یہ کام ہو کہ زخمیوں کو پانی پلائے اور انہیں پیچھے لے آئے.... ایسے ہی اس نے اور بھی اعتراض کئے اور سب سے بڑا اعتراض یہ کیا کہ لڑائی کے دوران نماز کا وقت ہو جائے تو باقاعدہ اذان دی جائے اور باجماعت نماز پڑھی جائے اور اسلام کے احکام کے مطابق دو آدمی سنتری کھڑے رہیں جو بعد میں نماز پڑھ لیں.... میں اس شخص کو سمجھ گیا اور اس کی کسی بھی بات کا جواب نہ دیا۔ اُسے چھوٹے سے ایک ایکشن میں بھیج دیا اور وہ مجھے پھر کبھی نظر نہ آیا۔ میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ زخمی بھی نہیں ہُوا اور پکڑا بھی نہیں گیا' معلوم نہیں کہاں لاپتہ ہو گیا تھا"۔

"میں اس قسم کے لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں" — میں نے کہا — "میں اپنے بارے میں قسم تو نہیں کھاؤں گا' کسی ایکشن میں بھیج کر دیکھ لیں پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اور میں مجاہد کہلوانے کے قابل بھی ہوں یا نہیں۔

ہندوستان میں ایسے بے شمار مسلمان پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کا آپ نے ذکر کیا ہے"۔

میں اس موضوع پر اور اس قسم کے "مجاہدین" کے متعلق بڑا لمبا چوڑا اظہارِ خیال اور اپنے مشاہدات پیش کر سکتا ہوں لیکن میں صرف اپنی داستان تک محدود رہوں گا۔

○

اب یہ واقعہ سنئے اور اس پر غور کریں.... مجھے اور عاشق کو چار پانچ دن وہیں رہنا پڑا۔ میں عثمان سے کہتا تھا کہ ہم دونوں کو کسی چھوٹے سے ایکشن میں نہ بھیجے بلکہ پہلے ہی ہمیں ایسے ایکشن میں بھیجے جو بہت ہی بڑا ہو اور زیادہ سے زیادہ فوج کے مقابلے میں ہو۔ میں نے جب بھی اُس کے ساتھ یہ بات کی تو وہ جواب میں صرف مسکرا دیا۔ وہ عقل اور ہوش والا آدمی تھا۔ بات مختصر اور دو ٹوک کیا کرتا تھا۔ ایک روز پتہ چلا کہ اُس نے ایک کمرے میں وائرلیس سیٹ بھی رکھا ہُوا ہے جس پر اسے پیغام ملتے ہیں اور پیغام بھیجتا بھی ہے۔ ظاہر ہے یہ وائرلیس سیٹ انہوں نے فوجیوں سے چھینا ہو گا۔

ایک روز عثمان کے ہاں دو عورتیں آئیں۔ دونوں کی عمریں تیس سال سے کچھ کم ہی لگتی تھیں اور وہ ذرا خوبصورت عورتیں تھیں۔ ایک تو انڈونیشی تھی لیکن دوسری ہندوستانی تھی۔ دونوں نے انڈونیشی لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے انڈونیشی عورت کا نام یاد نہیں رہا۔ یہی یاد ہے کہ وہ مسلمان تھی اور دوسری نے اپنا نام رقیہ بتایا۔ انڈونیشی عورت سے کچھ پوچھنا تو ضروری نہیں تھا لیکن قدرتی طور پر ہندوستانی عورت سے یہ پوچھنا ضروری سمجھا گیا کہ وہ یہاں کس طرح آئی ہے۔

اس ہندوستانی عورت رقیہ نے بتایا کہ اُس کا خاوند انڈونیشیا کے مرکزی شہر جکارتہ میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا۔ جنگِ آزادی شروع ہوئی تو وہ بھی اس میں شامل ہو گیا اور ابتداء میں ہی پکڑا گیا۔ اسے جیل میں بند کر دیا گیا اور اس کے بعد اُس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس کے بھائیوں نے کاروبار پر قبضہ کر لیا اور رقیہ کو بے دخل کر دیا۔

رقیہ جوان لڑکی تھی اور خوبصورت بھی تھی۔ ایک انڈونیشی نے اس کے ساتھ شادی کر لی لیکن ڈیڑھ سال بعد وہ مر گیا۔ اس کے بعد رقیہ نے شادی نہ کی اور دو مسلمان گھرانوں نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اُسے جب پتہ چلا کہ انڈونیشیا کے لوگ مسلح جنگِ آزادی لڑ رہے ہیں اور اس میں لڑکیاں بھی شامل ہوتی ہیں تو وہ بھی اس جہاد میں

شریک ہو گئی۔

اُس نے تین چار گوریلا ایکشن سنائے اور بتایا کہ وہ ان میں شامل تھی اور باقاعدہ لڑی تھی۔ پھر اس نے خاصی لمبی کہانی سنا کر کہا کہ آخر وہ یہاں سے پندرہ میل دُور ایک گاؤں میں آکر آباد ہو گئی اور اس کے بعد کسی ایکشن میں شریک نہ ہوئی۔

اُس کے ساتھ جو انڈونیشی عورت تھی، اُس نے رقیہ کے بیان کی تصدیق کی اور یہ بھی بتایا کہ وہ بھی دو گوریلا کارروائیوں میں شامل ہوئی تھی۔ اس عورت نے رقیہ کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ اس گاؤں میں ان کی بڑی ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہو رہی تھی لیکن فوجیوں نے اب وہاں جینا حرام کر دیا ہے۔

میں ان دونوں کا پورا پورا بیان نہیں سنا رہا۔ صرف یہ بتا رہا ہوں کہ دونوں کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے کو متاثر کرتا تھا۔ وہ مسئلہ یہ لے کر آئی تھیں کہ پندرہ میل دُور ان کا چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں جوان لڑکیاں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں سے تین چار میل دور ایک فوجی کیمپ ہے اور اس کیمپ میں سے ہر رات چھ سات فوجی آجاتے ہیں اور دھمکیاں دے کر تلاشی کے بہانے گھروں میں گھس جاتے ہیں اور لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ جس عورت یا لڑکی کو پکڑتے ہیں اُسے اس طرح ڈراتے ہیں کہ ریوالور یا رائفل کی نالی اس کے سر کے ساتھ لگا کر کہتے ہیں کہ سارے کپڑے اُتار دو۔

ان دونوں عورتوں نے یہ بھی بتایا کہ گاؤں میں دو گھر دلندیزیوں کے ہیں۔ دونوں گھروں میں شراب بڑی افراط سے مل جاتی ہے اور انہوں نے باقاعدہ شراب خانے کھول رکھے ہیں۔ فوجی وہاں آکر شراب پیتے اور گاؤں میں من مانی کرتے ہیں۔ لوگ وہاں سے بھاگ جانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے لیکن کوئی بھی وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو گاؤں سے دور یا نزدیک فوجی اسے پکڑ لیتے ہیں اور واپس گاؤں لے آتے ہیں۔ زیادہ تر تو لڑکیوں کے والدین وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں نکلنے نہیں دیا جاتا۔

"آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں؟" ـــــ عثمان نے اُن سے پوچھا۔

"اپنی حفاظت کے سوا ہم اور کچھ نہیں چاہتیں" ـــــ انڈونیشی عورت نے جواب دیا" ـــــ اگر آپ کو ہماری اور گاؤں کی لڑکیوں کی عزت کا کچھ خیال ہے تو ایک ایک

رات اپنے آدمی وہاں بھیجیں جو گاؤں میں آئے ہوئے فوجیوں کے خلاف کوئی شدید کارروائی کریں۔ ہم دونوں بھی دو دو تین تین مرتبہ ان فوجیوں کے ہاتھوں بے آبرو ہو چکی ہیں"۔

یہ بات کہتے ہوئے اس عورت کے آنسو نکل آئے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ یہ شکایت وہاں عام تھی۔ جس گاؤں کے قریب فوجی آکر ڈیرے ڈالتے تھے اس گاؤں میں وہ ایسی ہی بدتمیزیاں کرتے تھے۔ انڈونیشی مجاہدین کو اطلاع ملتی تو وہ کوئی نہ کوئی کارروائی کر کے اس گاؤں کو محفوظ کرتے یا وہاں کی ساری آبادی کو کسی اور گاؤں میں منتقل کر کے اس گاؤں کو جو خالی ہو چکا ہوتا تھا آگ لگا دیتے تھے۔ یہ دو عورتیں ویسی ہی شکایت لے کر آئی تھیں جس پر عثمان کو ذرا سا بھی شک نہ ہُوا۔ نہ اس نے کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس کی۔

ان عورتوں نے تین دنوں بعد کی رات بتائی اور کہا کہ اس رات فوج کے تمام افسر جن میں انگریز افسر بھی شامل ہیں اور ہندوستانی افسر بھی، کوئی جشن منائیں گے۔ انہیں یہ بات ان ولندیزی گھرانوں میں سے ایک گھرانے کی ایک لڑکی نے بتائی تھی جنہوں نے شراب خانے کھول رکھے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام افسر شراب پی کر گاؤں کی لڑکیوں کو اپنے ساتھ رکھ لیں گے اور انہیں خراب کریں گے۔

عثمان نے ان کی یہ ساری بات سن کر ان سے کچھ اور پوچھا اور کچھ ہدایات دیں اور انہیں رخصت کر دیا۔ انہیں اطمینان دلایا کہ اُس رات کچھ آدمی گاؤں میں موجود ہوں گے لیکن کسی کو پتہ نہ چلے کہ کچھ آدمی آرہے ہیں یا آچکے ہیں۔ عثمان نے اُن دونوں کے ساتھ اپنے دو آدمی بھیجے کہ ان عورتوں کا اکیلے جانا ٹھیک نہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ دونوں آدمی گاؤں کا جائزہ لے آئیں کہ وہاں کا ماحول وغیرہ کیسا ہے اور کتنے آدمیوں کی پارٹی کافی ہو گی اور کیا اس پارٹی کو گاؤں میں چھپانا ہے یا گاؤں کے باہر جنگل میں چھپا کر رکھنا ہے۔

دونوں عورتیں فضول سی گھوڑا گاڑی پر آئی تھیں۔ عثمان کے آدمی سائیکلوں پر اُن کے ساتھ چلے گئے۔

○

دونوں آدمی شام کے وقت واپس آئے۔ میں اتنا ہی دیکھ سکا کہ وہ واپس آگئے ہیں

لیکن مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے عثمان کو کیا رپورٹ دی ہے۔ عثمان معروف آدمی تھا اور اُس کی حیثیت ایک کمانڈر کی تھی اس لئے میں اُس کے پاس زیادہ نہیں بیٹھتا تھا۔ میں وہی بات سنا سکتا ہوں جو اپنے کانوں سنی تھی یا اپنی آنکھوں دیکھی تھی۔ ہُوا یہ کہ اگلے ہی روز عثمان نے معلوم نہیں کہاں سے بیس انڈونیشی گوریلے اکٹھے کر لئے۔ مجھے اور عاشق کو بھی عثمان نے بلا کر کہا کہ ہم دونوں اس پارٹی کے ساتھ جائیں گے۔ ہم دونوں بہت خوش ہوئے کہ جہاد میں شریک ہونے کا پہلا موقع مل گیا ہے۔

میں آپ کو خاص بات یہ بتاتا ہوں کہ عثمان خود بھی پارٹی کے ساتھ جا رہا تھا۔ مجھے بعد میں یہ پتا چلا تھا کہ ان دونوں عورتوں نے عثمان پر بہت زور دیا تھا کہ وہ اس پارٹی کے ساتھ ضرور آئے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیوں یہ ضرورت سمجھی تھی اور عثمان کیوں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ وہ غالباً" اس کیمپ کو اپنی نظروں سے دیکھنا چاہتا تھا جس کے فوجی گاؤں میں آ کر بے ہُودہ حرکتیں کرتے تھے۔ وہ کیمپ کی نفری وغیرہ دیکھنا چاہتا ہو گا۔

وجہ خواہ کچھ بھی تھی، ہُوا یہ کہ عثمان بھی ساتھ چل پڑا۔ ہم دوپہر کا کھانا کھا کر چلے تھے۔ ہمیں پیدل اُس گاؤں تک پہنچنا تھا۔

اس پارٹی کے گوریلوں نے میرے ساتھ اور عاشق کے ساتھ نہایت ہی پیار اسلوک روا رکھا۔ سب باری باری ہمارے ساتھ چلتے اور اشاروں میں کچھ کہتے اور خوشی کا اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ ان میں سے ایک بھی اردو نہیں بولتا یا سمجھتا تھا۔ ان کی ہنسی اور مسکراہٹوں میں پیار اور اخوت موج زن تھی۔

اگر علاقہ میدانی ہوتا تو پندرہ میل پیدل کوئی فاصلہ نہیں تھا لیکن زمین کھڈ نالوں سے بھرپور تھی اور ٹیلے ٹیکریوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ پھر یہ گھنا جنگل تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد راستہ مُڑتا تھا اور اس طرح فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو سورج اُفق کے قریب پہنچ چکا تھا۔

عثمان نے پوری پارٹی کو ایک ٹیکری کے پیچھے بٹھا دیا اور وہ خود آگے گاؤں کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ یہ دیکھ بھال (رُیکی) بڑی احتیاط سے کرنی تھی۔ احتیاط یہ کہ گاؤں میں ولندیزی بھی آباد تھے، انہیں پتہ نہ چلے کہ گوریلے آ گئے ہیں یا آ رہے ہیں۔

عثمان اُس وقت واپس آیا جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ پارٹی کو ٹیکری کی اوٹ

اوٹ میں ایک طرف لے گیا۔ وہاں بھی ایسی ٹیکریاں تھیں اور جنگل تو اور زیادہ گھنا تھا۔ وہاں سے گاؤں نظر آتا تھا اور گاؤں چند قدم ہی دور تھا۔ پتہ چلا کہ ولندیزیوں کے مکان گاؤں کے دوسری طرف ہیں اور جس طرف ہم چھپے ہوئے تھے، یہ مکان مسلمانوں کے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اِدھر سے ہم گاؤں میں داخل ہوتے تو دوسری طرف کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ یہ کوئی بڑا گاؤں نہیں تھا۔ پچاس یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ مکان ہوں گے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ ہمارے مکانوں جیسے مکان نہیں تھے بلکہ جھونپڑے سے تھے جو بڑے سلیقے سے تعمیر کئے گئے تھے۔

عثمان نے انڈونیشیوں کو اپنی زبان میں کچھ ہدایات دیں اور مجھے اور عاشق کو اردو میں بتایا کہ ایک ایک آدمی اس طرف سے چھُپ کر فلاں مکان کے قریب جائے گا اور وہاں اسے ایک آدمی ملے گا اور وہ اسے کسی نہ کسی مکان میں لے جائے گا۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ رات اشارہ ملنے پر حملہ کیا جائے گا اور گاؤں کے مسلمان اتنی آگ باہر جلا دیں گے کہ پوری روشنی ہو جائے گی اور کسی فوجی کو زندہ نہیں نکلنے دینا۔

یہ میں بڑی مختصر بات سنا رہا ہوں۔ عثمان کی ہدایات جنگی نقطۂ نگاہ سے بڑی ہی دانشمندانہ ہدایات تھیں اور وہ ایک ایک بات کو نہایت اچھی طرح واضح کر رہا تھا تاکہ یہ کارروائی ناکام نہ ہو جائے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ آخر میں اشارہ ملے گا تو ہر آدمی اپنے اپنے طور پر واپس جائے گا اور اپنے ساتھیوں کا انتظار نہیں کرے گا۔

○

سورج غروب ہو گیا اور شام بڑی جلدی گہری ہو گئی۔ جنگل کی شام ایسی ہی گہری ہو جایا کرتی ہے۔ عثمان ہمارے ساتھ تھا۔ اُس نے ایک ایک آدمی کو گاؤں میں بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک آدمی گاؤں میں چلا جاتا تھا تو دوسرا آدمی ادھر سے چل پڑتا تھا۔ عثمان نے کہا تھا کہ اپنے ہتھیار تیار رکھنا تاکہ کسی آدمی کو کوئی دشمن یا فوجی دیکھ لے اور اسے پکڑنے کو آئے تو اسے گولی مار دی جائے۔

اس طرح ہم سب گاؤں میں داخل ہو گئے۔ میں اور عاشق ایک مکان میں چلے گئے۔ وہاں ہمیں گاؤں کا ایک آدمی لے گیا تھا۔ اب ہم اشارے کے منتظر تھے۔ مجھ پر ہیجانی سی کیفیت طاری تھی۔ عاشق علی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس کے جذبات میں ہلچل مچی ہوئی ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو ہم مسکرائے لیکن

یہ عام قسم کی مسکراہٹیں نہیں تھیں۔ ہم پہلے ایکشن میں آئے تھے اور اس قسم کی ذہنی کیفیت قدرتی بات تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور گاؤں میں بالکل خاموشی تھی۔ رات پوری طرح تاریک ہو چکی تھی۔ اب تک وہ ہنگامہ شروع ہو جانا چاہئے تھا جس کی رپورٹ عثمان کو ملی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا' میری بے تابی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے عاشق سے کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گوریلا پارٹی کو گاؤں میں داخل ہوتے ولندیزیوں نے دیکھ لیا ہو گا اور انہوں نے فوجیوں کو اطلاع دے دی ہو گی کہ آج رات گاؤں میں نہ آئیں کیونکہ گوریلے گھات میں بیٹھے ہیں۔ عاشق علی نے کہا کہ پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فوجی چپکے سے آ کر گاؤں کو محاصرے میں لے لیں اور ہم مارے جائیں۔

کچھ دیر اور گزری تو عثمان اس جھونپڑے میں داخل ہُوا جس میں عاشق علی اور میں بیٹھے انتظار کرتے تھے۔ اُس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگ دھوکے میں آ گئے ہیں لیکن ابھی کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس شک کی اُس نے وجہ یہ بتائی کہ ہندوستانی عورت تو اس کے ساتھ تھی لیکن دوسری جو انڈونیشی تھی وہ کہیں غائب ہو گئی ہے۔ عثمان نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کوئی شراب خانہ نہیں اور چند ایک گھرانے آباد ہیں جن میں تین چار ولندیزیوں کے ہیں۔ اگر یہاں افسروں نے آ کر جشن منانا ہوتا تو وہ اب تک آ چکے ہوتے۔ یہاں جشن کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔

عثمان ابھی یہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ باہر سے بلند آواز اٹھی۔ کوئی آدمی انڈونیشی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ عثمان نے کہا کہ اس کا شک ٹھیک نکلا ہے۔ فوجیوں نے گاؤں کو محاصرے میں لے لیا ہے اور انہوں نے انڈونیشی زبان میں اعلان کروایا ہے کہ تمام مسلمان گوریلے باہر آ کر ہتھیار ڈال دیں ورنہ سب مارے جائیں گے اور گاؤں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ عثمان نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس کا نام لے کر کہہ رہے ہیں کہ عثمان باہر آ جائے۔

اس کے فوراً" بعد اردو میں اعلان ہُوا کہ انڈین آرمی کے جو دو حوالدار گاؤں میں ہیں وہ باہر آ کر اپنے آپ کو فوج کے حوالے کر دیں تو انہیں معاف کر دیا جائے گا ورنہ گاؤں میں ہی انہیں گولی مار دی جائے گی۔

اب تو کوئی شک نہ رہا کہ عثمان جیسا عقل مند کمانڈر پھندے میں آ گیا تھا۔ میں نے

اُسے کہا کہ اس ہندوستانی عورت کو نہ چھوڑے اور اگر ہم یہاں سے صحیح سلامت نکل گئے تو اس عورت کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ عثمان نے کہا کہ اسی شک پر اُس نے اس عورت کو اپنے ساتھ پابند کر لیا تھا اور وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ پھر عثمان نے مجھے اور عاشق علی کو یہ ہدایت کی کہ ہم باہر آ کر کسی اچھی پوزیشن میں چلے جائیں اور کوئی فوجی نظر آئے تو گولی مار دیں اور پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں اور اگر ہم مناسب سمجھیں اور صورتِ حال اجازت دے تو ہم پیچھے سے فوجیوں پر گولیاں برسائیں۔

میرے پاس سٹین گن تھی اور تین گرینیڈ تھے۔ سٹین گن کی میگزینیں کافی تھیں۔ عاشق علی کے پاس بھی سٹین گن تھی اور تین گرینیڈ تھے۔ عثمان نے کہا کہ وہ اب باقی پارٹی کے ہر آدمی کے پاس جائے گا اور اب ہم اپنے اپنے طور پر لڑیں گے یہاں سے نکلیں گے۔

○

عثمان ہمیں ہدایات دے کر چلا گیا۔ اُس نے محاصرہ توڑنے کے انتظامات کرنے تھے۔ اُس نے جاتے جاتے ہمیں کہا تھا کہ اب تم دونوں انگریزوں کی فوج میں نہیں ہو اس لئے یہ ایمونیشن سوچ سمجھ کر اور کنجوسی سے فائر کرنا۔ وہ ہمارے جھونپڑے سے نکلا ہی تھا کہ تین چار دھماکے سنائی دیئے اور ان کے فوراً" بعد باہر کی فضا روشن ہو گئی۔ یہ ان فوجیوں کی حماقت تھی کہ انہوں نے روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے تھے اور یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کی روشنی میں وہ خود بھی ہمیں نظر آ جائیں گے۔ میں اور عاشق جھونپڑے سے نکلے اور کسی اچھی پوزیشن کی تلاش اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک جھونپڑا نظر آیا جس کے پچھلی طرف دو کھڑکیاں تھیں۔ ہم اس کے اندر چلے گئے۔ یہ خالی تھا۔

پہلے فائر کئے ہوئے روشنی راؤنڈ نیچے آ چکے تھے کہ فوجی بیوقوفوں نے چار پانچ اور روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے اور مجھے اس جھونپڑے سے پچیس تیس گز دور چار پانچ ہندوستانی فوجی نظر آئے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سی رجمنٹ کے تھے۔ میں نے سٹین گن سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا اور وہ سب ڈھیر ہو گئے۔ اُدھر عاشق نے بھی تین چار کو گرا لیا اور ہم دونوں اس جھونپڑے سے نکل گئے۔ اتنی عقل تو مجھ میں تھی کہ پوزیشن بدل بدل کر فائر کرنا ہے۔

اب تو یہ عالم تھا کہ دونوں طرف کی فائرنگ سے رات لرز رہی تھی اور کوئی آواز

سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ عثمان نے ایک نہایت اچھا انتظام کر لیا۔ اس نے ایک خالی جھونپڑے کو جو لکڑی کا بنا ہُوا تھا آگ لگا دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور خالی جھونپڑے سے شعلے اٹھنے لگے۔ اب ہمارے لئے روشنی کافی ہو گئی تھی۔ فوجیوں نے گاؤں میں گرینیڈ پھینکے۔ آدھے سے زیادہ گاؤں خالی تھا۔ گرینیڈ وہ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے جو فوجیوں نے سوچا ہو گا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میری پارٹی کے انڈونیشی گوریلے کیا کچھ کر رہے تھے لیکن وہ سب تجربہ کار گوریلے تھے اور عثمان کے چُنے ہوئے۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کے اندر اور باہر بھی گرینیڈ پھٹنے لگے لیکن میں نے اور عاشق نے ابھی ایک بھی گرینیڈ نہیں پھینکا تھا کیونکہ ہم اتنی قیمتی چیز ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہاں میں اپنی اور عاشق کی ایک کمزوری بتا دوں۔ ہم دونوں حوالدار کلرک تھے اور ہمیں لڑنے کا تجربہ نہیں تھا۔ ہمارے پاس لڑنے کا جذبہ تھا اور ہم ہتھیاروں کا استعمال جانتے تھے اور ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں سے نکلنا ہے اور پیچھے سے ان فوجیوں پر فائر کرنا ہے۔

میں نے صرف ایک جھلک دیکھی کہ چھ سات فوجی گاؤں میں داخل ہو گئے تھے اور کسی طرف سے گرینیڈ آیا جو ان کے قدموں میں پھٹا۔ تصوّر میں لائیں کہ اُن کے جسموں کا کیا حشر ہُوا ہو گا۔ معلوم نہیں کہ یہ گرینیڈ اُن کے اپنے ہی ساتھی نے پھینکا تھا یا کسی گوریلے نے۔ میں اور عاشق تین یا شاید چار جھونپڑے بدل چکے تھے اور ہم دونوں تین تین چار چار فوجیوں کو نشانہ بنا چکے تھے۔

کچھ دیر بعد پانچ چھ جھونپڑے جل رہے تھے۔ اُن کے شعلے دور اوپر تک جا رہے تھے۔ اور انہوں نے تاریک رات کو چمکتا ہُوا دن بنا دیا تھا۔ میں نے ایک بڑا ہی بھیانک منظر دیکھا۔ اُس وقت میں اور عاشق ایک جھونپڑے سے نکل کر کسی اور پوزیشن کی طرف جانے لگے تھے۔ دو فوجی سٹین گنیں سیدھی کئے' اِدھر اُدھر دیکھتے ایک جلتے ہوئے مکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے دو انڈونیشی گوریلے آئے اور انہوں نے ایک ایک فوجی کو بازوؤں میں جکڑ کر اٹھا لیا اور جلتے ہوئے جھونپڑے کے شعلوں میں پھینک دیا ان کی چیخیں فضا کو چیر رہی تھیں۔ وہ دوڑتے ہوئے شعلوں سے نکلے تو ان کی پوری کی پوری وردی شعلے بنی ہوئی تھی۔ انڈونیشی تو وہیں کہیں غائب ہو گئے لیکن ان دونوں کو میں نے زندہ جلتے' چیختے اور تڑپتے اور پھر گرتے دیکھا۔

پھر مجھے اور عاشق کو ایک طرف سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ ہم دونوں نے در اصل جان کا خطرہ مول لیا تھا۔ اس طرف فوجی ہو سکتے تھے لیکن ہماری خوش نصیبی کہ نہیں تھے۔ ہم دونوں دبے پاؤں باہر نکل گئے اور قریبی ٹیکری پر جا چڑھے۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں اِکا دُکا فوجی نظر آ جاتا تھا اور دوسرے لمحے ہمارے فائر سے گرتا' تڑپتا اور ٹھنڈا ہو جاتا۔ میں یوں محسوس کرنے لگا جیسے کچھ اور گوریلے بھی باہر آ گئے ہیں اور انہوں نے فوجیوں پر پیچھے سے فائرنگ شروع کر دی ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان فوجیوں کی نفری کوئی زیادہ نہیں پچاس ہو سکتی تھی اور زیادہ سے زیادہ ایک سو یعنی ایک کمپنی۔ میرے اندازے کے مطابق آدھی نفری زخمی یا ہلاک ہو چکی تھی۔ ہم جس ٹیکری پر تھے اُس طرف کا بھی ایک جھونپڑا جلنے لگا۔ جھونپڑے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے' انہیں تو جلنا ہی تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے ایک گورا چہرہ نظر آیا۔ وہ انگریز افسر تھا جو یقیناً" کمپنی کمانڈر ہو گا۔ اس کے ساتھ کمپنی صوبیدار ہو گا اور دو اور جوان تھے۔ بڑا خوبصورت ٹارگٹ تھا۔ میں نے اور عاشق نے مل کر ان پر فائر کیا اور سب کو ڈھیر کر دیا۔

یہاں میں آپ کو سٹین گن کے متعلق ایک بات بتاتا ہوں۔ سٹین گن میں یہ خرابی ہے کہ یہ ٹھیک نشانے پر فائر نہیں کر سکتی۔ اگر آپ نشانہ لے کر فائر کریں گے تو گولیاں نشانے سے اوپر جائیں گی۔ سٹین گن دراصل اٹلی کے ڈاکوؤں نے بنائی تھی اور وہاں سے یہ فوج میں آئی۔ اسے ہجوم پر فائر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے فوج میں بتایا گیا تھا کہ سٹین گن کا فائر صحیح نشانے پر کرنا ہو تو نشانے سے گن کو ذرا نیچے رکھیں۔ میں نے یہ بات عاشق کو بھی بتا دی تھی۔ اگر ہم یہ بات نہ جانتے تو گولیاں ضائع کرتے رہتے۔

فوجیوں کی طرف سے فائر میں کچھ کمی آنے لگی۔ عاشق نے کہا کہ اب ہمیں پیچھے ہٹ جانا چاہئے۔ اُس کا مشورہ ٹھیک تھا۔ ہم دشمن کو اچھا خاصا نقصان پہنچا چکے تھے اور ان کو ہم بڑی اچھی کارکردگی کی رپورٹ دینے کے قابل ہو گئے تھے۔ پیچھے نکلنے کے لئے راستہ صاف تھا۔ ہم وہاں سے چل پڑے۔ شک ہوتا تھا کہ ہم راستہ بھول بیٹھے ہیں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہاں ٹیکریاں زیادہ تھیں اس لئے راستے کے موڑ بھی قدم قدم پر تھے۔ اللہ کا نام لیتے ہوئے ہم چلتے گئے' کچھ بھٹکے بھی اور آخر واپس ٹھکانے پر پہنچ

گئے۔ وہاں پہنچے ہی تھے کہ فجر کی اذان کی مقدّس صدا اٹھی۔ عثمان کے گھر والے اور دو تین ساتھی بے تابی سے منتظر تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی سب نے گھیر لیا اور پوچھا کہ وہاں کیا ہُوا ہے۔ ہم نے بات یہاں سے شروع کی کہ بہت بڑا دھوکہ ہُوا ہے اور پھر انہیں اس معرکے کا پورا حال سنایا۔

باتیں تو بہت سی سنانے والی ہیں لیکن میں سب سے زیادہ اہم بات ہی سناؤں گا۔ صبح طلوع ہونے تک عثمان بھی خیر خیریت سے آگیا اور اس سے کچھ پہلے اور کچھ بعد گیارہ ساتھی واپس آئے' باقی شہید ہو گئے تھے۔ عثمان کے ساتھ وہ ہندوستانی عورت تھی جس کا نام رقیہ تھا۔ معلوم ہُوا کہ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے تھے اور جب معرکہ ختم ہُوا تو اسے اٹھا کر لے آئے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ان دو عورتوں نے ہمیں دھوکہ دیا تھا اور اس پھندے میں لے گئی تھیں لیکن یہ عورت کچھ بتاتی نہیں تھی۔ ابھی تک کہہ رہی تھی کہ اس نے کوئی دھوکہ نہیں دیا لیکن اس سے پوچھتے تھے کہ جو انڈونیشی عورت اس کے ساتھ آئی تھی وہ کہاں ہے تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتی تھی۔

اس عورت کے بال اس کی کمر تک لمبے تھے۔ عثمان نے دو رسّیاں منگوائیں۔ اس عورت کے بال دو حصوں میں تقسیم کر کے اوپر کو کئے اور ایک رسّی ایک طرف کے بالوں کے ساتھ اور دوسری رسّی دوسری طرف کے بالوں کے ساتھ باندھ دی اور اُسے باہر لے گئے۔ ایک درخت کے اونچے ٹہن پر ایک لڑکے کو چڑھایا اور دونوں رسّیوں کے سرے اوپر پھینکے۔ وہ سرے لڑکے نے پکڑ لئے۔ عورت کو پکڑ کر اوپر اٹھایا اور لڑکے سے کہا کہ وہ دونوں رسّیاں ٹہن کے ساتھ باندھ دے۔ وہ اس نے باندھ دیں اور عورت کو چھوڑ دیا۔ وہ اب بالوں سے لٹک رہی تھی اور اس کے پاؤں زمین سے ڈیڑھ دو فٹ اوپر تھے۔ اس نے چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ عثمان نے اپنے قریب کھڑے ایک آدمی سے کچھ کہا۔ وہ آدمی اس عورت تک گیا اور اسے کمر سے پکڑ کر ذرا اوپر اٹھایا اور چھوڑ دیا۔ اس جھٹکے سے اور اُس کے جسم کے وزن سے اس کے بال اکھڑتے تھے اور جو اسے تکلیف ہوتی تھی وہ اس کی چیخوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ آدمی تین چار منٹ بعد اسے اسی طرح ذرا اوپر اٹھا کر چھوڑ دیتا۔ یہ اذیّت کم از کم یہ عورت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

تقریباً" پندرہ منٹ بعد عثمان اُس کے پاس گیا اور کہا کہ یہ ابھی ابتدا ہے۔ اس کے بعد اسے جو اذیّتیں دی جائیں گی وہ اسے زندہ بھی نہیں رہنے دیں گی اور مرنے بھی نہیں دیں گی لیکن وہ عورت مان گئی اور کہنے لگی کہ وہ سب کچھ بتائے گی۔ اسے اتار دیا گیا اور اس کے بالوں سے رسّیاں کھول دی گئیں۔ وہ بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر رونے لگی۔ عثمان نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور جھٹکے سے اٹھا کر کمرے میں لے گیا اور اسے کہا کہ وہ زیادہ انتظار نہیں کرے گا۔

اس کمرے میں اور کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ میں بھی باہر کھڑا رہا اور جو بات بعد میں معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ انڈونیشی عورت جو اس کے ساتھ تھی اور اپنے آپ کو مسلمان کہتی تھی وہ دراصل ولندیزی تھی۔ اس کے نقش انڈونیشیا کے لوگوں جیسے اس لئے تھے کہ اس کی ماں انڈونیشی اور باپ ولندیزی تھا۔

یہ ہندوستانی عورت' اپنے بیان کے مطابق' مسلمان نہیں ہندو تھی۔ اس کا تعلق انڈین نیشنل آرمی کے ساتھ تھا۔ میں نے انڈین نیشنل آرمی کے بانی سبھاش چندر بوس کی جو فوٹو دیکھی تھی' اس میں اس کے ساتھ وردی پہنے ہوئے دو جوان سال لڑکیاں بھی تھیں۔ اس نے عورتوں کی فوج الگ بنانے کی بھی کوشش کی تھی۔ معلوم ہُوا کہ بنگال کی کچھ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ملایا پہنچایا گیا تھا۔ پھر وہ انڈونیشیا آگئی تھیں۔ یہ عورت رقیہ نہیں بلکہ نرملا تھی۔

اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اسے اور اس کے ساتھ آنے والی ولندیزی عورت کو فوج کے اعلیٰ امریکی اور انگریز افسروں نے اس راستے پر ڈالا تھا اور اس کارروائی میں جو انہوں نے کروائی تھی مقصد یہ سامنے رکھا تھا کہ عثمان کو قتل کروانا ہے کیونکہ وہ اس علاقے کا بڑا مشہور اور دہشت ناک گوریلا کمانڈر تھا۔ ان عورتوں کو فوج کی طرف سے بھیجا گیا تھا کہ اس طرح عثمان کو اس گاؤں میں کھینچ کر لاؤ اور زیادہ سے زیادہ ساتھی عثمان کے ساتھ آئیں۔

اس عورت نے صاف الفاظ میں کہا کہ امریکی اور انگریز تو چاہتے ہی ہیں کہ مسلمان آزاد نہ ہوں لیکن ہندوستان کے ہندو بھی نہیں چاہتے کہ انڈونیشیا کے مسلمانوں کی الگ مملکت بنے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ انڈین نیشنل آرمی کا اصل مقصد ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا تھا۔ اس طرح اُس نے کوئی پردہ نہ رہنے دیا۔

عثمان نے اس عورت سے یہ بیان لیا اور اسے کمرے سے باہر لے آیا۔ اُس وقت

ہم سب باہر کھڑے تھے۔ عثمان نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اُس عورت نے حیرت زدہ نظروں سے عثمان کی طرف دیکھا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ اُسے تو حیران ہونا ہی تھا۔ ہم سب حیران رہ گئے کہ عثمان اس عورت کو آزاد کر رہا ہے۔ عثمان نے دیکھا کہ عورت ابھی وہیں کھڑی ہے تو اُسے ایک بار پھر کہا کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ چل پڑی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوگی کہ عثمان نے اپنے قریب کھڑے ایک گوریلے سے اُس کی ٹامی گن لی جس پر میگزین چڑھی ہوئی تھی۔ عثمان نے گن اُس عورت کی طرف کی اور ایک برسٹ فائر کیا۔ عورت رُکی، گری اور بغیر تڑپے مرگئی۔

اس ہندو عورت نرملا پر کیجئے۔ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو نقصان پہنچانے کے لئے وہ کتنی بڑی سازش میں شریک ہوئی تھی۔ یہ سازش انڈونیشی مجاہدین آزادی کے لئے بھی خطرناک اور اس کی اپنی ذات کے لئے بھی خطرناک تھی۔ اس کے لئے آخر خطرناک اور جان لیوا ہی ثابت ہوئی۔ اُس کے دل میں مسلمانوں کی ایسی نفرت بھر دی گئی تھی کہ اُس نے خطرہ مول لے لیا اور اپنی جان دے

میں جن انڈونیشی مجاہدین کی پارٹی میں شامل ہُوا تھا وہ شہروں سے دُور دُور ہی رہی۔ اُس پارٹی کا دائرۂ عمل دیہاتی علاقہ تھا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ وہاں کسی کی پسند اور مرضی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کس پارٹی میں رہنا چاہتا ہے۔ ایسے فیصلے گوریلوں کی مرکزی تنظیم کیا کرتی تھی۔ انڈین آرمی سے جو مسلمان فوجی انڈونیشی مجاہدین سے جا ملے تھے، انہیں باقاعدہ گوریلا تنظیم میں شامل کیا گیا تھا اور کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اپنی من مانی کارروائیاں کرتا پھرتا۔ جو حکم ملتا یا جو آپریشن آرڈر آتا، اس کے مطابق کارروائی کرنی ہوتی تھی۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں بڑے شہروں سے دُور ہی رہا اس لئے شہروں کے متعلق مجھے جو باتیں معلوم ہوئی تھیں وہ آزادی مل جانے کے بعد ہوئی تھیں۔ معلوم ہُوا تھا کہ کچھ ہندو انڈونیشی گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض نے یہ دھوکہ دیا کہ آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی اصلیت پر پردہ نہ ڈالا۔ انہوں نے اپنے اصل نام بتائے اور کہا کہ وہ ہندو ہیں اور وہ اس لئے انڈونیشیا کی جنگ

آزادی میں شامل ہو رہے ہیں کہ انہیں انگریزوں سے نفرت ہے اور یہ بھی کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک دشمن ہے۔

اُن ہندوؤں میں زیادہ تعداد اُن ہندوؤں کی تھی جو میری طرح آرمی سے بھاگ انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے تھے لیکن اب وہ اس ڈر سے واپس ہندوستان نہ جاتے تھے کہ پکڑے جائیں گے اور سزا پائیں گے۔ یہ تو ایک وجہ تھی کہ وہ انڈونیشیا رک گئے تھے۔ ان میں سے چند ایک انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہوئے تھے یہ ایک باقاعدہ پلان کی ہوئی سازش تھی جس کے تحت ان ہندوؤں کو مجاہدینِ آزادی درمیان چھوڑ دیا گیا تھا۔ کچھ ہندو انڈونیشیا کے ہی رہنے والے تھے۔ وہ ہندو تاجروں اور دکانداروں کی اولاد تھے۔ ان کا دائرۂ عمل شہروں میں تھا۔ ان کی کئی باتیں سازشیں مجھے سنائی گئی تھیں جو میں یہاں سنانے بیٹھ گیا تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ان یہ تھا کہ ظاہری طور پر وہ انڈونیشی گوریلا مجاہدین کے ساتھ رہتے اور ہر کارروائی سرگرم ہوتے تھے لیکن درپردہ وہ مسلمانوں کو دھوکے دیتے تھے اور ان میں بددلی آپس میں نفاق پیدا کرتے تھے۔

میں ذرا یہ بات واضح کرنے کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ جکارتہ انڈو مرکزی شہر تھا۔ اس کے مضافات میں گوریلوں کی ایک بڑی پارٹی سرگرم رہتی تھی جو کمانڈر انڈین آرمی سے بھاگ آنے والا ایک مسلمان حوالدار تھا۔ اس پارٹی میں دو بھی شامل ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے ہر گوریلا ایکشن میں بڑی ہی دلیری اور جانبازی مظاہرے کئے اور پارٹی میں نام پیدا کر لیا۔ پھر پارٹی میں پارٹی کمانڈر یعنی اس حوالدا خلاف ایک لہر چل پڑی جیسے پارٹی اس کمانڈر سے مطمئن نہیں رہی تھی۔

پارٹی میں ایک اور انڈونیشی تھا جس کے حق میں آوازیں اٹھنے لگیں اور مطالبہ سر اٹھانے لگا کہ پارٹی کمانڈر تبدیل ہونا چاہئے اور فلاں کو کمانڈر بنانا چاہئے۔

صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی کہ پارٹی کمانڈر اور اس انڈونیشی کے مابین جسے پارٹ کمانڈر بنانا چاہتی تھی' ایسی چپقلش پیدا ہو گئی کہ نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی اور پارٹی گوریلا کارروائیاں تھیں وہ ناکام رہنے لگیں اور پھر یہ پارٹی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی دونوں حصے ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ ایسے نظر آنے لگا تھا کہ یہ پارٹی کسی آپس میں ہی لڑ مرے گی۔

انڈین آرمی کے مجھ جیسے جو جوان انڈونیشی مجاہدینِ آزادی سے جا ملے تھے' وہ دین ایمان کی دولت سے مالا مال تھے اور انہیں کوئی لالچ نہ تھا۔ وہاں کوئی تنخواہ نہیں لیتے تھے نہ انہیں یہ توقع تھی کہ انڈونیشیا آزاد ہو جائے گا تو انہیں فوج میں بڑے بڑے عہدے دیئے جائیں گے۔ یہ حوالدار جو اس پارٹی کا کمانڈر تھا کچھ زیادہ ہی مردِ مومن ثابت ہُوا۔ وہ پنجاب کے علاقہ پوٹھوہار کا رہنے والا تھا۔ ایک روز اس نے ساری پارٹی کو اکٹھے بٹھالیا اور درمیان میں قرآنِ پاک رکھ دیا پھر پوچھا کہ جو کوئی بات کرے وہ اس کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر کرے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جس کی بات جھوٹی ثابت ہوئی' اُسے یہیں گولی مار دوں گا۔

میں جنگِ آزادی سے پہلے کی بات نہیں کرتا اور پھر میں جب انڈونیشیا سے واپس آ رہا تھا' اس کے بعد کی بات نہیں کرتا کہ انڈونیشی مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے اور کیا وہ اب مسلمان رہے بھی تھے یا نہیں' میں جنگ آزادی کے دوران کی بات کرتا ہوں۔ اُس وقت انڈونیشی پکے مسلمان اور ایماندار تھے۔ جھوٹ بولنے اور قرآن پر جھوٹی قسم کھانے کو تو وہ گناہ کبیرا سمجھتے تھے۔ وہ ایسے نہ ہوتے تو آزادی کی ضرورت ہی نہ سمجھتے۔ کہتے کہ کوئی آ جائے' ہم پر حکم چلائے لیکن ہماری ضروریات پوری کرتا رہے اور ہمارے نیک و بد سے نہ روکے۔

حوالدار نے جب قرآن سامنے رکھ کر تحقیقات شروع کی اور کہا کہ کھُل کر بات کریں اور ایک دوسرے سے مت ڈریں اور دل میں صرف اللہ کا خوف رکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہر ایک نے بتایا کہ اسے فلاں بات فلاں نے بتائی تھی اور اُس نے کیا کہا تھا۔ یہ بات اُن دو ہندوؤں پر جا رُکی اور پتہ چلا کہ یہ فساد خفیہ طریقوں سے انہوں نے ہی پیدا کیا تھا۔

حوالدار کو کچھ شک ہُوا۔ یہ دونوں ہندو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے تھے۔ حوالدار اُٹھا اور ان دونوں کے کپڑے اتروا کر بالکل برہنہ کر دیا تو سب نے دیکھا کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ حوالدار نے وہیں سے باہر نکل کر ان دونوں کو ایک درخت کے ساتھ کھڑا کیا اور پارٹی سے کہا کہ سب ان پر فائر کرو۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور دونوں ہندوؤں کے جسم گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔

یہ واقعہ ایسا ہے جس میں ان ہندوؤں کا پتہ چل گیا تھا' کئی واقعات ایسے ہوئے کہ

ہندوؤں کی سازش کامیاب ہوئی اور متعلقہ گوریلا پارٹیوں میں فتنہ فساد ہُوا۔

یہ الگ بات ہے کہ ان سازشی کارروائیوں کا مجموعی طور پر جنگِ آزادی پر کوئی بُرا اثر نہ ہُوا لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ ہندو نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان ہندوؤں کی ایسی تخریبی سرگرمیاں شہروں تک محدود تھیں مثلاً" جکارتہ' جوگ جکارتہ' بنڈونگ وغیرہ۔

○

میں جانتا ہوں کہ بعض قارئین کرام میری ان باتوں سے بوریت محسوس کرتے ہوں گے۔ میں آپ کی اس فرمائش کا احترام کرتا ہوں کہ دلچسپ' سنسنی خیز اور جذباتی سے واقعات سناؤں لیکن میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس حقیقی داستان کو ناول بنا دوں۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور قارئین کرام سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ خفا نہیں ہوں گے کہ میں ایک ہی بات بار بار کہے جا رہا ہوں۔ ضرورت یہ ہے کہ میرے ان تجربات اور مشاہدات سے آپ سب کو کچھ حاصل ہو۔ حاصل اسی صورت میں ہو گا کہ آپ میری روئیداد کو ذاتی سطح پر نہیں بلکہ قومی سطح پر آکر پڑھیں۔

بات اتنی سی ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلمان کا نہ کبھی دوست رہا ہے اور نہ کبھی رہے گا۔ میں نے انڈونیشیا کی جنگ آزادی لڑی ہے۔ اپنی جنگِ آزادی یعنی تحریکِ پاکستان میں شریک نہیں ہو سکا تھا۔ انڈونیشیا سے واپس آکر مجھے تحریکِ پاکستان کی جو باتیں معلوم ہوئی تھیں ان میں خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے تحریکِ پاکستان کی جڑیں کاٹنے کے لئے کیا کچھ کیا تھا۔ قومی یعنی سیاسی سطح پر تو ہندوؤں نے جو کیا وہ اُس وقت کے اخباروں میں اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں میں محفوظ ہے لیکن ہندوؤں نے ذاتی سطح پر مسلمانوں کو یا یوں کہئے کہ سرکردہ مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے اپنی دولت اور اپنی خوبصورت بیٹیاں بھی استعمال کی تھیں۔

چند مہینے پہلے آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ بھارت سے ایسی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ انہوں نے یعنی بھارت نے پاکستان پر جو ثقافتی (کلچرل) حملہ کیا ہے وہ سو فیصد کامیاب ہے۔ ہندو لیڈر تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اپنا کلچر آہستہ آہستہ اسلامی کلچر پر غالب کر دیا ہے اور اب پاکستان پر فوجی حملے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ ہندو لیڈروں کے ان بیانات کو فلمی بڑھکیں نہ سمجھیں۔ قومی سطح پر آکر ان پر غور

کریں۔ ان کا براہِ راست تعلق امریکہ کے "نیو ورلڈ آرڈر" کے ساتھ ہے۔ پاکستان سے اسلام پسندی اور اسلام کی عسکری روح کو ختم کرنے کے لئے امریکہ بھارت کو استعمال کر رہا ہے۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ ہمارے نوجوان بلکہ نوجوانوں کے والدین بھی ہندو کا کلچر اُس کی فلموں وغیرہ کے ذریعے دل و جان سے قبول کرتے چلے جا رہے ہیں اور وہ نتائج سے بے خبر ہیں۔

میں آپ کو اس باب میں ایک زبردست گوریلا ایکشن سناؤں گا جو آپ کو چونکا دے گا لیکن میں آپ کو اسلام اور پاکستان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ میری یہ باتیں بھی سن لیں اور ان پر غور بھی کریں اور عمل بھی۔

میں یہاں دو تین خطوط کے جواب مختصر طور پر دوں گا۔ "حکایت" کے ایڈریس پر مجھے یہ خطوط ملے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ میں سوئیکارنو کو فرشتہ سیرت لیڈر بنا کر پیش کر رہا ہوں لیکن وہ تو عیّاش' شرابی اور اتنا آزاد خیال آدمی تھا کہ اُس کا سارا کردار اسلام کے منافی تھا..... جواب میں عرض ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو قائدِ اعظمؒ کے خلاف ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ کی داڑھی نہیں تھی' نماز نہیں پڑھتے تھے' انگلینڈ گئے تو وہاں شراب پیتے تھے اور ان کی رشتے داریاں پارسیوں کے ساتھ تھیں وغیرہ۔ ایک عالمِ دین نے تو قائدِ اعظمؒ کو کافرِ اعظم بھی کہا ہے۔ مولوی صاحبان کے علاوہ یہ الزام لگانے والے اُن سیاسی پارٹیوں کے لوگ بھی ہیں جو تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ قائدِ اعظمؒ اسلامی نظام کے سخت خلاف تھے اور وہ سیکولر نظام چاہتے تھے اور یہ بھی کہ وہ تھے ہی انگریزوں کے ایجنٹ۔

یہی سلوک احمد سوئیکارنو کے ساتھ ہُوا اور ہو رہا ہے۔ میں سوئیکارنو کو ایک فرشتہ بنا کر پیش نہیں کر رہا لیکن یہ مت بھولیں کہ تاریخ تاقیامت گواہی دیتی رہے گی کہ سوئیکارنو جنگِ آزادی کے لیڈر اور ہیرو تھے۔ انہوں نے دو بڑی طاقتوں' امریکہ اور برطانیہ' کی بے پناہ جنگی طاقت کے خلاف منظم طریقے سے جنگِ آزادی لڑوائی' اپنے ان عوام کو جو بڑی لمبی مدت سے ولندیزیوں کے غلام چلے آ رہے تھے' ایک غیور اور پُروقار قوم بنایا اور دنیا کے نقشے پر ایک نیا اور آزاد ملک پیدا کیا جس کا نام انڈونیشیا رکھا۔ آج تمام ملک ڈرتے ہیں کہ اقوامِ متحدہ ان میں سے کسی پر پابندیاں عائد نہ کر دے۔ سوئیکارنو وہ واحد حکمران ہیں جنہوں نے اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں کھڑے ہو کر ان بڑی طاقتوں کے

منہ پر تھوکا اور اقوامِ متحدہ سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ اس کے نتائج انڈونیشیا کے لئے بڑے ہی خطرناک ہو سکتے تھے لیکن احمد سوئیکارنو نے اپنی قوم اور اپنے ملک کے وقار کو سامنے رکھا اور نتائج کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے روس کے ساتھ معاہدہ کر کے اپنے ملک کو ایک جنگی طاقت بنا دیا۔

یہ تفصیلات میں پہلے بھی پیش کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ امریکہ احمد سوئیکارنو کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔ ایک جرم یہ کہ سوئیکارنو کی قیادت میں انڈونیشی مسلمانوں نے امریکہ اور برطانیہ کو شکستِ فاش دی تھی۔ دوسرا جرم یہ کہ سوئیکارنو نے اقوامِ متحدہ کی توہین کر دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقوامِ متحدہ امریکہ کا اپنا ادارہ ہے پھر احمد سوئیکارنو نے یہ جرم کیا کہ روس کے ساتھ دوستی کرلی اور اپنے ملک کو جنگی طاقت بنالیا۔ زمین کی معدنی دولت سے عوام کو خوشحالی دی۔

احمد سوئیکارنو نے سب سے بڑا گناہ یہ کیا کہ ستمبر 1965ء کی جنگ میں پاکستان کو بھرپور جنگی مدد دی۔ یہ تفصیل بھی میں پہلے سُنا چکا ہوں۔ امریکہ سخت ناراض ہُوا۔ امریکہ کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان بھارت کے ہاتھوں ایسی بُری حالت کو پہنچے کہ بھارت کی برتری تسلیم کرلے اور اپنے اسلامی تشخص اور خودارادیت سے دستبردار ہو جائے۔ یہ بھی مان لے کہ امریکہ اسے بھارت کے ہاتھوں پٹوا بھی سکتا ہے اور چھڑوا بھی سکتا ہے۔ سوئیکارنو کو امریکہ نے اس جرم کی یہ سزا دی کہ سی آئی اے کے انتظامات کے تحت انڈونیشیا میں ایسی قتل و غارت کروائی کہ ملک خون میں ڈوب گیا۔ امریکہ سوہارتو کو اوپر لایا اور سوئیکارنو کو قید میں ڈال کر سوہارتو کو صدر بنا دیا اور اس طرح امریکہ نے انڈونیشیا فتح کرلیا۔

آج اکتیس سال گزر گئے ہیں' سوہارتو ہی انڈونیشیا کا صدر چلا آ رہا ہے۔ وہاں باقاعدہ الیکشن ہوتے ہیں اور ہر بار جیت سوہارتو کی ہوتی ہے۔ یہ الیکشن فوج اور پولیس کے زیرِ سایہ ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ سوہارتو کے دورِ حکومت میں انڈونیشیا پر امریکہ کی گرفت مکمل طور پر مضبوط ہو گئی اور سوہارتو نے اپنے ہاتھوں اسلام کی جڑیں کاٹیں اور عوام کے لئے روٹی کپڑے کا مسئلہ کھڑا کر کے انہیں غریب اور کنگال بنا دیا۔ انڈونیشیا ہزاروں جزیروں کا مجموعہ ہے۔ کئی جزیروں میں ایک عرصے سے یہ مہم چل رہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے وہاں عیسائیوں کو آباد کیا جا رہا ہے اور عوام احتجاج کرتے ہیں تو اُن پر پولیس اور فوج کو کتوں کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے۔ امریکہ یہی چاہتا تھا کہ یہ ملک آہستہ آہستہ عیسائیوں کے قبضے میں آ جائے اور اسلام برائے نام رہ جائے۔

اپنی اس داستان کو آگے چلانے سے پہلے میں موزوں سمجھتا ہوں کہ انڈونیشیا میں اب جو خونریز صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے' اس کا انتہائی مختصر ذکر کر دوں۔ یہ اس لئے کہ انڈونیشیا میں ایک بار پھر سوئیکارنو کے نعرے لگنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہاں ایک اور الیکشن مہم شروع ہو گئی ہے اور سوہارتو اب بھی ملک کا پریذیڈنٹ بننا چاہتا ہے۔ امریکہ کے اِس پٹھو کی عمر 75 برس سے تجاوز کر گئی ہے اور وہ دل کے کسی عارضے میں بھی مبتلا ہو چکا ہے جس کا وہ علاج کروا رہا ہے لیکن ہوسِ اقتدار کا یہ عالم کہ وہ اب بھی پہلے کی طرح پولیس اور فوج کی رائفلوں کے سائے میں صدارت کی کرسی پر براجمان رہنا چاہتا ہے لیکن احمد سوئیکارنو کی بیٹی میگاوتی سوئیکارنو پتری اُس کے مقابلے کے لئے میدان میں اُتر آئی ہے۔ اس خاتون کی عمر 43 سال ہے۔ اس نے اپنی پارٹی بنالی ہے جس کا نام انڈونیشی جمہوری پارٹی ہے اور وہ اُس کی چیئرپرسن ہے۔ "سوئیکارنو پتری" کا مطلب ہے سوئیکارنو کی بیٹی۔ انڈونیشیا کے عوام اور وہاں کا نوجوان طبقہ' کیا بچہ کیا بوڑھا کیا جوان' میگاوتی کے جھنڈے تلے جمع ہو گیا ہے۔ وہاں کے لوگ سوہارتو کی اکتیس سالہ ڈکٹیٹرشپ سے اتنے زیادہ تنگ آ چکے ہیں کہ وہ گلیوں میں اور سڑکوں پر نعرے لگاتے ہیں — "میگاوتی جیتے گی"۔

ڈیڑھ دو مہینے پہلے جکارتہ میں لوگوں نے بڑے لمبے لمبے جلوس نکالے اور نعرہ بازی کی۔ وہ سوہارتو جو پولیس اور فوج کے زیرِ سایہ انڈونیشیا کا تاحیات بادشاہ بنا بیٹھا ہے' کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ کوئی اور کرسیٔ صدارت سے اُٹھانے کے لئے اس کے مقابلے میں آئے۔ اُس نے حکم دے دیا کہ مظاہرین پر گولی چلا دو۔ پولیس نے گولی چلائی' بہت خون خرابہ کیا اور میگاوتی پر پابندیاں عائد کر دیں۔ اس کے جواب میں لوگوں نے بڑے ہی خطرناک مظاہرے کئے' پولیس کی گاڑیاں جلا ڈالیں اور جتنی بھی توڑ پھوڑ کر سکتے تھے کی اور پھر پولیس اور فوج نے ان مظاہروں کو کنٹرول کرنے کے لئے پہلے سے زیادہ ظلم و تشدد کیا۔

میں ان مظاہروں اور پولیس اور فوج کی ظالمانہ کارروائیوں کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا' اس کی بجائے میں آپ کو ایک دو دلچسپ باتیں سناتا ہوں۔ ایک یہ کہ میگاوتی

اپنے نام کے ساتھ "سوئیکارنو پُتری" لکھتی ہے۔ عوام کی غالب اکثریت اس کے ساتھ ہو گئی ہے۔ سوہارتو کی حکومت کے ہر شعبے میں فوجی افسر مقرر ہیں جو ہر شعبے کی کارکردگی پر نظر رکھتے ہیں تاکہ کوئی کام سوہارتو کے خلاف نہ ہو۔ معلوم ہُوا ہے کہ محکمۂ اطلاعات و نشریات میں جو فوجی افسر بیٹھا ہے' اس نے اخباروں کو یہ نوٹس بھیجا ہے کہ وہ جب کسی خبر میں میگاوتی کا نام لکھیں تو اُس کے ساتھ سوئیکارنو پُتری نہ لکھا کریں بلکہ اُس کے خاوند کا نام لکھیں۔ اس حکم کا مطلب یہ ہے کہ میگاوتی کو جو اتنی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے یہ اس کے باپ سوئیکارنو کے نام کی وجہ سے ہے لہٰذا سوئیکارنو کو بلیک آؤٹ کر دیا جائے۔

انڈونیشیا پر دراصل جرنیل حکومت کر رہے ہیں۔ انڈونیشی ذرائع کے مطابق یہ جرنیل امریکہ کے وظیفہ خور ایجنٹ ہیں۔ میگاوتی نے قوم کو یہ نعرہ دیا ہے کہ انڈونیشیا میں جرنیلی حکومت نہیں جمہوری حکومت چلے گی لیکن جرنیل یہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ میگاوتی دراصل کمیونسٹ ہے اور ملک میں کمیونزم رائج کرنا چاہتی ہے۔ یہ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ سوئیکارنو نے روس کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ امریکہ کے اسلحہ خانے میں سب سے بڑا بم یہی ہے کہ کسی ملک کے حکمران کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اُس کے خلاف یہ پروپیگنڈہ زور و شور سے شروع کر دیتا ہے کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ فلپائن میں مسلمان اپنا الگ وطن بنانے کے لئے لڑ رہے ہیں لیکن امریکی پروپیگنڈہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھو تو لکھا ہے کہ فلپائن کی حکومت کے خلاف کمیونسٹ گوریلے لڑ رہے ہیں۔

میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ جنگِ آزادی کا لیڈر اور ہیرو احمد سوئیکارنو ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہے۔ آپ کی دلچسپی کے لئے بتاتا ہوں کہ سوئیکارنو نے اپنے تین بیٹوں کے جو نام ہیں ان ناموں کے معنی یہ ہیں — "ایک ہے آسمانی بجلی' دوسرا رعد کی گرج اور تیسرے کا نام ہے تیز و تند سمندری طوفان" — اس بیٹی کا نام میگاوتی ہے۔ میگا کے معنی ہیں بادل۔ سوہارتو دیکھ رہا ہے بادل میں آسمانی بجلیاں چمکنے اور گرجنے لگی ہیں اور تیز و تند سمندری طوفان آ رہا ہے۔

اگر میگاوتی جیت گئی تو یہ امریکہ کی شکست ہو گی۔ ایک ایسا ملک اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کی زمین تیل' پٹرول اور بڑی ہی قیمتی اور وافر معدنیات دیتی ہے۔ امریکہ کے لئے یہ بھی بڑے دکھ والی بات ہو گی کہ ایک مسلمان ملک جس میں وہ سوہارتو

کے ذریعے عیسائیوں کو آباد کرتا چلا جا رہا تھا اور اسلام کی بیخ کنی ہو رہی تھی' وہ ملک اس کے پنجے سے نکل جائے گا۔

ہماری اصل مجبوری یہ ہے کہ عالمی میڈیا (اخبار رسالے اور ٹی وی وغیرہ) امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ تیسری دنیا کے ذرائع ابلاغ تو ہیں ہی امریکہ کے زیرِ اثر۔ اس صورتِ حال میں ہمیں جو خبریں اور تبصرے پڑھنے کو یا سننے کو ملتے ہیں' وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتے' ان میں امریکی مفاد اور نقطۂ نگاہ چھپا ہُوا ہوتا ہے۔ آج کی دنیا کے سامنے احمد سوئیکارنو کی جو تصویر پیش کی جا رہی ہے' وہ امریکی مفادات اور نقطۂ نگاہ کے مطابق مسخ شدہ ہوتی ہے۔ میں اس سوئیکارنو کو جانتا ہوں جس کے احکام اور تنظیم میں شامل ہو کر میں نے جنگِ آزادی لڑی تھی۔ میں اکیلا ہی نہیں' اُس وقت کی انڈین آرمی کے بے انداز مسلمان فوجی انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شریک تھے اور ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہیں سوئیکارنو ملا تھا اور ملتا رہتا تھا۔ یہ وہ مسلمان فوجی تھے جو انڈونیشیا کے مرکزی شہر جکارتہ میں یا اس کے مضافات میں تھے۔ ایسے لوگ ابھی زندہ ہوں گے' ان کی رائے بھی لے لیں۔

○

میں چونکہ برما وغیرہ کے علاقوں میں رہا ہوں اور جاپانی فوجی ہر وقت دل و دماغ پر آسیب کی طرح سوار رہتے تھے اور پھر میں جاپانیوں کے ساتھ رہا بھی ہوں اس لئے اس وقت کی کوئی بات کسی اخبار یا کتاب میں دیکھتا ہوں تو بڑے ہی شوق اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ میری زندگی کے بہترین اور بڑے ہی قیمتی سال ان علاقوں میں گزرے ہیں۔ آغازِ جوانی کا ہی تو وقت ہوتا ہے جب انسان اپنا مستقبل بناتا ہے لیکن میرا وہ وقت ایسی زمین پر اور ایسے حالات میں گزرا جب موت سائے کی طرح ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور کوئی بھی قدم زندگی کا آخری قدم ہو سکتا تھا۔ ذہن میں یہ سوچ رہتی تھی کہ میں اپنی فوج کی گولی سے مروں گا یا جاپانی پکڑ لیں گے اور میرے جسم پر سنگین بازی کی مشق کریں گے یا ہوائی جہاز سے بم گرے گا یا کسی توپ کا گولہ میرے قریب پھٹے گا اور میرے جسم کے ٹکڑے اُڑ جائیں گے۔

کچھ دن پہلے عالمی ٹی وی سی این این پر چھوٹی سی ایک فلم دیکھی جس میں تھائی لینڈ اور برما کے جنگلوں میں سے گزرتی ہوئی ایک ریلوے لائن دکھائی گئی۔ یہ ریلوے لائن

سامنے آجاتی ہے اور جب تک میں اسے کاغذ پر اُگل نہ دوں یا دو چار دوستوں کو سنا نہ دوں مجھے چین نہیں آتا۔

آیئے' میں آپ کو میدانِ حشر میں لے چلتا ہوں جہاں دنیا کی سب سے بڑی صلیبی طاقتیں مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے اپنے بمبار ہوائی جہازوں' توپوں اور مشین گنوں سے آگ برسا رہی تھیں۔ مسلمانوں کو غلام بنانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس خطے سے اسلام کی آواز نہ اُٹھ سکے اور یہاں سے اسلام کو بے دخل کر دیا جائے۔

یہ میں بتا چکا ہوں کہ انڈونیشی مجاہدین آزادی کے پاس ہوائی جہاز بھی نہیں تھے اور توپخانے بھی نہیں تھے۔ وہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے بھی محروم تھے۔ پھر انہوں نے جنگ آزادی کس بل بوتے پر اور کس طاقت کے زور پر جیت لی تھی؟.... کچھ واقعات تو سنا چکا ہوں' ایک اور سناتا ہوں۔

پچھلے باب میں جو واقعہ سنایا ہے' اس کے بعد مجھے اور عاشق علی کو ہیڈ کوارٹر کے حکم کے مطابق عثمان کی پارٹی میں ہی مستقلاً" شامل کر دیا گیا تھا۔ یوں تو عثمان ہمیں بڑا پکا لگتا تھا لیکن عثمان میں کچھ ایسے اوصاف تھے کہ میں اور عاشق علی اسے اپنا پیر استاد اور بڑا ہی مخلص دوست سمجھنے لگے تھے۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتا تھا اور کبھی نہیں بھولتا تھا کہ ہم اتنی دُور پردیس کے رہنے والے اُس کی مدد کو آئے تھے۔ فرائض کے معاملے میں بڑا ہی سخت آدمی تھا۔ غلطیاں اور بھول چُوک برداشت کر لیتا تھا لیکن دانستہ کوتاہی اور بزدلی ..... کبھی معاف نہیں کرتا تھا۔ گوریلا کارروائیوں میں اگر کوئی بہت ہی مشکل صورتِ حال پیدا ہو جاتی تو وہ ایسی بے خوفی اور دلیری کے مظاہرے کر گزرتا تھا کہ وہ انسان کم اور آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق زیادہ لگتا تھا۔

مجھے اور عاشق کو اس کے ساتھ رہتے ہوئے چار پانچ مہینے گزر گئے تھے۔ اس عرصے میں ہم نے چھوٹی موٹی گوریلا کارروائیاں کی تھیں۔ یہ سب کی سب سنانا ضروری نہیں۔ ایک بڑی جھڑپ سناتا ہوں۔ ہیڈ کوارٹر سے عثمان کا بلاوا آیا اور وہ چلا گیا اور وہ شام کو واپس آیا۔ اس کے پاس ایک آپریشن آرڈر تھا۔

میں نے یہ آپریشن آرڈر پڑھا۔ یہ انگریزی زبان میں ٹائپ کیا ہُوا تھا۔ عام طور پر ان کے آپریشن آرڈر ان کی اپنی زبان میں لکھے جاتے تھے لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ آپریشن آرڈر انگریزی میں کیوں لکھا گیا تھا بلکہ ٹائپ کیا ہُوا تھا۔ میں جب فوج میں تھا تو

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے آئے ہوئے سیکرٹ آپریشن آرڈر پڑھا کرتا تھا۔ اب ان گوریلوں کا آپریشن آرڈر پڑھا تو ذرا سا بھی شک نہ رہا کہ اوپر ہیڈ کوارٹر میں صحیح معنوں میں فوجی ذہن والے لوگ موجود ہیں۔ تحریر اور انداز خالصتاً" فوجی تھا۔

جنگِ آزادی کا وہ دَور عروج کا دَور تھا اور یہ جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اُدھر امریکیوں اور انگریزوں نے بھی مزید کمک منگوائی تھی اور کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے یہ اہلِ صلیب باؤلے ہو گئے ہیں۔ اندھا دھند جنگلوں میں اُن کے ہوائی جہاز بم پھینکتے رہتے تھے اور ذرا سے اشارے پر ان کے توپ خانے آگ برسانے لگتے تھے۔

حکم یہ آیا تھا کہ دریا کے پار ساڑھے تین چار میل ہی دو گاؤں تھے۔ ظاہر ہے وہ مسلمانوں کے گاؤں تھے۔ یہ وہی دریا تھا جو میں نے تیر کر عبور کیا تھا۔ یہ دونوں گاؤں اُس طرف تھے جس طرف سے میں آیا تھا۔ دریا تو مُڑ کر کسی اور طرف چلا جاتا تھا اور جو گاؤں بتائے گئے تھے ان کے قریب سے ایک ندی گزرتی تھی جس کی چوڑائی تقریباً" پچیس گز بتائی گئی تھی اور اس کی گہرائی پانچ یا چھ فٹ کے درمیان تھی۔ اس ندی پر لکڑی کا ایک پل تھا جس کے نیچے کوئی ستون نہیں تھا۔

یہ دونوں گاؤں ندی کے ایک طرف تھے اور ندی سے ان کا فاصلہ تقریباً" ایک ایک میل تھا۔ ندی کے دوسرے کنارے سے تقریباً" اتنی ہی دُور ایک گورا رجمنٹ کی دو رائفل کمپنیوں نے آکر ڈیرے ڈال لئے تھے۔ وہاں غالباً" جاپانیوں نے جنگِ عظیم کے دوران عارضی کچّی سی تین چار بارکیں بنائی تھیں۔ گوروں کی یہ کمپنیاں ان بارکوں میں رہتی تھیں۔ ان گوروں کی نفری دو سو سے زیادہ تھی۔

ان کمپنیوں کی کچھ نفری نے ان دونوں بستیوں کے درمیان آکر ایک پوسٹ یعنی چوکی سی بنالی تھی۔ سینڈ بیگوں کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں اور ان کے اندر تین خیمے گاڑ لئے تھے۔ سینڈ بیگوں کی دیوار میں سے انہوں نے دو جگہوں سے دیوار میں سوراخ چھوڑ دیئے تھے۔ ان میں مشین گنیں لگا دی تھیں۔ ایک طرف اس پوسٹ سے چار پانچ فرلانگ دُور ایک گاؤں تھا اور پوسٹ سے آگے اتنی ہی دُور دوسری بستی تھی۔ اطلاع کے مطابق دونوں بستیوں میں آبادی بہت ہی کم تھی۔ وہاں زیادہ تر بوڑھے' عورتیں اور بچّے تھے۔ یہ تو ہم جانتے تھے کہ تمام لڑکے اور جوان آدمی لڑنے کے لئے گھروں سے غائب ہو گئے ہیں۔

عثمان کو ہیڈ کوارٹر میں بلا کر زبانی بتایا گیا تھا کہ یہ گورے وقتاً" فوقتاً" ان دونوں بستیوں میں جاو ٹھہکتے ہیں اور آباد گھروں کی تلاشی لیتے ہیں اور جو گھر خالی ہیں' ان کے اندر جا کر بھی دیکھتے ہیں۔ ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی کہ انہوں نے کسی عورت کو کبھی چھیڑا ہو یا کسی اور طریقے سے گاؤں والوں کو پریشان کیا ہو۔ بتایا گیا کہ وہ جب تلاشی لیتے ہیں تو بڑے غصے میں ہوتے ہیں اور بار بار رائفلوں کی نالیاں گاؤں والوں کی طرف کر کے ڈراتے ہیں۔

پھر ان گوروں نے گاؤں والوں تک اپنی باتیں پہنچانے کا یہ ذریعہ حاصل کر لیا کہ دو انڈونیشی اپنے ساتھ رکھ لئے جو انگریزی جانتے اور بول سکتے تھے۔ وہ یقیناً" مسلمان نہیں تھے' ولندیزی ہی ہو سکتے تھے۔ اب وہ گاؤں میں داخل ہوتے تو ان آدمیوں کی معرفت لوگوں سے بات کرتے تھے۔ گاؤں والے اور ہم سب سمجھتے تھے کہ یہ گورے فوجی اس شک پر بار بار گاؤں کی تلاشی لیتے ہیں کہ کوئی گوریلا پارٹی یا ایک دو گوریلے یہاں آکر پناہ لیتے ہوں گے۔

میں نے بتایا ہے کہ گورا رجمنٹ کے یہ جوان کسی عورت کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بڑے اچھے کردار والے اور شریف گورے تھے' وجہ یہ تھی کہ انہیں معلوم تھا کہ کسی عورت پر دست درازی کی تو گوریلے بہت بُرا انتقام لیں گے۔ گوروں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ دو ملکوں کی بری اور فضائی جنگی طاقت ان مسلمانوں کو نہیں دبا سکی بلکہ یہ روز بروز کامیابیاں حاصل کرتے جا رہے ہیں اس لئے انہیں اس قسم کا اشتعال نہ دلایا جائے کہ ان کی عزت پر ہاتھ ڈالا جائے۔ انہیں اوپر سے ایسا ہی حکم ملا ہو گا' حالانکہ میں نے بعد میں دونوں بستیوں میں دیکھا تھا' کچھ جوان اور اچھی شکل و صورت کی عورتیں موجود تھیں۔

اصل بات عثمان نے مجھے اور عاشق علی کو بتائی تھی۔ ہیڈ کوارٹر نے یہ محسوس کیا تھا کہ امریکی اور انگریز دیہاتی علاقوں میں آکر پوسٹیں بنا رہے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گوریلوں کے قریب آتے چلے جا رہے ہیں جیسے گھیرا تنگ کیا جاتا ہے۔ گوریلا آپریشن کا مقصد یہ تھا کہ ان کمپنیوں پر' ان کی اس پوسٹ پر ایسا حملہ کیا جائے کہ انہیں بہت سا جانی نقصان دیا جائے تاکہ یہ یہاں سے بھاگ جائیں اور پھر دشمن اپنی فوج کو دیہاتی علاقے میں اس طرح نہ بھیجے کہ بستیوں کے قریب آکر پوسٹیں بنا لیں۔ یہ کمپنیاں

دراصل گوریلوں پر نظر رکھنے کے لئے اور ان کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے یہاں آئی تھیں۔

ہمارے لئے حکم یہ تھا کہ ہماری پوری پارٹی عثمان کی قیادت میں دریا کے اُس کنارے پر جائے گی اور اُس کنارے سے جو علاقہ شروع ہوتا تھا' اس علاقے کی ایک یا دو گوریلا پارٹیاں ہمارے ساتھ مل جائیں گی اور پھر ہم ان گوروں پر حملہ کریں گے۔

عثمان نے پوری پارٹی کو اکٹھا کر کے اس آپریشن کی بریفنگ دی اور بتایا کہ کل صبح جب ابھی اندھیرا ہو گا' پارٹی روانہ ہو جائے گی۔ عثمان نے پہلے انڈونیشی زبان میں پارٹی کو سارا آپریشن سمجھایا اور اس کے بعد مجھے اور عاشق کو اردو میں یہ سب کچھ بتایا۔

میں خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں آمنے سامنے مورچہ بند ہو کر نہیں لڑنا تھا بلکہ یہ گوریلا آپریشن تھا جس کا اصول ہوتا ہے' ضرب لگاؤ اور اِدھر اُدھر ہو جاؤ۔ ہماری پارٹی کی جو نفری جا رہی تھی اس کی تعداد صرف سترہ تھی۔ پندرہ آدمی تھے اور دو جواں سال لڑکیاں۔ لڑکیوں کو آدمیوں کی کمی کی وجہ سے ساتھ لے جایا جا رہا تھا۔ کمی کی وجہ یہ تھی کہ پارٹی کے کچھ جوان کسی اور مشن پر چلے گئے تھے اور تین چار دنوں تک ان کی واپسی متوقع نہیں تھی.... ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ پہلے گوروں کی پوسٹ پر شب خون مارا جائے گا اور توقع ہے کہ ندی کے پار ان کی جو نفری بارکوں میں رہتی ہے وہ اُن کی مدد کو دوڑی آئے گی۔ اس نفری کو روکنے کے لئے ندی کا پل بارود سے اڑا دیا جائے گا۔

○

ہمیں بتایا تو یہ گیا تھا کہ روانگی علی الصبح ہو گی لیکن یہ وقت بدل دیا گیا اور ہم دوپہر کے بعد اپنے ٹھکانے سے چلے۔ ہم اکٹھے نہیں چل رہے تھے بلکہ دُور دُور بکھر کر جا رہے تھے۔ ہم دُور سے دیکھے نہیں جا سکتے تھے کیونکہ وہ علاقہ گھنا جنگل تھا اور اس میں چٹانیں اور ٹیکریاں بھی تھیں۔ گھاس خاصی اونچی تھی اور جنگلی پودے بھی زیادہ تھے۔ ہم دریا کے کنارے اس وقت پہنچے جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ دریا کے کنارے دو کشتیاں بندھی ہوئی تھیں اور چار آدمی وہاں موجود تھے۔ یہ چپوؤں سے چلنے والی چھوٹی کشتیاں تھیں۔ یہ دونوں آدمی ملّاح تھے۔ انتظام دیکھتے وہ پہلے سے موجود تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ سارا کام کیا ہے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ آگے راستہ صاف ہے۔

جب شام گہری ہو گئی تو سات آٹھ آدمی ایک کشتی میں بیٹھے اور دو ملّاحوں نے چپو

مارنے شروع کر دیئے۔ آدھی پارٹی ابھی پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کشتی کو وہاں سے سامنے والے کنارے تک لے جانا تھا جو بڑا ہی مشکل کام تھا کیونکہ دریا کا پاٹ تنگ تھا اور گہرائی زیادہ تھی اس لئے موجیں ذرا زیادہ اُٹھ رہی تھیں۔ یہ ان ملاّحوں کا ہی کمال تھا کہ وہ کشتی پار لے جا رہے تھے۔ میں تو دیکھ دیکھ کر کہتا تھا کہ کشتی ابھی ڈوبی کہ ڈوبی۔ موجیں اسے اوپر اٹھا اٹھا کر پٹختی تھیں۔

اندھیرا اتنا ہو گیا تھا کہ اب پار والا کنارہ بلکہ دریا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ پار والے کنارے پر ایک ماچس جلی اور ایک دو سیکنڈ بعد بجھ گئی۔ عثمان ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ چلو کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ وہ روشنی اشارہ تھا کہ پہلی کشتی پہنچ گئی ہے اور دشمن کا کوئی خطرہ نہیں۔ ہم سب کشتی میں بیٹھے اور ملاّحوں نے چپّو مارنے شروع کر دیئے۔ خطرہ یہ تھا کہ کبھی کبھی دریا میں فوجی موٹر بوٹ میں گشت کے لئے نکلا کرتے تھے لیکن میں تو دشمن سے زیادہ اس دریا کو دشمن سمجھ رہا تھا۔ میں اس علاقے کا رہنے والا ہوں جس میں کوئی دریا اور کوئی نہر بھی نہیں۔ یہی دریا تھا جس میں مَیں پُل سے کُود آیا اور تیر کر کنارے لگا تھا لیکن اُس روز یہ دریا غرّا غرّا کر کشتی کو اوپر نیچے پھینکتا اور جھنجھوڑتا تھا۔

آخر کشتی کو ملاّح کنارے پر لے گئے اور ہم اُترے۔ اب یہ خطرہ شروع ہو گیا تھا کہ یہ علاقہ دشمن کی زیرِ نگرانی تھا اور وہ پوسٹ کوئی زیادہ دور نہیں تھی۔

○

عاشق علی مجھ سے الگ ہو گیا تھا اور عثمان نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ وہاں دو آدمیوں نے ہمارا استقبال کیا۔ عثمان نے انہیں بتایا کہ میں انڈین آرمی سے بھاگ کر ان کے پاس آیا ہوں۔ وہ دونوں بڑے تپاک اور پیار سے ملے۔ ان میں ایک اس پارٹی کا کمانڈر تھا جو پہلے ہی اس علاقے میں موجود تھی۔ انہوں نے عثمان کے ساتھ کچھ باتیں کیں جو میں نہ سمجھ سکا۔ اپنے مشن کی ہی باتیں کی ہوں گی۔ اس پارٹی کے جوان کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ معلوم ہُوا کہ ان کی تعداد بارہ ہے۔

اگر یہ پارٹی فوج کی ہوتی تو کشتیوں میں اس کا بہت سا سامان بھی لدا ہُوا ہوتا۔ ایمونیشن اور گرینیڈوں کے بکس تو ضرور ہوتے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسا فالتو سامان نہیں تھا۔ وہی کچھ تھا جو ہم نے اپنے جسموں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ رائفلیں، ٹامی گنیں اور سٹین گنیں تھیں۔ ان کا ایمونیشن ہم نے پُوچوں میں ڈال رکھا تھا اور پُوچ

ہمارے جسموں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور ہر جوان کے پاس دو دو گرینیڈ تھے۔ یہ گرینیڈ فوجیوں سے چھینے گئے تھے۔ انڈونیشی مجاہدین کی اپنی کوئی فیکٹری تو تھی ہی نہیں۔ ہر آپریشن آرڈر کے نیچے یہ الفاظ ضرور لکھے ہوتے تھے کہ گولی اُس وقت چلاؤ جب یقین ہو کہ ایک دشمن کو ضرور لگے گی۔ یہ تو ہر کسی کے ذہن میں ڈال دیا گیا تھا کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لئے ایک بھی گولی نہیں۔

دوسری پارٹی کا کمانڈر عثمان کے ساتھ باتیں کر کے چلا گیا اور میں اور عثمان اکیلے رہ گئے۔ ہماری اپنی پارٹی کے آدمی اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ اس طرح بکھر کر ایک دوسرے سے دُور ہو جانا سکیم کے عین مطابق تھا۔ ہر آدمی کو اپنے اپنے کام کا پورا پورا پتہ تھا۔ اتنے گھنے جنگل میں جہاں اونچی نیچی ٹیکریاں بھی تھیں، وہاں ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ ممکن نہیں تھا لیکن رابطہ قائم تھا جسے صرف ہم ہی سمجھ سکتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مینڈک بولتا تھا یا کہیں سے اُلّو کے بولنے کی آواز آتی تھی۔ اگر مجھے معلوم نہ ہوتا تو میں ان آوازوں کی طرف توجہ ہی نہ دیتا اور انہیں مینڈک اور اُلّو کی ہی آوازیں سمجھ کر نظرانداز کرتا رہتا۔ یہ تو جنگل کی رات کی آوازیں ہوتی ہیں لیکن یہ آوازیں ہمارے اپنے ساتھیوں کی تھیں۔ ایک بار عثمان نے بھی منہ سے الو کی آواز نکالی۔ اس کے جواب میں مینڈک بولا۔ انہوں نے ان آوازوں کا کوڈ بنا رکھا تھا جسے ابھی میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔

ہمارے اس مشن کی ہر بات اور ہر حرکت بڑی ہی دلچسپ، پُراسرار اور ایمان افروز تھی لیکن میں یہ ساری تفصیلات نہیں سنا سکوں گا.... اُس روز میرے پاس سٹین گن تھی اور اس کی بھری ہوئی چار میگزینیں میں نے الگ اٹھا رکھی تھیں۔ دو گرینیڈ تھے اور ایک خنجر۔ ملٹری پوسٹ جس پر پہلے حملہ کرنا تھا وہ ابھی کچھ دور تھی۔ مینڈکوں اور اُلّوؤں کی آوازیں تھوڑی ہو گئی تھیں اور دُور ہٹتی جا رہی تھیں۔ میں اور عثمان آپس میں کوئی بات کرتے تو وہ کان میں کرتے تھے۔ ہمیں ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ عثمان نے اپنا بازو میرے آگے کر کے مجھے روک لیا۔ ہم دونوں نے غور سے سنا تو ہمیں باتیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ ہماری طرف آ رہی تھیں۔

آوازیں ہمارے سر پر پہنچ گئیں تو میں نے سنا کہ وہ انگریزی میں باتیں کرتے آ رہے تھے جس سے کوئی شک نہ رہا کہ یہ گورا رجمنٹ کے گشتی سنتری ہیں۔ ایک نے منہ سے

سیٹیاں بجانی شروع کر دیں جو ان گوروں کی عادت تھی۔ ہُوا یہ کہ وہ ذرا تیز رفتار سے آ رہے تھے اور ہم اتنی تیزی سے چھُپ نہ سکے۔ عثمان اس طرف تھا جس طرف سے وہ آ رہے تھے۔

عثمان بڑی پھُرتی سے بیٹھا اور پیچھے کو سرکا لیکن اُس کے یوں پیچھے ہٹنے اور چھُپنے سے جھاڑیوں نے آواز پیدا کی جو رات کے سنّاٹے میں دُور دُور تک سنی جا سکتی تھی۔ میں بھی ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ اندھیرے میں بھی وہ دونوں گورے نظر آنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے قد عام انسانوں سے کچھ زیادہ ہی اونچے ہو گئے ہوں' شاید یہ نظر کا دھوکہ تھا' میں جھاڑی کے پیچھے بیٹھا ہُوا انہیں دیکھ رہا تھا اور میرے دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ ان کے پاس ٹارچ نہ ہو۔ اگر ہو گی تو وہ نہ جلے لیکن انہیں شک ہو گیا تھا کہ یہاں کچھ ہے۔ دونوں رک گئے۔ مجھے یہ بھی نظر آ گیا کہ دونوں کے پاس سٹین گنیں تھیں جو سلنگوں سے انہوں نے اپنے کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔

ان میں سے ایک تو ایک ہی جگہ رکا کھڑا رہا اور دوسرا آہستہ آہستہ چلتا اس جھاڑی تک پہنچا جس کے پیچھے عثمان چھپا بیٹھا تھا۔ گورے نے سٹین گن کندھے سے اتار لی تھی۔ وہ انگریزی میں اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ یہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ میرا تو جیسے خون ہی خشک ہو گیا ہو۔ وہ بدبخت اس جھاڑی کے اوپر جا رکا تھا جس کے پیچھے عثمان چھپا ہوا تھا۔ اُس کافر نے عثمان کو دیکھ لیا اور اپنی زبان میں کہا کہ فوراً" اُٹھو' تم ہو کون اور پھر اُس نے انگریزی میں گالی دی۔

اُس کا ساتھی بھی جھاڑی کے قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ گورا جو پہلے آیا تھا اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ فاصلہ تین گز سے زیادہ نہیں تھا۔ انہیں یہ تو پتہ ہی نہیں چل سکا تھا کہ کوئی اور بھی ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ میں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ آج کی رات میری اور عثمان کی زندگی کی آخری رات ہے۔ عثمان اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو سٹین گن کا ایک ہی برسٹ اسے ختم کر دیتا۔ میں نے اس صورتِ حال میں بھاگ نہیں جانا تھا بلکہ ان گوروں پر سٹین گن چلانی تھی اور انہوں نے بھی مجھ پر فائر کرنا تھا۔

سوچنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ وہاں تو ایک سیکنڈ بھی بڑا لمبا وقت تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ فوج سے بھاگنے کے بعد موت میری ہم سفر رہی ہے۔ فوراً" فیصلہ کر لیا کہ

مرنے سے پہلے موت پر ایک جھپٹا تو ضرور ماروں گا۔ عثمان ابھی جھاڑی سے اٹھا نہیں تھا۔ میں نے خنجر نکالا اور پاؤں پر بیٹھے بیٹھے اسی پوزیشن پر ہو گیا کہ جمپ آسان ہو گئی۔ میں نے دل میں اللہ سے یوں التجا کی — "یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ" — پھر میں دبا کر چھوڑے ہوئے سپرنگ کی طرح اچھلا۔ جس گورے کی پیٹھ میری طرف تھی' پیچھے سے اپنا بایاں بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور بازو کا گھیرا یکلخت تنگ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی خنجر بلند کر کے گورے کی پسلیوں میں گھونپ دیا' نکالا اور پھر گھونپا اور نکال کر ایک بار پھر مارا اور گورے کو اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک اس کی سٹین گن اس کے ہاتھ سے گر نہ پڑی تھی۔

مجھے خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ دوسرا گورا عثمان پر سٹین گن فائر کر دے گا لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک ایسا منظر دکھایا جو اس صورت حال میں بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ وہ یہ کہ اِدھر میں نے اُس گورے کو چھوڑا اور اُدھر دیکھا کہ دوسرا گورا بھی گر پڑا تھا اور عثمان اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس ساری کارروائی میں پانچ نہیں تو زیادہ سے زیادہ سات سیکنڈ لگے ہوں گے۔

ہُوا یہ تھا جو عثمان نے مجھے بتایا کہ دوسرا گورا ایسے زاویے پر کھڑا تھا کہ عثمان اُس پر وار کر سکتا تھا۔ عثمان کے پاس بھی سٹین گن تھی لیکن رات کو خاموشی برقرار رکھنے کی ضرورت تھی اس لئے سٹین گن فائر نہیں کی جا سکتی تھی۔ میں نے جب ایک گورے کو دبوچ لیا تو دوسرا گورا جو تین چار گز یا شاید اس سے زیادہ فاصلے پر کھڑا تھا' ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا بایاں پہلو عثمان کی طرف تھا۔ عثمان نے بڑی پھُرتی سے خنجر نکالا اور اُٹھ کر گورے کو دبوچا نہیں بلکہ بڑی ہی تیزی سے اُٹھ کر خنجر گورے کے پہلو میں مارا اور اس طرح دو تین بار خنجر اس کے پہلو اور سینے میں گھونپا۔ وہ گورا بھی گر پڑا۔ ان گوروں پر ہمارا حملہ غیر متوقع تھا اس لئے وہ سنبھل نہ پائے۔ پھر بھی میں عثمان کی پھُرتی اور حملے پر حیران رہ گیا۔ میں نے بھی ایک گورے کو مار دیا تھا لیکن حملہ پیچھے سے کیا تھا۔ عثمان اس گورے کے تقریباً" سامنے ہو گیا تھا اور دونوں کے درمیان فاصلہ چار پانچ قدم تھا۔ وہ گورا اسے دیکھ کر اس پر فائر کر سکتا تھا لیکن عثمان حیران کن حد تک تیز نکلا۔

○

ہم نے دونوں گوروں کی سٹین گنیں لے کر اپنے کندھوں سے لٹکا لیں اور جن لمبے

پوچوں میں ان کی بھری ہوئی میگزینیں رکھی تھیں وہ پوچ ہی اتار کر گلے میں ڈال لئے۔ ہم نے ان کی جیبوں کی تلاشی نہ لی' ان کے بازوؤں سے گھڑیاں بندھی تھیں' وہ اتار لیں اور آگے چل پڑے۔ عثمان نے کہا کہ بسم اللہ اچھی نہیں ہوئی' دعا کرو اللہ خیر کرے۔

ابھی اُس نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ ایک ٹامی یا سٹین گن فائر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی گوروں کی پوسٹ سے دُور روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ ہم ابھی اس پوسٹ سے یعنی اپنے ٹارگیٹ سے دُور تھے۔ اس فائر سے یہ نقصان ہوا کہ ہم گوروں پر بے خبری میں جو شب خون مارنا چاہتے تھے وہ صورت ختم ہو گئی تھی اور گورے بیدار ہو گئے تھے۔ عثمان نے کہا کہ اپنے کسی آدمی نے کسی وجہ سے گھبرا کر یہ برسٹ فائر کیا ہے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ جس طرح ہمیں دو گورے گشت پر مل گئے تھے' اسی طرح دو گورے سپاہی ایک اور جگہ گشت پر جا رہے تھے۔ بالکل ہماری طرح دوسری پارٹی کے دو آدمی اچانک ان کے راستے میں آ گئے اور چھپ گئے۔ گوروں نے اُنہیں دیکھ لیا اور جب ان کے قریب گئے تو ایک نے سٹین گن کا برسٹ فائر کر کے دونوں کو ختم کر دیا۔ ان دونوں انڈونیشی گوریلوں کی جانیں تو بچ گئیں لیکن شب خون کا جو SURPRISE تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ عنصر ختم ہو جائے تو سمجھو مشن ہی ناکام ہو گیا لیکن ہمارے بے خوف مجاہدین نے کچھ اور سوچنے کی بجائے پوسٹ پر ہلّہ بول دیا۔ پھر تو یوں ہُوا کہ جنگل کی خاموشی اور تاریک رات رائفلوں اور مشین گنوں کے بے ہنگم فائر سے لرزنے لگی۔ پوسٹ کی مشین گنوں نے اندھا دُھند فائر کھول کر دیا۔ ہم جانتے تھے کہ فوج میں مشین گنیں کس بے دردی سے فائر کی جاتی تھیں اور فائر کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ گن کی نالی ہر طرف گھمائی جاتی تھی اور اس سے ایک انچ جگہ بھی محفوظ نہیں ہوتی تھی۔

پوسٹ سے روشنی راؤنڈ فائر ہو رہے تھے جن کی روشنی کی وجہ سے مجاہدین پوسٹ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ دو گرینیڈ پھینکے گئے لیکن وہ پوسٹ کے باہر گرے۔ میں اور عثمان دوڑتے وہاں تک گئے لیکن آگے نہ جا سکے۔ مشین گنوں اور رائفلوں کی گولیاں سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں اور ہمارے دائیں بائیں' آگے اور پیچھے زمین میں بھی لگ رہی تھیں۔

پوسٹ سے دو تین سرخ روشنی راؤنڈ فائر ہوئے۔ یہ پوسٹ نے ندی کے پار اپنی کمپنیوں کو اشارہ دیا تھا کہ خطرہ ہے اور مدد کو پہنچو۔ پوسٹ کے ساتھ ہی ایک چٹان تھی۔

عثمان نے مجھے کہا کہ چلو اس چٹان پر چلتے ہیں.... کہنے کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن اتنی زیادہ فائرنگ میں سے گزر کر وہاں تک پہنچنا خودکشی کے برابر تھا۔ بہرحال کچھ تو کرنا ہی تھا۔ بڑی آسان صورت یہ تھی کہ ہم لوگ پسپا ہو آتے اور یہ سمجھتے کہ شب خون ناکام ہو گیا ہے لیکن یہ ہم میں سے کسی کو بھی منظور نہیں تھا۔

دوسری پارٹی کے ایک انڈونیشی نے حیران کُن جرأت کا مظاہرہ کیا۔ جب روشنی راؤنڈوں کی روشنی ختم ہوئی تو پیٹ کے بل رینگتا ہوا پوسٹ کی ایک مشین گن پوزیشن کے نیچے تک پہنچ گیا۔ وہاں سینڈ بیگوں کی دیوار تھی۔ وہ نیچے سے اٹھا' مشین گن کی نالی دونوں ہاتھوں سے پکڑی اور گن کو زور سے پیچھے کو دھکیلا اور پھر آگے کو کھینچا۔ گن غالباً پہلے دھکّے سے پیچھے کو گر پڑا ہو گا اسی لئے گن ہمارے آدمی کے ہاتھ آ گئی اور وہ گن لے کر وہاں سے دوڑ پڑا۔ گن کے ساتھ گولیوں کی بیلٹ لگی ہوئی تھی۔ اس مجاہد کی یہ دلیری بے مثال تھی لیکن اس کے ہاتھ آنے والے چند دنوں کے لئے بے کار ہو گئے تھے کیونکہ فائر کرتی ہوئی مشین گن کی نالی اتنی ہی گرم ہوتی ہے جتنی گرم وہ سلاخ ہو جاتی ہے جسے کچھ دیر آگ میں رکھا جاتا ہے۔ اس مجاہد کی دونوں ہتھیلیاں جل گئی تھیں۔ صبح تک ہتھیلیوں پر آبلے اٹھ آئے تھے لیکن رات کو اُس نے پرواہ تک نہ کی اور مشین گن چٹان تک لے گیا۔

اِدھر سے میں اور عثمان بچتے بچاتے' کہیں رینگتے کہیں اوٹ کے پیچھے چٹان کے اوپر پہنچ گئے۔ اُدھر سے یہ مشین گن آ گئی۔ تب ہمیں پتہ چلا تھا کہ یہ جانباز یہ گن کہاں سے اور کس طرح لایا ہے۔ عثمان نے گن لے لی اور وہاں سے پوسٹ پر فائر کرنے لگا۔ پوسٹ پر چھت تو تھی نہیں' سینڈ بیگوں کی دیوار کے اندر خیمے تھے۔ میں نے سٹین گن سے پوسٹ کے اندر فائر کیا پھر پوسٹ کے اندر ایک گرینیڈ پھٹا۔ اب ہمیں اطمینان ہو گیا کہ ہم جو نقصان کرنا چاہتے تھے وہ کر لیا ہے۔

میں نے عثمان سے کہا کہ ہمیں یہاں سے اب نکل جانا چاہئے کیونکہ ندی کے اُس طرف سے دو کمپنیاں بھی آ رہی ہوں گی۔ عثمان نے اتنا ہی کہا' نہیں آ سکیں گی' انتظام کر لیا ہے....

عثمان نے اتنا ہی کہا تھا کہ ندی کی طرف بڑے زور کا دھماکہ ہُوا اور بہت بڑا شعلہ بھڑک کر بجھ گیا۔ عثمان نے کہا' دیکھا پُل اُڑا دیا گیا ہے' اب ہماری طرف کوئی نہیں آ سکتا۔

...پُل اڑانے کا انتظام دوسری پارٹی کے ساتھ تھا۔ اُس پارٹی کے آدمیوں نے یہ کام بڑی کامیابی سے کر دیا تھا۔ اگلے روز پتہ چلا تھا کہ دونوں کمپنیاں اپنی پوسٹ کی مدد کے لئے آ رہی تھیں اور پُل تک پہنچ بھی گئی تھیں لیکن پل درمیان سے اڑا دیا گیا اور لکڑی کا وہ پُل ندی میں کئی ٹکڑوں میں گرا اور ندی میں ڈوب گیا۔

○

گوروں کی پوسٹ خاموش ہو چکی تھی۔ یہ اب دوسری پارٹی کا کام تھا کہ پوسٹ سے اسلحہ اور ایمونیشن اور کام کی دیگر چیزیں اٹھا کر لے جائے۔ ہماری پارٹی کے لئے حکم تھا کہ مشن مکمل کر کے فوراً واپس آ جائے.... مشن مکمل ہو چکا تھا.... میں اور عثمان چٹان سے اُترے اور دوسری پارٹی کے کمانڈر کو ڈھونڈنے اور پکارنے لگے۔ وہ مل گیا اور اس نے کہا کہ آپ لوگ نکل جائیں۔ اس مشن کا دراصل مقصد یہ تھا کہ فوج کو یہ بتانا تھا کہ اب اس علاقے میں فوج کا عمل دخل ختم کر دیا گیا ہے اور آئندہ کوئی فوجی پوسٹ کسی بستی کے قریب نہ بنائی جائے۔

ذرا غور سے سنئے کہ پُل کس طرح اُڑایا گیا۔ پُل کو اس بارُود سے اُڑایا گیا تھا جسے بتی سے آگ لگائی جاتی تھی۔ دوسری پارٹی کا ایک انڈونیشی یہ بارود اس میں بتی لگا کر لے گیا۔ ہماری پارٹی کا جو آدمی اس کے ساتھ وہ عاشق علی تھا۔ دونوں پُل کے درمیان تک چلے گئے۔ پُل کے اس طرف یا اس طرف کوئی سنتری نہیں تھا۔ انڈونیشی نے پُل کے کنارے سے جھک کر نیچے ایک جگہ ڈائنامیٹ کا سلیب رکھ دیا۔ بتی کا سرا پُل پر تھا۔

اُس نے ماچس جلا کر بتی کو آگ لگا دی۔ بتی کا چھوٹا سا شعلہ شرارے کی مانند تھا جو ندی کے دوسرے کنارے تک گوروں کو نظر آ گیا۔ کمپنیاں پُل تک آ گئی تھیں۔ اِدھر سے ایک گولی فائر ہوئی۔ گولی ڈائنامیٹ رکھنے والے کو لگی۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ بتی جلا چکا تھا۔ اُس نے عاشق علی سے کہا کہ مجھے گولی لگ گئی ہے' میں بچ نہیں سکوں گا' تم بھاگ جاؤ۔ عاشق نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ اٹھ سکا۔ اُس نے پھر عاشق سے کہا کہ وہ بھاگ جائے۔

عاشق وہاں سے دوڑا تو پیچھے سے مشین گن یا سٹین گن کے دو تین برسٹ فائر ہوئے جن سے عاشق شدید زخمی ہو گیا لیکن وہ پُل سے نکل آیا اور ہماری طرف آ کر گرا۔ اس کے ساتھ ہی بارُود یعنی ڈائنامیٹ پھٹا اور پُل کے ساتھ وہ انڈونیشی مجاہد بھی اڑ

گیا۔ دونوں پارٹیاں قریب والے گاؤں میں اکٹھی ہوئیں تو پتہ چلا کہ چھ انڈونیشی مجاہدین شہید ہو چکے ہیں اور تین چار زخمی ہیں۔ ایک کمرے میں لالٹین کی روشنی تھی۔ دو انڈونیشی عاشق علی کو اٹھا کر لائے۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ کچھ گولیاں اس کے دائیں کندھے کے قریب لگی تھیں اور کچھ بائیں ٹانگ میں لگیں۔ دوسری پارٹی کے کمانڈر نے کہا کہ اسے یہیں چھوڑ جاؤ لیکن عثمان نے کہا کہ وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ فوری طور پر اس کے زخموں پر کپڑے باندھ دیئے گئے اور میں نے اور دو اور انڈونیشیوں نے اٹھا لیا۔ گاؤں کے ایک آدمی نے کہا کہ اسے اس طرح مت اٹھاؤ' چارپائی پر ڈال کر لے جاؤ۔ ہم نے اسے چارپائی پر ڈالا اور اٹھا کر چل پڑے۔

ہم تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ پیچھے کوئی دوڑتا آیا اور چارپائی پر ہاتھ رکھ دیئے۔ عثمان ساتھ تھا۔ وہ کوئی انڈونیشی گوریلا تھا۔ عثمان نے اس کے ساتھ بات کی تو میں یہی سمجھ سکا کہ یہ انڈونیشی اپنی کسی بات پر اُڑا ہُوا ہے اور ضد کر رہا ہے۔ کچھ دیر ان میں اپنی زبان میں بحث ہوتی رہی۔ آخر عثمان مان گیا اور آگے آگے چل پڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس انڈونیشی کی آواز مردانہ نہیں۔ اندھیرے میں چہرہ تو ٹھیک طرح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ چل پڑا۔

میں اور عثمان آگے آگے چل رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کون ہے اور کیا باتیں ہو رہی تھیں.... عثمان نے بتایا کہ یہ وہ لڑکی ہے جسے زخمی حالت میں عاشق علی اٹھا کر اِدھر آیا تھا اور پھر ہمارے ساتھ ہی رہ گیا.... وہ آمنہ تھی جو دوسری پارٹی کے ساتھ اس مشن یا آپریشن میں شریک ہوئی تھی۔

ہمارے ساتھ جو لڑکیاں تھیں انہوں نے آمنہ کو اپنے ساتھ لے لیا اور پتہ چلا کہ وہ عاشق علی کے لئے اتنی پریشان ہے کہ رو رہی ہے اور ضد یہ کر رہی تھی کہ عاشق کے ساتھ ہی جاؤں گی اور کچھ دن اس کے ساتھ رہوں گی۔

وہ ہمارے ساتھ آ گئی اور پھر کشتیوں نے ہمیں اپنے کنارے تک پہنچا دیا اور پھر ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہاں مرہم پٹی کا نہایت اچھا انتظام تھا لیکن آمنہ کی بے تابیاں ایسی کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ عاشق اتنا شدید زخمی ہو کر بھی بچ گیا تھا۔ وہ چوتھے دن ہوش میں آیا تھا اور اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہ چار دن آمنہ اس کے ساتھ رہی۔ اس نے جب ہوش میں آ کر آنکھیں کھولی تھیں تو اسے جو پہلا چہرہ نظر آیا وہ آمنہ کا تھا۔

(جاری ہے)

آزاد

ملکوں کی فوجیں جنگیں لڑتی آئی ہیں۔ ہر جنگ میں فوجی بہادری کے کارنامے کرتے ہیں جن میں کچھ عمر بھر کے لئے معذور ہو جاتے ہیں اور کچھ اپنی جانیں ہی قربان کر دیتے ہیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوتا چلا جائے گا۔ ان بہادروں کو اور جذبۂ ایثار کے مظاہرے کرنے والوں کو بہادری کے تمغے دیئے گئے تھے اور آئندہ بھی دیئے جائیں گے۔

کچھ عرصہ پہلے جنگِ عظیم لڑی گئی تھی جس میں بے مثال بہادری کے مظاہرے ہوئے تھے اور انگریزوں نے ایسے مظاہرے کرنے والوں کو اپنا سب سے بڑا اعزاز وکٹوریہ کراس دیا تھا۔ پاکستان میں نشانِ حیدر بھی دیئے گئے' ہلال جرأت' ستارہ جرأت اور تمغۂ جرأت دیئے گئے تھے لیکن انڈونیشیا کی جنگِ آزادی لڑنے والوں کے لئے کوئی تمغہ نہیں تھا اور ان مجاہدین کو تمغے کا کوئی لالچ بھی نہیں تھا۔ انڈونیشی گوریلے چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں دور جنگلوں اور پہاڑی علاقوں میں جا کر لڑتے تھے۔ ان کے پارٹی کمانڈر کو بھی معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کون کیسی بہادری دکھا رہا ہے۔ اسے یقین اور اعتماد ہوتا تھا کہ جو کوئی جہاں بھی ہے' وہ اپنے فرض سے غافل نہیں اور وہ اپنی جان کو آزادی سے زیادہ قیمتی نہیں سمجھتا۔

میں نے پاکستان میں واپس آ کر تحریکِ پاکستان کی تفصیلات سنی تھیں اور مجھے پتہ چلا تھا کہ میری قوم نے کس طرح جان و مال کی قربانیاں دی تھیں۔ بخدا میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا تھا لیکن تحریکِ پاکستان مسلح جنگِ آزادی نہیں تھی جیسی انڈونیشیا کے مسلمانوں نے لڑی تھی۔ وہ تو دنیا کی دو بڑی جنگی طاقتوں کے خلاف جنگ تھی۔ مجاہدین جب کسی

مشن پر جاتے تھے تو یہ توقع اور امید دل سے نکال پھینکتے تھے کہ وہ زندہ واپس آ جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندہ واپس آنے کے لئے جاتے ہی نہیں تھے۔ ہر کوئی اسلام کی آزادی کے لئے اپنی جان کا نذرانہ لے کر جاتا تھا لیکن اسے ایسا کوئی لالچ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بڑھ چڑھ کر بہادری کا مظاہرہ کرے گا تو بڑھ چڑھ کر انعام دیا جائے گا۔

میں نے صرف ایک واقعہ سنایا ہے کہ ایک انڈونیشی نے گورا رجمنٹ کی دو کمپنیوں کے سامنے پل میں ڈائنامیٹ لگایا' اس کے پھٹنے سے پہلے ہی اسے گولیاں لگ گئیں لیکن وہ وہاں سے نہ ہٹا اور پل کے ساتھ ہی اڑ گیا۔ میں ایسے کارنامے سنانے لگوں تو دو چار نہیں' بے شمار ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کسی بھی تحریک' مہم یا معرکے میں دلوں پر طمع یا لالچ غالب آ جائے تو ناکامی لازمی ہو جاتی ہے۔ طمع رکھنے والوں کی لوحِ تقدیر سے کامیابی کا لفظ کھُرچ کر غائب کر دیا جاتا ہے۔

یہاں میں اپنی روئیداد سے ہٹ کر اپنے ملک کی ایک بات کرنا چاہوں گا۔ اگر کسی کو بُری لگے تو میں کسی سے معذرت نہیں چاہوں گا اور نہ معافی مانگوں گا۔ اس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی کہ ہماری قوم جسے عوام بنا دیا گیا ہے' ایک فریب خوردہ قوم ہے بلکہ مظلوم اور مجبور عوام کا ایک ہجوم ہے۔ حکمرانی جس کو بھی ملی' اس نے ایک نیا ہی فریب ایجاد کر کے قوم کو دھوکہ دیا اور مقبولیت حاصل کرنے کی مذموم کوشش کی۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم نے یہ پنج نکالی کہ تحریکِ پاکستان میں نمایاں کام کرنے والوں کو تمغہ اور نقد انعام دیا جائے۔ چنانچہ ہر یوم آزادی پر کچھ لوگوں کو یہ تمغے اور انعام دیئے جاتے ہیں۔ اس دور کے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ میں تو تحریکِ پاکستان سے دُور انڈونیشیا میں تھا اس لئے عینی شاہد نہیں ہوں لیکن اس دُور کے لوگ بتاتے ہیں کہ یہ انعام و اکرام ایسے افراد کو بھی دیئے گئے ہیں جن کا تحریکِ پاکستان کے ساتھ خاصی دُور کا یا رسمی سا تعلق تھا۔ میں سوچتا یہ ہوں کہ پاکستان گمنام مجاہدین کی قربانیوں کا حاصل ہے۔ میرے اپنے قصبے میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے بے مثال کام کئے تھے اور کسی لالچ کے بغیر کئے تھے۔ ایسے گمنام مجاہدین سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ ان میں سے بہت سے دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ اُن کے پسماندگان جب دیکھتے ہیں کہ تمغے اور انعام کن لوگوں کو مل رہے ہیں تو ان کے ذہن میں کچھ تلخیاں اور شکوے پیدا ہوتے ہیں جو پاکستان کی سلامتی اور بقاء کے لئے اچھے نہیں۔

پاکستان کے زوال کا باعث صرف لالچ اور طمع ہے۔ اوپر سے نیچے تک دیکھتے آئیں، حکمران بھی لالچ اور طمع میں مبتلا ہیں اور یہی کیفیت حاکموں پر طاری ہے اور جس شخص کو بھی سرکاری یا غیر سرکاری عہدہ مل گیا' اس نے اپنے دل و دماغ پر لالچ اور طمع کا غلبہ طاری کر لیا۔ ایک غیر ملکی دانشور نے کہا تھا کہ جس آزاد ملک کے حکمران اور اس کا انتظام چلانے والے حاکم اپنی توجہ طمع اور ذاتی تحفظ پر مرکوز کر لیں' اس ملک کو آزاد رہنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ محروم کرنے والا کون ہے؟.... اللہ تبارک و تعالیٰ کا قانون!

○

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں اپنا آپ قربان کر دینے والوں میں عاشق علی پاکستانی بھی تھا۔ اس وقت وہ پاکستانی نہیں تھا لیکن تحریکِ پاکستان کا ذکر آیا ہے تو دل چاہتا ہے کہ عاشق علی کو پاکستانی لکھوں جبکہ وہ اس وقت ہندوستانی تھا.... اُس کا کارنامہ سنا چکا ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ سامنے سے گورا رجمنٹ کی کمپنیاں آ رہی ہیں اور وہ ایک انڈونیشی مجاہد کے ساتھ پُل کو اُڑانے جا رہا تھا۔ وہ ایسا بُری طرح زخمی ہُوا تھا کہ اس کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ سورابایا تک اس کا زندہ رہنا ایک معجزہ تھا۔ اتنے وقت میں اس کا جسم خون سے خالی ہو جانا چاہئے تھا۔

وہ ایک امیر کبیر انڈونیشی کا خاصا بڑا مکان تھا جس میں پانچ چھ چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کسی اور جگہ منتقل ہو گیا تھا اور اس مکان کو اس نے جنگِ آزادی کے زخمیوں کا ہسپتال بنا دیا تھا۔ وہاں اُس وقت کی جدید سہولتیں اور سائنسی آلات تو میسّر نہیں تھے لیکن ایسے انتظامات موجود تھے کہ شدید زخمیوں کا علاج معالجہ ہو جاتا تھا اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں بھی جوڑی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر بھی موجود تھے اور تیمارداری کا انتظام بھی تھا۔ زخمیوں کی دیکھ بھال زیادہ تر عورتیں کرتی تھیں جن میں تربیت یافتہ نرسیں بھی تھیں۔

میں صبح شام عاشق علی کو دیکھنے جایا کرتا تھا اور ہر بار یہی جواب ملتا کہ ابھی عاشق بے ہوش ہے اور اسے گلوکوز اور خون لگا ہُوا ہے۔ خون کا انتظام خاصا اچھا تھا اور خون کا گروپ بھی معلوم کرنے کا انتظام تھا۔ میں نے پیشکش کی تھی کہ میں عاشق کو اپنا خون دوں گا۔ معلوم ہُوا تھا کہ آمنہ نے بھی اپنا خون پیش کیا تھا لیکن ڈاکٹر نے نہ میرا خون لیا

نہ آمنہ کا کیونکہ خون کی بوتلیں بھری رکھی تھیں۔

آمنہ عاشق علی کے ساتھ رہی اور وہی اس کی نرسنگ کرتی تھی۔ مجھے ابھی عاشق کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ آمنہ باہر آتی تو وہ مجھے اُس کی حالت بتاتی تھی۔ وہ تو بہت ہی اداس اور پریشان تھی۔ اُس نے بتایا کہ عاشق کسی کسی وقت بے ہوشی میں کچھ بڑبڑاتا ہے اور اپنی زبان میں کوئی بات کرتا ہے۔ آمنہ ہماری زبان نہیں سمجھتی تھی۔

آمنہ نے جب یہ بات سنائی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ عاشق علی ابھی نوجوانی کی عمر میں تھا۔ وہ زخمی ہُوا تو معلوم نہیں اسے ماں یاد آتی ہو گی' بہنیں یاد آتی ہوں گی اور اسے اپنا وطن' اپنا گھر تو یاد آیا ہو گا اور ہو سکتا ہے اسے یہ خیال بھی آیا ہو کہ وہ ہزارہا میل دُور پردیس میں مر رہا ہے۔ بے ہوشی میں شاید وہ اپنے گھر والوں کو یاد کرتا ہو گا اور ہو سکتا ہے خواب کی طرح اسے ماں باپ اور بہن بھائی نظر آتے ہوں۔ مختصر یہ کہ عاشق نے انڈونیشیا کے لئے یا اسلام کی خاطر بہت بڑی قربانی دی تھی۔

مشکل یہ تھی کہ میں آمنہ کی بات سمجھ نہیں سکتا تھا۔ یہ میری حماقت کہئے یا کچھ کہئے' میں نے انڈونیشی زبان سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ عاشق علی یہ زبان سیکھ رہا تھا.... آمنہ سر کے اشارے سے بتاتی تھی کہ عاشق علی کی حالت ٹھیک نہیں' باقی بات اشاروں سے کرتی تھی جو میں کچھ سمجھ جاتا اور زیادہ تر کچھ بھی نہ سمجھتا۔

دوسرے یا تیسرے روز آمنہ کا والد بھی آ گیا تھا۔ وہ اردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ وہ عاشق علی کو دیکھنے آیا تھا اور ظاہر ہے اپنی بیٹی کے متعلق بھی پریشان ہو گا۔ اُس نے عاشق علی کو بے دریغ خراجِ تحسین پیش کیا اور اس دوران اُس کی آنکھیں آنسوؤں کو نہ روک سکیں۔ وہاں ڈاکٹر انڈونیشی تھے۔ آمنہ کے باپ نے ان سے پوچھ کر مجھے بتایا تھا کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عاشق علی زندہ رہے گا یا نہیں.... آمنہ نے باپ سے کہہ دیا تھا کہ وہ ابھی گھر واپس نہیں آئے گی اور باپ نے اسے اجازت دے دی تھی۔

یہ تھی مسلمان کی شان اور مومن لوگوں کا صحیح کردار جسے اسلامی کردار کہنا چاہئے۔ اس باپ کو ایسا کوئی غم فکر نہ تھا کہ اس کی نوجوان بیٹی یہاں محفوظ نہیں رہے گی یا اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کرے گا یا یہ یہاں تکلیف میں رہے گی۔ میں نے سنا ہے کہ تحریکِ پاکستان میں ایسی ہی فضا پیدا ہو گئی تھی جس میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے

اپنے مشن میں لگن رہتے تھے اور لڑکے لڑکیوں کو ان کے گھروں تک چھوڑ آتے تھے...

آج پاکستانی کردار ایسا پست ہُوا ہے کہ میں جب اس دُور کی باتیں سوچتا ہوں اور اب لکھ رہا ہوں تو کبھی یوں لگتا ہے جیسے میں افسانہ لکھ رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ آج بھی ہمارا قومی کردار اور معاشرتی اخلاق اسی بلند مقام پر پہنچ جائے جو میں نے انڈونیشیا میں دیکھا تھا یا آپ نے تحریک پاکستان کے دور میں دیکھا تھا تو پاکستان ایک ایسی طاقت بن سکتا ہے کہ دشمن ہماری طرف دیکھنے سے پہلے سوچ سمجھ لے کہ اس باوقار ملک کی طرف دیکھنا بھی ایک جسارت ہے۔

○

یہاں میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ اس ہسپتال میں تمام ڈاکٹر انڈونیشی تھے۔ غالباً" چوتھا دن تھا' میں عاشق علی کے متعلق پوچھنے گیا تو اندر سے ایک ہندوستانی ڈاکٹر نکلا جسے میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ انڈونیشیوں میں ہندوستانی تو فوراً" پہچانا جاتا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا لیکن میں کوشش کے باوجود مسکرا نہ سکا۔ میرے دل اور دماغ پر عاشق علی سوار تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ عاشق اب کس حالت میں ہے۔

"الحمدللہ!" — اُس نے کہا — "خطرے سے نکل آیا ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا"۔

مجھے اُس کی اس رپورٹ سے ایسا دلی اطمینان ہُوا جیسے میں خطرے سے نکل آیا ہوں اور زندہ رہوں گا۔

"کیا آپ انڈین آرمی سے آئے ہیں؟" — ڈاکٹر نے پوچھا۔

"ہاں صاحب!" — میں نے جواب دیا — "میں انڈین آرمی سے بھگوڑا ہو کر آیا تھا اور یہ زخمی عاشق بھی میرا ساتھی ہے۔ ہم دونوں مختلف حالتوں اور طریقوں سے یہاں پہنچے تھے"۔

وہ اپنے کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ ہندوستانی ہونے کے ناطے سے وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ڈاکٹر بیٹھا کرتے تھے۔ وہ کوئی پرانی عمر کا آدمی نہیں تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ وہ اسی روز اس ہسپتال میں آیا تھا اور اُس روز اُسی نے عاشق علی کی پٹیاں کھولیں اور زخموں کی حالت دیکھ کر مرہم پٹی کر دی تھی۔ اُس نے بتایا

کہ عاشق کا زندہ رہنا بھی معجزہ ہے لیکن اس سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ اتنی زیادہ گولیاں لگنے کے باوجود اُس کی ہڈیاں محفوظ رہ گئی ہیں۔

"اب ایک خطرہ باقی رہ گیا ہے" — ڈاکٹر نے کہا — "دایاں بازو تو یہ اب استعمال نہیں کر سکے گا جس طرح پہلے کیا کرتا تھا۔ کندھے کے پٹھے کٹ گئے ہیں اور ایک دو اہم رگیں بھی کٹی ہیں جس کا اثر یہ ہو گا کہ اب یہ بازو کو پوری طرح گھما نہیں سکے گا۔ تھوڑا سا اٹھا سکے گا اور ہاتھ کی گرفت ذرا کمزور ہو جائے گی۔ اسی طرح ٹانگوں کے پٹھے بھی کٹ گئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ یہ زخمی ٹانگ سے اتنا کام نہیں لے سکے گا جتنا لیا جانا چاہئے۔ بہرحال مجھے یہ تو اطمینان ہے کہ اللہ نے اس کی قربانی قبول کر لی ہے"۔

اُس نے مجھ سے پوچھا میں یہاں کس طرح پہنچا تھا۔ یہ سوال وہ مجھ سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا اور میں نے چند الفاظ میں جواب دیا تھا۔ میں اُس وقت صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ عاشق کس حال میں ہے۔ اب ذرا تفصیلی جواب دیا لیکن کم سے کم الفاظ میں اسے بتایا کہ میں کہاں سے اور کس طرح یہاں پہنچا تھا۔ عاشق کے متعلق بھی بتایا کہ وہ کس طرح آیا تھا۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ میں نے انڈونیشیا کے مجاہدین کے پاس پہنچ کر بڑی قربانی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس ڈاکٹر کی بات سنی تو میں نے کہا کہ قربانی تو اس شخص نے کی ہے۔ وہ ہندوستان کے مشہور شہر آگرہ کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام جمشید انور تھا اور انڈین آرمی میں کیپٹن ڈاکٹر تھا۔

وہ کسی امیر باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ اس کا باپ ایک مسلم ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ جمشید سب سے بڑا تھا۔ اسے باپ نے میڈیکل کالج میں داخل کروا دیا تھا اور جمشید اتنا محنتی نکلا کہ ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا میٹرک پاس ہونا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ وکالت اور ڈاکٹری تو بڑے ہی امیر خاندانوں کے ریزرو تھیں۔ مسلمان بہت ہی کم وکیل یا ڈاکٹر بنتے تھے لیکن جمشید کے باپ کا ایک عزم تھا اور یہ اس کی خواہش تھی کہ اس کے بیٹے معاشرے میں اونچا مقام پیدا کریں۔ جمشید سے چھوٹا بھائی بی اے کر کے بی ایڈ کر رہا تھا۔ اسے باپ ٹیچنگ لائن میں بھیجنا چاہتا تھا۔ اس سے چھوٹا ابھی تھرڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔

جمشید انور نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کر لی تو جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ اس

نے فوج میں قسمت آزمائی کی تو اسے فوراً "لیفٹیننٹ" کے عہدے پر لے لیا گیا۔ جنگ کی وجہ سے فوج کی بھرتی عام تھی اور ڈاکٹروں کی تو بہت ہی زیادہ ضرورت تھی۔ باپ کا ارادہ تو یہ تھا کہ جمشید نوکری کر کے تجربہ حاصل کر لے اور پھر اپنا کلینک کھول لے لیکن اُس زمانے میں ڈاکٹر نوکری کو زیادہ پسند کرتا تھے۔

ڈاکٹر اس وجہ سے نوکری پسند کرتے تھے کہ ان وقتوں میں بیماریوں کا یہ حال نہیں تھا جو ہم آج کے دَور میں دیکھ رہے ہیں۔ آج کل تو کوئی آدمی یہ کہے کہ وہ تندرست ہے تو حیرت ہوتی ہے۔ وہ میری جوانی کا وقت تھا۔ کوئی کوئی شخص بیمار ہوتا تھا اور گھریلو ٹوٹکے استعمال کر کے یا کسی سیانے کے بتائے ہوئے پرہیز سے ہی ٹھیک ہو جاتا تھا۔ اشیائے خورد و نوش خالص ہوتی تھیں۔ آج کل تو ہوا بھی خالص نہیں ملتی اور پانی بھی صاف ستھرا نہیں ہوتا۔ ہسپتال خالی پڑے رہتے تھے۔ ان حالات میں ڈاکٹر نوکری کو ہی اچھا سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر جمشید انور کا باپ کوئی مردِ مومن تھا۔ جمشید کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ اُس کا باپ پکّا مسلمان تھا لیکن ملا ٹائپ نہیں بلکہ مجاہدانہ خیالات کا آدمی تھا۔ وہ اپنے بیٹوں کو جہاد کی باتیں سناتا رہتا تھا اور زیادہ تر صلیبی جنگوں کی باتیں کرتا تھا۔ جمشید انور نے اپنے باپ کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور اس نے تاریخ اسلام کی جنگوں کا مطالعہ سب سے زیادہ کیا اور اس طرح اُس کے خیالات اسی سانچے میں ڈھل گئے۔ اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت بھر گئی۔ انگریزوں کو وہ صلیبی کہا کرتا تھا۔

وہ فوج میں آیا تو اسے ہر طرف ہندو افسر نظر آئے جن میں دو چار ایسے تھے جو ہندوستان کی آزادی کی باتیں کرتے تھے اور انگریزوں کے خلاف سکیمیں بناتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر جمشید ان کی باتوں سے متاثر ہو گیا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال یقین بن کر بیٹھ گیا کہ ہندوستان سے اگر کوئی انگریزوں کو نکال سکتا ہے تو وہ ہندوؤں کی کانگرس پارٹی ہے اور اس کے لیڈر ہیں۔ فوج میں آ کر اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں رہے گا بلکہ لڑنے والا افسر بنے گا۔

اسے ایک یونٹ کے ساتھ برما کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ جاپانی سنگاپور ملایا وغیرہ کو فتح کرتے ہوئے بڑی ہی تیزی سے برما تک پہنچ گئے۔ یہ میں پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں کہ جاپانیوں نے کس طرح برق رفتار حملے سے برما لے لیا تھا اور انڈین آرمی کی بے شمار

نفری کو جنگی قیدی بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر جمشید بھی جاپانیوں کے ہاتھ آ گیا۔

بین الاقوامی قانون کے مطابق ڈاکٹر دشمن کا جنگی قیدی بن جائے تو بھی اسے ڈاکٹر ہی تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ جنگی قیدیوں والا سلوک نہیں کیا جاتا۔ مطلب یہ کہ وہ دشمن کے پاس جا کر بھی اپنی حیثیت سے محروم نہیں ہوتا۔ جاپانیوں کو بھی آخر زیادہ سے زیادہ ڈاکٹروں کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے جمشید انور کو پوری تعظیم اور تکریم دی اور وہ ڈاکٹری کا کام ہی کرتا رہا۔

اس دوران ڈاکٹر جمشید نے سبھاش چندر بوس کا نام پہلی بار سنا اور وہ انڈین نیشنل آرمی کے حوالے سے اس کانگرسی لیڈر سے متعارف ہُوا۔ میں یہ بات بھی آپ کو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں' یہاں ایک بار پھر سنانے کی ضرورت نہیں۔ انڈین آرمی کے جنگی قیدیوں کو انڈین نیشنل آرمی میں شامل کیا گیا تو ڈاکٹر جمشید بھی ادھر ہی چلا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے متعلق وہ جذباتی تھا یا نہیں' وہ انگریزوں کو اپنا اور اسلام کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ میں آپ کو اس کی ساری بات نہیں سنا رہا۔ صرف یہ بتاتا ہوں کہ وہ اس معاملے میں یعنی اسلام کے سلسلے میں بہت ہی جذباتی تھا اور حقیقت کو کچھ کم ہی دیکھتا تھا۔ اسے آپ اندھی عقیدت کہہ لیں جس میں انسان عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ سوچتا ہے۔ البتہ ڈاکٹر جمشید انور کے کردار کا بنیادی وصف یہ تھا کہ سو فیصد مخلص اور اپنے اسلامی عزم کا وفادار تھا۔

میری طرح اس پر بھی انڈین نیشنل آرمی کی حقیقت کھلی تو وہ تڑپنے لگا کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے۔ ہندو افسروں کی باتوں سے وہ صرف اس لئے متاثر ہُوا تھا کہ دشمن مشترک تھا یعنی انگریز۔ ڈاکٹر جمشید نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو وہ ہندوستان پر ہندو راج کو قبول کر لے گا۔ یوں کہہ کہ وہ دو قومی نظریئے کا ماننے والا تھا اور اس کا مطالبہ یہ تھا کہ پورے ہندوستان میں نہ سہی' ہندوستان کے کسی حصے کو اسلامی ملک بنا دیا جائے۔ اُس وقت نہ وہ نہ ہم دو قومی نظریئے اور پاکستان سے واقف تھے۔ میں تو چھوٹے سے عہدے کا فوجی تھا اس لئے بڑے لیڈروں سے نہیں مل سکا تھا' ڈاکٹر جمشید ان بڑے افسروں سے ملا تھا جو انڈین نیشنل آرمی کے کمانڈر بن گئے تھے۔ ان کی باتیں سن کر جمشید بہت ہی پریشان ہو گیا تھا۔

جاپانیوں کی پسپائی شروع ہوئی تو آئی این اے لاوارث ہو کر بکھرنے لگی۔ پھر جس

طرح میں آئی این اے سے بچ بچا کر انڈونیشیا کے مسلمانوں کے پاس پہنچ گیا تھا اسی طرح ڈاکٹر جمشید بھی انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہو گیا۔ اب وہ پوری طرح خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تو وہ اسی ملک کا باشندہ بن جائے گا اور واپس اپنے گھر یعنی آگرہ اس وقت جائے گا جب ہندوستان سے انگریز جا چکے ہوں گے۔

وہ صرف ایک پریشانی لئے پھرتا تھا۔ اپنے ماں باپ کو یاد کرتا اور غمگین ہو جاتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس کے باپ نے اپنا پیٹ کاٹ کر اُسے ڈاکٹر بنوایا تھا۔ اسے سرکاری اطلاع یہ ملی ہو گی کہ تمہارا بیٹا لاپتہ ہو گیا ہے۔ لاپتہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ زندہ نہیں یا یہ کہ اس کی لاش نہیں ملی۔

"میرے والد صاحب کا ہارٹ فیل ہو چکا ہو گا" — ڈاکٹر جمشید نے کہا — "ہو سکتا ہے میری والدہ بھی زندہ نہ ہو۔ سوچتا ہوں بھائیوں کا کیا بنے گا"۔

یہ تھی ڈاکٹر جمشید کی قربانی۔ اُس نے اپنے والدین کی امنگیں قربان کر دی تھیں۔ باپ کے بعد خاندان کی ساری ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر آتی تھیں لیکن اُس نے اس کی بھی پرواہ نہ کی۔

"لیکن اللہ سے ہمیشہ خیر کی توقع رکھنی چاہئے" — اس نے کہا — "میں کسی ذاتی غرض اور مقصد کے لئے تو یہاں نہیں آیا۔ یہ لوگ اللہ کے نام پر اسلام کی آن کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ان کا مقابلہ صلیبی طاقتوں سے ہے۔ میری کوشش یہ رہتی ہے کہ اس جہاد میں جو زخمی ہو جائے' اس کی صبح شام شفقت اور محبت سے مرہم پٹی کروں اور نرسنگ کروں اور اسے زندہ رکھوں۔ میں جب کسی مجاہد کی مرہم پٹی کر رہا ہوتا ہوں تو کوئی نہ کوئی وظیفہ کرتا رہتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے ہر وقت باوضو رہنا پڑتا ہے"۔

○

ڈاکٹر جمشید انور کے پاس اتنا وقت نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اُس روز اُسے خاصی فراغت میسّر آ گئی۔ وہ اس طرح کہ اسے عاشق علی کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔ انڈونیشی ہندوستانی مسلمانوں کی تو خاص طور پر دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا تھا کہ ہمارے ایریا کمانڈر عثمان نے ہیڈ کوارٹر والوں سے کہا تھا کہ عاشق علی کی حالت ٹھیک نہیں اس لئے کوئی اور ڈاکٹر بھیجا جائے۔ ڈاکٹر جمشید سپیشلسٹ نہیں تھا نہ وہ ایکسپرٹ تھا

لیکن اسے زخموں کی مرہم پٹی وغیرہ کا خصوصی تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔ چھُری چاقو' تلوار خنجر' بلکہ کلہاڑی کے زخموں کی مرہم پٹی آسان ہوتی ہے لیکن جو زخم رائفلوں اور مشین گنوں کی گولیوں کا پیدا کردہ ہوتا ہے یا توپ کے گولے کے ٹکڑے سے جو زخم آتا ہے' اس کی مرہم پٹی آسان نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر جمشید جب سے یہاں پہنچا تھا' وہ ایسے ہی زخمیوں کا علاج کرتا رہا تھا۔ ہیڈ کوارٹر نے اس روز اُسے صرف عاشق علی کے لئے بھیجا تھا۔

اس کے ہاتھ میں اللہ نے ایسی شفا دی تھی کہ صبح آتے ہی اُس نے عاشق کی پٹیاں کھولیں' زخم دیکھے اور معلوم نہیں اس نے کیا کیا کہ پٹیاں باندھ دیں اور کچھ دیر بعد عاشق ہوش میں آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے مرہم پٹی کے دوران کوئی وظیفہ پڑھا ہو گا۔

اب وہ عاشق علی کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لیکن ابھی اسے وہیں رہنا تھا اور رات اور دن عاشق علی کی صحت یابی کا جائزہ لینا تھا۔ اس طرح اسے اتنی فرصت مل گئی کہ میرے ساتھ باتیں کرتا اور سنتا رہا۔ میں چونکہ ہندوستانی مسلمان تھا اس لئے بھی وہ میرے ساتھ باتیں کرنا اور سننا چاہتا تھا۔

"معلوم نہیں آپ کو کوئی ایسا تجربہ ہُوا ہے یا نہیں" — اُس نے کہا — "یہاں کے صلیبی مسلمانوں کی اس جنگِ آزادی کو ناکام کرنے کے لئے زمین دوز کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ہندو بھی ان کے ساتھ شامل ہیں۔ صلیبیوں میں ایک تو انڈونیشی عیسائی ہیں اور دوسرے ڈچ (ولندیزی) ہیں۔ میں ان کی زمین دوز تخریب کاری کے کچھ واقعات سن چکا ہوں اور ایک ایسا واقعہ میرے ساتھ بھی ہُوا ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے کہ یہ غدار مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو سبوتاژ نہیں کر سکیں گے"۔

"انشاء اللہ کفّار بُری طرح ناکام رہیں گے" — میں نے کہا — "جو قوم دو طاقتور دشمنوں کی فوج' ایئر فورس اور نیوی کو ناکوں چنے چبوا رہی ہے اور فتح صاف نظر آنے لگی ہے' اس قوم کا زمین دوز کارروائیاں کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔ ہمارے ساتھ ایسا ایک واقعہ ہو چکا ہے"۔

ڈاکٹر جمشید باتوں کے دوران تین بار عاشق علی کو دیکھنے کے لئے اُس کے کمرے میں گیا تھا اور اس نے مجھے ہر بار آ کر بتایا تھا کہ اب عاشق سویا ہوا ہے اور اُس کی نبض بالکل

ٹھیک چل رہی ہے۔ وہ ایک بار پھر گیا اور عاشق کو دیکھ کر آ گیا۔ آمنہ کے متعلق دو چار باتیں ہوئیں اور وہ پھر اسی موضوع پر آ گیا۔ میں نے اسے سنایا کہ ایک ولندیزی اور ایک ہندو عورت ہمیں ایک پھندے میں لے گئی تھیں اور یہ اللہ کا کرم تھا کہ ہم وہاں سے نکل آئے تھے۔ میں نے اسے وہ واقعہ بھی سنایا جب میں سورابایا میں داخل ہونے سے پہلے ایک ولندیزی گھر میں چلا گیا تھا اور ان لوگوں کے دھوکے میں آ گیا تھا۔

"آپ خوش قسمت تھے کہ وہاں سے نکل آئے" — ڈاکٹر جمشید نے کہا — "اگر آپ اس پھندے سے نکل نہ سکتے اور ان لوگوں کا دھوکہ کامیاب ہو جاتا تو وہ لوگ آپ کو گرفتار کروا کے انگریزوں کے حوالے کر دیتے پھر آپ کا کورٹ مارشل ہوتا اور آپ کو دو تین سال سزائے قید مل جاتی۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں تو ایسے ایک پھندے میں پھنس گیا تھا جس میں سے اللہ تعالیٰ مجھے نہ نکالتا تو میں قتل ہو گیا ہوتا۔ وہ میرے قتل کی ہی سازش تھی۔ یہ میرا ایمان ہے اور ہر مسلمان کا یہی ایمان ہونا چاہئے کہ اللہ کی راہ پر چلنے والوں کی رہبری اللہ ہی کیا کرتا ہے"۔

ڈاکٹر جمشید انور نے جب مجھے یہ واقعہ سنایا تو میں کچھ دیر تو اس کے منہ کی طرف ہی دیکھتا رہا۔ مجھے اتنا حیران نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ڈاکٹر جمشید نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایمان پکا ہو تو اللہ مدد کیا کرتا ہے۔ میرا بھی یہی ایمان تھا۔ انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں اس سے بھی زیادہ حیرت ناک واقعات ہوئے ہیں مگر آج پاکستان میں بیٹھ کر جب میں وہ وقت یاد کرتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان میں وہ ایمان نہیں رہا۔

ڈاکٹر جمشید نے یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ سنایا تھا۔ اسے میں اپنی زبان میں پیش کروں گا.... ڈاکٹر جمشید مجھ سے بہت پہلے انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں شامل ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر تھا اور کیپٹن بھی تھا اس لئے وہ ایک اہم شخصیت تھا۔ مجھ جیسا کوئی سپاہی یا چھوٹے سے رینک کا آدمی مارا جاتا ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کسی افسر کے مارے جانے سے اور بھی بہت کچھ مر جاتا ہے۔ جمشید قتل ہو جاتا تو ایک ڈاکٹر مرجاتا اور پھر ایک کیپٹن مرجاتا اور ایسا خلا پیدا ہو جاتا جسے ایک کیپٹن ڈاکٹر ہی پر کر سکتا تھا لیکن وہاں ڈاکٹروں کی کمی تھی۔

ڈاکٹر جمشید کی ایک اہمیت اور افادیت اور بھی تھی۔ وہ مبلغ بھی تھا اور جہاں جاتا وہاں جہاد کی تلقین اور تبلیغ کرتا تھا۔ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے میرا ذہن

صاف اور جذبہ تیز کر دیا تھا۔ اسے جاننے والے ہندو اسے زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر جمشید آئی این اے میں سے نکل کر انڈونیشیا کے ایک بڑے شہر جوگ جکارتہ پہنچا تھا اور وہاں کے مسلمانوں سے ملا تو انہوں نے اسے اپنے گوریلا ہیڈ کوارٹر میں لے جا کر جنگِ آزادی میں شامل کر لیا تھا۔ انڈونیشی بہت ہی خوش ہوئے کہ انہیں ایک ڈاکٹر مل گیا ہے۔ میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر جمشید کس جوش اور جذبے سے ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے لگا تھا۔ وہ دو چار مہینے جوگ جکارتہ میں رہا پھر اسے ایک اور شہر سورا کارتہ بھیج دیا گیا جو وہاں سے تقریباً" نوّے میل دُور تھا۔ وہاں زخمی زیادہ تعداد میں آتے تھے۔

○

اُس وقت سورا کارتہ چھوٹا سا قصبہ ہُوا کرتا تھا۔ آبادی کی اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن زیادہ تر لوگ قصبے میں موجود نہیں تھے۔ وہ لڑنے کے لئے مختلف جگہوں پر چلے گئے تھے۔ قصبے میں اسی قسم کا ایک ہسپتال بنا لیا گیا تھا جیسا سورابایا میں بنایا ہُوا تھا۔ قصبے میں عورتیں تھیں یا بچے یا وہ جواں سال آدمی نظر آتے تھے جو زخمیوں کو لاتے اور ایک دو دن قصبے میں رک کر چلے جاتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں کوئی جوان آدمی تھا ہی نہیں۔ کچھ گھرانے ولندیزیوں کے تھے اور کچھ عیسائیوں کے بھی۔ مسلمان جوان بھی نظر آتے تھے لیکن زیادہ دیر نہیں رکتے تھے۔

ڈاکٹر جمشید وہاں پہنچا تو اس نے ہسپتال کی ڈیوٹی سنبھال لی اور زخمیوں میں مصروف ہو گیا۔ تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ ایک ہندوستانی اس کے پاس آیا اور کہا کہ یہاں ایک گھر مسلمانوں کا ہے جس میں ماں ہے اور ایک جوان سال بیٹی۔ یہ بھی بتایا کہ اس عورت کا بیٹا جنگِ آزادی میں شامل تھا اور تین مہینوں سے اس کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اس کی کل اولاد یہ بیٹی ہے اور ایک جوان بیٹا ہے جو اپنی گوریلا پارٹی کے ساتھ باہر ہی رہتا ہے۔

"میں اتفاق سے اس گھر کے سامنے سے گزرا" — اس ہندوستانی مسلمان نے کہا — "عورت دروازے میں کھڑی تھی اور رو رہی تھی۔ میں نے رونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ گھر میں کوئی ایک بھی مرد نہیں اور اُس کی بیٹی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے کہ عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہے"۔

"تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟" — ڈاکٹر جمشید نے پوچھا — "کیا یہاں اور

کوئی ڈاکٹر نہیں؟"

"آپ کے اس ہسپتال میں اور بھی ڈاکٹر ہیں" — اس ہندوستانی مسلمان نے کہا — "لیکن میں ان کی زبان نہیں جانتا۔ آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ایک تو آپ ہندوستانی مسلمان ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ میں نے آپ کو آئی این اے میں دیکھا تھا۔ میں بھی فوج سے بھاگ کر آئی این اے میں آگیا تھا"۔

"اس انڈونیشی عورت کی زبان تم کس طرح سمجھ گئے تھے؟" — ڈاکٹر جمشید نے پوچھا۔

"میں جس گھر کی بات کر رہا ہوں وہ کوئی اونچا تعلیم یافتہ گھر معلوم ہوتا ہے" — ہندوستانی مسلمان نے جواب دیا — "عورت اتنی سی انگریزی بول سکتی ہے کہ اپنا مطلب واضح کر لیتی ہے۔ میں بھی اتنی سی ہی انگریزی جانتا ہوں"۔

ڈاکٹر جمشید کا انداز انکوائری والا یا شک رفع کرنے والا نہیں تھا۔ وہ ویسے ہی اس ہندوستانی سے کچھ باتیں پوچھ رہا تھا۔ ڈاکٹر تو جوشیلا جوان تھا' وہ جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہُوا تھا۔ وہ انڈونیشیا آیا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ وہ اس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔

اس گھر میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے ان کا استقبال کیا۔ وہ چہرے کے خدوخال سے انڈونیشی لگتی تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کا نام بتایا جو مجھے ڈاکٹر جمشید نے بتایا تھا لیکن یاد نہیں رہا۔ وہ بڑی مغموم اور پریشان تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے اس کے ساتھ انگریزی میں بات کی اور عورت نے بھی انگریزی بولی جو گرامر کے لحاظ سے خاصی ناقص تھی لیکن ڈاکٹر جمشید اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے گھر کے کمروں پر نظر دوڑائی' زیب و زیبائش دیکھی اور فرنیچر دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ کسی تعلیم یافتہ اور اونچے درجے کے آدمی کا گھر ہے۔

ڈاکٹر جمشید کو انڈونیشی مسلمانوں کے گھروں میں جانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ یہ پہلا گھر تھا جس میں وہ داخل ہُوا تھا۔ شاید یہ وجہ تھی کہ وہ وہاں کے گھروں کی اونچ نیچ کو نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ بھی نہ سمجھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمشید مرد مومن تھا اور وہ اپنے کردار کی آنکھ سے سب کچھ دیکھتا تھا اور اس وقت اس کے ذہن پر ایک مریضہ غالب آئی ہوئی تھی جسے دیکھنے کے لئے وہ وہاں گیا تھا۔ اگر اسے بتایا جاتا کہ یہ ایک مقامی عیسائی کا یا کسی ولندیزی کا گھر ہے اور یہاں ایک مریض تڑپ رہا ہے تو بھی ڈاکٹر جمشید کسی

خطرے کی اور کسی پابندی کی پرواہ نہ کرتا اور وہاں جا پہنچتا۔

عورت اسے ایک کمرے میں لے گئی۔ اس کمرے کا فرنیچر وغیرہ بھی امیرانہ تھا اور ہر چیز سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ ایک پلنگ پر ایک جوان لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے خدوخال انڈونیشی ہی تھے لیکن ماں سے ذرا مختلف لگتی تھی۔ عورت نے بتایا کہ یہ اس کی بیٹی ہے اور نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔

لڑکی ڈاکٹر کو دیکھ کر اٹھ بیٹھی اور اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات آ گئے۔ وہ ڈاکٹر سے دُور ہٹنے کے لئے پلنگ پر سرکتی ایک کونے تک چلی گئی۔ اس کی ماں نے اسے پیار کیا' پکارا اور کہا کہ یہ ڈاکٹر ہے اور تمہیں اس ذہنی اذیت سے نجات دلا دے گا۔ وہ اپنی زبان میں بیٹی سے بات کر رہی تھی۔ ڈاکٹر جمشید نہیں سمجھ سکا تھا۔ مجھے یہ جملے سناتے ہوئے اس نے کہا کہ ماں اپنی بیٹی کو یہی کہتی ہو گی کیونکہ اس کی حرکتیں ایسی ہی تھیں۔

ہندوستانی جس نے اپنا نام عبدالخالق بتایا تھا' ڈاکٹر کے ساتھ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ یہ لڑکی بھی کچھ کچھ انگریزی بول لیتی ہے اور سمجھتی بھی ہے۔ اس وقت ڈاکٹر جمشید کو خیال آیا کہ عبدالخالق کا اس گھر کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس نے عبدالخالق سے پوچھا تو عبدالخالق نے اسے بتایا کہ وہ جب انڈین نیشنل آرمی سے بھاگ کر یہاں آیا تھا تو اسی گھرانے نے اسے پناہ دی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس گھر میں چونکہ کوئی مرد نہیں رہا اور یہ ماں بیٹی اکیلی ہیں اس لئے وہ ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے وقتاً" فوقتاً" آتا رہتا ہے۔

مجھے اگر اس ڈاکٹر کا صرف یہ واقعہ ہی سنانا ہوتا تو میں ذرا ذرا سی تفصیلات بھی نہ سناتا۔ کہانی خاصی طویل ہے لیکن میں ذرا اختصار سے کام لوں گا۔ واقعہ پورا سناؤں گا اور اس میں کوئی تشنگی نہیں رہنے دوں گا۔

ڈاکٹر جمشید نے جان لیا کہ لڑکی کو کوئی جسمانی بیماری لاحق نہیں اور اگر کچھ ہے تو وہ اس کے ذہن میں ہے اور یہ صدمے کا اثر ہے۔ ڈاکٹر جمشید کو ایک شک یہ بھی تھا کہ لڑکی کے ساتھ کسی نے زبردستی دست درازی اور زیادتی کی ہو گی۔ اس وقت انڈونیشیا میں کوئی قانون نہیں چلتا تھا۔ پولیس شاید ہو گی لیکن وہ مفلوج اور بے کار تھی۔

ایک صدمے کے متعلق تو اسے بتایا ہی گیا تھا کہ لڑکی کا باپ جنگِ آزادی میں شامل

ہُوا اور پھر اس کا پتہ ہی نہ چلا۔ ایک جوان بھائی تھا' وہ بھی کچھ عرصے سے گھر نہیں آیا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر جمشید سمجھ گیا کہ لڑکی کے ذہن میں صدمے کا بے پناہ اثر موجود ہے اور یہ اثر اسے پاگل پن تک بھی پہنچا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جمشید اٹھا اور لڑکی کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور انگریزی میں اسے کہا کہ وہ اس کا ہمدرد ہے اور اس کے باپ اور بھائی کو ڈھونڈ کر لے آئے گا لیکن ابھی وہ اسے یعنی لڑکی کو ذہنی سکون دینے آیا ہے اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو وہ بتا دے اور ڈرے نہیں اور تعاون کرے۔

لڑکی کا جسم ساکن ہو گیا اور وہ آنکھیں پھاڑے ڈاکٹر کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر پلنگ پر بیٹھ گیا تھا اور لڑکی اس سے ذرا دُور سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر نے ہاتھ اس کی طرف لمبا کیا تو وہ آہستہ آہستہ سرکتی ڈاکٹر کے قریب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اسے مزید تسلی تشفی دی اور بڑے پیارے انداز میں باتیں کیں۔ لڑکی نے ڈاکٹر کا ایک بازو پکڑ کر اپنی پیٹھ کے پیچھے کر لیا اور ڈاکٹر کے ساتھ اس طرح لگ گئی جیسے ڈرا ہُوا بچہ اپنی ماں کی آغوش میں پناہ لیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر جمشید پکّا مومن تھا۔ وہ مومن تو پکّا تھا لیکن عمر ابھی کچّی تھی۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہی تھی۔ لڑکی کی عمر تیئیس چوبیس یا زیادہ سے زیادہ پچیس سال تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے مجھے بتایا کہ لڑکی جب اس کے بازو کے گھیرے میں آ کر اس کے جسم کے ساتھ لگی تو اس کے گال لڑکی کے سر کے ساتھ مَس کرنے لگے۔ لڑکی کے کھلے ہوئے بال ریشم جیسے ملائم تھے۔ ڈاکٹر جمشید نے اپنے جذبات میں کچھ عجیب سی ہلچل محسوس کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی نیّت بد ہو گئی تھی بلکہ مطلب صرف اتنا تھا کہ اسے اپنائیت کا احساس ہونے لگا اور یہ احساس بھی کہ اس لڑکی کے ساتھ اس کا کوئی اور تعلق بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔ لڑکی کی ماں اس طرف کھڑی تھی جس طرف اس کی بیٹی کی پیٹھ تھی۔ وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور سر سے ہلکا سا اشارہ کر کے باہر نکل گئی۔ اشارے کے مطلب یہ تھا کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو یہ ٹھیک ہے اور اسے یعنی ماں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ عبدالخالق بھی باہر نکل گیا۔ ان کے جانے کے بعد لڑکی کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔ کسی وقت لڑکی کا جسم اچانک لرز جاتا تھا جیسے جھٹکا لگا ہو۔

یہاں میں اپنی تھوڑی سی رائے دینا چاہوں گا۔ وہ اس لئے کہ بعض لوگ یہ واقعہ

پڑھ کر کہیں گے کہ یہ ڈاکٹر اچھا مومن تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر پگھل گیا۔ ڈاکٹر جمشید کے اس وقت کے تاثرات کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے کچھ عرصہ ان حالات میں گزرا ہو جن حالات میں اس ڈاکٹر نے عمر کے چار سال گزار دیئے تھے۔ یہ کیفیت مجھ پر بھی طاری ہو چکی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ برما کے جنگلوں میں ایسی ہی ایک خوبصورت لڑکی نے مجھے بھی اس آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ ذرا تصوّر میں لائیں کہ آپ تین چار برس جنگل میں جانوروں کی طرح بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ جانوروں کی طرح خوراک اور پناہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ پھر آپ کو ایک ایسی جنگ میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں صرف گولیاں چلتی ہیں اور موت کے قہقہے سنائی دیتے ہیں۔ آپ کے اعصاب پر مسلسل بوجھ بھی پڑ رہا ہے اور کھچاؤ ایسا جو بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہو کر دماغی توازن بگاڑ دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک جوان لڑکی آپ کے اتنے قریب آ بیٹھتی ہے کہ آپ اس کے جسم کی تپش اور بُو بھی محسوس کر سکتے ہیں تو اس وقت آپ کو اپنا گھر یاد آئے گا' ماں بھی' بہن بھی اور کوئی بیٹی ہے تو وہ بھی اور اگر کوئی بیوی ہے تو وہ اور ہی زیادہ یاد آئے گی۔ آپ کو اس خوبصورت لڑکی کے وجود میں سب کچھ نظر آنے لگے گا.... ماں بھی' بہن بھی' بیٹی اور بیوی بھی.... میں ان تاثرات کو اچھی طرح اور پورے وثوق کے ساتھ اس لئے بیان کر سکتا ہوں کہ میں اس پُل صراط سے گزرا ہوں۔

ڈاکٹر جمشید کی نیّت بد نہیں ہُوئی تھی نہ اس میں حیوانی جذبات بیدار ہوئے تھے لیکن یہ خواہش یقیناً" بیدار ہوئی تھی کہ یہ خوبصورت اور ملائم جسم والی لڑکی کچھ دیر اور اس کے لگی بیٹھی رہے اور وہ اس کے ساتھ پیار اور ہمدردی کی باتیں کرتا رہے۔ ذہن میں یہ حقیقت رکھیں کہ ڈاکٹر جمشید انسان بھی تھا اور جوان بھی۔ اس نے لڑکی کو اپنے بازو کی گرفت میں اور زیادہ لے لیا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ لڑکی کا انداز ایسا ہو گیا جیسے اس نے اپنا سراپا اور اپنا وجود جمشید کے حوالے کر دیا ہو۔

لڑکی کی انگریزی بہت ہی ناقص تھی اور وہ کچھ باتیں اشاروں سے واضح کرتی تھی لیکن ڈاکٹر جمشید اس کا عارضہ سمجھ گیا تھا۔ لڑکی اسے کہہ رہی تھی کہ وہ ہر وقت اس کے پاس رہے لیکن ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ یہ اس کے لئے ممکن نہیں' وہ اس کے پاس آتا رہے گا۔ پھر ڈاکٹر جمشید نے اسے کہا کہ وہ اسے ایک دوائی دے گا جس سے نیند آ جائے گی اور جس ذہنی بے چینی یا صدمے میں مبتلا ہے' اس میں خاصا افاقہ ہو گا۔

ڈاکٹر جمشید کو یہاں آتے ہی ایک بیگ دے دیا گیا تھا جس میں ایمرجنسی کی تمام ضروری دوائیاں ڈالی گئی تھیں۔ اُس نے ایک گولی بیگ میں سے نکال کر لڑکی کو دی اور کہا کہ یہ ابھی پانی کے ساتھ لے لے۔ لڑکی نے گولی تکیئے کے نیچے رکھ دی اور کہا کہ گولی ڈاکٹر کے جانے کے بعد لے گی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ گولی ابھی لے لے لیکن لڑکی نے کہا کہ جب تک وہ اس کے پاس موجود ہے' وہ گولی نہیں لے گی کیونکہ اس کی موجودگی میں وہ بیدار رہنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر اس کی باتوں میں آگیا اور کچھ دیر اور اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی اس طرح اس کے اور ہی زیادہ قریب ہونے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اس کے جسم میں سما جانا چاہتی ہو۔

آخر ڈاکٹر اٹھا اور لڑکی کے ساتھ پھر آنے کا وعدہ کر کے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے لڑکی کی ماں کو بتایا کہ وہ ایک گولی دے چلا ہے جو لڑکی کو ابھی پانی کے ساتھ دے دینی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند سو جائے گی اور جب جاگے گی تو اس کی حالت بہتر ہو جائے گی۔ اس نے ماں کو یہ بھی بتایا کہ یہ صدمے کا اثر ہے اور گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

ماں نے پریشانی کے عالم میں بتایا کہ اس لڑکی کا علاج نہ ہُوا تو یہ ٹھیک ہے کہ یہ پاگل ہو جائے گی۔ اس نے بتایا کہ رات گہری نیند سے جاگ اٹھتی ہے اور بڑی زور کی چیخ مارتی ہے جس سے ماں کا دل دہل جاتا ہے۔ اچانک بیٹھے بیٹھے بلند آواز سے بولنا شروع کر دیتی ہے اور اس طرح ہر طرف' اوپر نیچے دیکھتی ہے جیسے اسے کوئی غیر مرئی چیز نظر آ رہی ہو۔

ڈاکٹر جمشید نے مجھے بتایا کہ اس کی تشخیص کے مطابق یہ اعصاب زدگی کا کیس تھا اور اعصاب زدگی کا باعث صدمہ تھا۔ اگر اس لڑکی کے بارے میں ڈاکٹر جمشید کی نیت شیطانی ہوتی تو وہ مجھے یہ بات اس طرح سناتا جیسے وہ اس لڑکی کے حسن اور جوانی سے ذرا بھی متاثر نہیں ہُوا اور ایک مومن کی طرح اس کا علاج شروع کیا تھا لیکن ڈاکٹر جمشید نے بڑی ہی صاف گوئی اور صداقت سے مجھے یہ واقعہ سنایا اور لڑکی کی قربت نے اس کے جذبات میں جو ہلچل مچائی تھی وہ مکمل طور پر سنائی اور پھر اس نے کہا کہ اس کی نیت بری نہیں تھی البتہ لڑکی اس کے ذہن پر سوار ہو گئی تھی۔

○

ڈاکٹر جمشید اپنے ہیڈ کوارٹر میں واپس آیا تو وہاں بتایا کہ ایک لڑکی کو دیکھنے گیا تھا اور وہ اعصاب زدگی کا کیس ہے جسے وہ پھر بھی دیکھنے جائے گا۔ کسی نے اس سے نہ پوچھا کہ وہ لڑکی کون ہے' کس کی بیٹی ہے اور کہاں رہتی ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہی کافی تھا کہ ڈاکٹر جمشید نے انہیں بتایا کہ وہ مسلمان ہیں اور لڑکی کا باپ لاپتہ ہے اور بھائی بھی کچھ عرصے سے گھر نہیں آیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس گوریلا ہیڈ کوارٹر میں کسی کو اِدھر اُدھر کی ہوش نہیں تھی۔ وہاں اوپر سے آپریشن آرڈر آتے رہتے تھے' یہاں مشن کے لئے پارٹیاں بنتی رہتی تھیں اور اِدھر اُدھر گوریلا کارروائیوں اور ان کے نتائج کی رپورٹیں آتی رہتی تھیں۔ زخمی آتے تھے تو دو تین ڈاکٹر جو وہاں موجود تھے' زخمیوں کی مرہم پٹی میں مصروف ہو جاتے تھے۔ اس صورتِ حال میں ڈاکٹر جمشید کی کسی نے پوری بات بھی نہ سنی۔

شام کے وقت ڈاکٹر جمشید پھر اس لڑکی کو دیکھنے چلا گیا۔ لڑکی کی ماں اسے لڑکی کے کمرے میں لے گئی۔ اس وقت لڑکی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کے چہرے پر تازگی بلکہ کچھ بشاشت تھی۔

ڈاکٹر جمشید نے اُس سے پوچھا کہ نیند آئی تھی؟.... پہلے ماں بولی' نیند تو بڑی ہی گہری آئی تھی اور یہ کچھ ہی دیر پہلے جاگی ہے۔ لڑکی نے مسکرا کر سر ہلایا جو اشارہ تھا کہ ماں ٹھیک کہتی ہے۔ ڈاکٹر جمشید نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ اب کتنا کچھ افاقہ محسوس کر رہی ہے۔

ڈاکٹر ابھی بیٹھا نہیں تھا' صوفے پر بیٹھی لڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس نے اُس کی ماں کے ساتھ کوئی بات کرنا چاہی تو اُدھر دیکھا لیکن ماں وہاں نہیں تھی۔ وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔ لڑکی اٹھی اور اپنے دونوں بازو ڈاکٹر جمشید کے گلے میں ڈال کر اس کے ساتھ جیسے چپک گئی ہو۔ ڈاکٹر جمشید نے ذرا سی بھی مزاحمت نہ کی بلکہ اس کا بھی ایک بازو لڑکی کے گرد لپٹ گیا۔

اپنے جذبات کا اس طرح والہانہ اظہار کر کے لڑکی نے ڈاکٹر جمشید کو بتایا کہ وہ خاصی بہتر محسوس کر رہی ہے لیکن ابھی کچھ بے چینی سی ذہن میں موجود ہے اور دل پر خوف سا بھی طاری ہو جاتا ہے لیکن اس کی شدت میں کمی آگئی ہے۔

کچھ دیر بعد لڑکی کی ماں چائے لے کر آگئی اور ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ چائے کے

دوران لڑکی کی ذہنی کیفیت اور علاج کی ہی باتیں ہوتی رہیں اور اس دوران ڈاکٹر جمشید نے دیکھا کہ لڑکی اسے جذباتی سی نظروں سے دیکھ رہی ہے اور ڈاکٹر نے بھی چند مرتبہ بے اختیار ہو کر لڑکی کو دیکھا اور دونوں کے ہونٹوں پر تبسّم آگیا۔

ماں چائے کے برتن اٹھا کر چلی گئی تو لڑکی نے ڈاکٹر جمشید سے کہا کہ اس کی گولی کا تو صرف یہ اثر ہُوا ہے کہ وہ سو گئی تھی اور اس سے اسے کچھ جسمانی سکون آگیا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کئی دنوں اور راتوں سے جاگتی ہی چلی آ رہی تھی اور وہ سو جاتی تھی تو بھی اس پر بیداری کا احساس طاری رہتا تھا لیکن اسے دلی سکون ڈاکٹر جمشید کی ذات سے اور باتوں سے ملا ہے۔ لڑکی نے جذباتی الفاظ میں بے ساختہ اظہار محبت کر دیا۔ تب ڈاکٹر جمشید نے اسے بتایا کہ اس کے بارے میں ان کے اپنے جذبات بھی ایسے ہی ہیں لیکن ان جذبات میں وہ بدی کو کسی قیمت پر نہیں لائے گا۔

لڑکی کے پاس انگریزی کے اتنے زیادہ الفاظ نہیں تھے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار پوری طرح کر سکتی لیکن اس نے پوری کوشش کی کہ دل کھول کر اس ڈاکٹر کے آگے رکھ دے۔ اسے جہاں الفاظ نہ ملے' اس نے ڈاکٹر جمشید کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چُوم لیا یا ایسے ہی کوئی اور جذباتی حرکت کر کے اپنے جذبات اور احساسات ڈاکٹر کے آگے کھول کر رکھ دیئے۔ ایک بار تو اس نے ڈاکٹر کا بازو پکڑا اور اسے اپنی طرف گھسیٹ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ ڈاکٹر جمشید کو یہ ڈر تھا کہ اس کی ماں آجائے گی لیکن لڑکی پوری طرح بے باک تھی جیسے اُسے یقین تھا کہ ماں نہیں آئے گی۔

ڈاکٹر جمشید نے مجھے بتایا کہ یہ لڑکی اُس کے دل پر قابض ہوتی جا رہی تھی لیکن وہ اسے بھی علاج کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا.... ڈاکٹر جمشید بات سناتے ہوئے یہ کوشش بھی کر رہا تھا کہ میں اس پر کوئی شک نہ کروں۔ میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں نے اس پر کوئی شک کیا ہے۔ میں حقیقت کو سمجھنے والا آدمی تھا اور اسے فرشتہ نہیں سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر نے محسوس ہی نہ کیا کہ اسے وہاں بیٹھے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا ہے اور اسے واپس جانا چاہئے۔ وہ تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ کسی اور کے لئے بھی ڈاکٹر ہے اور ہو سکتا ہے کچھ اور زخمی کہیں سے آئے ہوں۔ اسے اطمینان تھا کہ وہاں دو اور ڈاکٹر موجود تھے.... جب اُسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہئے' عبدالخالق آگیا۔ ڈاکٹر جمشید نے اسے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا کہ لو بھائی' تمہاری مریضہ کو میں نے ٹھیک کر دیا ہے لیکن

پوری طرح صحت یاب ہونے میں کچھ دن اور لگیں گے۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" — عبدالخالق نے کہا — "یہ مریضہ میری نہیں' آپ کی ہے۔ میں تو اس ماں بیٹی کو جانتا تک نہ تھا۔ اس کی ماں کو باہر دروازے میں کھڑے روتا نہ دیکھتا تو آپ بھی اس گھر میں نہ آتے اور پھر آپ جانتے ہیں کہ اس لڑکی کا انجام کیا ہوتا۔ میں یہ دیکھ کر آپ کے پاس گیا تھا کہ یہ جوان اور خوبصورت لڑکی ہے۔ اگر ذہنی خرابی میں یہ باہر نکل گئی تو پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا کیا حشر ہونا تھا۔ یہاں قانون تو کوئی ہے ہی نہیں۔ جسے موقع ملتا ہے وہ من مانی کر جاتا ہے۔ یہ انڈونیشی مسلمان اپنی جنگِ آزادی میں مصروف ہیں۔"

"نہیں بھائی!" — ڈاکٹر جمشید نے کہا — "یہ جنگِ آزادی صرف ان کی نہیں بلکہ ہم دونوں کی بھی ہے اور دنیا کے ہر مسلمان کی ہے۔ ہمیں اس خطّے میں اسلام کو آزاد رکھنا ہے۔ یہاں سے ہم اسلام کو اور آگے لے جائیں گے"۔

"میں آپ کا ہم خیال ہوں ڈاکٹر صاحب!" — عبدالخالق نے کہا — "ہم تو گمراہ ہو کر انڈین نیشنل آرمی میں جا شامل ہوئے تھے۔ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس اسلامی جنگِ آزادی میں شرکت کا موقع مل گیا۔ یہ تو میں آپ کو بتا ہی نہیں رہا کہ میں اس وقت تک ان گوریلا مجاہدین کے ساتھ کیسے کیسے خطرناک مشن کر چکا ہوں"۔

کچھ دیر اور باتیں ہوئیں اور عبدالخالق اجازت لے کر چلا گیا۔ جس وقت عبدالخالق اُس کمرے میں موجود تھا اس وقت لڑکی کی ماں بھی آگئی تھی لیکن عبدالخالق وہاں سے نکلا تو ماں بھی اُس کے ساتھ ہی نکل گئی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر جمشید نے نیند کی ایک اور گولی لڑکی کو دے کر کہا کہ کھانے کے بعد پانی سے لے لے۔ ساتھ ہی اسے وٹامن کی گولیاں بھی دیں۔ یہ اعصابی طاقت کے لئے تھیں۔ وہ جانے کے لئے اٹھا تو لڑکی ایک بار پھر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اسے کہا کہ وہ صبح ہوتے ہی اس کے پاس آجائے۔ ڈاکٹر وعدہ کر کے چلا گیا۔

○

اگلی صبح طلوع ہوئی تو ڈاکٹر جمشید نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور پھر ہسپتال میں اُن زخمیوں کو دیکھا جو اس کی ذمہ داری میں تھے اور پھر ایک دو کی پٹیاں بدل کر فارغ ہُوا تو اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو یہ بتا کر کہ وہ اپنی مریضہ کو دیکھ کر واپس آتا ہے' چلا گیا۔ ابھی وہ

باہر نکلا ہی تھا کہ ایک ڈاکٹر دوڑتا ہُوا باہر آیا اور اسے آواز دے کر کہا کہ وہ جلدی واپس آ جائے کیونکہ کچھ دیر پہلے اطلاع آئی تھی کہ چند ایک زخمی لائے جا رہے ہیں۔

لڑکی کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ڈاکٹر جمشید بہت ہی تیز تیز چلتا لڑکی کے گھر پہنچا۔ اسے اپنا منتظر پایا۔ سب سے پہلے اس کی ذہنی حالت پوچھی۔ وہ تو اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ چہرے پر وہی تازگی تھی جو اس نے گذشتہ شام دیکھی تھی۔ ماں حسبِ معمول کمرے سے نکل گئی اور لڑکی نے محبت کی دیوانگی کا اظہار اپنے ہاتھوں اور ہونٹوں سے شروع کر دیا۔ ڈاکٹر جمشید نے اسے بتایا کہ وہ زیادہ دیر رک نہیں سکے گا کیونکہ کچھ زخمی آ رہے ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ دن کے وقت اسے نیند کی گولی نہیں دی جائے گی اور لڑکی دوسری گولیاں لیتی رہے جو اعصابی طاقت کے لئے تھیں۔ بس اتنی سی بات کہہ کر ڈاکٹر جمشید وہاں سے آ گیا۔ وہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

اُس کا وہ دن بہت ہی مصروف گزرا۔ چار زخمی آئے تھے جن میں سے ایک کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ بڑی کوشش کے باوجود اسے بچایا نہ جا سکا اور وہ مرہم پٹی کے دوران ہی شہید ہو گیا۔ دوسرے زخمیوں کے زخم بھی گولیوں کے تھے لیکن گولیاں ٹانگوں اور بازوؤں میں لگی تھیں اس لئے ان کی جانیں بچائی جا سکتی تھیں جو انہوں نے بچا لیں۔ البتہ ایک زخمی کا ایک بازو کندھے سے کاٹنا پڑا کیونکہ مشین گن کا پورا برسٹ کلائی سے کندھے تک ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر گیا تھا۔

شام تک ڈاکٹر جمشید نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر لڑکی کے گھر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر زخمیوں کو دیکھا اور ساتھی ڈاکٹروں کو بتا کر وہاں سے نکل گیا۔

اُس نے اس شام بھی لڑکی کو بے تابی کی حالت میں دیکھا اور وہ اُٹھ کر ڈاکٹر کے گلے لگ گئی۔ لڑکی کی ماں نے آ کر کہا کہ آج وہ کھانا یہیں کھائے گا۔ ماں اتنی سی بات کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ جمشید نے لڑکی سے کہا کہ وہ کھانے کے لئے نہیں رکے گا کیونکہ سب ڈاکٹر اکٹھے کھانا کھایا کرتے ہیں اور اس نے اپنے ساتھیوں کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کھانے پر نہیں پہنچ سکے گا۔ لڑکی نے اصرار کیا لیکن ڈاکٹر جمشید نے اسے منوا لیا کہ وہ نہیں رک سکے گا۔

وہ اس خیال سے اٹھا کہ باورچی خانے میں جا کر لڑکی کی ماں سے کہہ دے کہ وہ اس کے لئے کھانے کا تردّد نہ کرے.... یہ مکان اندر سے خاصا بڑا تھا اور صحن تو کچھ زیادہ ہی

وسیع تھا۔ ایک طرف کیارے تھے جن میں پودے اور چھوٹے چھوٹے درخت اُگے ہوئے تھے۔ جمشید جب بھی یہاں آیا' اس نے ان کیاروں کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ اب وہ صحن میں نکلا تو صحن کا بلب جل رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں جا رہا تھا جو سامنے تھا۔

جمشید کی نظر کیاروں کی طرف گئی تو اُسے تازہ کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر نظر آیا۔ اُس نے اس مٹی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیاروں کے ساتھ ہی مکان کی اونچی دیوار تھی۔ باورچی خانہ ان کیاروں کے قریب ہی تھا۔ جمشید باورچی خانے میں گیا اور لڑکی کی ماں سے کہا کہ وہ کھانے کے لئے نہیں رک سکے گا۔ اس نے وہی وجہ بتائی جو لڑکی کو بتائی تھی۔ وہ باورچی خانے سے نکلا تو ماں بھی اس کے ساتھ ہی نکل آئی۔ ڈاکٹر جمشید نے دیکھا کہ مٹی کے ڈھیر کے ساتھ کیارہ کھُدا ہُوا تھا اور اس کی گہرائی کم و بیش تین فٹ تھی اور لمبائی چھ فٹ کے لگ بھگ تھی۔

ڈاکٹر جمشید نے لڑکی کی ماں سے ویسے ہی پوچھا کہ یہ جگہ یہاں سے کیوں کھُدوائی گئی ہے؟.... ماں نے بڑے شگفتہ لہجے میں بتایا کہ اس کی بیٹی کو پودوں اور پھول دار درختوں کے ساتھ بڑی ہی دلچسپی ہے اور یہاں تین درخت لگانے ہیں اور یہ لڑکی کو خوش رکھنے کا اہتمام ہے۔ اس نے بتایا کہ دن کو دو مزدور بلائے تھے اور یہ گڑھا کھُدوایا ہے اور کل یہی مزدور درخت لے آئیں گے اور اس میں لگا کر مٹی بھر دیں گے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسے بتایا گیا تھا کہ درخت ابھی چند فٹ ہی اونچے ہیں لیکن انہیں گہرائی میں لگانا ہے۔

ڈاکٹر جمشید نے ادھر کوئی توجہ نہ دی' اس نے ماں بیٹی کے ذوق کی تعریف کی اور واپس لڑکی کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی اُس شام سوائے محبت اور پیار کے کوئی بات کرتی ہی نہیں تھی۔ اُس نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اسے ذہنی اذیّت سے نجات دلا دی ہے۔

ایسی ہی جذباتی کیفیت ڈاکٹر پر بھی طاری ہونے لگی۔ لڑکی نے اسے کہا کہ وہ بے فکر رہے' اس کی ماں اچانک کمرے میں نہیں آئے گی۔ لڑکی نے یہ بھی کہا کہ اس نے اپنی ماں کو بتا دیا ہے کہ وہ ڈاکٹر کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے اور اس کی صحت یابی کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ماں نے اس کے ان جذبات کو اور اس محبت کو قبول کر لیا

ہے اور کہا ہے کہ وہ ڈاکٹر کے ساتھ کسی وقت بات کرے گی اور اسے شادی کے لئے رضامند کرلے گی۔

میرا خیال تو یہ تھا کہ ڈاکٹر سادہ آدمی تھا۔ اس کی اپنی فطرت میں کوئی ہیر پھیر نہیں تھا اس لئے ہر کسی کو اپنے جیسا مخلص سمجھتا تھا۔ یہاں اس کے لئے ایک مجبوری یہ بھی پیدا ہو گئی کہ اتنی خوبصورت لڑکی نے اس کی فطرت میں ایک تشنگی پیدا کر دی تھی جو انسان کی فطرت کی ایک کمزوری ہوتی ہے۔

اب آپ اُس منظر کو تصوّر میں لائیں جو میں بیان کرنے لگا ہوں۔ ڈاکٹر نے تو ذرا ذرا سی بات اور حرکت مجھے سنائی تھی اور ایسے لگ رہا تھا جیسے ڈاکٹر کسی انگریزی فلم کا سین سنا رہا ہو۔

یہ منظر یوں بنا کہ لڑکی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک لمبوترا سا سٹول تھا جس پر بڑی خوبصورت گدی سلی ہوئی تھی۔ لڑکی نے یہ سٹول گھسیٹ کر اپنے سامنے رکھ لیا اور ڈاکٹر کا بازو پکڑ کر کھینچا اور اسے اس سٹول پر بٹھا دیا۔ سٹول لڑکی کے اتنا قریب تھا کہ دونوں کی ٹانگیں ایک دوسرے میں الجھ گئی تھیں۔

اس شام تو لڑکی نے بہت ہی زیادہ جذباتی ہو کر محبت کا اظہار کیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ ڈاکٹر کی گردن میں دائیں بائیں رکھے اور اسے آگے کو کر کے اپنا منہ اس کے منہ کے قریب کر لیا۔ ایک دو منٹ بعد ڈاکٹر ذرا پیچھے ہو گیا اور اس نے اپنا منہ ذرا اوپر کیا۔

کمرے کا دروازہ ڈاکٹر کی پیٹھ کے پیچھے تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے سنایا کہ ویسے ہی اس کی نظر صوفے کے دائیں طرف کمرے میں ایک کونے میں گئی۔ وہاں قدِ آدم آئینے والا ڈریسنگ ٹیبل رکھا تھا۔ سامنے انگیٹھی یعنی ایک بڑی خوبصورت سیزی فریم میں لگی ہوئی رکھی تھی۔ یہ دو فٹ سے ذرا زیادہ لمبی اور فٹ ڈیڑھ فٹ چوڑی تھی۔ فریم میں شیشہ لگا ہُوا تھا۔ کمرے کی بتی چھت سے لٹک رہی تھی۔

آپ ذرا تصوّر میں لانے کی کوشش کریں۔ ڈریسنگ ٹیبل کا آئینہ ایسے زاویے پر رکھا تھا کہ دروازے میں سے داخل ہونے والا کوئی بھی شخص اس میں سے نظر نہیں آتا تھا لیکن سیزی کے شیشے میں صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ دروازہ ہے اور اس کے آگے صحن ہے۔ وہ جو عکس سیزی کے شیشے میں آتا تھا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں سے ہو کر آرہا

تھا۔ سیزی کے شیشے میں دروازے کا براہِ راست عکس نہیں آسکتا تھا کیونکہ اس کا زاویہ کچھ اور تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے آئینے اور شیشے اور دروازے کے نشان بنا کر اور لکیریں ڈال کر سمجھایا تھا کہ یہ عکس کدھر سے کدھر آتا تھا۔

لڑکی پر اُس شام محبت کی کچھ زیادہ ہی دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ بار بار ڈاکٹر کے کندھوں پر یا گردن پر ہاتھ رکھ کر اس کا منہ اپنے منہ کی طرف کرتی تھی اور ڈاکٹر کی پوزیشن ایسی ہو جاتی تھی جیسے رکوع میں ہوتی ہے۔ ایک بار پھر لڑکی نے یہی حرکت کی تو ڈاکٹر کو جمائی آگئی۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا کیا اور جمائی لینے کے لئے منہ ذرا اوپر کیا تو اس کی نظر سیزی والے شیشے میں چلی گئی۔ اسے پیٹھ پیچھے کھلا دروازہ نظر آیا لیکن دروازہ خالی نہیں تھا۔ اس نے صاف طور پر دیکھا کہ دروازے میں عبدالخالق کھڑا تھا اور اس کے پیچھے ساتھ ہی لگا ایک اور ہندوستانی کھڑا تھا۔ اسے یہ بھی نظر آگیا کہ دونوں کے ہاتھوں میں ننگے خنجر تھے۔

وہ عام قسم کے سیدھے خنجر نہیں تھے بلکہ وہ انڈونیشیا کے خاص قسم کے خنجر تھے جن کے بلیڈ یعنی پھل دستے کے قریب چوڑے تھے اور آخر میں آکر نوکیلے ہو جاتے تھے اور اس بلیڈ کی شکل رینگتے ہوئے سانپ جیسی تھی۔ یہ خنجر کسی کے جسم میں داخل کر کے جب کھینچا جاتا تھا تو وہاں سے گوشت باہر آجاتا تھا اور زخم ایسا ہوتا تھا جس کی مرہم پٹی بھی دشوار ہو جاتی تھی۔ یہ انڈونیشیا کا بڑا ہی خطرناک خنجر تھا۔

میں حیران ہوں کہ ڈاکٹر جمشید نے اپنے ہوش و حواس کس طرح ٹھکانے رکھے۔ کوئی اور ہوتا تو وہ فوراً پیچھے دیکھتا لیکن ڈاکٹر نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی اور ظاہر یہ کیا کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں کہ اس کے عقب میں کیا ہے۔ دماغ حاضر اور ٹھنڈا رکھنے کا نتیجہ تھا کہ وہ سمجھ گیا کہ یہ جو دو ہندوستانی آئے ہیں' ان کے انداز سے ان کا ارادہ بے حد خطرناک ہے۔

خالق کی نیت ٹھیک ہوتی تو وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہتا لیکن وہ دبے پاؤں آیا اور پھر ہاتھ میں کھلا خنجر اس کی نیت کا اظہار کرتا تھا۔ ڈاکٹر لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا رہا لیکن نظر سیزی کے فریم کے شیشے میں رکھی۔

خالق دبے پاؤں آگے آتا رہا اور اس کا ساتھی اس کے پیچھے اور ذرا دائیں اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ لڑکی نے ڈاکٹر کو ایک بار پھر گردن سے پکڑا اور اپنی طرف

جھکانے لگی۔ ڈاکٹر فوراً سمجھ گیا کہ اب خنجر اس کی پیٹھ میں اُترے گا۔

ڈاکٹر نے آگے جھکنے میں ذرا مزاحمت کی اور اُس کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ لڑکی کی گردن کے دائیں بائیں بڑے پیار سے رکھ لئے اور نظریں شیشے پر رکھیں۔ خالق کا خنجر اوپر کو اٹھا اور جونہی خنجر نیچے آیا ڈاکٹر نے لڑکی کو گردن سے پکڑے ہوئے اپنی طرف کھینچا اور خود اپنے آپ کو سٹول سے بائیں طرف گرا دیا۔ خنجر ڈاکٹر کی پیٹھ میں اُترنے کی بجائے لڑکی کی پیٹھ میں اُس مقام میں اُتر گیا جو شولڈر بلیڈوں کے درمیان ہوتی ہے۔

ڈاکٹر سپرنگ کی طرح اچھل کر اٹھا۔ عبدالخالق تو سُن ہو کے رہ گیا ہو گا کہ اُس نے خنجر ڈاکٹر کو مارا تھا لیکن خنجر لڑکی کی پیٹھ میں اُتر گیا۔ عبدالخالق ابھی جُھکا ہُوا ہی تھا کہ ڈاکٹر نے اس کے بائیں طرف سے اس کے پیٹ میں نیچے سے ایسی کِک ماری کہ خالق کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ گیا اور لڑکی کی پیٹھ میں ہی رہ گیا اور خالق مزید جُھک گیا کیونکہ پیٹ میں ایسی کِک شاید گھوڑا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر نے حیران کن پھرتی سے خنجر لڑکی کی پیٹھ سے نکال لیا۔ یہ خنجر اس نے خالق کو مارنا تھا لیکن اس کا ساتھی جُھکے ہوئے خالق کے پیچھے سے ڈاکٹر کی طرف خنجر تول کر آنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک اور کمال کر دکھایا۔ وہ جمپ لگا کر خالق کے دوسرے پہلو کی طرف ہو گیا اور پوری طاقت سے خنجر جُھکے ہوئے عبدالخالق کی پیٹھ میں اتار دیا۔ خنجر نکالا اور اس کے ساتھ ہی خالق سیدھا ہو گیا۔ درد سے خالق کے دانت بجنے لگے۔

ڈاکٹر نے پوری طاقت سے عبدالخالق کو سینے پر ایسا دھکا دیا کہ اس کی پیٹھ اس کے ساتھی کے سینے سے ٹکرائی۔ پیچھے چھوٹا صوفہ رکھا تھا جس سے ٹھوکر لگی تو خالق کا ساتھی صوفے پر ایسے گرا جیسے بیٹھ گیا ہو اور خالق بھی اس کی گود میں گرا۔ ڈاکٹر نے خنجر پورا بلند کر کے خالق کے ساتھی کی گردن کے قریب ہنسلی میں اتار دیا۔ اس نے خنجر اوپر سے نیچے اتارا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ خنجر کم و بیش چھ انچ جسم کے اندر چلا گیا ہو گا۔ اس سے اس کا اس طرف کا پھیپھڑا کٹ گیا ہو گا۔

ڈاکٹر نے خنجر کا ایک اور وار خالق کے سینے میں کیا اور خالق خنجر کھا کر ایک طرف لڑھکا تو ڈاکٹر نے خنجر اس کے ساتھی کی گردن میں شہ رگ میں اتار دیا اور پیچھے کھینچا۔ اس کے ساتھی کا خنجر فرش پر گر پڑا جو ڈاکٹر نے اٹھا لیا۔

اتنے میں لڑکی کی ماں کمرے میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں

ہر گئیں اور یوں لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آجائیں گے اور پھر اُس کا منہ ی کھل گیا تھا۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر خنجر کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی اور کہا' ہرے آگے آگے چلو۔

وہ عورت تو بت بن گئی تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور ے جھٹکا دیا اور اسے بائیں کو موڑ دیا۔ پیچھے سے لات مار کر اسے پھر کہا' آگے آگے چلو۔ رت چل پڑی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جس شخص نے اس کی بیٹی کو اور ان دو آدمیوں مار ڈالا ہے' وہ اسے بھی مار ڈالے گا۔

○

ڈاکٹر جمشید کے دونوں ساتھی ڈاکٹر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ واپس آئے تو کھانا ائیں۔ ڈاکٹر جمشید آ تو گیا لیکن اس حالت میں کہ اُس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خنجر تھا جن میں سے ایک خنجر خون آلود تھا اور ڈاکٹر نے ایک عورت کو آگے لگا رکھا ۔ایک ڈاکٹر نے اسے دیکھا تو دوڑا آیا اور ذرا سی دیر میں ہسپتال کے سارے لوگ ے ہو گئے۔

ڈاکٹر جمشید نے سارا واقعہ سب کو سنایا۔ کسی نے کہا کہ یہ عورت تو ولندیزی ہے اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ ڈاکٹر جمشید نے کہا کہ وہی ہو گی جسے میں قتل کر آیا ہوں... علاقے کا جو گوریلا کمانڈر تھا' فوراً" اسے اطلاع دی گئی اور وہ دوڑا آیا۔ اس کے تین چار آدمی تھے۔

جمشید ابھی انڈونیشی زبان نہیں بول اور سمجھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر بڑی سے انگریزی بولتے تھے۔ انہوں نے کمانڈر کو سارا واقعہ سنایا اور پھر سب اس ت کو ساتھ لے کر اس کے گھر چلے گئے۔ وہاں تین لاشیں پڑی تھیں اور کمرے میں بہہ رہا تھا بلکہ بہہ کر جم چکا تھا۔

اس عورت سے پوچھا گیا کہ یہ کیا سازش تھی۔ وہ کچھ بتا نہیں رہی تھی۔ اُسے تھا کہ یہ لوگ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لئے راز اپنے ساتھ ہی لے جائے اس کے ساتھ وعدہ کیا گیا کہ اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ وہ پھر بھی نہ بولی تو کمانڈر ا کہ اس کی دونوں آنکھیں نکال دو اور زبان کاٹ دو اور ہسپتال لے جا کر اس کے یک کر دو تاکہ اس حالت میں یہ زندہ رہے۔

آخر اُس نے خوفزدہ ہو کر راز فاش کر دیا۔ وہ انڈونیشی عیسائی تھی یعنی انڈونیشیا کی ہی پیدائش تھی۔ اُس نے ایک ولندیزی کے ساتھ شادی کر لی تھی جس سے یہ لڑکی اور دو لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ جب جاپانیوں نے ان علاقوں پر حملہ کیا تو اس عورت کا خاوند یہاں سے بھاگ گیا تھا اور ان کے دونوں بیٹے مارے گئے تھے۔ یہ عورت اپنی بیٹی کو ساتھ لئے کہیں چھُپی رہی ورنہ جاپانی اتنی خوبصورت لڑکی کو گھر میں نہ رہنے دیتے اور اپنے ساتھ لے جاتے۔

یہ ایک الگ کہانی ہے کہ یہ عورت کہاں اور کس طرح چھُپی رہی۔ مختصر یہ کہ جاپانیوں نے انڈونیشیا والوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ان کی حکومت بنا دی تھی۔ میں یہ تفصیلات پہلے سنا چکا ہوں۔

ایک انڈونیشی عیسائی نے اس عورت کو اپنے گھر رکھ لیا تھا یا غالباً" وہ عیسائی اس کے گھر میں آ گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ وہ کوئی بوڑھا اور امیر کبیر عیسائی تھا جس کی دولت اور زیورات کی شکل میں سونا محفوظ تھا لیکن اس کا بہت بڑا گھر بمباری سے تباہ ہو گیا تھا۔ اس عیسائی نے اس عورت کے ساتھ شادی نہ کی لیکن اسے داشتہ بنائے رکھا۔ عورت نے اپنی بیٹی کو اس شخص سے بچائے رکھا۔

معلوم نہیں یہ جوان لڑکی اس دولتمند عیسائی سے بچی رہی تھی یا نہیں' ہُوا یہ کہ جاپانیوں کی پسپائی اور شکست شروع ہو گئی اور یہاں امریکی اور انگریز فوجیں پہنچ گئیں تو اس عورت نے اس عیسائی کو زہر دے کر مار ڈالا۔ وہ کوئی بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی ساری دولت اس عورت کے ہاتھ میں آ گئی۔

اس کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ ہو گیا تو یہ اس کی مخبر بن گئی اور اس نے کچھ مسلمانوں کو دھوکہ دے کر گرفتار بھی کروایا اور مروایا بھی.... میں اس عورت کی ہسٹری سنا کر اپنا اور آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ انڈونیشی مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو ناکام بنانے کے لئے امریکیوں' انگریزوں' ولندیزیوں اور ہندوؤں نے کیسا متحدہ محاذ بنایا تھا اور کس طرح سازشیں تیار کی تھیں۔ یہ واقعہ اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔

یہ عورت کچھ عرصے سے تخریب کاری اور سبوتاژ کی کارروائیوں میں باقاعدہ شرکت کرنے لگی تھی اور جہاں ضرورت پڑتی' اپنی بیٹی کو بھی استعمال کر لیتی تھی۔ اس

کی اسے باقاعدہ اُجرت ملتی تھی اور اس نے اس عیسائی کی دولت بھی ہتھیالی تھی۔ ڈاکٹر جمشید نے مجھے اتنا ہی سنایا تھا کہ اس عورت نے اپنے بیان میں اپنی کچھ تخریبی کارروائیوں کا ذکر کیا تھا لیکن ڈاکٹر نے مجھے یہ کارروائیاں نہیں سنائیں۔

عورت نے اپنے بیان میں بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ اسے سابقہ آئی این اے کے آدمی دیئے گئے تھے اور میلیشیوں کی ملٹری انٹیلی جنس نے یہ سکیم بنائی تھی کہ انڈونیشی مسلمان لیڈروں کو قتل کرایا جائے اور گوریلا کمانڈروں کو بھی ختم کیا جائے۔ ان اہم شخصیات کی ہٹ لسٹ میں وہ ڈاکٹر بھی شامل کئے گئے تھے جو زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کرتے تھے۔

یہ دونوں آدمی جنہیں ڈاکٹر جمشید نے قتل کیا تھا' آئی این اے میں تھے اور جب آئی این اے بکھر گئی تو یہ انڈونیشیا میں آ گئے اور بعد میں ان کا رابطہ ملٹری انٹیلی جنس کے ساتھ ہو گیا۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ دونوں مسلمان ہی تھے۔ عبدالخالق کا صحیح نام یہی تھا۔ یوں نہیں ہُوا جیسا کہ میں پہلے ایک واقعہ سنا چکا ہوں کہ ہندو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے انڈونیشی گوریلوں میں شامل ہو گئے تھے۔ عبدالخالق اور اس کے ساتھی نے ڈاکٹر جمشید کو کہیں دیکھ لیا تھا اور اس عورت کو بتایا تھا کہ ایک شکار پھانسا جا سکتا ہے۔

یہ عورت بہت ہی چالاک اور عقل مند تھی اور اس کی بیٹی بھی اسی جیسی ہو گئی تھی۔ ان چاروں نے ڈاکٹر جمشید کو ختم کرنے کی سکیم بنائی اور اس پر عمل کیا۔

اس عورت سے پوچھا گیا کہ کسی آدمی کو گھر بلا کر قتل کر دینا کوئی مشکل کام نہیں' پھر انہوں نے پہلے روز ہی اس ڈاکٹر کو قتل کیوں نہ کر دیا؟

عورت نے بتایا کہ عبدالخالق کا ساتھی کسی اور کام سے سورا کارتہ سے باہر چلا گیا تھا اور یہ کام اس کے آنے پر ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ ان دو دنوں میں یہ فائدہ ملا کہ لڑکی نے ڈاکٹر جمشید کو اپنے حسن و جوانی کے طلسم میں گرفتار کر لیا تھا۔ تاخیر کی دوسری وجہ یہ تھی کہ لاش گھر میں ہی غائب کرنی تھی۔ عبدالخالق کا ساتھی آ گیا تو انہوں نے اس یقین کے ساتھ کہ وہ بڑی آسانی سے ڈاکٹر جمشید کو قتل کر لیں گے' ایک گیارہ کھود کر اس کی قبر تیار کر لی تھی۔

اتفاق سے یہ قبر ڈاکٹر جمشید نے دیکھی تھی اور اس عورت سے پوچھا تھا کہ یہ گڑھا

کیوں کھودا گیا ہے۔ عورت نے کہا تھا کہ اس میں درخت لگانے ہیں۔ ڈاکٹر جمشید کے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنی قبر دیکھ رہا ہے۔ اسے اس گڑھے میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جانا تھا۔

عورت نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ پہلا آدمی ہے جو ان کے جال سے زندہ نکل گیا ہے۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس ڈاکٹر نے کس طرح ان دونوں کو قتل کر دیا تھا اور اُسے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی پیٹھ میں خنجر کس طرح لگا۔ ڈاکٹر جمشید نے اُسے بتایا کہ وہ عبدالخالق کا خنجر تھا جو اسی کے ہاتھ سے اس کی بیٹی کی پیٹھ میں اتر گیا۔

اس عورت کو معاف نہیں کیا گیا تھا نہ ہی کسی قیمت پر معاف کرنا تھا۔ اس سے یہ بیان اسی گھر میں لیا گیا تھا جس گھر میں اس کی بیٹی اور اس کے گینگ کے دو آدمیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ گوریلا کمانڈر اٹھا اور اس عورت کو اپنے ساتھ لاشوں والے کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر جمشید نے مجھے سنایا کہ اس کمرے سے ریوالور کی تین گولیاں چلنے کے دھماکے سنائی دیئے اور فوراً بعد گوریلا کمانڈر واپس اس کمرے میں آ گیا جہاں سب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ عورت کو اُس کے گینگ کے پاس پہنچا آیا تھا۔

رات کو یہ چاروں لاشیں اٹھوا کر قریبی ندی میں پھینک دی گئی تھیں اور یہ مکان انڈونیشی گوریلوں کے ہیڈ کوارٹر نے بلکہ انڈونیشی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس مکان سے اچھی خاصی رقم نکلی اور زیورات بھی ملے تھے۔

"غور فرمایئے صاحب!" — ڈاکٹر جمشید نے یہ واقعہ سنا کر کہا — "یہ صحیح ہے کہ میں صرف ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ اپنے شوق سے کچھ ملٹری ٹریننگ بھی لی تھی لیکن جس طرح میں نے لڑکی کو اس کے اپنے ہی ساتھی سے مروایا اور پھر جس طرح ان دو تگڑے آدمیوں کو جن کے پاس خنجر تھے، انہی کے خنجر سے مارا، اسے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا معجزہ کہتا ہوں۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے اور سیزی کے شیشے نے جس طرح میری مدد کی اور پھر جس طرح میرا دماغ ٹھکانے رہا، یہ اللہ کی خاص مدد تھی اور یہ ہے اصل ایمان کہ ایمان پختہ ہو اور انسان اللہ کی راہ پر چلا جا رہا ہو تو وہ درندوں سے بھی محفوظ رہتا ہے اور غالباً" درندے بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ جب عبدالخالق نے خنجر اوپر کر کے مجھے مارنا چاہا تھا، اُس وقت سے اس وقت تک جب میں نے عبدالخالق اور اس کے ساتھی کو مار ڈالا تھا، زیادہ سے زیادہ پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کیا میں اتنا تیز ہو

گیا تھا؟ نہیں، یہ اللہ کا ہاتھ تھا جس نے مجھے محفوظ رکھا اور اسلام کے دشمنوں کو میرے ہاتھوں انہی کے خون میں ڈبو دیا"۔

مجھے یاد آ گیا کہ ڈاکٹر جمشید نے کہا تھا کہ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے یا کسی مشکل کے وقت کسی وظیفے کا ورد جاری رکھتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اُس نے جب سیزی کے شیشے میں دو آدمیوں کو ہاتھوں میں خنجر لئے دیکھا اور ان کی نیت اور ارادے کو سمجھ گیا تو کیا اُس نے کوئی وظیفہ یا قرآن کی کوئی آیت پڑھی تھی؟

"ہاں صاحب!" — اُس نے جواب دیا — "آپ نے بڑے کام کی بات پوچھی ہے۔ میرا جواب اپنے ذہن میں نقش کر لیں۔ جب مجھے ان لوگوں کے ارادے کا علم ہو گیا میرے سوچے بغیر ہی میری زبان پر یہ کلمہ آیا، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا... اس کے معنی ہیں، ہمیں اللہ کی مدد کافی ہے اور وہی سب سے بڑھ چڑھ کر کارساز ہے اللہ پر ہی ہمیں بھروسہ ہے... میں نے دل ہی دل میں اس وظیفے کا ورد شروع کر دیا اور میں سو فیصد یقین سے کہتا ہوں کہ اللہ کے اسی کلام کی برکت تھی کہ میں دشمنوں پر حاوی ہو گیا"۔

میں نے یہ وظیفہ زبانی یاد کر لیا اور آج تک جہاں کہیں مشکل پیش آئی، میں نے یہ وظیفہ پڑھا اور اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی۔

○

میں اُس روز عاشق علی کو نہ دیکھ سکا۔ ڈاکٹر جمشید انور نے اگلے روز آنے کے لئے کہا۔ صرف آمنہ کو کمرے میں جانے بلکہ رہنے کی اجازت تھی۔ میں ڈاکٹر جمشید کی اتنی لمبی اور سنسنی خیز کہانی سن کر واپس چلا آیا۔

میں اگلے روز دوپہر کے بعد جا سکا۔ آمنہ باہر آئی تو مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ میں سمجھ گیا کہ عاشق بہتر ہو گیا ہے۔ وہ مجھے کمرے میں لے گئی۔ عاشق جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بایاں ہاتھ آگے کیا کیونکہ اُس کا دایاں بازو پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

اس کے ساتھ جو باتیں ہوئیں وہ ایسی نہیں جو میں آپ کو سناؤں۔ سنانے والی بات یہ ہے کہ باتوں کے دوران ایک بار اس کے آنسو نکل آئے۔ میں یہ سمجھا کہ اسے گھر یاد آ رہا ہے۔ آمنہ نے اس کے آنسو دیکھ لئے اور وہ پریشان ہو گئی۔ عاشق کے تکیئے کے پاس رومال پڑا ہوا تھا۔ آمنہ نے رومال سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور اشاروں سے

پوچھنے لگی کہ وہ کیوں رویا ہے۔ عاشق علی نے ذرا سا مسکرا کر اور سر ہلا کر اسے بتانے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی بات نہیں۔

عاشق علی یہ سوچ کر غمگین ہو گیا تھا کہ وہ اگر بازو اور ٹانگ سے معذور ہو گیا تو اُس کا عزم ختم ہو جائے گا۔ اُس نے کہا کہ وہ جو مقصد اور جو جذبہ لے کر آیا تھا وہ دھرا رہ جائے گا اور محتاجی کی زندگی کی سوچ کر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ میں اسے جھوٹی سچی تسلیاں دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے ڈاکٹر جمشید انور کا بتایا ہُوا وظیفہ یاد کرا دیا اور کہا کہ وہ اس کا ورد کرتا رہا کرے۔

کچھ دیر آمنہ کی وارفتگی کی باتیں ہوئیں اور میں نے اس کے ساتھ ڈاکٹر جمشید انور کی باتیں شروع کر دیں۔ اس نے اس ڈاکٹر کی بہت ہی زیادہ تعریف کی اور ساتھ ہی یہ خبر بھی سنائی کہ وہ واپس چلا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمشید عاشق علی سے مل کر گیا تھا اور اسے تسلی دے کر گیا تھا کہ وہ ایسا معذور نہیں ہو گا کہ کسی کا محتاج ہو جائے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کی بجائے آپ کو ایک اور واقعہ سنا دوں.... میں اب تک یہ کہتا آیا ہوں کہ انڈونیشی مسلمان بڑے ہی زبردست جذبے سے لڑ رہے تھے اور بے دریغ خون اور جان کے نذرانے دے رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر انڈونیشی مسلمان کا یہی جذبہ تھا۔ تاریخ اسلام کے دو پہلو ہیں۔ غالب پہلو تو شجاعت اور جذبۂ ایثار کا ہے لیکن غدّاری کا پہلو بھی ہر دور میں موجود رہا ہے۔ ایسے غدار انڈونیشیا کی جنگِ آزادی میں بھی موجود تھے اور کچھ ایسے تھے جو غدار تو نہیں تھے لیکن ان حالات میں بھی وہ اپنے ذاتی جذبات کے پابند تھے۔

ایسے ہی ایک انڈونیشی نوجوان مجاہد نے عاشق علی کے لئے خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کا ابھی عاشق علی کو علم نہیں تھا۔ میں جس روز عاشق علی کو دیکھنے گیا تھا اُسی رات عثمان نے مجھے ایک بات سنائی۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں عاشق علی کو دیکھ آیا ہوں۔ اس نے بتایا کہ میرے بعد وہ بھی عاشق کو دیکھنے گیا تھا۔

عثمان نے مجھے سنایا کہ عاشق علی کا ہسپتال میں تیسرا دن تھا' شام کے وقت آمنہ عثمان کے پاس آئی اور اسے بتایا کہ اُس روز وہ عاشق علی کے کمرے سے نکل کر کسی اور طرف چلی گئی تھی۔ واپس کمرے میں آئی تو ایک انڈونیشی نوجوان عاشق علی پر جُھکا ہُوا تھا۔ اسے پتہ نہ چل سکا کہ آمنہ دروازے میں کھڑی ہے۔ آمنہ نے اسے عقب سے ہی

پہچان لیا تھا کہ وہ کون ہے۔

آمنہ کھڑی دیکھتی رہی کہ یہ کیا کر رہا ہے یا کیا کرے گا۔ اس نوجوان کا نام علی الشام تھا اور اسے علی کہتے تھے۔ سال ڈیڑھ سال پہلے آمنہ کے والدین نے آمنہ کو علی سے منسوب کر دیا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ علی آمنہ کا منگیتر تھا لیکن آمنہ عاشق علی کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔

آمنہ نے عثمان کو بتایا کہ علی اچھی نیت سے نہیں آیا تھا۔ اُس نے اُس باریک سی پائپ کو ہاتھ لگا کر بھی دیکھا جس سے علی کے جسم میں گلوکوز اور خون جا رہا تھا۔ جب اس نے علی کو یہ حرکت کرتے دیکھا تو آمنہ کو خطرہ محسوس ہُوا کہ یہ کہیں نالی کھینچ ہی نہ دے جو عاشق علی کی جان بھی لے سکتی تھی۔

اس خطرے کے پیشِ نظر آمنہ تیزی سے آگے ہوئی۔ علی نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ اس وقت عاشق علی بے ہوشی میں تھا۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

آمنہ نے علی سے پوچھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟.... علی نے کہا کہ وہ عاشق کو دیکھنے آیا ہے کہ ہوش میں آ چکا ہے یا نہیں اور اس کی حالت کیا ہے۔

آمنہ نے عثمان کو سنایا کہ اس نے علی سے کہا کہ وہ اس کمرے میں آ کیسے گیا ہے' کسی کو اندر آنے کی ابھی اجازت نہیں ملی۔ آمنہ نے اسے کہا کہ وہ فوراً" یہاں سے چلا جائے ورنہ آمنہ اس کی رپورٹ کروے گی.... علی نے آمنہ کو بازو سے پکڑا اور اسے باہر لے آیا۔ آمنہ غصے میں آ گئی اور علی سے کہا کہ وہ یہاں بھی نہ آئے اور اس کے سامنے بھی نہ آئے۔

"ہوش میں آؤ آمنہ!" — علی نے آمنہ سے کہا — "اپنا دماغ ٹھکانے پر لے آؤ اور اس آدمی کو ذہن سے اتار دو۔ تم میری ہو اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ تم کسی اور کو اپنے دل میں بٹھا لو"۔

"یہ فیصلہ میرا نہیں" — آمنہ نے کہا — "میرے باپ نے عاشق علی کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تو وہ مجھے اس کے ساتھ بیاہ دے گا.... میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ جاؤ اور میرے باپ کے ساتھ بات کرو لیکن میں تمہیں بتا دیتی ہوں کہ میں اپنا فیصلہ کر چکی ہوں اور جو بدل نہیں سکتا"۔

"تمہارے باپ کے ساتھ بات کرنا بیکار ہے" — علی نے کہا — "تم اس ہندوستانی کو چاہتی ہو اور یہ مجھے منظور نہیں"۔

آمنہ نے عثمان کو بتایا کہ علی کے ساتھ اُس کی اچھی خاصی ترش کلامی ہوئی اور علی اُسے یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ وہ اس ہندوستانی کو یعنی عاشق علی کو واپس ہندوستان بھیج دے گا اور اسے انڈونیشیا میں رہنے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ جاتے جاتے علی یہ بھی کہہ گیا کہ یہ شخص بڑے دُور کے ایک ملک کا باشندہ ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ یہاں سے بھاگ جائے' اور اب تو یہ ایسا زخمی ہُوا ہے کہ بازو اور ٹانگ سے معذور اور محتاج ہو جائے گا۔

آمنہ نے اسے کہا کہ معذور ہو سکتا ہے لیکن عاشق علی کو وہ کسی کا محتاج نہیں ہونے دے گی۔ اس نے کہا کہ عاشق علی انگریزوں کا فوجی قانون توڑ کر انڈونیشیا کی آزادی کی جنگ لڑنے آیا اور اسی جہاد میں اتنا شدید زخمی ہو گیا ہے تو ہم انڈونیشی ایسے گھٹیا لوگ تو نہیں کہ اسے کچھ صِلہ بھی نہ دیں گے۔

آمنہ نے یہ باتیں عثمان کو اس لئے بتائی تھیں کہ یہ ایریا عثمان کا تھا اور آمنہ نے عثمان کو اس خطرے سے آگاہ کیا تھا کہ علی رقابت کے جوش میں آکر عاشق علی پر اوچھا وار کرے گا۔ آمنہ نے صاف الفاظ میں بتایا کہ علی کا ہسپتال آنا اور عاشق علی کے کمرے میں جا کر اس پر جھکنا اور پھر خون اور گلوکوز کی نالیوں کو دیکھنا' بڑے خطرناک ارادے کا اظہار کرتا ہے۔

عثمان نے آمنہ کو تسلیاں دے کر مطمئن کیا اور کہا کہ وہ علی کو بلا کر اسے سمجھانے کی کوشش کرے گا اور اگر اس نے پھر کوئی ایسی خطرناک حرکت یا بے ہُودہ بات کی تو اس کے خلاف باقاعدہ کارروائی کی جائے گی۔

عثمان میرا کمانڈر تھا لیکن اس تعلق کے علاوہ اس نے مجھے اپنا دوست بنا لیا تھا اور ہر بات میرے ساتھ کرتا تھا سوائے ان رازوں سے جن کا تعلق جنگ آزادی کے ساتھ تھا۔

○

اب میں پانچ چھ مہینے آگے کی بات سناؤں گا۔ اس عرصے میں عاشق علی کے زخم بھر گئے تھے' خون کی کمی کبھی کی پوری ہو چکی تھی اور وہ زخمی ہونے سے پہلے کی طرح روزمرّہ کے معمولات میں رواں ہو گیا تھا لیکن اُس کے جسم میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔

ایک یہ کہ وہ تیز دوڑنے کے قابل نہیں رہا تھا نہ ہی وہ تیز چل سکتا تھا۔ جو ٹانگ زخمی ہوئی تھی' اس ٹانگ کو وہ کھینچ کر چلتا تھا اور گھٹنے سے یہ ٹانگ پہلے کی طرح دوہری نہیں ہوتی تھی۔ ایسے ہی دایاں بازو پوری طرح اوپر نہیں اٹھتا تھا نہ تندرست بازو کی طرح گھمایا جا سکتا تھا۔ ہاتھ کی گرفت ٹھیک تھی لیکن بازو کمزور سا ہو گیا تھا۔ عاشق علی اس ہاتھ سے رائفل اور ٹامی گن وغیرہ چلا سکتا تھا لیکن پہلے کی طرح نہیں۔ اب وہ صرف لیٹ کر فائر کر سکتا تھا۔

ان پانچ چھ مہینوں میں مَیں چند ایک گوریلا کارروائیوں میں گیا تھا اور عاشق علی بھی دو کارروائیوں میں شامل ہو چکا تھا۔

ایک اور بڑے گوریلا ایکشن آپریشن آرڈر آگیا۔ میں اس آپریشن کو پوری طرح بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ یہ بھی ویسا ہی آپریشن تھا جیسا وہ آپریشن تھا جس میں عاشق علی زخمی ہُوا تھا۔ یہ سارے آپریشن ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے اس لئے بھی میں آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا۔ میں بھی اس آپریشن میں شامل تھا لیکن مجھے کسی اور طرف بھیج دیا گیا تھا۔ دن بھر لڑائی ہوئی' آپریشن کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا اور ہمارے کچھ آدمی زخمی ہوئے اور تین شہید بھی ہوئے۔

پچھلے پہر کے چار بج رہے تھے جب اس آپریشن میں شامل ہونے والی پارٹیاں ایک جگہ اکٹھی ہوئیں۔ ایک امریکی ہیلی کاپٹر کو گھات میں لینا تھا جو ہم نے لیا اور امریکیوں کو خاصا جانی نقصان پہنچایا۔ کچھ دیر جم کر فائرنگ کا تبادلہ بھی ہُوا۔ آخر امریکی بہت سی لاشیں پیچھے چھوڑ کر اپنے ٹرکوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔

میں نے آپریشن ختم ہونے کے بعد آمنہ کو دیکھا۔ اس آپریشن میں بھی چند ایک لڑکیاں شامل تھیں۔ آمنہ عثمان کے پاس آئی اور سر کے اشارے سے اسے الگ لے گئی۔ دونوں دور کھڑے باتیں کرتے رہے اور پھر آمنہ اپنی پارٹی میں چلی گئی اور عثمان واپس آکر الگ تھلگ بیٹھ گیا اور اس نے سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ آمنہ نے اسے کوئی خاص بات بتائی ہے۔

میں نے پہلے بتایا ہے کہ عثمان مجھے اپنا دوست بنائے ہوئے تھا۔ آخر اس نے مجھ سے حلفیہ وعدہ لیا کہ میں یہ راز سوائے عاشق علی کے کسی اور کو نہیں بتاؤں گا.... آمنہ کا کردار اور ایمان دیکھیں کہ وہ آپریشن ختم ہونے کے بعد عثمان کے پاس آئی اور اسے بتایا

کہ جب دونوں طرف سے فائر کھل گیا تو وہ پوزیشن بدلنے لگی۔ اس جگہ اونچی نیچی ٹیکریاں اور کھڈ بھی تھے اور جنگل گھنا تھا۔ اس نے علی کو دیکھا کہ وہ اپنی پوزیشن سے اٹھ کر بائیں طرف کو جا رہا تھا۔ آمنہ کو اچانک خیال آگیا کہ اس طرف عاشق علی پوزیشن میں تھا۔

آمنہ کو عاشق علی کے ساتھ ایسی والہانہ محبت تھی کہ آپریشن پر بھی اس کی نظر عاشق علی کی طرف جاتی تھی۔ چونکہ علی بھی ان کے درمیان موجود تھا اس لئے آمنہ جتنی توجہ اس آپریشن پر دے رہی تھی اتنی ہی عاشق علی پر بھی دیتی تھی۔ اس نے جب علی کو بلاجواز اپنی پوزیشن سے اس طرف جاتے دیکھا جس طرف عاشق علی تھا تو آمنہ بھی آپریشن کو بھول کر چھپتی چھپاتی علی کے پیچھے گئی۔ علی ایک جگہ لیٹ گیا اور وہاں سے ایک طرف گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگنے لگا۔ آمنہ کے سامنے ایک اونچی ٹیکری تھی جس پر درخت بھی تھے اور جھاڑیوں کے علاوہ اونچی گھاس بھی تھی۔ آمنہ اس پر اس طرح چڑھ کر چھپ گئی کہ وہ کسی کو نظر نہیں آسکتی تھی۔

آمنہ تربیت یافتہ اور تجربہ کار گوریلا فائٹر تھی۔ مجھے اس کی وہ نوجوانی یاد آتی ہے' میں نے اسے اپنی آنکھوں سے تین چار مرتبہ ایکشن میں دیکھا تھا۔ اُس نے عثمان کو بتایا کہ جب اس ٹیکری پر جاکر پوزیشن لی تو اسے بائیں طرف کچھ آگے عاشق علی نظر آیا جو ذرا کم بلند ٹیکری پر ایک درخت کے پیچھے بیٹھا فائر کر رہا تھا۔

آمنہ کو علی بھی نظر آگیا جو عاشق کے پیچھے ایک ٹیکری پر پوزیشن لے رہا تھا۔ اس کے اور عاشق علی کے درمیان بیس پینتیس گز فاصلہ تھا۔ علی کے پاس رائفل تھی اور آمنہ کے پاس ٹامی گن تھی۔ آمنہ اور علی کے درمیان پچیس گز کا فاصلہ تھا۔

آمنہ نے دیکھا کہ علی نے رائفل کندھے سے لگائی اور رائفل کی نالی عاشق علی کی طرف تھی۔ علی جس پوزیشن میں تھا وہاں سے وہ دشمن پر فائر نہیں کر سکتا تھا' وہ عاشق علی کو گولی مارنے کے لئے اس پوزیشن میں گیا تھا۔

جونہی علی نے رائفل کندھے سے لگا کر عاشق علی کی طرف سیدھی کی' آمنہ نے ٹامی گن علی کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ علی کا دایاں پہلو آمنہ کی طرف تھا۔ گن کا پورا برسٹ علی کے پہلو میں لگا اور وہ وہیں بغیر تڑپے مر گیا.... آمنہ نے عاشق علی کو بچا لیا تھا۔

اگر آمنہ عثمان کو نہ بتاتی کہ علی کو اس نے مارا ہے تو کسی کو شک تک نہ ہوتا۔ وہاں

ہمارے کچھ ساتھی زخمی بھی ہوئے اور شہید بھی ہوئے تھے۔ باقی سب علی کو بھی شہید کہہ رہے تھے لیکن آمنہ کے کردار اور ایمان کو دیکھیں کہ اس نے عثمان کو صحیح بات بتا دی اور یہ بھی کہا کہ آپ میرے کمانڈر ہیں' اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے بلاجواز قتل کیا ہے تو مجھے یہیں گولی مار دیں۔

عثمان نے کچھ دیر سوچا اور کہا — "تم نے ٹھیک کیا ہے۔ علی اسی قابل تھا.... کسی کو بتانا نہ دینا"۔

(جاری ہے)

ایک

روز عثمان کو جکارتہ سے اطلاع آئی کہ ایک دو دنوں تک ناسوشن اُس کے ایریا ہیڈکوارٹر میں آرہا ہے اور یہ ایک کانفرنس ہوگی جس کے لئے اسے تیاری کرلینی چاہئے۔

پہلے میں آپ کو بتادوں کہ ناسوشن کون تھا.... وہ احمد سوئیکارنو اور سوہارتو کے پائے کا لیڈر تھا اور یہ سب جرنیل تھے۔ جکارتہ میں ہماری فوج کے جی ایچ کیو کی طرح گوریلا فورس کا ایک جی ایچ کیو تھا اور بڑے بڑے گوریلا اور کمانڈو آپریشن کے احکام اسی ہیڈ کوارٹر سے آیا کرتے تھے اور ان پر دستخط ناسوشن کے ہوتے تھے۔ ناسوشن گوریلا طرزِ جنگ میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔ جنگِ عظیم سے پہلے جب انڈونیشیا کا نام ونشان نہ تھا اور وہ خطّہ ولندیزیوں کے زیرِ نگیں تھا' اُس وقت ناسوشن ولندیزی فوج میں اعلیٰ رینک میں تھا۔

میں پچھلے کسی باب میں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ یہ جرنیل انڈونیشیا کی جنگِ آزادی ایک خاص تنظیم' پلان اور ڈسپلن کے تحت لڑا رہے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ کہیں بھی چند ایک جوشیلے نوجوان اکٹھے ہوجاتے اور دشمن پر حملہ کردیتے۔ چھوٹے چھوٹے گوریلا آپریشن لڑانے کے لئے ایریا کمانڈر مقرر تھے جیسا عثمان تھا۔ ساری تنظیم ایک باقاعدہ فوج جیسی تھی' فرق یہ تھا کہ انڈونیشی مسلمان فوج کی طرح مورچہ بند ہوکر نہیں لڑتے تھے۔ وہ شب خون مارتے تھے اور ــــ "ضرب لگاؤ' غائب ہوجاؤ" ــــ کے اصول پر لڑتے تھے۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ قوم کا بچہ بچہ' عورتیں بھی مرد بھی گوریلے فائٹر بن گئے تھے اور وہ اپنے آپ کو کمانڈروں کے احکام اور ضروری ڈسپلن کے

پابند رکھتے تھے۔

اگلی صبح کانفرنس میں شریک ہونے والے ہمارے ہیڈکوارٹر میں پہنچنے لگے۔ دوپہر تک دوسو آدمی آچکے تھے۔ ان میں بیس اکیس ہندوستانی مسلمان بھی تھے۔ یہ سب میری طرح انڈین آرمی سے بھگوڑے ہوکر انڈونیشیا آئے تھے۔ چار ایریا کمانڈر شام تک آگئے۔ اس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ یہ کوئی بڑی کانفرنس ہے اور اس کا کوئی خاص مقصد ہوگا۔ عثمان میرا کمانڈر تھا لیکن میرے ساتھ اور عاشق علی کے ساتھ دوستانہ مراسم بھی رکھے ہوئے تھا۔ وہ مجھے ہر بات بتا دیا کرتا تھا لیکن کوئی جنگی راز کی بات ہوتی تو وہ گول کرجاتا' میں سمجھ جاتا اور پھر نہ وہ بتاتا اور نہ میں پوچھتا تھا۔

○

اس کانفرنس کے متعلق عثمان نے مجھے بتادیا کہ اس کے اغراض ومقاصد کیا ہیں اور اس کا پس منظر کیا ہے۔ بات یہ تھی کہ اقوام متحدہ نے ایک سال سے زیادہ عرصہ پہلے انڈونیشی لیڈروں کے ساتھ مذاکرات شروع کردیئے تھے اور انہیں آمادہ کیا جارہا تھا کہ جنگ بندی کردیں۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اور پھر دیگر نمائندوں نے بھی انڈونیشی لیڈروں کے آگے کچھ شرائط رکھیں جن میں ایک یہ بھی تھی کہ انہیں انڈونیشیا کے کچھ حصے پر خود مختاری دے دی جائے گی لیکن انڈونیشی لیڈر کوئی شرط قبول نہیں کررہے تھے۔ وہ ایک ہی شرط پیش کرتے تھے' وہ تھی آزادی اور مکمل آزادی اور ولندیزیوں کا انخلاء۔

انڈونیشی لیڈروں کا مؤقف یہ تھا کہ جاپانیوں نے ولندیزیوں سے یہ خِطّہ جنگ لڑکر چھین لیا اور اس پر قابض ہوگئے تھے پھر انڈونیشی مسلمانوں نے اپنے آپ کو منظم کرکے جاپانیوں کو یہاں سے بھگادیا اور اس خطّے کو اپنا ملک بنالیا۔

پھر انڈونیشی لیڈروں کا ایک مؤقف یہ بھی تھا کہ یہ خِطّہ مسلمانوں کا ہے اور یہاں مسلمان غالب اکثریت میں آباد ہیں۔ وہ اب اس خطے پر کسی دوسری قوم کا تسلّط قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور اسے وہ اپنا جائز حق سمجھتے تھے۔

انڈونیشی کمانڈروں نے باقاعدہ انٹیلی جنس تنظیم بنا رکھی تھی۔ اس انٹیلی جنس کی رپورٹ یہ تھی کہ امریکہ اور برطانیہ جو اس طرح کی بات کرتے ہیں جیسے ان کے دلوں میں انڈونیشی مسلمانوں کے لئے رحم ہے اور وہ انہیں اپنی جنگی طاقت سے بچانا چاہتے

ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں صلیبی ملکوں کی حکومتوں اور فوجی قیادت نے دیکھ لیا تھا کہ انڈونیشی مسلمانوں کو شکست دینا یا انہیں دبالینا اتنا آسان کام نہیں جتنا وہ شروع میں سمجھے تھے۔ انڈونیشی مسلمانوں نے جذبۂ حریت اور عسکری اہلیت سے ان صلیبیوں پر ثابت کردیا تھا کہ — "آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا"

انڈونیشیا کی جنگِ آزادی چوتھے سال میں داخل ہو چکی تھی۔ اتحادی طاقتوں یعنی امریکہ اور برطانیہ کو توقع تھی کہ ان دونوں کی ہوائی جہازوں کی طاقت اور بحری اور بری جنگی طاقت یہاں کے مسلمانوں کو تباہ کردے گی اور جو زندہ رہیں گے ان پر دہشت طاری ہوجائے گی۔ انہوں نے یہ توقع لگا رکھی تھی کہ ان مسلمانوں کے پاس ایمونیشن ختم ہوجائے گا اور خالی رائفلیں اور مشین گنیں رہ جائیں گی۔ ان کی یہ توقع بجا تھی کیونکہ انڈونیشی حریت پسندوں کے پاس کوئی ایمونیشن کی فیکٹری نہیں تھی نہ انہیں کسی بھی ملک سے ایمونیشن ملتا تھا۔ اس کے باوجود ان کے پاس ایمونیشن ختم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی جارہا تھا۔ یہ سب امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں سے چھینا ہوا تھا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ گوریلوں کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ ایمونیشن خود حاصل کریں اور گولی اس وقت چلائیں جب انہیں یقین ہو کہ گولی ضائع نہیں جائے گی۔

انگریزوں کو ایک زد اور بھی پڑ رہی تھی۔ وہ یہ کہ انگریز انڈین آرمی کو بھی انڈونیشی حریت پسندوں کے خلاف لڑا رہے تھے اور ان کی انڈین آرمی سے مسلمان ایک ایک دو دو کرکے بھگوڑے ہو رہے تھے اور انڈونیشی مسلمانوں کے پاس جارہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا یہ جذبہ روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ انگریزوں اور امریکیوں کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ مسلمان فوجی فوج میں رہ کر بھی انڈونیشی مجاہدین کی کسی نہ کسی طرح مدد کررہے ہیں۔

یہ مدد بڑی واضح اور نمایاں تھی۔ انگریز دیکھ رہے تھے کہ وہ انڈونیشی گوریلوں کے کسی ٹھکانے پر حملہ کرنے جاتے ہیں تو وہ راستے میں ہی انڈونیشی مجاہدین کی گھات میں آکر مارے جاتے ہیں۔

انڈین آرمی سے انڈونیشیوں کو کچھ اور سازوسامان بھی مل رہا تھا مثلاً" سگنل کور کے فوجی بھگوڑے ہوئے اور وہ خالی ہاتھ نہیں گئے بلکہ وائرلیس سیٹ (ریڈیو ٹیلی فون) اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اسی طرح کچھ اور ضروری سامان انڈونیشی مسلمانوں

تک پہنچ جاتا تھا۔ انڈین آرمی کی گاڑیاں تک ان کے پاس پہنچیں۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ انڈونیشیا کے لیڈر مخلص اور بے غرض تھے۔ انہوں نے قوم میں اتحاد پیدا کردیا تھا۔ نہ وہاں کوئی سیاسی پارٹی تھی نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا۔ وہاں کے لوگ فرقہ بندیوں کو بھول گئے تھے۔ ان کے ذہن میں دو ہی چیزیں رہ گئی تھیں.... اسلام اور آزاد انڈونیشیا.... ہر مرد اور عورت اپنی اپنی جگہ فرض شناس اور ذمہ دار بن گئے تھے۔ میں اپنی آنکھوں دیکھے واقعات سنا چکا ہوں کہ وہاں کے مردوں اور عورتوں کا کردار کس طرح بلند ہوگیا تھا۔ ان کا نعرہ اور نصب العین ایک ہی تھا.... "مردیکا".... (آزادی)۔

صلیبی اتحادیوں نے پوری کوشش کی تھی کہ حریت پسندوں کے اتحاد کو توڑا جائے اور ان میں گروہ بندی یا فرقہ بندی پیدا کی جائے۔ انہوں نے ولندیزی اور ہندو عورتوں کے ذریعے سبوتاژ کے ڈرامے کھیلے تھے لیکن ناکام رہے۔ میں نے یہ دو تین واقعات آپ کو سنائے ہیں۔

○

میں نے پاکستان کا ذکر نہیں کیا کیونکہ میں اسے ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمیں ریڈیو کے ذریعے خبر مل گئی تھی کہ پاکستان معرضِ وجود میں آگیا ہے اور پھر قائد اعظمؒ کے انتقال کی خبر بھی ملی تھی۔ پاکستان بننے کی خبر آئی تھی تو ہمارے انڈونیشی بھائیوں نے ہمیں گلے لگا لگا کر مبارکباد دی تھی اور بعض جگہ جشن بھی منائے گئے تھے۔ قائد اعظمؒ کی وفات کی خبر آئی تو انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر آنسو بھی بہائے اور آہیں بھی بھری تھیں۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ایک تو یہ خوشی ہوئی کہ ہم آزاد ہوگئے ہیں اور اب انگریز کے غلام نہیں رہے۔ دوسری خوشی یہ کہ ہم انڈین آرمی کے بھگوڑے تھے اور کبھی یہ ڈر دل میں آہی جاتا تھا کہ کبھی انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گئے تو وہ کورٹ مارشل کرکے ہمیں سزائے قید دے گا۔ اب وہ خطرہ ختم ہوگیا تھا اور ہم کہتے تھے کہ اس ملک کو آزاد کراکے اپنے آزاد ملک میں واپس جائیں گے۔ مختصر یہ کہ اب ہم انگریز کی فوج کے بھگوڑے نہیں رہے تھے۔

پاکستان کے وجود میں آنے سے انڈونیشی مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ انہیں یہ

تاثر ملا کہ آزادی حاصل کی جاسکتی ہے۔ تعلیم یافتہ انڈونیشی کہتے تھے کہ ایک مسلمان ملک پاکستان کے نام سے وجود میں آیا ہے اور ایسا ہی دوسرا آزاد مسلمان ملک انڈونیشیا ہوگا۔

ہم بہت کوشش کرتے تھے کہ ریڈیو پاکستان کی آواز سنیں لیکن پاکستان کا ریڈیو اتنا کمزور تھا کہ اتنی دُور تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہمیں مجبوراً" آل انڈیا ریڈیو سننا پڑتا تھا۔ اس کی ٹرانسمیشن میں اتنی طاقت تھی کہ انڈونیشیا میں صاف سنائی دیتا تھا لیکن اس کی خبریں اور تبصرے یکطرفہ اور پاکستان کے خلاف ہوتے تھے۔ صحیح خبر ہم بی بی سی اور امریکہ کے ریڈیو سے سنا کرتے تھے۔ ان نشریاتی اداروں کی خبروں سے ہمیں پتہ چلتا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا' انہیں لُوٹا' اُن کے گھر نذر آتش کئے' ان کی بیٹیاں اغوا کیں اور وہاں کے مسلمانوں کو قتل کردیا اور جو بچے وہ پاکستان کو بھاگ گئے۔

ان خبروں کا ردِعمل سورابایا میں ظاہر ہُوا۔ انڈونیشیا میں جنگِ عظیم سے پہلے ہندوؤں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ یہ سب تاجر اور دکاندار تھے۔ جاپان نے حملہ کیا تو جس طرح دوسرے لوگ آبادیوں سے بھاگے اس طرح ہندو بھی نکل بھاگے لیکن وہ جا ہی کہاں سکتے تھے۔ وہ اپنے زیورات اور دولت یعنی روپیہ پیسہ اپنے ساتھ لئے جنگلوں میں جا چھپے تھے۔ کچھ تو جنگل کی صعوبتیں برداشت نہ کرتے ہوئے مرگئے اور بعض جاپانیوں کے ہاتھوں مارے گئے پھر بھی ان کی خاصی تعداد صحیح اور سلامت رہی۔

جاپانیوں نے ان علاقوں پر قبضہ کرکے انڈونیشی مسلمانوں کی حکومت قائم کردی تو ہندو پھر واپس آگئے اور منڈی میں کاروبار سنبھال لیا۔ یہ تو بڑی ہی عیّار اور مکّار قوم ہے' انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی یہاں حکومت بن گئی ہے تو یہ مسلمانوں کے وفادار بن گئے اور خوب فائدہ اٹھایا۔ فائدہ یہ کہ کاروبار سنبھال لیا۔

سورابایا میں ہندوؤں کے دو گھر تھے۔ پہلے زیادہ تھے لیکن جنگ کے دوران ان میں سے بہت سے دوسرے بڑے شہروں کو چلے گئے تھے۔ ایک روز خبر ملی کہ ان دونوں ہندو گھروں کے تمام افراد کو قتل کردیا گیا ہے۔ ان کے گھر اور ان کی دکانیں لوٹ لی گئی تھیں اور ان کے مکانوں پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ یہ دو پاکستانیوں کی انتقامی کارروائی تھی۔ یہ دونوں پاکستانی میری طرح پہلے ہندوستانی فوجی تھے اور انڈین آرمی سے بھگوڑے

ہوئے تھے۔ انہوں نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں بی بی سی اور امریکی ریڈیو سے سنی تھیں۔ انہیں پتہ چلا کہ شہر میں دو ہندو فیملیاں آباد ہیں۔ ان پاکستانیوں نے اپنے چند ایک انڈونیشی دوستوں کو ساتھ لیا اور ان دونوں فیملیوں کا بچہ بچہ قتل کرڈالا' گھروں کو لُوٹا' کاروبار کو لوٹا اور انتقام لے لیا۔

○

عمان کے ہیڈکوارٹر میں کانفرنس منعقد ہورہی تھی جس میں کسی بڑے آپریشن کا فیصلہ کرنا اور پلان بنانا تھا۔ اقوام متحدہ مذاکرات کے ذریعے فائربندی کرانے کی بہت کوشش کرچکی تھی لیکن انڈونیشی لیڈر سوائے آزادی کے کوئی اور بات سنتے ہی نہیں تھے۔ مجھے مزید باتیں معلوم ہوئیں جو یوں تھیں کہ انڈونیشی انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے مطابق صلیبی اتحادی ہار گئے تھے لیکن اس شکست کو اپنی جنگی طاقت سے چھپائے ہوئے تھے۔ ان اتحادیوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کے فوجیوں کا مورال بری طرح پست ہوگیا تھا وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ اور ہی قسم کی تھی۔ اتحادی فوجوں نے جنگِ عظیم رجمنٹوں اور بریگیڈوں کی صورت بھی لڑی تھی اور انہیں توپوں اور ہوائی جہازوں کی مدد حاصل تھی مگر انڈونیشیا میں وہ اس طرح نہیں لڑسکتے تھے۔

فوجی ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنا حوصلہ اور مورال قائم رکھتے ہیں لیکن ان فوجوں کے خلاف لڑنے والے نظر ہی نہ آئیں تو یہ کچھ اور ہی بات بن جاتی ہے۔

بات یہ بن جاتی ہے کہ کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا کب کوئی گوریلا یا کمانڈو پارٹی ان پر شب خون مارے گی اور سوئے ہوئے کو گولی مار کر یا گرینیڈ پھینک کر غائب ہوجائے گی۔ یہ فوجیں جب جنگل میں گوریلوں کے خلاف جاتی تھیں تو ہر لمحہ ہر فوجی پر موت کا خوف طاری ہوتا تھا کہ نہ جانے کس طرف سے ایک گولی یا ایک گرینیڈ آئے گا اور کئی ایک کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ گھات کا خطرہ بھی ہوتا تھا۔ امریکی اور انگریز فوجی رات کو خیموں میں یا بارکوں میں سوتے تھے تو بھی ان پر خوف طاری ہوتا تھا کہ دشمن کی گوریلا پارٹی شب خون مارے گی اور وہ سوئے ہوئے موت کے گھاٹ اُتر جائیں گے۔

یہ ایسی صورتِ حال تھی جس نے امریکیوں اور انگریزوں کا مورال مجروح کردیا تھا۔ یہ دیکھ کر بھی وہ اس کوشش میں تھے کہ فائربندی ہوجائے۔

یہ تو آپ اور ہم سب جانتے ہیں کہ صلیبی اس کوشش میں تھے کہ ایک اور

مسلمان ملک وجود میں نہ آئے اور یہاں صلیبی حکومت قائم رہے جو مسلمانوں کو دینی اور نظریاتی لحاظ سے ناکارہ کردے۔

مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ امریکیوں اور انگریزی افواج پر ایسے زوردار حملے کئے جائیں کہ ان کا دم خم ٹوٹ جائے اور پھر حملوں اور شب خونوں کا تسلسل قائم رکھا جائے۔ مطلب یہ تھا کہ اقوام متحدہ کو یقین ہوجائے کہ انڈونیشی حریت پسند اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ وہ اس کی ہر شرط کو ٹھکرا کر اپنی شرط منوا سکیں۔

کانفرنس میں شریک ہونے والے اتنے زیادہ افراد کو شہر میں مسلمانوں کے گھروں میں بطور مہمان ٹھہرایا گیا۔ ایسے گھرانے بھی تھے جو تین تین مہمانوں کو اپنے گھروں میں لے گئے تھے۔ کانفرنس اگلے روز شروع ہونی تھی لیکن اس میں ان سب کا شریک ہونا ضروری نہیں تھا۔ صرف لیڈروں نے اکٹھے ہو کر بات چیت کرنی تھی۔ وہ دو سو آدمی جو مسلح تھے وہ تجربہ کار گوریلے تھے۔ کانفرنس میں حملہ پلان کر کے یہیں سے اس پر عمل کیا جانا تھا۔

اگلی صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں اور عاشق علی باہر کھڑے تھے۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ ناسوشن رات کو آگیا ہے۔ ہم اُسے دیکھنا چاہتے تھے۔ عثمان نے بتایا تھا کہ وہ ہم دونوں کو ناسوشن سے ملوائے گا۔ اس نے بتایا کہ ناسوشن انڈین آرمی کے بھگوڑے مسلمانوں سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے اور ان کی بہت ہی قدر کرتا ہے۔

○

اس گوریلا پارٹی کے دو انڈین آرمی کے مسلمان باہر آئے جو پارٹی ناسوشن سے پہلے یہاں پہنچی تھی۔ وہ دونوں پنجابی تھے اور ہمارے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ ایک دوسرے کا تعارف ہُوا اور اتنے میں ایک ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی۔ ہم چاروں نے اس طرف دیکھا۔ دُور سے ایک لڑاکا ہوائی جہاز نیچی پرواز کرتا ہماری طرف آرہا تھا۔

ہمارے سروں پر پہنچ کر ہوائی جہاز اُٹھا اور کچھ آگے جا کر بائیں کو مُڑا۔ اس کی بلندی اتنی کم تھی کہ اس کے پروں کے نیچے لگے ہوئے دو بم ہمیں صاف نظر آئے۔ یہ ایک انجن والا لڑاکا بمبار ہوائی جہاز تھا۔ بائیں کو مُڑ کر وہ پھر بائیں کو مُڑا۔ اب اس کی بلندی زیادہ تھی۔ اس بلندی سے وہ غوطے میں آیا۔ میں نے اس کے پروں کے نیچے سے

دونوں بم الگ ہوتے دیکھے جو بڑی تیزی سے نیچے کو آنے لگے۔ ہوائی جہاز وہیں سے پُل اپ PULL UP کر کے ہمارے اوپر سے گزر گیا۔

ہم چاروں فوجی تھے' ٹریننگ کے مطابق جونہی ہم نے بم نیچے آتے دیکھے' ہم پلک جھپکتے پیٹ کے بل زمین پر گرے اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر دبالئے۔ بم کے دھماکے سے بچنے کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ زمین پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو یا کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔ ہمیں ابھی یہ معلوم نہیں تھا کہ بم کس جگہ گریں گے۔ ایک توقع یہ بھی تھی کہ ہمارے اوپر گریں گے یا ہمارے بالکل قریب۔

اتنا شدید اور زوردار دھماکہ ہُوا کہ کان ہاتھوں سے بند رکھنے کے باوجود بالکل ہی بند ہوگئے جیسے ان کے پردے پھٹ گئے ہوں۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں۔ زمین اتنے زور سے ہلی جیسے زمین کے نیچے سے مجھے کسی نے دھکا دیا ہو۔ یہ پانچ پانچ پونڈ کے بم تھے۔ پھٹنے کے بعد ہمیں ان کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں کے زناٹے اور سنسناہٹیں سنائی دیں اور پھر میں نے یوں محسوس کیا جیسے ہوا کے طوفانی جھونکے نے ہمیں اُس طرف بڑی زور سے دھکیلا ہو جس طرف بم گرے تھے۔

یہ کیفیت چند سیکنڈ رہی اور ہم چاروں جس طرح گرے تھے اسی طرح اپنے آپ کو بڑی تیزی سے اٹھایا اور اُس طرف دوڑے جہاں بم گرے تھے۔ ہم تماشا دیکھنے نہیں جا رہے تھے بلکہ وہاں ہماری شدید اور فوری ضرورت تھی۔ ہمیں ان لوگوں کو سنبھالنا تھا جو ان بموں کی زد میں آئے تھے۔

وہ تمام کی تمام گوریلا فورس جو ناسوشن کے حکم پر یہاں آئی تھی اور تمام ایریا کمانڈر اور دیگر شرکائے کانفرنس اس قدر تیزی سے باہر آئے جیسے پہلے ہی باہر موجود تھے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ وپکار سنائی دی۔

خوش قسمتی دیکھئے کہ بم گرے کہاں۔ بارش کے پانی کا ایک خاصا لمبا چوڑا چھپڑ تھا جس میں کناروں تک پانی بھرا ہُوا تھا۔ دونوں بم اس میں گرے اور پھٹے تھے۔ اس چھپڑ کے کناروں سے کچھ فاصلے پر لوگوں کے مکان تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے۔ گنجان آبادی چھپڑ سے کچھ دُور تھی۔ یہ ساری آبادی سورابایا کے باہر کی طرف تھی۔ اصل شہر راہٹ کر آباد تھا۔

چھپڑ کے قریب جو چند ایک مکان تھے وہ جھونپڑے سے تھے اور ان میں لکڑی اور

بانسوں کے بنے ہوئے بھی دو یا تین جھونپڑے تھے۔ یہ سب ملبے کے ڈھیر بن گئے تھے لیکن جو اچھے مکان ان سے ہٹ کر تھے وہ بالکل محفوظ تھے۔

میں آپ کو بم پھٹنے کے اثرات ذرا سمجھانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہوائی جہاز سے گرایا بم جب زمین سے ٹکرا کر پھٹتا ہے تو اس کے دھماکے کی اس قدر زیادہ قوت ہوتی ہے کہ ہوا کو بڑی تیزی سے پیچھے کو دھکیلتا ہے' اس حد تک کہ جہاں بم پھٹتا ہے وہاں خلا بن جاتا ہے جسے VACUUM کہتے ہیں۔ خلا کو اپنی فطرت کے مطابق ہوا اس قدر زیادہ تیزی سے آکر پُر کرتی ہے جس تیزی سے رائفل سے نکلی ہوئی گولی جاتی ہے۔ ایک تو مکان بم کے دھماکے سے اس وقت گرتے ہیں جب دھماکہ ہوا کو ہر طرف پیچھے دھکیلتا ہے لیکن یہی ہوا اس قدر تیزی سے آتی ہے کہ کھڑے مکان بھی گر پڑتے ہیں۔ زیادہ نقصان واپس آنے والی ہوا کرتی ہے۔ کوئی آدمی کھڑا ہو تو اُسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائے گی۔

امریکی لڑاکا بمبار ہوائی جہاز کے گرائے ہوئے یہ بم اگر خشک زمین پر گر کر پھٹتے تو چھپڑ سے دُور دُور کی آبادی کو ملبے میں بدل ڈالتے لیکن یہ پانی کے اندر پھٹے اس لئے اس کے دھماکے کے اثرات نصف سے زیادہ زائل ہوگئے۔ چھپڑ کے کنارے جو مکان گرے تھے وہ اتنے کمزور نہ ہوتے تو نہ گرتے۔

بموں کے ٹکڑوں سے دو معصوم بچے بُری طرح کٹ کر مارے گئے۔ تین آدمی اور ایک عورت جو چھپڑ کے کنارے کھڑے یا بیٹھے تھے مارے گئے اور پھر ہم سب گرے ہوئے مکانوں کا ملبہ ہٹانے لگے تو تین بوڑھے آدمیوں کی لاشیں ملیں اور چند ایک کو ہم نے زندہ نکال لیا۔ وہ صرف زخمی ہوئے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ چھپڑ میں ایک گائے اور دو بھینسیں اُتری ہوئی تھیں وہ ماری گئیں اور دو تین اور مویشی جو چھپڑ سے پانی پی رہے تھے مارے گئے۔

میں اتنا جانتا ہوں کہ ہوائی جہاز امریکی ایئر فورس کا تھا۔ امریکہ اور برطانیہ کی ایئر فورسوں نے انڈونیشیا میں بمباری سے بہت تباہی مچائی تھی لیکن صرف دیہاتی علاقوں اور جنگلوں میں۔ شہروں پر انہوں نے اس طرح کی بم باری بہت کم کی تھی۔ دیہاتی علاقوں میں وہ اسلئے دیہاتی بستیوں پر بمباری کرتے تھے کہ وہاں گوریلا حریت پسندوں کو پناہ اور دیگر مدد ملتی تھی۔

ناسوشن بھی وہاں آگیا تھا اور وہ دوسرے عام لوگوں کی طرح بھاگتا دوڑتا پھر رہا تھا۔ پھر وہ ایک جگہ رُک گیا اور گوریلا کمانڈر اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ میں اور عاشق بھی قریب چلے گئے۔ مجھے آج تک وہ جلال یاد ہے جو میں نے اُس کے چہرے پر دیکھا تھا۔

وہ پوچھ رہا تھا کہ یہ ہوائی جہاز کس طرف سے آیا تھا۔ میں آگے ہوگیا۔ مجھے خیال تھا کہ وہ میری زبان نہیں سمجھ سکے گا لیکن پتہ چلا کہ وہ انگریزی ٹھیک ٹھاک بولتا اور سمجھتا ہے۔ عثمان نے آہستہ سے مجھے کہا کہ انگریزی زبان میں بات کرنا۔

میں نے بتایا کہ جہاز فلاں طرف سے آیا تھا اور یہ بھی بتایا کہ میرے تین ساتھی بھی دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُس طرف اشارہ کیا جس طرف سے ہوائی جہاز آیا تھا۔

اُس کے منہ سے آواز نکلی — "ملانگ" — پھر وہ اپنے جونیئر کمانڈروں سے مخاطب ہوا اور اپنی زبان میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ ملانگ کہا اور کمانڈروں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی یا غالباً" شک کا اظہار کیا۔ دو اور آدمیوں نے بھی آکر وہی سمت بتائی جو میں بتا چکا تھا۔ وہ دو آدمی ہوائی جہاز کو آتا دیکھ چکے تھے۔

○

وہاں اس وقت تو مجھے کچھ پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ یہ لوگ آپس میں کیا باتیں کر رہے ہیں۔ بعد میں یہ سب باتیں عثمان کی زبانی معلوم ہوئیں۔ یہ میں آپ کو سناتا ہوں:

"یہ ہوائی جہاز دوبارہ نہیں اُڑے گا" — ناسوشن نے بڑے اطمینان سے کہا — "اس کے پائلٹ کو بھی زندہ نہیں رہنا چاہئے۔"

اس کے بعد اُس نے کہا کہ ایک ہفتہ پہلے تک ملانگ میں کسی ایئر فورس کا کوئی ہوائی جہاز نہیں تھا۔ اس نے حکم دیا کہ ابھی آدمی بھیجو جو یہ دیکھ کر آئیں کہ وہاں کوئی ایئر فورس آگئی ہے یا وہاں کچھ بھی نہیں پھر دوسرے ہوائی اڈوں سے معلوم کریں گے۔

ملانگ چھوٹا سا قصبہ تھا جو سورابایا کے جنوب کی طرف ستر پچھتر میل دُور تھا۔ عثمان نے بعد میں بتایا تھا کہ وہاں ہوائی اڈا تو نہیں لیکن درخت کاٹ کر کھلی جگہ بنائی ہوئی تھی۔ یہ غالباً" جاپانیوں نے بنائی تھی جسے عارضی ہوائی اڈا کہا جاسکتا ہے۔ ایک رن وے بنا دیا گیا اور اس سے ذرا ہٹ کر ہوائی جہاز کھڑے کرنے کے لئے جگہ بنائی گئی تھی اور

اس کے عملے وغیرہ کے لئے بارکیں بنادی گئی تھیں۔

ناسوشن کے پاس چھوٹا فوجی ٹرک تھا جس پر وہ ہمارے پاس آیا تھا۔ اُس نے اپنے منتخب کئے ہوئے دو آدمیوں سے کہا کہ وہ ملانگ تک جائیں۔ چونکہ میں نے کہا تھا کہ بم گرانے والے ہوائی جہاز کو اچھی طرح دیکھا تھا اس لئے مجھے کہا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں اور یقین کرکے واپس آؤں کے بم گرانے والے ہوائی جہاز ملانگ میں موجود ہیں اور بالکل ایسے ہی ہیں۔ میں نے عاشق علی کو بھی ساتھ لے لیا۔

ہمارے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں تھیں جو ہم نے تیار کرکے لوڈ رکھی ہوئی تھیں۔ راستے میں کہیں بھی دشمن کی کسی پارٹی کے ساتھ ہماری ٹکر ہو سکتی تھی.... راستے میں تین چار مرتبہ ٹرک روکا اور قریب سے گزرنے والے آدمیوں سے پوچھا کہ انہوں نے ایک جہاز سورابایا کی طرف آتا دیکھا ہوگا اور اگر دیکھا ہے تو وہ کس طرف سے آیا تھا۔ چونکہ یہ ہوائی جہاز بہت ہی نیچی پرواز کرتا ہُوا آیا تھا اس لئے ان سب نے رک کر اسے دیکھا تھا۔ ان سب نے بتایا کہ جہاز ملانگ کی طرف سے آیا تھا۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ملانگ کی طرف ہی واپس گیا تھا۔

اس طرح ہم ملانگ تک پہنچ گئے۔ ہمارے انڈونیشی ساتھی نے ملانگ کے چند آدمیوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ ملانگ کی لینڈنگ گراؤنڈ پر تین چار دن پہلے ہوائی جہاز آئے ہیں۔ لینڈنگ گراؤنڈ آبادی سے دو میل دُور بنائی گئی تھی۔ ہم وہاں تک چلے گئے۔

وہاں گھنا جنگل تھا۔ ٹرک کچھ دور روک لیا اور ہم پیدل آگے چلے گئے۔ ہمارے سامنے کھلا بلکہ وسیع و عریض میدان تھا جس میں کچا رن وے بنایا گیا تھا۔ کچے کا مطلب یہ ہے کہ اسے سڑک کی طرح پکا نہیں کیا گیا تھا جس طرح ہوائی اڈوں کے رن وے ہوتے ہیں۔ اس سے تھوڑا ہی پرے آٹھ ہوائی جہاز پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ وہ سب ایک ہی قسم کے تھے اور بم گرانے والا جہاز بھی اسی قسم کا تھا۔ یہ امریکی ایئر فورس کے جہاز تھے۔

وہاں ایئر فورس کے کئی ایک آدمی گھوم پھر رہے تھے اور مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ دُور تین لمبی بارکیں تھیں جن میں اس ایئر فورس کی نفری رہتی تھی۔ میرے انڈونیشی ساتھیوں نے صرف یہ نہیں دیکھا کہ ہوائی جہاز کھڑے ہیں بلکہ وہ مختلف جگہوں اور زاویوں سے ہوائی جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اور کوئی زبان نہیں سمجھتے تھے اس لئے میں ان سے کوئی بات نہ کرسکا۔ اتنا سمجھ گیا کہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ان

ہوائی جہازوں کو کس طرح تباہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ ہماری طرف دیکھتے اور مسکراتے تھے اور ہم دونوں بھی سر ہلا کر مسکرا دیتے تھے۔

ہم شام سے کچھ دیر پہلے واپس سورابایا پہنچ گئے۔ میں اور عاشق علی باہر ہی رہے اور وہ دونوں انڈونیشی عثمان کے گھر میں داخل ہوگئے۔ ناسوشن وہیں تھا اور وہ اسے رپورٹ دینے گئے تھے.... شام کا کھانا کھانے کا بعد مجھے اور عاشق علی کو عثمان نے بلایا۔ ہم فوراً اُس کے پاس پہنچے۔ اس نے بتایا کہ آج رات ایک پارٹی ان ہوائی جہازوں کو تباہ کرنے کے لئے جارہی ہے اور ہم دونوں اس پارٹی کے ساتھ جائیں گے۔

ہمیں اس پارٹی کے کمانڈر سے ملوایا گیا۔ وہ بہت ہی کم اُردو جانتا تھا اور اُس کی انگریزی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اردو یا انگریزی میں اظہارِ خیال پوری طرح نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے ہم دونوں کو جو ہدایات دینی تھیں وہ عثمان نے اردو میں ہمیں سمجھادیں۔

ہم دونوں کو ملا کر یہ دس آدمیوں کی پارٹی تھی۔ پارٹی کے ہر فرد کو تین تین گرینیڈ دیئے گئے تھے۔ ہمارے پاس رائفلیں اور سٹین گنیں بھی تھیں۔ پارٹی کے ایک آدمی کے پاس لائٹ مشین گن تھی۔

○

ہم دن کے وقت بھی اُدھر گئے تھے' واپس بھی آئے تھے اور اب رات کو بھی ملانگ پہنچ گئے تھے۔ ہمیں راستے میں کسی نے نہ روکا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں بے بس ہو چکی ہیں اور اب ان علاقوں پر اور ان راستوں پر ان کا کنٹرول نہیں رہا۔ کچھ عرصہ پہلے فوجی جس کسی کو چاہتے روک کر چیک کرتے اور پھر آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ انڈونیشی گوریلوں کی یہ کامیابی تھی کہ انہوں نے دشمن کی فوجوں کو دور پیچھے دھکیل دیا تھا اور ان کا حکم کھولا کردیا تھا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے ہم ملانگ پہنچ گئے۔ حریت پسندوں نے یہ قصبہ بھی فوج سے آزاد کرا لیا تھا ورنہ ہم اتنی آزادی سے وہاں گھوم پھر نہ رہے ہوتے۔ اس نقل و حرکت کی آزادی سے جنگِ آزادی میں سہولت حاصل ہوگئی تھی۔ ہم ٹرک میں ہی بیٹھے رہے اور پارٹی کمانڈر اُتر کر کہیں چلا گیا.... کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ کمانڈر کے کہنے پر ہم ٹرک سے اُترے اور وہ دو آدمی ہمیں تپاک سے ملے۔ معلوم ہُوا کہ ٹرک یہیں چھوڑنا ہے اور آگے ٹارگیٹ تک پیدل جانا ہے۔

پارٹی کمانڈر نے ہمیں آخری بار ہدایات دیں جو پہلے دی جا چکی تھیں۔ مجھے اور عاشق علی کو عثمان نے یہ ساری باتیں اُردو میں سمجھا دیں تھیں۔ ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ ہوائی جہاز کس طرح تباہ کئے جائیں گے۔ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ٹارگیٹ پر پہنچنے کے بعد اتنی خاموشی برقرار رکھنی ہے کہ کھانسی بھی نہ آئے اور چھینک پر بھی قابو رکھا جائے۔ یہ تو ہمیں اندازہ تھا کہ ان ہوائی جہازوں کی حفاظت کے بڑے سخت انتظامات ہوں گے۔ رات کے وقت وہاں سنتریوں کا ہونا تو لازمی تھا۔

پیدل چلتے ہوئے ہم اُس جگہ پہنچ گئے جہاں سے دن کے وقت ٹرک روک کر ہوائی جہاز دیکھے تھے۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہاں جنگل تھا۔ ہمیں ایک سہولت یہ بھی حاصل تھی کہ راتیں تاریک ہُوا کرتی تھیں۔ اُن دنوں چاند آدھی رات کے بعد اُفق سے اوپر آیا کرتا تھا۔

ایسا ممکن نہیں تھا کہ ہم سیدھے ہوائی جہازوں تک جا پہنچتے۔ ہمارے سامنے کھلا میدان تھا۔ کوئی آڑ اور کوئی اوٹ نہیں تھی۔ ہوائی جہازوں پر پہرے کے لئے ایک یا دو سنتریوں کی موجودگی لازمی تھی۔ ہم نے دن کے وقت دیکھا تو نہیں تھا' امکان یہ بھی تھا کہ ہوائی جہازوں کی حفاظت کے لئے قریب کہیں گارد کی پوسٹ ہو سکتی ہے۔ بہرحال ہم ہر قسم کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار تھے۔

ہمیں دُور کا چکر کاٹنا تھا۔ جہاں رن وے اور میدان ختم ہوتا تھا اس طرف سے ہمیں جنگل میں چھپ چھپ کر آگے جانا تھا اور ہم بڑی خاموشی سے قدم پھونک پھونک کر رکھتے اُس طرف چلے جا رہے تھے.... اس طرح ہم سامنے کی طرف پہنچ گئے۔ آگے درخت کچھ دور دور تھے۔ پارٹی کچھ بکھر گئی اور اپنے اپنے طور پر ایک ایک درخت کی اوٹ میں ہوتے ہوئے ہم آگے بڑھتے گئے اور ہوائی جہازوں کے قریب جا پہنچے لیکن مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ آگے کوئی آڑ اور اوٹ نہیں تھی۔ اتنی سی سہولت مل گئی کہ گھاس ذرا اونچی تھی جس میں لیٹ کر آدمی چھپ سکتا تھا اور کچھ جھاڑیاں بھی تھیں۔ چاند افق سے نکل آیا تھا۔ اس کے زیادہ اوپر آجانے سے پہلے ہمیں اپنا کام ختم کرنا تھا کیونکہ چاند اُن دنوں پورا تھا اور اوپر آنے کی صورت میں روشنی ہمارے لئے خطرناک تھی۔ ہم لیٹ کر کہنیوں اور گھٹنوں کے بل گھاس میں سرکنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے پیچھے تھے اور درمیانی فاصلہ زیادہ رکھا تھا۔

○

ہوائی جہاز کم و بیش ایک سو گز دُور تھے اور اب کچھ کچھ نظر بھی آنے لگے تھے۔ یہ بھی نظر آگیا کہ ایک پٹرول ٹینک بھی کھڑا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا آپ سڑک پر دیکھا کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے پٹرول جہازوں کو پٹرول سپلائی کیا جاتا ہے۔ یہ ٹینک ہمارے قریب تھا۔ ہوائی جہاز اس سے آگے تھے۔ ہم رینگتے گئے اور پٹرول ٹینک سے چند ہی قدم دور رہ گئے۔

ہلکے ہلکے قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہم سب اس طرح گھاس میں دبک گئے جیسے یہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ میں درمیان میں تھا اور عاشق علی میرے ساتھ تھا۔ پٹرول ٹینک کی اوٹ سے دو آدمی آہستہ آہستہ چلتے سامنے آئے۔ انہوں نے کندھوں سے رائفلیں لٹکا رکھی تھیں۔ یہ یقیناً" ایئر فورس کے آدمی تھے جو ہوائی جہازوں پر پہرہ دے رہے تھے۔ ہوائی جہازوں پر پہرہ لازمی تھا کیونکہ اس خطّے میں جنگی صورتِ حال بنی ہوئی تھی اور کسی بھی وقت انڈونیشی گوریلے ان جہازوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے بلکہ نقصان پہنچانے آگئے تھے۔ روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان سنتریوں کے چہرے پہچانے جا سکتے تھے۔ ان کے لمبے قد اور ڈیل ڈول سے پتہ چلتا تھا کہ یہ امریکی ہیں۔

وہ دونوں ہمارے قریب آگئے اور رک گئے۔ انہیں اب پیچھے جانا تھا کیونکہ وہ ہوائی جہازوں سے دور نکل آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے نہ جانے کیسے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ انڈونیشیوں کو ہی بُرا بھلا کہہ رہا ہو گا۔ ان ہی کی وجہ سے ان کو رات کو پہرہ دینا پڑتا تھا.... ذرا رُک کر وہ اسی طرف چلنے لگے جس طرف سے آئے تھے۔ وہ تیز نہیں بلکہ ٹہلنے کی رفتار سے چلتے تھے' بہت آہستہ آہستہ۔

میرے قریب پیچھے سے دو انڈونیشی اٹھے اور اتنی احتیاط سے اٹھے کہ مجھے ان کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی نہ سنائی دی۔ دونوں سنتری اپنی باتوں میں مگن آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ پیچھے سے ایک ایک انڈونیشی نے انہیں جست لگا کر اس طرح پکڑ لیا کہ بایاں بازو گردن میں ڈالا اور بازو کا گھیرا تنگ کر دیا۔ آدمی کو قابو کرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے لیکن یہاں یہ دشواری سامنے آگئی کہ سنتریوں کہ قد خاصے لمبے تھے اور دونوں انڈونیشیوں کے قد چھوٹے تھے۔ ویسے بھی یہ دونوں انڈونیشی کچھ دبلے پتلے تھے۔ انہوں نے امریکیوں کے گلوں میں بازو تو ڈال لئے مگر خنجر نہ چلا سکے کیونکہ دونوں

امریکیوں نے ایسا داؤ کھیلا کہ گوریلوں کے پاؤں زمین سے اُٹھ گئے اور امریکیوں نے دھوبی پٹڑے کے انداز سے انہیں اپنے آگے گرا لیا۔ ہم ہر صورتِ حال کے لئے تیار تھے۔ ہمارے دونوں ساتھی تو امریکیوں کے آگے گر پڑے تھے اور اب یوں ہونا تھا کہ امریکیوں نے رائفلیں کندھوں سے اتار کر ان دونوں کو گولی مار دینی تھی لیکن ہُوا یوں کہ دونوں امریکی سیدھے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آ گئی اور دوسرے کی گردن پارٹی کمانڈر کے بازو کے شکنجے میں آ گئی۔

میرا قد ٹھیک ٹھاک تھا اور پارٹی کمانڈر کا قد بھی موزوں تھا۔ ہم دونوں نے بازوؤں کے شکنجے کس دیئے اور دائیں ہاتھ سے خنجر نکال کر دونوں کے پیٹوں میں مارے۔ میں نے اپنے شکار کے پیٹ اور سینے میں تین بار خنجر مارا تھا۔ ہمارے کمانڈر نے بھی اپنے شکار کا پیٹ چاک کر دیا تھا۔

ان دونوں کو چھوڑا تو وہ گر پڑے۔ ہم نے ان کی لاشیں گھسیٹ کر گھاس میں پھینک دیں اور ان کی رائفلیں اور ایمونیشن ان کے پاس ہی رہنے دیا جو واپسی پر ہم نے ساتھ لے جانا تھا۔

ہم مطمئن ہو گئے کہ سنتریوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے لیکن پھر ہمیں قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہماری پارٹی پھر پیچھے ہٹ کر گھاس میں دبک گئی اور ہم آنے والوں کا انتظار کرنے لگے۔ پٹرول ٹینک کی اوٹ سے دو اور امریکی سنتری سامنے آئے اور وہیں رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یہ دونوں غالباً" پہلے سنتریوں کی جگہ آئے تھے اور اب ان کا پہرہ شروع تھا۔ فوج میں اسے سنتریوں کی بدلی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رات کو چار سنتری ڈیوٹی پر ہوتے ہوں گے۔ اگر ایسا تھا تو کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ گوریلوں کی دلیرانہ کارروائیوں کے پیشِ نظر اتنے قیمتی ہوائی جہازوں کی حفاظت کا ایسا ہی انتظام ہونا چاہئے تھا۔

ایک نئے آنے والے سنتری نے اپنے ساتھی سے کہا کہ معلوم نہیں وہ دونوں کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ وہ دونوں وہیں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ ایک نے کہا وہ کہیں سو نہ گئے ہوں۔ ایک نے بلند آواز میں انہیں پکارا لیکن کوئی جواب نہ پا کر دوسرے نے بھی ہانک لگائی۔ سوائے خاموشی کے انہیں کوئی جواب نہ ملا۔

وہ آگے نہ آئے۔ وہیں سے پیچھے کو مُڑے اور آہستہ آہستہ چل پڑے۔ وہ پٹرول

ٹینک کی اوٹ میں ہوئے تو ہمارا کمانڈر اٹھا۔ اُس نے ایک انڈونیشی کو ساتھ لیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دبے پاؤں چلتے پٹرول ٹینک کے دوسرے پہلو تک پہنچ گئے۔ دو اور انڈونیشی اٹھے اور وہ بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔ وہ دونوں اس لئے گئے تھے کہ اُن کے اگلے ساتھی ناکام ہو جائیں تو وہ دونوں فوراً" ان کی مدد کو پہنچ جائیں جیسا پہلے ہو چکا تھا۔

ان دونوں سنتریوں نے یوں کیا کہ آگے جانے کی بجائے پٹرول ٹینک کے سامنے چلے گئے اور وہاں سے اُس طرف مُڑ آئے جدھر میرے ساتھی جھکے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ تو آمنے سامنے والی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں امریکیوں نے اپنی رائفلیں کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ پیشتر اس کے کہ وہ رائفلیں کندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں لیتے اور پھر ان انڈونیشیوں کی طرف نالیاں کرتے، چاروں انڈونیشی مجاہد بجلی کی سی تیزی سے اُن تک پہنچ گئے اور انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ ان میں سے دو کے پاس ٹامی سب مشین گنیں تھیں، ایک کے پاس سٹین گن اور چوتھے کے پاس رائفل تھی جس کے آگے سنگین لگی ہوئی تھی۔

آپ شاید جانتے ہوں کہ امریکی جنگجو قوم نہیں۔ ہندوؤں کی طرح امریکی بھی بُزدل اور بنئے ہیں۔ عیّاری، مکّاری اور فریب کاری سے کام چلاتے ہیں۔ لڑنا پڑے تو ہجوم کی صورت میں لڑتے ہیں لیکن فرداً" فرداً" لڑائی لڑنی پڑے تو پھر ان کے پاؤں نہیں جم سکتے۔ ہندوؤں کے متعلق آپ کو ایک بات بتاتا ہوں جو آپ نے 1965ء کی جنگ میں دیکھی ہو گی اور 1971ء کی جنگ میں بھی۔ ہندو فوج انتہائی زیادہ نفری سے حملہ کرتی ہے۔ جونہی ان کا جانی نقصان ہونا شروع ہوتا ہے اور نفری کم ہونے لگتی ہے، ان کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے اور وہ پیچھے کو دیکھنے لگتے ہیں۔ دفاع کی صورت میں وہ سیمنٹ اور سٹیل کے بنکروں کے اندر سے ٹھیک فائر کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں بنکروں سے نکلنا پڑے تو پھر وہ حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ یہی حال امریکیوں کا ہے۔ اپنی قوم کو آپ جانتے ہیں کہ جہاں بھی لڑی ہے بہت ہی کم تعداد میں لڑی ہے اور فتح بھی حاصل کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان کو عسکری روح ورثے میں ملی ہے۔

○

ان دونوں امریکی سنتریوں نے جب دیکھا کہ چار ہتھیاروں کے نرغے میں آ گئے ہیں تو بڑی برخورداری سے اپنے کندھوں سے رائفلیں اتاریں اور ہمارے ساتھیوں کے

حوالے کردیں۔ انہوں نے منہ سے ذرا سی بھی آواز نہ نکالی۔

ان دونوں کو اِدھر ہی لے آئے جدھر پہلے ہی ان کے دو ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ لاشیں انہیں دکھائی گئیں تو ان کے چہروں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ان پر خوف طاری ہوگیا ہے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ میں نے پہلے بتایا ہے کہ ہمارا پارٹی لیڈر اردو اور انگریزی اتنی تھوڑی جانتا تھا کہ اپنا مدعا بیان نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اس امریکی فوجی کی اتنی سی بات سمجھ گیا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میں نے کمانڈر کی طرف دیکھا۔

کمانڈر نے کچھ اشارے کئے' چند لفظ انگریزی کے بولے اور چند اردو کے۔ مین نے اور عاشق علی نے بڑی مشکل سے اس کی بات سمجھی۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ ہوائی جہاز کیسے کھلتے ہیں۔ گرینیڈ ہوائی جہازوں کے اندر پھینکنے تھے تاکہ یہ بالکل تباہ ہوجائیں۔ کچھ دن بعد مجھے معلوم ہُوا کہ یہ کسی کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ جہاز کس طرح کھلتا ہے۔ جہازوں کے نیچے گرینیڈ پھینکنے سے ان کے انجن تباہ نہیں ہو سکتے تھے' باڈی کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا جو مرمّت ہو جاتا تھا۔

میں نے ان امریکیوں سے کہا کہ وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے ساتھ چلیں اور سارے جہاز اوپر سے کھول دیں۔ ان دونوں کے پہلوؤں کے ساتھ ٹامی گنوں کی نالیاں لگی ہوئی تھیں۔ انڈونیشی حرّیت پسند ٹامی گنوں کی نالیاں ان کے جسموں سے ہٹاتے ہی نہیں تھے۔ دونوں امریکی چپ چاپ آگے چل پڑے۔ میں نے راستے میں پوچھا کہ یہاں اور کوئی سنتری یا حفاظتی چوکی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ اور کچھ بھی نہیں اور وہ دونوں پہلے سنتریوں کی جگہ لینے آئے تھے اور انہوں نے واپس چلے جانا تھا یعنی پہلے سنتریوں کی ڈیوٹی ختم ہوگئی تھی۔

آٹھ ہوائی جہاز اس طرح پہلو بہ پہلو کھڑے تھے کہ ان کے پروں کے درمیان چند انچوں کا فاصلہ تھا۔ ایک امریکی سنتری پہلے جہاز کے پر یعنی وِنگ پر چڑھ گیا۔ اس کے اوپر کاک پٹ (پائلٹ کی سیٹ) تھی۔ اوپر سلائیڈنگ کور تھا۔ یہ پلاسٹک کا بنا ہُوا تھا جو آگے پیچھے سلائیڈ ہوتا تھا۔ امریکی نے اس پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو دبایا تو یہ کور پیچھے چلا گیا اور کاک پٹ کھل گئی۔ اس طرح آٹھوں جہازوں کی کاک پٹیں کھلوالی گئیں۔ یہ پہلے ہی طے ہوگیا تھا کہ ان ہوائی جہازوں کو کس طرح تباہ کیا جائے گا۔ ناسوشن ان جہازوں سے

واقف تھا۔ میں انڈونیشی مسلمانوں کی عقل اور ذہانت کا تو پہلے ہی قائل تھا لیکن جس طرح ان جہازوں کو تباہ کرنے کا پلان بنالیا گیا تھا' اس سے تو میں اور زیادہ متاثر ہُوا کہ یہ لوگ کتنی عقل رکھتے ہیں۔

غور کریں' اگر باری باری ہر جہاز میں گرینیڈ پھینکا جاتا تو پہلے ہی دھماکے سے بارکوں میں جو نفری سوئی ہوئی تھی وہ فوراً بیدار اور مسلح ہو کر پہنچ جاتی اور ہم اگر بھاگ نکلتے تو باقی جہاز محفوظ رہتے لیکن فوج کی بے پناہ فائرنگ سے سب کا بچ کر نکل آنا بھی ناممکن ہوتا۔

ناسوشن نے طریقہ یہ بتایا تھا کہ سارے ہوائی جہاز اوپر سے کھول لئے جائیں اور ہر ہوائی جہاز پر ایک ایک بندہ چلا جائے اور ایک ہی بار آٹھوں آدمی اپنا اپنا گرینیڈ پھینک کر نیچے اُتر آئیں اور بہت تیزی سے جہازوں سے دور بھاگیں۔ ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ ایک ایک آدمی ایک ایک گرینیڈ لے کر ایک ایک ہوائی جہاز کے وِنگ پر چلا گیا اور کمانڈر کے اشارے پر گرینیڈوں سے پنیں نکال دیں اور جب سب تیار ہوگئے تو کمانڈر کے اشارے پر گرینیڈ تمام ہوائی جہازوں کی کاک پٹوں میں پھینک دیئے گئے۔ تمام آدمی وِنگوں سے کودے اور کئی قدم دوڑ کر زمین پر لیٹ گئے۔

آٹھ گرینیڈ اکٹھے پھٹے تو ان کا دھماکہ پانچ سو پونڈ کے بم جتنا تھا۔

سب اُٹھے اور اس طرف دوڑ پڑے جہاں دو امریکیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ مجھے ٹامی گنوں کے دو لمبے برسٹ فائر ہونے کی آواز سنائی دی جو بالکل قریب تھی۔ جلدی ہی پتہ چلا کہ ہمارے کمانڈر نے یہ گن فائر کی تھی اور دونوں امریکیوں کو مار ڈالا تھا۔

ہمارا مشن مکمل ہوگیا تھا اور اب ہمیں بہت تیزی سے وہاں سے بھاگنا تھا۔ ہوائی جہازوں کو آگ بھی لگ گئی تھی۔ اس آگ کی روشنی میں مجھے دو جہاز نظر آسکے جو درمیان سے ٹوٹ گئے تھے اور ان کی باڈیاں زمین کے ساتھ لگ گئی تھیں اور ابھی ان کے پٹرول ٹینک پھٹنے تھے۔

ہم وہاں سے بھاگے تو ایک بڑا ہی زور کا دھماکہ ہُوا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو پٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا اور اس کا شعلہ دور اوپر تک چلا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ افسوس ناک بات بھی معلوم ہوئی کہ اپنا ایک انڈونیشی ساتھی بھی پٹرول ٹینک کے ساتھ ہی اُڑ گیا ہے۔ یہ اس طرح ہُوا تھا کہ یہ انڈونیشی جوش میں آکر پٹرول ٹینک پر چڑھ گیا تھا۔ اسے

معلوم ہو گا کہ یہ اوپر سے کھلتا ہے۔ اس نے پٹرول ٹینک کھول لیا اور ایک گرینیڈ اس کے اندر پھینک دیا۔ اُسے غالباً" اندازہ نہیں تھا کہ یہ پٹرول سے بھرا ہُوا ٹینک کس طرح پھٹے گا۔ وہ اوپر سے کودا اور پھر اٹھ کر بھاگنے کی مہلت نہ ملی۔ ٹینک پھٹا اور بے انداز پٹرول اُس پر گرا۔ یہ پٹرول تو اب آگ کا مہیب شعلہ تھا جس نے ہمارے ساتھی کو فوراً" ہی ختم کر ڈالا اور اس طرح وہ زندہ جل کر شہید ہو گیا۔

ہم بہت ہی تیز دوڑے۔ ہمیں یقین تھا کہ بارکوں میں سوئے ہوئے امریکی ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ انہیں بیدار ہونا تھا' پھر ہتھیار لینے تھے اور پھر جلتے ہوئے ہوائی جہازوں تک آنا تھا' اتنی دیر میں ہم نے جنگل میں غائب ہو جانا تھا۔

ہم غائب ہو بھی گئے۔ ہم دوڑتے بھی جا رہے تھے اور جلتے ہوئے ہوائی جہازوں کو بھی بار بار دیکھتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کئی دھماکے ہوئے۔ یہ جہازوں کی ٹینکیاں پھٹ رہی تھیں۔ ایسے مہیب شعلوں کی روشنی میں ہمیں بہت سے امریکی نظر آئے جو اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ اس سے ہمیں اطمینان ہُوا کہ وہ ہمارے تعاقب میں نہیں آ رہے اور نہ آئیں گے۔ یہ تو انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ جہازوں کو تباہ کرنے والے کدھر نکل گئے ہیں۔

دوڑ دوڑ کر ہم تھک گئے تو چلنے لگے۔ چاند اتنا اوپر آ گیا تھا کہ اس کی روشنی میں خاصی دور تک چیزیں نظر آتی تھیں۔ جنگلاتی علاقوں میں چاندنی بڑی ہی شفاف ہُوا کرتی ہے کیونکہ نمی کی وجہ سے فضا بالکل صاف ہوتی ہے۔ کچھ دور آ کر ہم اکٹھے ہونے لگے اور ایک دوسرے کو دیکھنے اور پوچھنے لگے کہ سب خیریت سے ہیں یا کوئی زخمی ہُوا ہے.... سب خیریت سے تھے لیکن ہمارا ایک ساتھی ہم میں نہیں تھا۔ اُسے جس نے زندہ جلتے دیکھا تھا سب کو بتایا کہ جوش میں آ کر وہ کیا کارروائی کر بیٹھا تھا۔

سحری کے وقت ہم واپس اُس جگہ پہنچ گئے جہاں اپنا ٹرک چھوڑ کر گئے تھے۔ سحری کا وقت تھا' ہر سو خاموشی تھی۔ پٹرول ٹینک اور ہوائی جہازوں کی ٹینکیوں کے دھماکے ملانگ بستی تک سنائی دیئے تھے۔ بہت سے لوگ جاگ اٹھے تھے اور گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہاں سے انہیں دو میل دور کے شعلے تو دکھائی نہیں دیتے تھے کیونکہ راستے میں جنگل تھا لیکن ان شعلوں نے اُس طرف کا آسمان روشن کر دیا تھا۔ وہاں کا گوریلا کمانڈر جانتا تھا کہ ہم کس مشن پر گئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ ہم سب سے بغلگیر ہو کر ملا اور بے

تحاشہ خوشی کا اظہار کیا۔ ہم ٹرک میں بیٹھے اور واپس چل پڑے۔

○

پَو پھٹ رہی تھی جب ہم واپس سورابایا پہنچ گئے۔ عثمان اور کچھ دوسرے لوگ ہمارے انتظار میں سو بھی نہ سکے تھے لیکن ناسوشن گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ ہمارے کمانڈر نے عثمان کو مشن کی کامیابی کی اطلاع دی تو عثمان کچھ کہے بغیر دوڑ پڑا اور ناسوشن کو جگا کر اسے بتایا کہ پارٹی مشن کی تکمیل کے بعد واپس آ گئی ہے۔ ناسوشن بہت بڑا لیڈر تھا' جرنیل بھی تھا اور اسے احمد سوئیکارنو اور سوہارتو کے ساتھ بین الاقوامی شہرت اور اہمیت حاصل ہو گئی تھی لیکن اس کا انداز اللہ کے سپاہیوں جیسا تھا۔ جونہی اسے ہماری کامیابی کی اطلاع ملی' وہ شب خوابی کے لباس میں باہر آیا اور پارٹی کے ہر آدمی کو گلے لگا کر ملا۔

امریکہ جیسے امیر ملک کے لئے آٹھ جہازوں کا نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا تھا لیکن اس نقصان کی اہمیت یہ تھی کہ اُس قوم نے اُس کے ہوائی جہاز تباہ کر دیئے ہیں جن کے پاس ایئر فورس تھی ہی نہیں اور توپیں بھی نہیں تھیں اور جن کو وہ دھوکہ دے کر اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے یہ امریکہ اور برطانیہ کے لئے بہت بڑی چوٹ تھی۔

کچھ دنوں بعد عثمان نے مجھے بتایا تھا کہ احمد سوئیکارنو نے اقوام متحدہ کے نمائندوں سے کہا تھا کہ امریکہ نے شہری آبادی پر بم پھینکے ہیں جس کے جواب میں ہم نے وہ آٹھ جہاز تباہ کر دیئے ہیں جن میں ایک ہوائی جہاز بمباری کرنے آیا تھا۔ اگر آئندہ اس طرح بمباری کی گئی تو ہم اس سے زیادہ نقصان پہنچا کر انتقام لیں گے۔

انڈونیشی حرّیت پسندوں کی انٹیلی جنس کی رپورٹ یہ تھی کہ اتحادی صلیبیوں کی انٹیلی جنس نے معلوم کر لیا تھا کہ فلاں دن فلاں جگہ فلاں وقت ناسوشن سورابایا ایک بڑی ہی اہم کانفرنس کے لئے جا رہا ہے۔ یہ دو بم دراصل ناسوشن پر گرائے گئے تھے۔ بم بڑے صحیح وقت پر گرائے گئے لیکن پائلٹ کو کچھ غلطی لگی اور بم کانفرنس والی جگہ سے دُور پانی میں گرے۔ یہ تھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد۔ اسلام کی آن پر لڑنے والوں کے سروں پر اللہ کا ہاتھ تھا۔

انڈونیشی لیڈروں کا ڈسپلن ملاحظہ فرمائیں۔ ناسوشن کو انٹیلی جنس نے بتایا کہ بم اُس پر گرائے گئے تھے تو یوں نہیں ہُوا کہ ناسوشن اپنے آپ کوئی بیان جاری کر دیتا اور اپنے جذبات اور انتقامی جذبے کا اظہار کرتا۔ ان کا کوئی لیڈر اپنے طور پر کوئی بیان ریڈیو یا اخبار

کو نہیں دیتا تھا۔ ہر بات احمد سوئیکارنو تک پہنچتی اور پھر سرکاری بیان جاری ہوتا تھا۔

ناسوشن تو آیا ہی بہت بڑا آپریشن پلان تیار کرنے کے لئے تھا لیکن اب اُس کی جذباتی حالت یہ تھی کہ وہ بڑا ہی زبردست انتقامی وار کرنے پر تُل گیا تھا۔ امریکیوں کے آٹھ ہوائی جہاز تباہ کر کے اُس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

○

کانفرنس منعقد ہوئی جس میں صرف ایریا کمانڈر شامل کئے گئے اور ہیڈ کوارٹر کے دو جونیئر کمانڈر بھی شریک ہوئے۔ دو گھنٹوں کے بعد ہم سب کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا اور بتایا گیا کہ ہمارا اگلا مشن کیا ہوگا۔

یہ مشن بڑا ہی خطرناک تھا۔ میں نے پچھلے ایک باب میں ایک گورا رجمنٹ پر ایک شبخون کا واقعہ لکھا ہے۔ اس میں ان کی دو پوسٹیں تباہ کی گئی تھیں اور ندی کا پل اُڑا دیا گیا تھا۔ وہ گورا رجمنٹ کبھی کی وہاں سے جا چکی تھی اور اب امریکہ کی میرین فورس کی ایک بٹالین آ گئی تھی جس کی نفری سات آٹھ سو بتائی گئی تھی۔ یہ بھی اطلاع ملی کہ اس بٹالین کے ساتھ ایمونیشن کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جسے مختلف جگہوں پر اس بٹالین نے استعمال کرنا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ بٹالین اس لئے یہاں رکھی گئی ہے کہ اس علاقے کے لوگوں پر جنگی طاقت کا رعب طاری کیا جائے۔ یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا کہ اس بٹالین کی چیک پوسٹیں سورابایا تک ہر راستے پر اور اندر بھی قائم کی جائیں گی اور ہر آنے جانے والے کو چیک کیا جائے گا۔

ناسوشن نے اپنی زبان میں اس گوریلا فورس کو جو وہاں اکٹھی کی گئی تھی بڑا ہی جذباتی اور اشتعال انگیز لیکچر دیا لیکن اس کی جذبانیت اور اشتعال انگیزی لیکچر تک ہی محدود تھی۔ اُس نے پلان سنایا تو وہ ایسا حقیقت پسندانہ تھا جیسا ایک بڑے ہی قابل اور کامیاب جرنیل کا ہوتا ہے۔ یہ مختصراً یوں تھا کہ اس امریکی بٹالین پر رات کے وقت حملہ کرنا تھا اور کوشش یہ کرنی تھی کہ اس کے اسلحہ بارُود کے ذخیرے پر قبضہ کیا جائے اور قبضہ ممکن نہ ہو تو اُڑا دیا جائے۔

بات دراصل یہ تھی کہ اقوام متحدہ جو دراصل امریکہ کا اور صلیبی ممالک کا اپنا ادارہ ہے' انڈونیشیوں پر فائر بندی کے لئے دباؤ ڈال رہا تھا اور انہیں فائر بندی پر آمادہ کرنے کے لئے اپنی جنگی طاقت کا بھرپُور مظاہرہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف انڈونیشی لیڈر

اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے اقوام متحدہ کو بتا رہے تھے کہ ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ دوسروں کی شرائط ماننے کی بجائے اپنے شرائط دوسروں سے منوائیں۔

ناسوشن کے متعلق بتا چکا ہوں کہ وہ بہت بڑا سیاسی لیڈر اور ہیڈ کوارٹر کا بہت بڑا جرنیل تھا۔ اتنے بڑے جرنیل کا اس آپریشن کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہونا چاہئے تھا کہ حکم دیتا کہ یہ آپریشن کرنا ہے اور اسے کامیاب بنانا ہے لیکن وہ اس معاملے میں اتنا سنجیدہ تھا کہ خود اس آپریشن کی نگرانی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی کہ وہ اپنا کام مکمل کر کے واپس آئے گا۔

انڈونیشیا میں جنگِ آزادی کے دوران بڑے ہی خطرناک گوریلا اور کمانڈو اپریشن ہوئے تھے۔ بہادری کے اور حُبّ الوطنی کے ایسے ایسے مظاہرے ہوئے کہ سننے والے حیرت میں ڈوب جاتے ہیں لیکن کسی بھی اپریشن پر اتنی زیادہ نفری استعمال نہیں کی گئی تھی جتنی اب ناسوشن نے تیار کی تھی۔ یہاں میں کئی بار کہی ہوئی بات ایک بار پھر کہوں گا کہ وہ دشمن کی جنگی طاقت کا رعب ماننے کی بجائے دشمن پر اپنی طاقت کا رعب جمانا چاہتا تھا۔

دو سو بڑے ہی تجربہ کار اور منتخب گوریلا مجاہدین باہر سے آئے تھے اور عثمان کے ایریا کے بیس گوریلا مجاہدین اس نفری میں شامل کئے گئے تھے۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں بھی اس فورس میں شامل تھا۔ عاشق علی کے بازو اور ٹانگ کی کمزوری کی وجہ سے اس میں شامل نہ کیا گیا لیکن اُس نے ایسی ضد کی کہ اسے شامل کرنا پڑا۔ اس نے کہا کہ وہ آٹھ ہوائی جہازوں کو تباہ کرنے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ اُسے اس اپریشن میں شامل نہ کیا جائے۔ جذبہ دیکھئے کہ جب عاشق علی کو بتایا گیا تھا کہ اُسے اس فورس میں شامل نہیں کیا جا رہا تو اُس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ جی میں آتی ہے ایسے ہر گوریلا آپریشن کا ذکر ایسے کروں کہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ اپنے ہر ساتھی کے جذبۂ ایثار کا تذکرہ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں لیکن طوالت کے ڈر سے بات مختصر کرنا پڑتی ہے۔ آج جب اپنے ملک پاکستان کو اس دگرگوں اور افسوس ناک حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے انڈونیشی حریت پسند اور ان کے شجاعت کے کارنامے یاد آتے ہیں۔

جب حُبّ الوطنی کا جذبہ یاد آتا ہے تو عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے.... ایک

بات کہوں گا جو کسی کو بُری لگے تو اس سے معافی نہیں مانگوں گا۔ بات یہ ہے کہ کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے پاکستان پر ولندیزیوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور امریکہ اور برطانیہ اُن کی پشت پناہی کر رہے ہیں کہ ولندیزی پاکستانیوں کو اپنا غلام بنائے رکھیں۔

ناسوشن نے کمانڈروں سے کہا کہ وہ آج شام تک آگے جائیں اور اس امریکی بٹالین کا کیمپ دیکھ آئیں اور پھر دریا پار جاکر ان کی وہ پوسٹیں دیکھیں جو انہوں نے پُل کے ساتھ بنائی ہیں۔ اس حکم پر پانچ کمانڈر چلے گئے۔ میں نے یہ علاقہ پہلے دیکھا تھا اس لئے دوبارہ بیان نہیں کروں گا۔ ہم نے اسی جگہ ایک گورا بٹالین کو کمر توڑ نقصان پہنچایا تھا۔

شام کے وقت یہ کمانڈر واپس آگئے۔ میں گورا بٹالین کا ذکر کر رہا ہوں' اس کی صرف دو کمپنیاں اس کیمپ میں آئی تھیں لیکن کمانڈروں نے بتایا کہ امریکی بٹالین کی نفری آٹھ سو کے قریب ہے اور بیرکیں چونکہ کم ہیں اس لئے باقی نفری کو خیموں میں رکھا گیا ہے۔ کیمپ کے اردگرد خاردار تار بچھادی گئی تھی جس کا صرف ایک گیٹ رکھا گیا تھا۔ یہ کیمپ دریا کے کنارے پر تھا۔ بٹالین کی دو مشین گن پوسٹیں دریا کے دوسرے کنارے پر تھیں۔ ان پوسٹوں کے درمیان وہ پُل تھا جسے ہمارے ایک انڈونیشی مجاہد نے اُڑادیا تھا۔ یہ امریکیوں ہی نے مرمت کرکے قابلِ استعمال بنادیا تھا۔

حملے کے لئے اگلی رات مقرر کی گئی۔

کشتیوں کا انتظام پہلے سے موجود تھا۔ یہ کشتیاں صرف اس آپریشن کے لئے نہیں تھیں بلکہ یہ عثمان کا انتظام تھا کہ اس کی پارٹیوں کے لئے ہر وقت کشتیاں موجود رہیں۔ دریا کے پار صرف بیس آدمیوں نے جانا تھا۔ ان کے ذمے دشمن کی پوسٹیں تھیں۔ باقی نفری کو دریا کے اپنے کنارے کی طرف رہنا اور کیمپ تک پہنچنا تھا۔ میں اور عاشق بھی ان بیس آدمیوں میں تھے۔ بیس آدمی خاموشی کو برقرار رکھتے ہوئے ٹارگٹ تک پہنچ سکتے تھے لیکن دو سو آدمیوں کو اس طرح بھیجنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے' خاصا دشوار کام تھا۔

ان دو سو آدمیوں کو چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ ٹولیاں اس طرح گئیں کہ فردا" فردا" بکھر کر آگے بڑھیں اور دوسری ٹولیاں ایک دوسری سے دُور دُور رہیں۔ یہاں بھی ہمیں رات کی تاریکی کا فائدہ حاصل تھا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ یہ سارا علاقہ جنگلاتی تھا اور اس میں چٹانیں بھی تھیں اور ہری بھری ٹیکریاں بھی تھیں جن پر درخت

تھے اور گھنی جھاڑیاں بھی تھیں۔ اس طرح چھپنے کا قدرتی انتظام اچھا خاصا تھا۔ امریکیوں کا کیمپ کشادہ جگہ پر تھا۔

ہمارا کمانڈر عثمان تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو گورا رجمنٹ پر شب خون مارنے ہم گئے تھے تو بھی میں عثمان کے ساتھ تھا۔ اس طرح مجھے اس علاقے اور علاقے کے خطروں سے واقفیت تھی۔ اب بھی ہمیں توقع تھی کہ کشتی سنتری ضرور ملیں گے۔ یہ تو ہر فوج کا طریقۂ کار ہوتا ہے۔

اندھیرے میں ہم کشتیوں کے ذریعے دریا پار کر گئے۔ اگلے کنارے پر جاکر پارٹی کو بکھیر دیا لیکن یہ بکھیرنا بھی ایک ترتیب اور تنظیم کے مطابق تھا۔ ہر مجاہد اپنی ذمہ داری سے واقف تھا۔

اس طرح بکھر کر ہم بڑھتے گئے۔ میں' عاشق اور عثمان اکٹھے تھے۔

آگے جاکر ہم چٹانوں اور ٹیکریوں میں پہنچے تو نہ جانے کیوں ایسا ہوگیا کہ میں عثمان اور عاشق سے چند قدم آگے نکل گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے یہ دونوں ساتھی مجھ سے کتنے قدم پیچھے ہیں اور انہیں میرا علم تھا کہ میں کہاں ہوں۔ آگے ایسے درخت آگئے جو بہت ہی کم اونچے تھے اور ان کی شاخیں زمین سے تھوڑی ہی اوپر تھیں۔ انہیں ہٹاکر گزرنا پڑتا تھا۔

خاصا آگے جاکر میں ایک ٹیکری سے مُڑا تو قریب سے ہی آواز آئی۔ "ہالٹ"۔ یہ سنتری کی آواز تھی۔ ساری دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ رات کا سنتری کسی کو اپنے علاقے میں دیکھے تو اُسے ہالٹ کہتا ہے اور پھر اسے اچھی طرح دیکھتا ہے کہ یہ کون ہے اور پھر جانے کی اجازت دیتا ہے۔

میں نے اُدھر دیکھا۔ دو سائے میرے قریب ہی کھڑے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ وہ گشتی سنتری تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان میں پوچھا۔ کون ہو؟ کہاں جارہے ہو؟.... میں نے فورا" سوچ لیا کہ انگریزی نہیں بولوں گا۔ میرے لئے مشکل یہ تھی کہ میں انڈونیشی نہیں تھا۔ سوچا کہ ان امریکیوں کو یقیناً" پتہ ہوگا کہ انڈین آرمی کے ہزاروں مسلمان بھگوڑے ہو کر انڈونیشی حریت پسندوں سے جاملے ہیں۔ یہ مجھے پکڑ لیں گے اور انگریزوں کے حوالے کردیں گے۔

وہ میرے بالکل قریب آگئے۔ عثمان اور عاشق علی میرے پیچھے تھے۔ انہوں نے

سنتریوں کی آواز سن ہی لی ہوگی اور وہ دُبک گئے ہوں گے۔ اللہ نے میری یہ مدد کی کہ دماغ میں بڑی اچھی ترکیب آگئی۔ میں نے ہاتھ اوپر کردیئے۔ اُس رات میرے پاس سٹین گن تھی جس کا سلنگ میں نے کندھے میں ڈال رکھا تھا۔ وہ دونوں میرے اتنا قریب آگئے کہ اپنا منہ میرے منہ کے قریب لا کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں آہستہ آہستہ بائیں طرف ہوگیا اور وہ اسی طرح تھوڑے تھوڑے مُڑ گئے۔ میری ترکیب یہ تھی کہ ان کی پیٹھیں عثمان اور عاشق کی طرف ہو جائیں' وہ ہو گئیں۔

ان میں سے ایک نے پوچھا—"انڈین؟"—میں نے سرہلا کر اقرار کیا کہ میں انڈین ہوں۔ دوسرے نے انگریزی میں پوچھا' انگریزی جانتے ہو؟ میں نے سرہلا کر انکار کیا۔ ایک نے جھپٹا مار کر میرے کندھے سے سٹین گن اتار لی۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ امریکی سپاہی اُردو نہیں جانتے۔

"پیچھے آؤ بھائیو"—میں نے ذرا اونچی آواز میں عثمان اور عاشق سے کہا۔

"شٹ اَپ یُو باسٹرڈ انڈین!"—ایک سنتری نے میرے سینے پر گھونسے مارتے ہوئے کہا—"انگلش.... سپیک انگلش!"

میں نے سٹین گن کی میگزینیں بھی انہیں دے دیں اور جھولے میں دو گرینیڈ تھے وہ بھی ان کے حوالے کر دیئے اور پھر اشاروں میں بتانا شروع کردیا کہ میں ان کی زبان نہیں جانتا۔ میں دراصل انہیں اپنی طرف متوجہ رکھنے کے لئے اوٹ پٹانگ اشارے کررہا تھا۔ ان میں سے ایک نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے اور زور سے اس طرح گھمایا کہ میری پیٹھ ان کی طرف ہوگئی۔ پیچھے سے اُس نے مجھے بڑی زور سے لات ماری۔ میں منہ کے بل آگے جا پڑا۔

میں جتنی دیر میں ان اٹھا اتنی دیر میں ان دونوں امریکیوں کے سینوں میں خنجر اُتر چکے تھے۔ میری چال کامیاب رہی تھی۔ ان امریکیوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ تربیت یافتہ گوریلوں سے پڑ گیا ہے۔ گوریلوں کا وار اسی قسم کا ہوتا ہے۔ اپنی پاک فوج میں جاکر دیکھیں۔ ایک تجربہ کار فوجی بھی اس طرح وار نہیں کرسکتا جس طرح ایک کم تجربہ کار کمانڈو کرسکتا ہے۔

مجھے عاشق کے متعلق ڈر تھا کہ اُس کا ایک بازو کمزور تھا جسے وہ ٹھیک طرح سے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ یہ حملہ اس طرح ہُوا کہ عثمان اور عاشق نے ان سنتریوں کو اس

طریقے سے نہیں پکڑا تھا کہ پیچھے سے ان کی گردنوں میں بازو ڈال کر دبا دیتے اور پھر پیٹ اور سینے میں خنجر مارتے۔ اس کی بجائے انہوں نے یوں کیا کہ پیچھے سے انہیں کندھے پر اوپر سے نیچے کو خنجر مارا جو ہنسلی اور کندھے کے درمیان سے گزر کر پھیپھڑوں میں چلا گیا۔ عثمان کے لئے یہ طریقہ ٹھیک تھا۔ اس کا بایاں بازو بالکل ٹھیک تھا اس لئے اس نے بائیں ہاتھ میں خنجر لے کر مارا تھا۔ دونوں سنتری یہ وار اپنے جسموں میں لے کر پیچھے کو مُڑے تو میرے ساتھیوں نے خنجر سینوں میں گھونپ دیئے۔ دونوں سنتریوں کی ہلکی ہلکی آوازیں نکلیں اور وہ پاؤں پر کھڑے رہے لیکن تیسری بار خنجر کھا کر دونوں آہستہ آہستہ گرنے لگے۔ وہ جب گر پڑے تو عثمان نے دونوں کی شہ رگ کاٹ دی تاکہ یہ جلدی ختم ہو جائیں۔

میں نے اپنی سٹین گن اور جھولا لے لیا جس میں دو گرینیڈ تھے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں۔ ہم نے وہ بھی لے لیں اور ان کا ایمونیشن بھی لے لیا۔ عثمان نے کہا ان کی گھڑیاں اتار لو جو ہم نے اتار لیں۔ یہ ایک بہت بڑا خطرہ تھا جسے اللہ کی مدد سے ہم نے جلدی ہی راستے سے ہٹا لیا۔ گوریلا اور کمانڈو ایکشن میں سنتری' خصوصاً "گشتی سنتری بہت بڑی رکاوٹ ہُوا کرتے ہیں۔

ہماری پارٹی کو اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے دو گھنٹے انتظار کرنا تھا کیونکہ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دو سو آدمیوں کو کیمپ تک پہنچنا تھا۔ ان کے لئے خاصا وقت درکار تھا۔ انہیں ایک اشارے کا انتظار کرنا تھا۔ اشارہ تھا روشنی راؤنڈ۔ پہلا ہی روشنی راؤنڈ فائر ہونے پر انہوں نے اپنا ایکشن شروع کردینا تھا لیکن یہ راؤنڈ ہماری پارٹی نے فائر نہیں کرنا تھا نہ ہمارے پاس روشنی راؤنڈ ہوتے تھے اور نہ راؤنڈ فائر کرنے والے پستول۔ یہ روشنی راؤنڈ دشمن نے ہی فائر کرنا تھا۔ ہم نے پوسٹ پر ایک خاص طریقے سے حملہ کرنا تھا اور پوسٹ والوں نے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ روشنی راؤنڈ فائر کریں گے۔ یہ اشارہ ملتے ہی ہمارے دو سو ساتھیوں نے اپنا ایکشن شروع کردینا تھا۔

○

انتظار والی جگہ پر پہنچے' تو عثمان نے منہ سے مینڈک کی آواز نکالی۔ ہم وہیں رک گئے اور عثمان اپنی پارٹی کے ہر مجاہد کو دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ وقت بہت تھا' دو گھنٹے انتظار کرنا تھا۔

عثمان خاصا وقت لگا کر واپس آگیا۔ تمام آدمی اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے تھے۔ ہم بار بار گھڑیاں دیکھتے تھے۔ ہمارے پاس ریڈیم والی گھڑیاں تھیں جن کا وقت رات کی تاریکی میں نظر آجاتا ہے.... خدا خدا کر کے پورے دو گھنٹے گزر گئے۔ ہم اٹھے اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگے۔ اندھیرے میں بھی دشمن کی پوسٹیں نظر آنے لگیں۔ دونوں پوسٹیں دریا کے کنارے پر تھیں اور یہ کنارے ریتلے نہیں تھے بلکہ بڑی مضبوط مٹی اور چٹانوں جیسے پتھروں کے تھے اور ان کے ساتھ مشین گن پوسٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ہم سمجھ نہ سکے کہ گورا رجمنٹ نے بھی یہیں پوسٹیں بنائی تھیں اور امریکیوں نے بھی وہی جگہیں موزوں سمجھیں۔ غالباً" وہ پُل کو اپنے قبضے میں اور اپنی حفاظت میں رکھنا چاہتے تھے۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ جب سے یہ امریکی بٹالین آئی تھی' اُس نے پُل کو فوجی مقاصد کے لئے ریزرو کر لیا تھا اور شہریوں کو اس پل سے لاتعلق کر دیا تھا۔ شہری بڑی دور کا چکر کاٹ کر ایک اور پل سے آتے جاتے تھے۔

یوں تو ہر انڈونیشی جوان شجاعت میں اپنی مثال آپ ہی تھا لیکن ہماری پارٹی کے دو انڈونیشی غیر معمولی طور پر بہادر اور دلیر تھے۔ ہم جانتے تھے کہ یہ دونوں اپنے مشن پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ ان کا مشن یہ تھا کہ دریا کے کنارے رینگتے ہوئے پوسٹوں تک پہنچنا تھا اور پوسٹوں کے اندر گرینیڈ پھینکنے تھے۔ پھر ہم نے ہلّہ بولنا تھا۔ دونوں پوسٹوں میں نفری پندرہ پندرہ سولہ سولہ جوانوں کی تھی۔ دونوں پوسٹوں میں دو بڑی مشین گنیں تھیں۔ باقی سب رائفلیں' ہلکی مشین گنیں اور سٹین گنیں تھیں۔ گرینیڈوں کا شاک تو لازماً" ہوگا۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ پوسٹیں آگ اگلنے والی چٹانیں تھیں۔ اُن پر سامنے سے کھلا حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے جن دو نو انڈونیشی حریت پسندوں کی شجاعت کا ذکر کیا ہے' وہ اپنے مشن پر چلے گئے تھے۔ ہم نے انہیں دیکھا تو نہیں لیکن تصوّر کی آنکھ سے وہ دریا کہ کنارے کنارے پیٹ اور گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے اپنے ٹارگٹ کی طرف جا رہے تھے۔

ایسے مشن میں وہی کامیاب ہو سکتے ہیں جو یہ حقیقت قبول کر کے آگے جاتے ہیں کہ زندہ واپس نہیں آنا۔

انتظار کا ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر ہُوا جا رہا تھا۔ آخر دونوں پوسٹوں کے اندر ایک ایک گرینیڈ کا دھماکہ ہُوا۔ یہ گرینیڈ ہمارے ان دو جری اور بے خوف

انڈونیشی جوانوں نے پیچھے سے پوسٹ کے قریب جا کر اندر پھینکے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ان گرینیڈوں نے پوسٹ کے اندر کی آدھی سے زیادہ نفری کو ہلاک اور شدید زخمی کر دیا ہوگا پھر بھی دونوں پوسٹوں سے مشین گن کا فائر شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پوسٹ سے روشنی راؤنڈ فائر ہوا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پوسٹوں کے اندر ابھی کچھ جوان زندہ ہیں۔

مشین گنوں کی نالیوں سے گولیاں نکلتی تھیں تو وہاں شرارے پیدا کرتی تھیں جن سے ان کی نشاندہی ہو رہی تھی۔

ہم سب پلان کے مطابق چٹانوں اور ٹیکریوں کی اوٹ میں آگے بڑھے۔ اتنے میں دونوں پوسٹوں میں ایک ایک گرینیڈ اور پھٹا اور پھر پوسٹیں خاموش ہو گئیں۔ ہم نے دریا کے کنارے جا پوزیشنیں لیں۔ ہم جانتے تھے اب کیا ہوگا۔

سب کام ہمارے پلان کے مطابق ہو رہے تھے۔ پوسٹوں میں گرینیڈوں کے دھماکوں اور مشین گنوں کے فائر سے دریا کے پار امریکی بٹالین جاگ اٹھی اور وہاں ہڑبونگ بپا ہو گئی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس بٹالین کی ایک کمپنی پوسٹوں کی طرف آئی یا دو کمپنیاں' وہ جتنی نفری بھی تھی ہم اس کے منتظر تھے۔

پُل پر امریکی میرین فورس کی خاصی نفری دوڑتی نظر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پُل پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا جو پوسٹوں کی طرف اڈا آرہا تھا۔ ہم کنارے پر منتظر بیٹھے تھے۔ جب دیکھا کہ ہجوم خاصا زیاہ ہو گیا ہے تو ہم نے اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے۔ میرے کچھ ساتھی پُل سے آگے کنارے پر پوزیشنیں لئے ہوئے تھے۔ دونوں طرفوں سے فائر کھلا تو امریکی ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ چیخنے چلّانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس ہجوم میں سے کچھ لوگ آگے کی طرف دوڑے اور کچھ واپس دوڑ پڑے۔ ہم نے فائر جاری رکھا۔

پوری بٹالین اور اس کے آفسروں کی توجہ پوسٹوں کی طرف ہو گئی اور پُل پر آنے والوں پر جو فائرنگ ہوئی' اس نے سب کی توجہ اپنی طرف کر لی۔

وہاں بجلی کی روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ قصبوں اور شہروں میں بجلی کی روشنی ٹھیک ٹھاک سب کو ملتی تھی لیکن فوجیوں کی بیرکیں بجلی سے محروم تھیں۔ امریکیوں نے اس قدر روشنی راؤنڈ فائر کر دیئے کہ درختوں اور گھاس کا پتا پتا نظر آنے لگا۔

ہمارے دو سو مجاہدین نے اس ہڑبونگ اور بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کیمپ

کے ارد گرد جو تار بچھائی گئی تھی وہ کئی جگہوں سے کاٹ دی اور کیمپ میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے عقب سے امریکیوں پر فائر کھول دیا۔ وہ خیموں اور بارکوں کی آڑ سے فائر کرتے تھے۔

امریکہ کی میرین فورس اُس وقت بھی شہرت یافتہ تھی اور آج بھی اس کی شہرت ویسی ہی ہے۔ بعض لوگ اسے کریک فورس بھی کہتے ہیں مگر اس کریک فورس کے لئے مجاہدین نے ایسی صورتِ حال پیدا کردی تھی کہ جم کر لڑنے کے لئے بٹالین کو منظم کرنا محال ہوگیا تھا۔ انڈونیشی حریت پسندوں کا یہ شب خون بڑا ہی کارگر اور امریکیوں کے لئے ظالمانہ تھا۔

گوریلا کمانڈروں کو کیمپ کے نقشوں پر بتا دیا گیا تھا کہ اسلحہ اور ایمونیشن کا سٹور کہاں ہے۔ اس کے لئے الگ پارٹی تھی جسے اس کا کمانڈر وہاں لے گیا۔

وہ ایک بارک تھی جس کے دروازے لوہے کے تھے اور ان پر بڑے بڑے تالے لگے ہوئے تھے۔ اس بارک میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی روشن دان۔

امریکی سمجھ گئے تھے کہ یہ گوریلوں کا شب خون ہے۔ پوری ایک کمپنی نے اسلحہ بارود کے سٹوروں کو اپنے حصار میں لے لیا۔ انڈونیشی گوریلوں نے اُن پر فائر کیا مگر امریکیوں کا فائر بھی کچھ کم کارگر نہ تھا۔ امریکیوں کی کوشش تھی کہ ان سٹوروں تک گوریلے نہ پہنچیں اور اگر وہ اسلحہ اور ایمونیشن اٹھا کر لے جائیں گے تو ان ہی کے خلاف استعمال کریں گے۔

ایک جگہ بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کی چابیاں تو ان کے ساتھ نہیں تھیں کہ گوریلے ان کو چلا کر لے جاتے۔ ایک مجاہد نے یہ کمال کر دکھایا کہ ایک بڑے ٹرک کا سٹارٹنگ سوئچ توڑ کر تار ملا دیئے اور ٹرک سٹارٹ کرلیا۔ گوریلوں میں کچھ ڈرائیور بھی تھے۔ اس ڈرائیور نے اپنی زبان میں پکار پکار کر کہا کہ جو ساتھی گاڑیاں چلا سکتے ہیں وہ آجائیں۔ چار انڈونیشی آگئے۔ اس نے چار ٹرک سٹارٹ کردیئے اور انڈونیشی گوریلے یہ ٹرک لے گئے۔

پلان کے مطابق گوریلے زیادہ دیر نہ رکے۔ انہیں صرف آدھا گھنٹہ وقت دیا گیا تھا' اس کے بعد انہیں وہاں سے نکلنا تھا۔ چنانچہ وہ فرداً فرداً وہاں سے نکلے اور جنگل میں غائب ہوتے گئے۔

ہمارا مشن ختم ہوچکا تھا۔ ہمارے کمانڈر عثمان نے ہمیں اکٹھا کیا اور ہم دریا کی طرف چلے گئے جہاں کشتیاں ہماری منتظر تھیں۔ ہم کشتیوں میں بیٹھے اور ملاحوں نے ہمیں دوسرے کنارے تک پہنچا دیا۔ ہمارا کوئی ایک بھی ساتھی شہید یا زخمی نہیں ہُوا۔

ہماری پارٹی سب سے پہلے سورابایا اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچی۔ کیمپ پر حملہ کرنے والی پارٹی کچھ دیر بعد واپس آئی۔ وہ ساری پارٹیاں امریکیوں کے ٹرکوں پر آئی تھیں اسی لئے دیر سے پہنچی تھیں کیونکہ جس علاقے سے وہ گزر کر آئی تھیں اس علاقے میں ٹرک مشکل سے ہی آگے بڑھ سکتا ہے۔ پھر بھی وہ ٹرک لے کر ہی آئے۔ وہ پارٹیاں اسلحہ اور ایمونیشن کے سٹوروں تک نہیں پہنچ سکی تھیں لیکن چار ٹرک لے آئی تھیں۔ گوریلوں کی اس دو سو نفری میں سے پندرہ جوان شہید ہوگئے تھے اور زخمی تیس کے لگ بھگ تھے۔ لاشیں تو نہ اٹھائی جاسکیں' زخمیوں کو ساتھ لے آئے۔

اگلے روز انڈونیشی انٹیلی جنس نے اطلاع دی کہ امریکی میرین بٹالین کے تقریباً" پانچ سو جوان مارے گئے ہیں جن میں تین افسر بھی شامل تھے۔ زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس لحاظ سے ہمارا آپریشن سو فیصد کامیاب ہُوا تھا۔

○

اس اتنی بڑی نفری کا شب خون کسی اور مقصد کے لئے مارا گیا تھا۔ میں یہ مقصد پہلے بیان کرچکا ہوں۔ ایک بار پھر بتا دیتا ہوں کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ اور برطانیہ پر ایسا وار کیا جائے کہ وہ اس خوش فہمی سے نکل آئیں کہ انڈونیشی مسلمان کمزور ہوگئے ہیں اور جلد یا بدیر ان کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے۔ ہم اس مقصد میں کامیاب ہوگئے تھے۔

ناسوشن نے ہم سب کو اکٹھا کر کے خراجِ تحسین پیش کیا تھا اور یہ اُس کے الفاظ تھے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہیں اور اب اقوامِ متحدہ' امریکہ اور برطانیہ ہمارے مستقبل کے بارے میں بات کرنے سے پہلے کئی بار سوچ لیا کریں گے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ آٹھ لڑاکا بمبار ہوائی جہازوں کا نقصان امریکہ کے لئے کچھ بھی نہیں مگر یہ نقصان ان لوگوں کے ہاتھوں ہُوا جنہیں امریکہ بہت کمزور سمجھتا تھا۔

ناسوشن اسی روز واپس جکارتہ چلا گیا۔ دوسرے افراد کی جو مختلف گوریلا پارٹیاں آئی تھیں' وہ بھی چلی گئیں۔ عثمان بہت ہی خوش تھا کہ اس کی عزت بڑھ گئی ہے اور کامیابی کا

سہرا اس کے ہیڈ کوارٹر کے سر ہے۔

میں بتا نہیں سکتا کہ میری اس داستان یا سفرنامے یا آپ بیتی کا یہ حصہ قارئین کرام پسند کر رہے ہیں یا نہیں لیکن میں اس حصے کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ میں یہ داستان پڑھنے والوں کو چسکے کی خاطر نہیں سنا رہا۔ آج دیکھ لیں کہ صلیبی اقوام کس بے دردی سے مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہی ہیں اور بعض اسلامی ممالک کو انہوں نے اپنی فریب کارانہ چالوں سے غلام بنا لیا ہے۔ انہوں نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ کمیونزم کے بعد ہمیں اسلام سے خطرہ ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ غیر مسلم اقوام اسلام کی بیخ کنی کر رہی ہیں۔ عرب وہ مقدّس خطّہ ارض ہے جہاں سے اللہ کا یہ عظیم دین جلوہ افروز ہوا تھا مگر آج یہ خطّہ امریکہ کو اپنا خدا بنا بیٹھا ہے۔ اس خطّے پر یہودیوں کا آسیب طاری ہو چکا ہے۔

اگر آج مسلمان انڈونیشی حریت پسندوں والا جذبہ اور ملّی غیرت اپنے اندر پیدا کر لیں تو ان صلیبی اقوام کی ہیبت ناک جنگی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ اسلام ایک ایسی قوت ہے جسے کمزور کرنا ہے۔ اگر ہم مسلمان یہ عقیدہ اپنے دل پر نقش کر لیں کہ اسلام واقعی ایک قوت ہے اور ہماری طاقت اسلام ہی ہے تو اسلام کا بول بالا ہو سکتا ہے اور ہم صلیبی اقوام کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔

میں نے آپ کو دکھا دیا ہے کہ انڈونیشی حریت پسندوں نے امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کا منہ پھیر دیا تھا۔ آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ انڈونیشی حریت پسندوں کی اصل قوت کیا تھی.... اسلام' اتحاد' لیڈروں کا خلوص اور ایک مقدّس نصب العین.. .. نہ کوئی سیاسی گروہ تھا نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا۔ سب مسلمان تھے اور حریت پسند!

میں آج اس داستان کو لپیٹ اور سمیٹ رہا ہوں۔ میں نے شجاعت اور حُبّ الوطنی کی دیوانگی کے چند ایک واقعات سنائے ہیں جن کا میں عینی شاہد ہوں۔ جنگِ آزادی کے دوران انڈونیشیا میں معجزہ نما کارنامے ہوئے تھے۔ عالم اسلام ان سے بے خبر رہا اور ساری دنیا بے خبر رہی۔ وجہ یہ تھی کہ انڈونیشیا والوں کے پاس ذرائع ابلاغ نہیں تھے۔ تمام تر عالمی میڈیا اور ذرائع ابلاغ یعنی اخبار' رسالے اور ریڈیو وغیرہ امریکیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں میں تھے۔ ساری دنیا برطانیہ کے نشریاتی ادارے بی بی سی اور وائس آف امریکہ کو سنتی تھی۔ جرمنی اور فرانس کے نشریاتی ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں بھی امریکہ اور

برطانیہ کی طرح انڈونیشیا کے حریت پسندوں کا بلیک آؤٹ کرتی تھیں اور امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں کو خراج تحسین پیش کرتی تھیں کہ یہ فوجیں انڈونیشیا سے بدامنی ختم کر رہی ہیں۔

میں نے بتایا ہے کہ انڈین آرمی کے بے شمار مسلمان جوان انڈونیشی حریت پسندوں سے جا ملے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی ملیں تو وہ آپ کو ان واقعات سے کہیں زیادہ حیران کن واقعات سنائے گا جو میں سنا چکا ہوں لیکن دنیا والوں کو ان کی خبر نہ ملی۔ میں نے بے شمار واقعات سنے تھے لیکن ان سب کو اپنی داستان میں شامل کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسا صرف ایک واقعہ سناؤں گا۔

یہ واقعہ سنانے والا انڈین آرمی کا ایک مسلمان فوجی تھا۔ ناسوشن کانفرنس کے موقع پر دوسو نفری کی جو گوریلا فورس آئی تھی' ان میں بیس انڈین آرمی کے بھگوڑے مسلمان بھی تھے۔ اتفاق دیکھئے کہ ان میں ایک لانس نائیک جمیل تھا جو میرے ہی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو میں نے اس کا ذکر پہلے بھی کیا ہے۔ جمیل کے ساتھ میری ملاقات ڈیڑھ پونے دو سال پہلے کوالالمپور میں ہوئی تھی۔ وہ اُس گاؤں کا رہنے والا تھا جس گاؤں میں واجدہ بیاہی گئی تھی۔ آصف اس کا خاوند تھا۔ مجھے امید ہے کہ آپ آصف کو نہیں بھولے ہوں گے۔ وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا تھا اور میں نے برما فرنٹ سے اُسے ایسی زخمی حالت میں اُٹھایا اور پیچھے بھجوایا تھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔ آپ یہ واقعہ اس داستان کے پچھلے کسی باب میں دیکھ لیں اور جمیل نے آصف اور واجدہ کی جو باتیں مجھے سنائی تھیں وہ بھی پچھلے ایک باب میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ (حکایت سالنامہ 1996ء ماہ فروری)۔

جمیل میرے پاس دو تین راتیں رہا تھا اور ہم پوری پوری رات بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ جب انڈونیشیا میں آیا تو اسے ایک دور دراز علاقے کی پارٹی میں بھیج دیا گیا تھا۔ اُس نے اپنے کچھ مشن سنائے۔ وہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان واقعات سے ملتے جلتے ہیں جن میں سے میں کچھ آپ کو سنا چکا ہوں۔ اس نے تین مہینے پہلے کا ایک مشن سنایا تو میں کچھ دیر اُس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے پیچھے ایک باب میں لکھا تھا کہ میرین فورس امریکہ کے بحری جہازوں میں آئی تھی۔ اور جنگی بحری جہاز تھے جو بڑے ہی قیمتی اور سمندری جنگ میں بڑے کار آمد

اور دہشتناک ہوتے ہیں۔

جمیل نے سنایا کہ تین مہینے پہلے جب انڈونیشی لیڈروں کو فائر بندی پر آمادہ کرنے کے لئے اقوام متحدہ نے سفارتی سطح پر زور دینا شروع کیا تو دوسری طرف اتحادیوں نے اپنی جنگی کارروائیاں تیز کردیں تاکہ انڈونیشی لیڈروں کو خوفزدہ کیا جاسکے۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' انڈونیشی لیڈروں نے بڑی زبردست جوابی کارروائیوں کا پروگرام بنالیا۔ امریکہ کے یہ بحری جنگی جہاز انڈونیشیا کے ایک جزیرے بالی کے ساحل پر لنگر انداز تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے دور دور لنگر انداز کیا گیا تھا۔ ان میں سے جو سب سے بڑا تھا وہ ساحل سے کچھ دور لنگر انداز تھا۔

امریکہ کو معلوم تھا کہ ان بحری جہازوں کے لئے کوئی خطرہ نہیں کیونکہ انڈونیشیا والوں کے پاس ائیر فورس تو تھی نہیں نہ ان کے پاس بحری طاقت تھی۔ انڈونیشی لیڈروں نے ہیڈ کوارٹر میں یہ پلان بنایا کہ ان بحری جہازوں میں سے ایک تباہ کرکے ڈبو دیا جائے۔ یہ کام انسانوں نے کرنا تھا اور بظاہر یہ کام مشکل تھا' ناممکن کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

چند ایک تیراک چُنے گئے۔ جمیل نے بھی اپنا نام دے دیا۔ وہ اپنی بٹالین میں تیراکی کے مقابلوں میں شامل ہُوا کرتا تھا۔ آخر چار تیراک منتخب کئے گئے جن میں ایک جمیل بھی تھا۔

ان چاروں کو سمندر میں کشتیوں پر لے جا کر بار بار اتارا گیا اور خُوب مشق کرائی گئی۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ بحری جہاز کو کس طرح تباہ کرنا ہے۔ آخر ایک روز ایک بادبانی کشتی میں چاروں کو بٹھایا گیا۔ وقت رات کا تھا۔ انہیں وہ لباس پہنایا گیا جس کے ساتھ آکسیجن سلنڈر بھی ہوتا ہے اور تیراک کے سر اور منہ پر ماسک چڑھا ہوتا ہے' آنکھوں کے آگے شیشے ہوتے ہیں اور سلنڈر سے آکسیجن اس ماسک میں جاتی رہتی ہے اور تیراک خاصی دیر سمندر میں رہ سکتا ہے۔

انہیں موٹر بوٹ یا لانچ میں بھیجا جاسکتا تھا لیکن رات کے وقت اس کے انجن کی آواز اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دور سے سنائی دیتی ہے اور اگر یہ استعمال کی جاتی تو بحری جہاز والے دور سے معلوم کرلیتے اور اسے پکڑ سکتے تھے۔ بادبانی کشتی کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔

انہیں بارودی سرنگیں دی گئیں۔ یہ مقناطیسی سرنگیں ہوتی ہیں۔ ایک ایسی

بارودی سرنگ بحری جہاز کے نیچے یعنی اس حصے کے ساتھ چپکا دی جائے جو پانی میں ہوتا ہے تو مقناطیس کی وجہ سے الگ نہیں ہوتی۔ اس کا وقت سیٹ کردیا جاتا ہے۔ جو تیراک یہ سُرنگ کسی بحری جہاز کے نیچے چپکاتا ہے وہ اتنا وقت سیٹ کرتا ہے کہ خود وہاں سے دُور کسی محفوظ مقام تک جاسکے۔

سمندر کے اس تھوڑے سے حصے میں جہاں وہ بحری جہاز ساحل سے دور دوسرے جہازوں کے ساتھ کھڑا تھا' اُس زمانے میں شارک مچھلیاں بھی ہوتی تھیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ شارک مچھلی کس قدر خونخوار ہوتی ہے۔ یہ وہیل مچھلی تک پر حملہ کردیتی ہے۔ ان چاروں تیراکوں کو معلوم نہیں تھا کہ وہاں شارک مچھلیوں کا خطرہ ہے پھر بھی انہوں نے پرواہ نہ کی اور کہا کہ سُرنگ جہاز کے ساتھ لگ جائے پھر وہ مر بھی جائیں تو کوئی بات نہیں۔

رات کے وقت ان چاروں کو بادبانی کشتی میں بٹھا کر اور سرنگیں دے کر اللہ حافظ کہہ دیا گیا۔ کشتی دُور کا چکّر کاٹ کر مطلوبہ مقام تک پہنچی اور بادبان لپیٹ لئے گئے۔ کشتی کو بحری جہاز کے قریب نہیں لانا تھا بلکہ دُور کھڑا کرنا تھا۔

چاروں تیراک ایک ایک سرنگ اپنے جسموں سے باندھ کر کشتی سے اُترے۔ وہاں سے بحری جہاز کم و بیش ایک میل دور تھا۔ جمیل نے بتایا کہ رات کے وقت وہ سائے کی طرح صاف نظر آرہا تھا۔

چاروں تیراک دیئے گئے ٹارگٹ کی طرف تیرنے لگے۔ جب وہ بحری جہاز کے قریب پہنچے تو ڈبکی لگا گئے اور عین اُس وقت انہیں پتہ چلا کہ ایک شارک مچھلی ان کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔ انہوں نے پرواہ نہ کی اور سمندر کے اندر اندر تیرتے ہوئے بحری جہاز تک پہنچ گئے اور سُرنگیں ان جگہوں پر چپکا دیں جو انہیں پہلے ہی سمجھا دی گئی تھیں۔

بحری جہاز کی ایک میگزین ہوتی ہے جس میں گولہ بارود سٹور کیا جاتا ہے۔ یہ پھٹ جائے تو بحری جہاز دو ٹکڑوں میں کٹ جاتا ہے یا فوراً ڈوب جاتا ہے۔ ایک سُرنگ میگزین کے مقام پر چپکائی گئی۔ انہوں نے پانی کے نیچے نیچے ٹائم سیٹ کرلیا جو وہ اندھیرے میں کرسکتے تھے۔

اتنے بڑے اور لمبے بحری جہاز کے ساتھ چار مقناطیسی سُرنگیں چپک گئیں اور جہاز

والوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ چاروں سمندر کے نیچے نیچے واپس تیرنے لگے۔ جمیل نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ تیرنے والے نے اس کا ایک بازو پکڑ لیا ہے پھر اس طرح ہُوا کہ وہ انڈونیشی جمیل کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ رہا تھا اور صاف پتہ چل رہا تھا کہ کوئی چیز اُسے پیچھے کو کھینچ رہی ہے۔ پھر اس انڈونیشی کا ہاتھ جمیل کے بازو سے اُکھڑ گیا۔ جمیل نے کسی نہ کسی طرح محسوس کر لیا کہ اس بد قسمت انڈونیشی کو شارک نے پکڑ لیا تھا۔

وہ کشتی تک پہنچ گئے اور ملاحوں نے ان کے ہاتھ پکڑ کر انہیں کشتی میں سوار کرایا لیکن اب وہ چار نہیں بلکہ تین تھے۔ وہاں وہ اپنے اس ساتھی کو پکار نہیں سکتے تھے' وہ تو سمندر سے اُبھرا ہی نہیں تھا۔

انہوں نے کچھ دیر انتظار کیا لیکن وہ زیادہ دیر وہاں رُک نہیں سکتے تھے کیونکہ سرنگیں پھٹنے میں تھوڑا سا ہی وقت باقی تھا۔ اس صورت میں کشتی دُور سے نظر آسکتی تھی۔ آخر وہ چل پڑے۔ جمیل کو پورا پورا یقین تھا کہ ان کے اس ساتھی کو شارک مچھلی لے گئی ہے۔

کشتی جب خاصی دُور نکل گئی تو سمندر میں اس قدر زوردار دھماکہ ہُوا کہ سمندر کی ایک لہر چند سیکنڈ بعد کشتی سے آ ٹکرائی۔ کشتی ڈول گئی۔ ان حریت پسندوں نے بحری جہاز کی طرف دیکھا۔ جہاز کو آگ لگ گئی تھی۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ میگزین پھٹ گئی تھی اور ایک سُرنگ اس جگہ لگائی گئی تھی جہاں بحری جہاز کے تیل کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ اس جہاز کو اب ڈوبنا ہی تھا۔

یہ ایک بہت بڑی ضرب تھی جو امریکہ کے سر پر پڑی اور امریکہ والے یقیناً" مان گئے ہوں گے کہ انڈونیشی مسلمانوں کو دبا لینا ممکن نہیں۔ اس بحری جہاز کو ڈبونے کا مقصد یہی تھا۔

○

امریکہ کی میرین بٹالین کے کیمپ پر شب خون مارنے کے پندرہ دن بعد یوں ہُوا جیسے اچانک اس سارے منظر پر ایک پردہ گر پڑا ہو اور اب جو پردہ اٹھا تو کوئی اور ہی منظر سامنے آگیا.... انڈونیشیا آزاد ہو گیا تھا۔ تاریخ تھی 27 دسمبر 1949ء۔ دنیا ہی بدل گئی۔ میں یہ بیان کر کے آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا کہ انڈونیشیا کے مسلمانوں نے کس طرح خوشیاں منائیں اور کس طرح جشن برپا کئے۔ ہم جو انڈین آرمی کے بھگوڑے ہو کر

ان کے پاس گئے تھے ان کے لئے فرشتے بن گئے۔ ہمیں وہ اس طرح گلے سے لگاتے اور دباتے تھے جیسے پسلیاں ہی توڑ ڈالیں گے۔ بڑی عمر کی عورتیں ہمارے سر اور ماتھے چُومتی تھیں۔ ہر کسی کے چہرے پر آزادی کی خوشی کا جلال تھا۔ بڑی عمر کے آدمیوں اور عورتوں کی آنکھوں میں آنسو تھے' یہ خوشی کی انتہا کے آنسو تھے۔ لیکن یہ آنسو ان بیٹوں کی یاد میں بھی بہہ رہے تھی جو جنگِ آزادی میں شہید ہو گئے تھے۔

آج مجھے وہ سارے مناظر اور جشن اور انڈونیشی مسلمانوں کا پیار یاد آرہا ہے لیکن یہ میرے جذبات ہیں' انہیں مجھ تک ہی رہنے دیں۔ میں اتنی سی بات کہوں گا کہ انڈونیشیا کی آزادی ضربِ کلیم کا کرشمہ تھی۔

ہم جو انڈین آرمی سے وہاں گئے تھے' انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ بلائے گئے اور احمد سوئیکارنو جو آزاد انڈونیشیا کا پہلا صدر بنا تھا' ہمیں خاص طور پر ملا اور اُس نے ہمارے اعزاز میں جشن بھی منایا اور باقاعدہ ہمارا جلوس بھی نکلوایا تھا تاکہ انڈونیشی قوم دیکھ سکے کہ کہاں کہاں کے رہنے والے مسلمان کیسے کیسے خطرے قبول کر کے ان کے ساتھ آن ملے تھے۔

میں اب واپس اپنے وطن آنا چاہتا تھا لیکن فوری طور پر کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ سمندر کے راستے ہی آنا تھا لیکن یہ ابھی ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے یہ انتظام انڈونیشی حکومت کے کرنے والا تھا۔ عثمان مجھے جکارتہ سے واپس سورابایا اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے مجھ پر زور دینا شروع کر دیا کہ میں اب ہمیشہ کے لئے وہیں رہوں۔ وہ کہتا تھا کہ میں کسی بھی لڑکی کو پسند کروں وہ میری شادی اس لڑکی کے ساتھ کروا دے گا لیکن مجھے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ اپنے والدین اور بہن بھائی یاد آرہے تھے۔ والدین کے متعلق میں پریشان تھا کہ وہ نہ جانے کس حال میں جی رہے ہوں گے۔ وہ تو مجھے یقیناً مرا ہُوا سمجھ چکے ہوں گے۔

آزادی کے اعلان کے اگلے ہی روز آمنہ کا باپ ہمارے پاس آیا اور عاشق علی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اُس نے صاف بتلایا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے عاشق علی سے کہا تھا کہ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تو وہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے ساتھ کرے گا۔ انڈونیشیا آزاد ہو گیا تھا اور آمنہ عاشق علی کی محبت میں تڑپ رہی تھی۔

چند دنوں بعد آمنہ کا باپ پھر آیا۔ اُس نے مجھے اور عثمان کو دعوت دی کہ اُس کی

بیٹی اور عاشق علی کی شادی پر آئیں۔ ہمارے لئے یہ خوشی کا موقع تھا۔ ہم شادی کے دن وہاں پہنچ گئے۔ بڑی سادگی سے ان کا نکاح ہُوا اور جو چند ایک مہمان مدعو کئے گئے تھے' انہیں بڑی پُرتکلف ضیافت دی گئی۔

میں نے عاشق علی سے کہا کہ اب واپسی کا پروگرام بناتے ہیں لیکن عاشق علی نے اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ اب انڈونیشیا کو ہی اپنا وطن بنائے گا۔ آمنہ کے باپ نے بھی اسے کہا تھا کہ وہ یہیں رہ جائے۔

عاشق علی نے جو فیصلہ کیا تھا وہ ٹھیک کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم دیہاتی لوگ ہیں اور ہماری تہذیب' ہمارا کلچر اور ہمارے لوگ بالکل ہی مختلف ہیں۔ جانے وہ آمنہ کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آمنہ وہاں جا کر پچھتانے لگے کہ یہ محبت تو بہت مہنگی پڑی۔ میں نے اُس کی تائید کی اور اس کا فیصلہ پوری طرح پکا کر دیا۔

ایک عاشق علی ہی نہیں بلکہ بہت سے ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان انڈونیشیا میں ہی ہمیشہ کے لئے آباد ہو گئے تھے۔ میں اپنے آپ کو وہاں تاعمر رہنے پر آمادہ نہ کر سکا پھر بھی مجھے تین سال وہاں رہنا پڑا۔ میں وہاں کیسے رہا' کیا کرتا رہا' ان باتوں کو چھوڑیئے۔ یہ میرے ذاتی معاملات تھے اور میں کوئی ایسا بڑا لیڈر یا جرنیل نہ تھا کہ پڑھنے والے میری ان ذاتی باتوں میں بھی دلچسپی رکھتے ہوں گے۔

آخر وہ دن آگیا جب میں جکارتہ جا کر ایک بحری جہاز میں سوار ہُوا۔ اخراجات انڈونیشی حکومت نے ہمارے سفارت خانے کی معرفت مجھے دیئے تھے۔ اس جہاز نے ڈیڑھ ماہ بعد مجھے کراچی کی بندرگاہ پر اُتارا اور میں جو ایک آزاد ملک سے آیا تھا اپنے آزاد ملک میں داخل ہُوا۔

○

میں نے کراچی سے دور اوپر شمال میں اپنے قصبے تک سفر کے دوران کیا کیا دیکھا' یہ لکھنے لگوں تو ایک کتاب لکھ ڈالوں لیکن اتنا ہی کہوں گا کہ مجھے مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ قوم کا وہ اتحاد جس نے پاکستان بنایا تھا' ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ درجنوں سیاسی پارٹیاں بن چکی تھیں اور اسلام کئی ایک فرقوں میں بٹ گیا تھا۔ صرف یہ خوشی حاصل ہوئی کہ اب ہم آزاد ہیں لیکن قوم اخلاقی قدروں سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ قوم تو ایک لفظ ہے' پاکستانی ایک قوم رہے ہی نہیں تھے۔

میں مزید کوئی اظہارِ خیال نہیں کروں گا نہ کوئی اور رائے دوں گا کیونکہ میں وہی کہوں گا جو پہلے ہی آپ کے دل میں ہے اور آپ خود محسوس کر رہے ہیں۔ میں ایک دلچسپ بات سنا کر اس داستان کو سمیٹ دیتا ہوں۔

میں جب اپنے قصبے میں پہنچ کر اپنی گلی میں داخل ہُوا تو وہ آدمی اور وہ عورتیں جو مجھے دُور سے ہی پہچان لیا کرتی تھیں' مجھے دیکھ کر حیرت زدہ ہو کے رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں زندہ واپس آگیا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے بعض محلّے داروں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ میں ان کے ایک محلّے دار کے بالکل مشابہ ہوں جو برما فرنٹ پر مارا گیا تھا۔ بعض نے تو میرے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے مجھے میری بدروح سمجھ لیا ہو اور دیکھ رہے ہوں کہ میں ابھی غائب ہو جاؤں گا۔

اپنے گھر میں داخل ہُوا تو میری والدہ اور بہن نے چونک کر دیکھا جیسے کوئی اجنبی کوئی غیر مرد بھولے بھٹکے ان کے گھر میں آگیا ہو۔ بڑی مشکل سے انہیں یقین آیا کہ میں زندہ اور سلامت ہوں اور میں اپنی روح یا بدروح نہیں ہوں۔ پھر آپ ان ماں باپ کی خوشیوں کا اندازہ کر ہی سکتے ہوں گے جنہیں گم شدہ بچہ ایک مدت بعد صحیح سلامت مل گیا ہو۔

"میں تمہیں سب سے پہلے پیر صاحب کے پاس لے جاؤں گا" — میرے والد صاحب نے کہا — "میں نے اُن کی بہت خدمت کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ تمہارا بیٹا آ جائے گا"۔

ہمارے گھر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ سب حیران تھے اور میرے والدین کو مبارک دیتے تھے کہ اللہ نے مجھے نئی زندگی دے کر واپس گھر بھیج دیا ہے۔

اگلے روز صبح والد صاحب مجھے پیر کے پاس لے جانے کے لئے تیار ہوئے اور مجھے بھی تیار کیا۔ یہ پیر صاحب میرے فوجی دوست حمید کے گاؤں میں رہتے تھے۔ میری اس داستان کا تیسرا باب پڑھ لیں تو آپ کو اس پیر کی ساری باتیں یاد آجائیں گی (حکایت شمارہ اکتوبر 1994ء)۔ میں نے والد صاحب کو یہ نہ بتایا کہ میں اس پیر کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان کا دل رکھنے کے لئے میں ان کے ساتھ چلا گیا۔ راستے میں والد صاحب مجھے بار بار یہ ہدایت دیتے تھے کہ پیر صاحب کے پاؤں اور گھٹنے چھُونا اور ان کے آگے سر اور نظریں جھکا کر رکھنا' ذرا سی بھی بدتمیزی نہ ہو۔

آخر ہم پیر صاحب کے حضور پہنچ گئے۔ یہ وہی پیر تھا جسے میں نے اور حمید نے ننگا کر کے اور درخت کے ساتھ باندھ کر اتنا پیٹا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور معلوم نہیں وہ زندہ کس طرح رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں اور ایک دو جنات باغی ہو گئے تھے اور انہوں نے اسے پیٹا ہے۔ بہتر ہے آپ یہ باب پڑھ لیں۔

میں نے پیر کے پاؤں بھی چھوئے اور گھٹنے بھی چھوئے اور سر جھکایا اور اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ میرے والد صاحب پیچھے بیٹھ گئے۔ میں دنیا کا اور خصوصیت سے اسلام کا حقیقی پہلو دیکھ کر آیا تھا۔ اس پیر کو میں ایک شیطان سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا تھا۔ میں اُس کی آغوش میں جھک گیا۔

"جناب پیر صاحب!" — میں نے سر جھکائے ہوئے سرگوشی کی — "تم مجھے جانتے ہو اور میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم میرے باپ کو یہ کہہ کر لوٹتے رہے ہو کہ تمہارا بیٹا آ جائے گا۔ میں تمہارا پردہ نہیں اٹھاؤں گا' یہ خیال رکھنا کہ میرے ساتھ کوئی بدمعاشی نہ ہو"۔

"نہیں ہو گی یار!" — پیر نے کہا — "تم بھی ذرا زبان بند رکھنا۔ کبھی دوستوں کی طرح ہی آ جایا کرنا۔"

اُس پیر کی مُریدی دُور دُور تک پھیل گئی تھی اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس کے مرید بن گئے تھے۔ اس نے غنڈے بھی پالے ہوئے تھے اور وہ ایک پاور بن گیا تھا۔

پھر میں آصف کے گھر گیا اور واجدہ کو وہاں دیکھا۔ آصف نے تو مجھے ایسا گلے لگایا کہ چھوڑ ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ واجدہ اس کی پوری پوری خدمت کر رہی تھی۔ واجدہ نے مجھے اتنا ہی کہا' اب شادی کر لو۔

وہ میں نے کر لی اور زندگی بہت اچھی گزری۔

محتشم شُدُ